بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
بانی و مدیرِ اعلیٰ محمود ریاض
مدیرہ رضیہ جمیل
مدیر منتظم آذر ریاض
مدیرِ اعزازی امتہ الصبوح
شاہین رشید
اشتہارات خالدہ جیلانی
خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی
زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
ممبر کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

مستقل سلسلے

اکتوبر 2016
جلد 31 شمارہ 2
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل پبلشر نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۳۰۱ بی پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

دکھ سکھ کی رنگیاں

پہلی بات

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسان کی زندگی خوشیوں اور غموں سے عبارت ہے۔ خوشیوں کے پل بہت مختصر، پر لگا کر اڑتے ہیں اور غم کے لمحات گزارے نہیں گزرتے۔ موت' زندگی کی سب سے المناک حقیقت اور اپنے پیاروں کی دائمی جدائی ایسا غم ہے۔ جس کا صبر اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ گزرتا وقت اپنے ساتھ بہت سے رنج والم کے لمحات کو دھندلا دیتا ہے مگر انسان بھول نہیں پاتا ہے۔ زخم مندمل بھی ہو جائیں تو کسک باقی رہ جاتی ہے۔

زندگی کے سفر میں ہمارے ساتھی' ہمارے دوست احباب اور ہمارے جان سے پیارے رشتے ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ جائیں تو وہ ہماری یادوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کی یادوں کے گلاب ہمیشہ مہکتے رہتے ہیں۔ ان کی محبتیں' مہربانیاں' جب بھی یاد آتی ہیں' آنکھوں کو پر نم کر دیتی ہیں۔

ایسی ہی مہربان' نرم خو' محبت کرنے والی' شخصیت ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے بانی و چیف ایڈیٹر محمود ریاض صاحب کی اہلیہ بھی تھیں۔ جو عید الاضحیٰ سے تین روز قبل 9 ستمبر کو داغ مفارقت دے گئیں۔

ایسی نیک دل' مشفق اور مہربان ہستیاں دنیا سے رخصت ہو جائیں تب بھی ہماری دعاؤں میں شامل اور ہماری یادوں کا حصہ رہتی ہیں۔

ادارہ شعاع کے اراکین اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ مرحومہ کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ ان کے متعلقین کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

جو لوگ دنیا سے رخصت ہو جائیں ان کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہماری دعائیں ہیں۔ قارئین سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں

- ☆ سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ جب وہ ملے
- ☆ ایمل رضا کا مکمل ناول۔ پیال ساز
- ☆ فرزانہ کھرل کا مکمل ناول۔ چھپا کے چھپی
- ☆ شہر خطا۔ نایاب جیلانی کا ناولٹ
- ☆ خواب شیشے کا۔ عفت سحر طاہر کا ناول
- ☆ قانتہ رابعہ' صباحت یاسمین' ماورا خان' ہاجرہ ریحان' راشدہ رفعت اور ام سعدی کے افسانے
- ☆ ٹی وی فنکار زاہد احمد سے ملاقات
- ☆ معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک
- ☆ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ
- ☆ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے' خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔
- ☆ شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

جو مالک ہے سب کا وہ مالک ہے میرا
اسی نے بنایا اُجالا اندھیرا

وہ سارے جہانوں کا واحد خدا ہے
وہ مشکل کُشا ہے، وہ حاجت روا ہے

اسی نے بنائے چمن زار سارے
اسی کی ہیں تخلیق چاند اور تارے

فلک ہیں مرے کبریا کی نشانی
زمیں ہے اسی ذات کی مہربانی

وہ پتھر میں مخلوق کو پالتا ہے
وہ سب پر نگاہِ کرم ڈالتا ہے

وہ سب سے مکرم وہ سب سے بڑا ہے
وہ سارے جہانوں کا فرماں روا ہے

ریاض حسین قمر

دل میں اُترتے حرف سے، مجھ کو ملا پتا ترا
معجزہ حسنِ صوت کا، زمزمۂ صدا ترا

اے مرے شاہِ شرق و غرب! نانِ جویں غذا تری
اے مرے بوریا نشین! سارا جہاں گدا ترا

سنگ زنوں میں گھر کے بھی، تو نے انہیں دعا ہی دی
دشتِ بلا سے بارہا، گزرا ہے قافلہ ترا

کوئی نہیں تری نظیر، روزِ ازل سے آج تک
تا بہ ابد نہیں مثیل کوئی، ترے سوا، ترا

یوں تو تری رسائیاں، فرش سے عرش تک محیط
میں نے تو اپنے دل میں بھی، پایا ہے نقشِ پا ترا

دُور سہی دیارِ نور، چُور سہی مرا شعور
تُو مرا حوصلہ تو دیکھ، میں بھی ہوں مبتلا ترا

احمد ندیم قاسمی

ادارہ

طعام کی تعریف، حکم اور کھانا کھانے کے احکام و آداب

طعام کی تعریف

طعام سے مراد ہر وہ چیز ہے جو بطور غذا کھائی جائے، مثلاً: گندم، چاول، کھجور اور گوشت وغیرہ۔

کھانے کا حکم

اسلام نے جسم اور نفس کے حقوق رکھے ہیں۔ نفس انسانی کو بچانے اور اسے واجبات دینی کی ادائیگی کے قابل بنانے کے لیے کھانا شروع کیا ہے، اس لیے ہر چیز حلال کردی سوائے ان چیزوں کے جن کی حرمت بیان کردی گئی ہے کیونکہ وہ انسانی جسم کے لیے مضر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اس اللہ ہی نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔" (البقرۃ 2۔39)

نیز فرمایا: "لوگو! زمین میں موجود حلال پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ۔"

جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا: "کھاؤ، صدقہ کرو اور لباس پہنو جب تک اسراف اور تکبر و غرور کا پہلو اس میں شامل نہ ہو۔" (سنن نسائی)

نیز فرمایا: "اللہ تعالیٰ جسے کسی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس پر دیکھے۔" (مسند احمد)

چند ممنوع کھانے

- دوسرے مسلمان بھائی کا مال جو اس کی ملکیت نہ ہو۔
- مچھلی اور ٹڈی کے علاوہ کوئی بھی جانور جو طبعی موت مر گیا، یا اس کا گلا گھونٹ کر مار دیا گیا یا وہ چوٹ لگنے سے مر گیا ہو۔
- ذبح کے وقت بہنے والا خون۔
- خنزیر کا گوشت، چربی اور دیگر اجزاء۔
- غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جانے والا جانور۔
- قبروں اور بتوں کی نذر کیا جانے والا جانور اور کھانا وغیرہ۔

کھانا کھانے کے چند ضروری احکام و آداب

- مسلمان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء کھانی جائز ہیں۔
- کھانے سے مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تقویت کا حصول ہو تو یہ کھانا کھانا باعث اجر بن جائے گا۔
- کھانا ٹیک لگائے بغیر تواضع کے ساتھ بیٹھ کر کھانا چاہیے۔
- کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، البتہ پسند نہ آئے تو نہ کھائے۔
- مہمان کو اہل خانہ کے ساتھ کھانا کھلایا جائے۔
- کھانے کے شروع میں بسم اللہ اور بعد میں الحمدللہ پڑھنا چاہیے۔
- کھانا دائیں ہاتھ سے اور اپنے سامنے سے کھانا چاہیے۔
- اگر لقمہ گر جائے تو اسے صاف کر کے کھا لینا چاہیے۔
- کھانا گرم ہو تو ٹھنڈا کرنے کے لیے پھونکیں نہ

مارے۔

○ مجلس میں موجود بڑے اور معزز افراد کو پہلے کھانا پیش کرنا چاہیے بشرطیکہ وہ دائیں جانب بیٹھے ہوں۔

○ کھانے کے دوران میں ساتھیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ بدتمیزی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ ہے کہ سب کچھ اپنی ہی پلیٹ میں ڈال لیا جائے۔

○ کھانا کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لے یا انہیں صاف کرلے یا دھولے۔ اسی طرح برتن کو انگلی سے چاٹ چاٹ کر صاف کیا جائے۔

کھانوں سے متعلق احکام و مسائل

کھانا کھلانے کا بیان

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ جلدی جلدی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور (گلیوں بازاروں میں عام لوگ) کہنے لگے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ تین بار (کہا۔) میں بھی لوگوں کے ساتھ زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ جب میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس پر توجہ سے نظر ڈالی تو مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کا چہرہ کسی جھوٹ بولنے والے کا چہرہ نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد میں نے سب سے پہلے سنا' وہ یہ تھا: "اے لوگو! سلام عام کرو' کھانا کھلایا کرو' صلہ رحمی کرو' اور جب لوگ سو رہے ہوں تو تم رات کو نماز (تہجد) پڑھو' تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔"

فوائد و مسائل : کسی عظیم نیک شخصیت یا بڑے عالم کی تشریف آوری پر اس کا استقبال کرنا چاہیے اور اس سے ملاقات کے لیے حاضر ہونا چاہیے۔

نیک آدمی کی نیکی اور برے کی برائی چہرے سے ظاہر ہو جاتی ہے لیکن بعض لوگ اس کی پہچان نہیں رکھتے۔

جب لوگ کسی عالم کی زیارت کے لیے جمع ہوں تو اسے چاہیے کہ مناسب وعظ و نصیحت کرے۔

سلام عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو سلام کیا جائے اور جب بھی ملاقات ہو سلام کیا جائے۔ اور جسے سلام کیا جائے وہ اس کا جواب دے۔

کھانا کھلانے سے مراد مہمانوں کی خدمت بھی ہے اور غریب و مستحق افراد کی امداد بھی۔

صلہ رحمی سے مراد قریبی رشتے داروں سے حسن سلوک ہے۔ جس میں ان سے میل ملاقات' مشکل میں ان کی مدد اور حسن سلوک کی دیگر سب صورتیں شامل ہیں۔

نماز تہجد ایک عظیم نیکی ہے جس میں خلوص' اللہ کی طرف توجہ' دعا و مناجات اور بہت سے فوائد اور برکات موجود ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے جنت ملتی ہے۔

حسن خلق

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سلام عام کرو' کھانا کھلاؤ اور جس طرح اللہ عزوجل نے تمہیں حکم دیا ہے اس طرح بھائی بھائی بن کر رہو۔" (مسند احمد)

فائدہ : حسن خلق اور حقوق العباد کی ادائیگی سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں امن و امان قائم رہتا ہے۔

بہتر عمل

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

"اے اللہ کے رسول! اسلام کا کون سا عمل بہتر

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ہے؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ کہ تو کھانا کھلائے اور جسے تو جانتا ہے اسے بھی سلام کرے اور جسے نہیں جانتا اسے بھی سلام کرے۔" (بخاری)

فائدہ : ہر واقف اور ناواقف کو سلام کرنے کا مطلب عزیز دوست اور اجنبی یعنی ہر مسلمان کو سلام کرنا ہے۔ جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ غیر مسلم ہے' اسے سلام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ غیر مسلم کا فرض ہے کہ مسلمان کو سلام کرنے میں پہل کرے۔ جب وہ سلام کرے تو مسلمان کو چاہیے کہ اسے سلام کے جواب میں وعلیکم کہے۔

ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے کافی ہوتا ہے۔ دو آدمیوں کا کھانا چار افراد کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور چار افراد کا کھانا آٹھ افراد کے لیے کافی ہوتا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اگر کھانا کم ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ دوسرے ساتھیوں کا خیال رکھ کر کھائے۔

2۔ مل کر کھانا کھانے سے تھوڑا کھانا زیادہ افراد کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور کھانے میں برکت ہوتی ہے۔

3۔ باہمی ہمدردی اور خیر خواہی مسلمانوں کی امتیازی خوبی ہے۔

کم خوری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ سات آنتوں میں کھانے سے مراد بہت زیادہ کھانا ہے۔

حرص اور لالچ مومن کی شان کے لائق نہیں۔

2۔ زیادہ پیٹ بھر کر کھانا صحت کے لیے نقصان دہ ہے' اس لیے صرف اسی قدر کھانا کھانا چاہیے جو آسانی سے ہضم ہو جائے۔

3۔ مومن اللہ کا نام لے کر کھاتا ہے' اس لیے اس کے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ کافر اللہ کا نام لے کر نہیں کھاتا' اس لیے اس کے کھانے میں برکت نہیں ہوتی اور کھانے میں اس کے ساتھ شیطان شریک ہو جاتا ہے۔

کھانے میں عیب نکالنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر پسند ہوتا تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اگر پکانے والے سے کھانا پکانے میں کوئی کمی رہ جائے تو برداشت کرنا چاہیے۔ معمولی بات پر آپے سے باہر ہو جانا اخلاق کے منافی ہے۔

2۔ بعض اوقات کوئی کھانا انسان کو پسند نہیں ہوتا' تب طبیعت پر جبر کر کے کھانا ضروری نہیں اور نہ پیش کرنے والے ہی پر ناراض ہونا چاہیے کہ یہ کھانا کیوں پکایا گیا۔

کھانا کھاتے وقت ہاتھ منہ دھونا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلا سے باہر تشریف لائے۔ آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ کی خدمت میں وضو کے لیے پانی پیش نہ کروں؟ آپ نے فرمایا: "کیا میں نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟" (مسلم)

فوائد و مسائل : کھانا کھانے کے لیے نماز والا

وضو کرنا ثابت نہیں۔
شریعت نے جو پابندی نہیں لگائی' صفائی یا تقویٰ وغیرہ کے نام پر وہ پابندی لگانا درست نہیں۔
نماز کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے۔

ٹیک لگا کر کھانا کھانے کا بیان

حضرت ابو جحیفہ (وہب بن عبداللہ) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔" (بخاری)
حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میں نے ایک بکری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیے کے طور پر پیش کی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کھانے لگے۔
ایک اعرابی نے (تعجب سے) کہا: بیٹھنے کا یہ کیسا انداز ہے؟
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ نے مجھے شریف بندہ بنایا ہے' متکبر اور سرکش نہیں بنایا۔"
فوائد و مسائل: (۱) محمد فواد عبدالباقی رحمتہ اللہ نے اتکاء (ٹیک لگانے) کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں: (ا) چار زانو (چوکڑی مار کر) بیٹھنا۔ (ب) اچھی طرح کھل کر بیٹھنا۔ (ج) بیٹھ کسی چیز (دیوار وغیرہ) سے لگا کر بیٹھنا۔ (د) ایک ہاتھ زمین پر رکھ کر (اس پر سہارا لے کر) بیٹھنا۔ عام طور پر اس لفظ سے تیسرا مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ (۲) گھٹنوں کے بل بیٹھنے سے مراد تشہد کی طرح بیٹھنا یا اکڑوں بیٹھنا ہے' یعنی پنڈلیاں کھڑی کر کے پاؤں کے پورے تلوے زمین پر لگا کر ان پر بیٹھنا۔ (۳) تکبر کی ہر صورت مذموم ہے اور ہر کام میں تواضع قابل تعریف ہے۔

کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھ اصحاب کے ہمراہ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک اعرابی (بدو) آیا' وہ (سارا کھانا) دو لقموں میں کھا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر یہ شخص بسم اللہ پڑھ لیتا تو کھانا تمہارے لیے کافی ہو جاتا' چنانچہ تم میں سے جو شخص کھانا کھائے اسے چاہیے کہ بسم اللہ پڑھ لے۔ اگر شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو (یاد آنے پر) یوں کہہ لے۔ بسم اللہ فی اولہ و آخرہ "اللہ کے نام کے ساتھ (کھانا شروع کرتا ہوں) اس کے شروع اور آخر میں۔"
فوائد و مسائل: بسم اللہ پڑھنے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے اور تھوڑا کھانا زیادہ لوگوں کو کافی ہو جاتا ہے۔
اگر چند افراد مل کر ایک برتن میں کھانا کھا رہے ہوں تو سب کو بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ اگر ایک آدمی بھی بغیر بسم اللہ کے کھانے لگے تو برکت ختم ہو جاتی ہے۔
کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنی چاہیے' یاد نہ رہے تو یاد آنے پر بسم اللہ اولہ و آخرہ یا بسم اللہ فی اولہ و آخرہ پڑھ لے۔

دائیں ہاتھ سے کھانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ دائیں ہاتھ سے کھائے' دائیں ہاتھ سے پیے' دائیں ہاتھ سے لے اور دائیں ہاتھ سے دے' کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے' بائیں ہاتھ سے پیتا ہے' بائیں ہاتھ سے دیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے لیتا ہے۔" (طبرانی)
فوائد و مسائل:
1۔ وہ تمام کام جو عرف عام میں اچھے سمجھے جاتے ہیں یا طبعاً ناگوار نہیں' ان میں دایاں ہاتھ استعمال کرنا چاہیے۔ دوسرے کاموں میں بایاں ہاتھ استعمال

کیا جائے۔

2۔ احادیث میں بہت سے کاموں کے بارے میں دائیں جانب کو اہمیت دینے کا ذکر موجود ہے' مثلاً: کھانا' پینا' لینا' دینا' وضو' غسل' کنگھی کرنا' کپڑا پہننا' جوتا پہننا' سر کے بال کٹوانا یا منڈوانا' لکھنا' مسجد میں داخل ہونا' بیت الخلا میں داخل ہونا' مسجد سے باہر آنا' لباس یا جوتا اتارنا وغیرہ۔

3۔ جو کام شیطان کو پسند ہیں مومن کو ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اپنے قریب سے کھانا

حضرت عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت میں پرورش پانے والا ایک بچہ تھا۔ (ایک دن کھانا کھاتے ہوئے) میرا ہاتھ پلیٹ میں (ادھر ادھر) گھوم رہا تھا تو آپ نے مجھ سے فرمایا۔

"بچے! اللہ کا نام لو (بسم اللہ پڑھو) دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے قریب سے کھاؤ۔" (بخاری)

فوائد و مسائل: 1۔ حضرت ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی برہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ یہ سابقین اولین میں سے ہیں۔ ۴ ہجری میں فوت ہوئے تو ان کی بیوہ حضرت ام سلمہ ہند بنت ابوامیہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح ان کے بیٹے عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہ اور بیٹی زینب بنت ابو سلمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ آگئے۔

2۔ بچے غلطی کریں تو نرمی سے سمجھانا چاہیے۔

3۔ بچوں کو واضح اور آسان اسلوب میں سمجھانا چاہیے اور اختصار پیش نظر رکھا جائے۔

4۔ جب برتن میں ایک ہی قسم کا کھانا ہو تو ہر ایک کو اپنے سامنے سے کھانا چاہیے' البتہ اگر مختلف قسم کی چیزیں (کھجوریں یا مٹھائی وغیرہ) ہوں تو اپنی پسند کی چیز دوسری طرف سے بھی لی جاسکتی ہے۔

دائیں ہاتھ سے کھانا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بائیں ہاتھ سے نہ کھایا کرو کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔" (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کوئی شخص اپنا ہاتھ نہ پونچھے' جب تک اسے چاٹ نہ لے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ کی انگلیوں کو زبان سے صاف کر لینا چاہیے۔

2۔ غذا کا معمولی حصہ ضائع کرنا بھی نعمت کی ناشکری ہے۔

3۔ بغیر صاف کیے ہاتھ کو کپڑے سے پونچھنا یا پانی سے دھونا مناسب نہیں کیونکہ اس طرح کپڑا خراب ہو گا یا پانی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا پڑے گا اور ہاتھ کو لگے ہوئے غذا کے ذرات نالی میں جائیں گے جو رزق کی ـــ کی ناقدری ہے۔

4۔ برکت ایک معنوی اور غیر محسوس چیز ہے۔ اس کے حصول کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے اور رزق کو ضائع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

5۔ کسی سے چٹوانا اس وقت درست ہے' جب دوسرا آدمی اس میں کراہت محسوس نہ کرے' مثلاً بیوی یا اولاد وغیرہ ہو۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

نسرین علیم۔ جڑانوالہ

میں کوثر خالد' جڑانوالہ کی نند اور بھابھی ہوں۔ ان ہی کے اصرار پر سروے میں حصہ لے رہی ہوں۔

1۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ 29 اپریل 1994

"شادی سے پہلے کے مشاغل؟"

ج۔ چار بھائیوں کی لاڈلی بہن تھی۔ ہر مرضی پوری ہوئی۔ خوب عیش کیے۔ بہن بیمار ہو گئی وہ پولیو کی مریض تھی۔ تو ماں نے پانچویں کلاس سے اسکول چھڑا دیا۔ اور یوں گھر بھر کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر آ گئی۔ ہر کام سیکھا۔ اچھی میزبان کہلائی بھابھیاں آئیں تو چھوٹی بھابھی کوثر خالد نے میٹرک کروایا۔ 500 نمبر لیے۔

3۔ "رشتے میں مرضی؟"

ج۔ "رشتے میں مرضی پوچھی ہی نہیں گئی۔ تھوپ دی گئی ورنہ ضرور اپنی مرضی کرتی۔"

4۔ "جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟"

ج۔ "سوچا تھا بہت پیار کرنے والا ہو۔ خوب باتیں کرنے والا ہو۔ مگر بہت محنتی بہت چپ رہنے والا اور ساتھ دینے والا ملا۔ میں نے اپنی ہر مرضی بعد میں بھی پوری کی۔ چاہے باپ کے بل بوتے یا اپنی محنت سے۔ مگر اس سے باتوں کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ وہ نمازی ہے اور میں بھی اب درس پہ جاتی ہوں۔ اور قرآن سیکھ رہی ہوں۔"

5۔ "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

"باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی۔ ہماری طرف سے۔" "ہاں" ہوئی تو سال دو سال بعد شادی ہو گئی۔ پہلی عید ہی منگنی کا تحفہ ٹھہرا۔

6۔ "شادی کے لیے قربانی؟"

ج۔ "کوئی نہیں۔ البتہ ماں کے گھر عیش دیکھا تھا' وہاں خود جدوجہد کرنی پڑی۔ سلائی کرتی ہوں۔ میاں کا

ساتھ دیتی ہوں۔ وہ میرا ساتھ دیتے ہیں‘ اپنے کام کے ساتھ میرے ساتھ سیکھ کر سلائی بھی کرتے ہیں۔ آٹا تک میری بیماری میں گوندھ لیتے ہیں۔ ہر فن مولا ہیں۔ مگر حلال کمائی کم ہے تو میں اپنے شوق اور معیار زندگی کے لیے محنت کرتی ہوں کہ مجھے تحائف لینے دینے کا بہت شوق ہے۔ اتنے ملے نہیں ‘جتنے دیے ہیں تحفے۔"

7۔ "رسموں کے لین دین میں جھگڑا؟"

"نشستہ‘ کوئی ناں۔"

8۔ "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

"عروسی کمرے میں بھابھی کوثر لائیں تو ویڈیو والے نے انہیں نکال دیا اور ویڈیو کے بعد یہ بھی کمرے سے باہر اسے چھوڑنے چلے گئے۔ ویڈیو میں منہ دکھائی رسم کرلی گئی۔ سونے کا لاکٹ ڈالا تھا (جو علیم نے گھر والوں سے چوری بنوا رکھا تھا) بعد میں یہ آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ میں ہی بولی "میری ہنھی نکال دو" (نند عالیہ نے دلہن بنایا تھا) بولے۔ کیا میں ہنھی اتارتا رہا ہوں؟ (مذاق میں) پھر اتار دیں۔ اور بالوں کی تعریف کرنے لگے۔ لانبے گھنے سیاہ بال۔ اب تو چھوٹے اور خراب ہوگئے ہیں۔"

9۔ "شادی کے بعد خاص تبدیلی؟"

ج۔ "باقی عادات سیرسپاٹا‘ گفٹ تحائف‘ ملنا جلنا‘ تو نہ چھوڑا مگر طبیعت کچھ خاموش ہوگئی۔ بعد ازاں دین کی طرف راغب ہوگئی۔"

10۔ "کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

ج۔ "پندرہ بیس دن بعد میٹھے چاول پکوائے گئے۔ اور مل کر کام کرتے۔ نند بھی تھی اور ساس بھی ماشاء اللہ ہمت میں جوان ہیں۔ میں صبح سو کر اٹھتی تب تک کپڑے بھی دھو لیتیں۔ سودا سلف بھی لاتیں۔ یہاں تک کہ اپنی دوا بھی وہ ویگن بدل کر لے آتی ہیں۔ مزے کی بات ایک بار کوثر خالد کی عینک بنوانا تھی۔ رکشہ نہ ملا اور وہ چوبرجی سے بھاٹی تک پیدل چلتی گئیں اور ہم دونوں پیچھے تھیں۔ مزے کی بات میں بھابھی کوثر سے کہا کرتی تم صفائی کرتے ہوئے چیزیں توڑتی ہو۔ میں کوئی غلطی نہ کروں گی۔ تو ساس کی نقل میں پیکٹ گھی کا توے پر گرم کرنا تھا تو وہ فاصلہ رکھتی ہوں گی۔ میں نے توے پر رکھ دیا اور جو حشر ہوا۔ میں بھرے پرے گھر سے آئی تھی۔ ایک دن تنہا کپڑے استری کررہی تھی۔ دروازے پہ کھٹکا ہوا تو میں ڈر گئی اور استری گر کے ٹوٹ گئی میں رونے لگی۔ علیم نے کہا کوئی بات نہیں ‘میں ٹھیک کردوں گا۔"

11۔ "میکے اور سسرال کے کھانوں کے ذائقے میں فرق؟"

ج۔ "ان کے ہاں سادہ کھانا پکتا تھا۔ گوشت شوربے والا۔ جبکہ میرے بھائی ڈرائیور‘ چٹ پٹے بھنے ہوئے کھانے کھاتے۔ البتہ نند بھی ڈشیں ٹرائی کرتی۔ مزے کی بات وہ ہنی مون پر بھی ہمارے ساتھ گئی تھی (کباب میں ہڈی مگر اس کی خواہش رد نہ کرسکے) اور اب تو میں بلڈ پریشر کی مریض بھی ہوں تو پھیکا ترین کھانا کھانا پڑتا ہے۔ مزے کی بات ‘میاں کو بلڈ پریشر نہیں پھر بھی پھیکا کھالیتے ہیں۔ بلکہ نمک تیز ہو تو کھاتے ہی نہیں۔"

12۔ "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی یا تنقید؟"

ج۔ "میرے کام خاص طور پر میرا پکایا ہوا کھانا سب کو پسند آیا۔ نند سے زیادہ اکلوتے دیور نے برا سلوک کیا جو میری شادی سے پہلے میرا دوست تھا اور میں کوثر بھابھی سے کہتی کہ میں خوش قسمت ہوں کہ ایسا دیور ہوگا۔ مگر الٹ ہوا اور وہ نند سے کہتا۔ اس سے زیادہ کام کروایا کرو۔ ورنہ (چوڑ) ہوجائے گی۔ میں نے سن لیا اور دکھ ہوا اب وہ اپنی بیوی سے بھی کام پہ لڑتا رہتا ہے کہ میری مرضی کا کرو۔"

13۔ "سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں۔"

ج۔ "پچاس فیصد۔"

14۔ "پہلے بچے کی پیدائش؟"

ج۔ "بچوں سے محروم رہی۔ ساس نے کہا۔ ہر وقت میکے جاتی ہو۔ اس لیے بچہ نہیں ہوا۔ اور موٹی ہو۔

شاید اس لیے (کوئی پہلے معلوم نہ تھا کہ موٹی ہوں) پھر میں نے ہر طرح کا چیک اپ اور علاج کروایا مگر بے سود۔

بھابھی کوثر کا بڑا بیٹا میرے پاس پڑھنے آیا۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے اس کی شادی کی۔ اس کے سارے شوق پورے کیے' خود بری تیار کی۔ اور ایک چھوٹا بیٹا محسن (تحفہ) ملا۔ جو اب کلاس ون میں ہے۔ اور بہو صائمہ کا "ربیع ثمر" جو کوثر کا پوتا ہے۔ اتنا پیارا ہے کہ اب میں تین بیٹے پال رہی ہوں۔"

15۔ "سسرال میں مقام؟"

ج۔ "میں' ساس' دیورانی سب مل کر ہر جگہ جاتے ہیں۔ چاہے رشتے دار ہوں یا چاہے دوست' چاہے شادی وغیرہ مگر عادات میں کچھ فرق بھی ہے۔ تو مقام؟ چوبیس سال بعد تقریباً" ہر کسی کو مقام مل ہی جاتا ہے۔ اور جنہیں نہیں ملتا۔ اللہ انہیں عطا کرے اے ون درزن ہوں۔ ہر کوئی ترستا ہے مجھ سے کپڑے سلوانے کے لیے۔ بھتیجیوں کے خاص طور پر (کوثر کی شمع) کے کپڑے فری سیتی ہوں۔ مگر وہ ہر طرح ساتھ دیتی ہیں' علیم' ممانی اور خالہ کے بھی ایک وقت تک فری سیے۔"

16۔ "میکے اور سسرال کے ماحول میں فرق؟"

ج۔ "ماں باپ دنیادار' رکھ رکھاؤ والے' برتنے والے اپنی ناک سلامت رکھنے والے' درباروں پہ جانے والے' ماں باپ تو میرے بھی بہت محنتی تھے۔ دو بھائی بھی مگر یہ سارے محنت تو کرتے ہیں مگر تنخواہیں معمولی۔ میرے ابا ڈرائیور تھے۔ (اپنی بس کے) سسر پوسٹ مین لاہور جی پی او۔ پڑھائی میں تو دس اور بس دونوں خاندان۔ سسر عبادت گزار تہجد گزار مگر ان میں دنیادار کوئی نہیں کہ وہ دل میں کوئی بات نہیں رکھتے صاف بول دیتے ہیں' ہم انہیں کہتے ہیں منہ پھٹ اور ہم موقع محل لوگ دیکھ کر بات کرتے ہیں۔ (یعنی کچھ باتیں دل میں رکھ لیتے ہیں)"

17۔ "جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟"

ج۔ "پہلے جوائنٹ پھر علیحدہ ہو جائیں۔ مگر مجھے دس سال بعد علیحدہ کیا گیا۔ دیور اور نند کی شادی کے بعد۔ گھر میں اوپر ہوں تو ساس' دیورانی اوپر آجاتی ہیں۔ وجہ دیورانی بولنے والی ہے۔ اور ساس چپ رہنے والی' مگر باتیں سننے آجاتی ہیں۔"

18۔ "شوہر سے تعلقات؟"

ج۔ "ماشاء اللہ بہت اچھے اتنے اچھے کہ جب وہ غصہ بھی کریں تو ہم پی جاتے ہیں۔" بس یہ لوگ سادہ اور کفایت شعار ہیں۔ اور ظاہری سی بات ہے میں بھی غصہ نکال لیتی ہوں اور پھر وہ بھی پی جاتے ہیں۔ آپ بھی پی جایا کریں اور جو پی گیا وہ جی گیا۔

قارئین۔ یہ ہیں میری بھابھی جو بولتی گئی اور میں لکھتی گئی۔ اس کے آخری جملے خالص اس کے اپنے ہیں اور کاش میں بھی غصہ پینا سیکھ لوں مگر میرا المیہ یہ ہے کہ میں کسی پر غصہ ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا میں آخری دم تک کوشش کروں گی کہ کوئی بھی غصے میں نہ آئے اور دنیا جنت بن جائے۔ میرے لیے دنیا کے سب لوگ برابر ہیں۔ اور میں لوگوں سے نہیں صرف اللہ سے مدد مانگتی ہوں۔

باصلاحیت فنکار

زاہد احمد سے ملاقات

شاہین رشید

"بے شرم، نعمت اور ذرا یاد کر کے تین مختلف کردار مگر شخصیت ایک ہے۔ جی۔ بات ہو رہی ہے زاہد احمد کی جو کم عرصے میں ٹی وی اسکرین پر چھا گئے ہیں۔ ان کے تینوں سیریلز آن ایئر ہیں اور بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر ان کا سیریل "ذرا یاد کر" جسے خلیل الرحمن قمر نے لکھا ہے، بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ "ہادی" کے رول میں زاہد کی بہترین پرفارمنس دیکھنے کو مل رہی ہے۔"

"کیا حال ہے زاہد احمد صاحب؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"تین سیریلز آن ایئر ہیں ماشاء اللہ سے۔ پھر بیٹے کی دنیا میں آمد۔۔۔ آج کل تو بہت خوش ہوں گے۔"

"الحمدللہ۔۔۔ کچھ نہ پوچھیں، کتنا خوش ہوں۔۔۔ ماشاء اللہ اب میرے دو بیٹے ہیں۔ اللہ ان کی زندگی رکھے، آمین۔"

"نام کیا رکھا ہے؟"

"زیان احمد۔۔۔"

"ماشاء اللہ تین سیریلز آن ایئر ہیں۔ رسپانس کیسا ہے اور آپ کو خود کون سا سیریل اچھا لگ رہا ہے؟"

"دیکھیں جی۔ رسپانس تو تینوں کا بہت اچھا ہے اور میں کسی کا نام نہیں لے سکتا کہ باقی دو کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔"

ویسے اگر کوئی میری رائے لیتا تو میں یہی کہتی کہ ڈرامہ سیریل "ذرا یاد کر" میں آپ کی پرفارمنس بہترین

ہے۔"

"شکریہ آپ کا۔"

"زاہد! آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ پہلے بہت فربہ ہوتے تھے۔ تو پھر اسمارٹ کیسے ہوئے؟"

ہنستے ہوئے۔ "یہ ایک لمبی اسٹوری ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں پہلے بہت موٹا ہوتا تھا۔"

"اچھا! کیا لمبی اسٹوری ہے؟ کچھ بتایئے؟"

"اسٹوری کچھ یوں ہے کہ 2011 میں' میں ایک آئی ٹی کمپنی میں بہ حیثیت چیف آپریٹنگ آفیسر کی جاب کرتا تھا اور چونکہ جاب اچھی تھی۔ اچھا خاصا کما رہا تھا تو سوچا' چلو شادی کرلیتے ہیں۔ چنانچہ 2011ء میں' میں نے شادی کرلی اور 2011ء میں ہی ہم ہنی مون منانے ملائیشیا چلے گئے۔ ہنی مون کے آخری دن پتا چلا کہ میری جاب ختم ہوگئی ہے۔ کیونکہ جس کمپنی میں' میں کام کرتا تھا وہ فراڈ کے الزام میں بند کردی گئی ہے۔ اگلے دن پاکستان آگئے۔ اب نہ میرے پاس جاب تھی اور نہ ہی لمبا چوڑا اماؤنٹ تھا بینک میں۔ نئی نویلی دلہن اور نئی نئی پریشانیاں۔ پھر 2012ء میں میرا ایک خوف ناک ایکسیڈنٹ ہوا اور میری ریڑھ کی ہڈی پہ چوٹ لگی۔ چار ماہ تک میں حرکت نہیں کرسکا اور اس عرصے میں' میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ 2012ء میں ہی ایک اور مصیبت مجھ پر نازل ہوئی کہ ریڈیو جاتے ہوئے میری ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف شروع ہوگئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو کی جاب بھی گئی۔ میری حرکت بالکل ختم ہوچکی تھی۔ میں کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ سبزیوں پہ میرا گزارہ ہوتا تھا۔ 2012ء میں ہی "پمز" اسلام آباد کے ہیڈ نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن کرالینا چاہیے۔ سرجری ہوگئی اور میں چلنے کے قابل ہوگیا۔ جاب مل گئی' مگر کام بہت کرنا پڑتا تھا۔ سیلری بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ 2012ء میں ہی پی ٹی وی کا ایک شو ملا جس میں انگریزی فلموں پہ ڈسکس کرنا ہوتا تھا۔ اب آجائیں 2013ء میں۔ 2013ء میں پی ٹی وی نے ایک نیا چینل متعارف کرایا اور اس وقت کی پی پی کی حکومت نے پی ٹی وی کے چیف کو جاب سے فارغ کردیا۔ اب میں بغیر پیسوں کے کام کررہا تھا۔"

"اف اتنی مشکلات۔ پھر اچھا وقت کب شروع ہوا؟ دبلے کس طرح ہوئے' یہ تو اب پوچھنا ہی بے کار ہے۔"

"بالکل جی۔ بالکل۔ اتنی مشکلات میں بھی دبلا نہ ہوتا کیا۔ خیر۔"

"حالات اچھے تب ہونے شروع ہوئے جب انور مقصود صاحب کی ٹیم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انور مقصود صاحب نے مجھے اپنے تھیٹر کے ڈرامے "سوا چودہ اگست" میں جناح کا رول دیا۔ میں نے ایک سال تک تھیٹر کیا اور اس دوران یعنی سارے واقعات میں 22kg ویٹ لوز کیا۔ 2014ء میں تھیٹر چھوڑ دیا' کیونکہ اس کا پروڈیوسر کرپٹ تھا۔ اب نہ گھر تھا' نہ پیسے' کراچی کی سڑکوں پر زومبیوں کی طرح پھرتا تھا۔ پھر ایک دن اسی سال ہم ٹی وی کے پروڈکشن ہاؤس سے مجھے کال آئی کہ آکر آڈیشن دیں۔ انہوں نے مجھے تھیٹر پر پرفارمنس کرتے دیکھا تھا۔ آڈیشن دیا اور کامیاب ہوگیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں ڈراما سیریل "محرم" کے لیے منتخب ہوگیا اور اب جو میں ہوں۔ وہ آپ کے سامنے ہوں۔ بڑی خواری' اور بے روزگاری کے بعد اللہ نے یہ مقام دیا ہے۔ یہ شاید میرا امتحان تھا' رب کی طرف سے۔"

"2011ء میں آپ کی شادی ہوئی اور پھر کرائسس میں گھرتے چلے گئے تو کیا۔۔۔؟"

"میں ایسا کچھ نہیں سوچتا۔ لیکن مشکل حالات میں اپنے پرائے کا فرق معلوم ہوجاتا ہے۔ خیر۔ مشکل وقت تھا گزر گیا۔ اللہ نے میرا امتحان لینا تھا۔ انسان کی زندگی میں اچھے برے دن آتے رہتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ برے دن گزر گئے۔ سوچتا ہوں تو جھرجھری آجاتی ہے۔"

"بالکل۔ تھیٹر تو غالباً" آپ 2005 سے

کررہے ہیں؟"

"تھیٹر میں 2006ء سے کررہا ہوں۔ 2005ء میں تو میں تھیٹر دیکھنے گیا تھا اور ڈرامے کے اختتام پر اناؤنسمنٹ ہوئی کہ جنہیں تھیٹر میں کام کرنے کا شوق ہے۔ وہ آڈیشن دے سکتے ہیں اور پھر انہوں نے اپنا طریقہ کار بتایا۔ میں نے اسی طریقہ کار کے حساب سے ای میل کے ذریعے اپنی دلچسپی ظاہر کی اور یوں مجھے آڈیشن کے لیے بلالیا گیا۔ میں نے آڈیشن دے دیا اور یوں 2006ء میں' میں نے باقاعدہ آغاز کیا۔ تھیٹر میں کام کرنے کا اور 2006ء سے لے کر 2013ء تک میں نے پانچ پلے کیے تھیٹر کے۔ تین پلے اسلام آباد میں اور باقی کراچی میں۔۔۔ جس میں انور مقصود کا کھیل "سوا چودہ اگست" اور "ہاف پلیٹ" بہت مقبول ہوا اور مجھے بھی پہچان ملی اور ان ہی کی وجہ سے مجھے پھر ٹی وی سے بھی پیش کش ہوئی اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ٹی وی کے لیے میرا باقاعدہ آڈیشن ہوا اور سیریل "محرم" ملا اور اس کے بعد "الوداع" جس نے میری شہرت کو چار چاند لگا دیے۔۔۔"

"جاب گئی۔۔۔ کرائسس میں وقت گزرا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس فیلڈ کی روزی ہوائی ہوتی ہے۔"

"ہر فیلڈ کی روزی ہوائی ہے۔ آپ جاب کررہے ہیں' اگلی صبح پتا چلا کہ آپ کی جاب ختم ہوگئی ہے' تو بتایئے اس کو کیا کہیں گے تم تو اس فیلڈ کے لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی روزی ہوائی ہے اور پھر انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فیلڈ کو کس طرح لے کر چل رہا ہے۔ ہر فیلڈ میں بہت نرم مزاجی کے ساتھ اور رب کے شکر کے ساتھ کام کریں۔ آپ نخرے دکھائیں گے' لوگوں کو تنگ کریں گے تو پھر کیسے اپنی جگہ بنا پائیں گے۔ اس کام میں بلاشبہ پیسہ ہے' لیکن اگر آپ پیسے کے پیچھے بھاگیں گے تو پیسہ آپ سے دور بھاگے گا۔"

"شہرت اور پیسہ دونوں نشے والی چیزیں ہیں۔۔۔ اس کی عادت ہوجائے تو چھٹکارا مشکل ہے۔"

"بے شک لیکن میں نہ پیسے کے پیچھے بھاگنا چاہتا ہوں اور نہ ہی شہرت کے۔ اعتدال کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ گرم گرم کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ ٹھنڈا کرکے کھاؤں گا تو دیرپا شہرت حاصل کروں گا۔"

"جاب بہتر رہتی ہے یا اس طرح کی کمائی۔ جو آپ آج کل کمارہے ہیں؟"

جاب سے بہتر ہے یہ کمائی۔۔۔ میں نے دس سال جاب کی ہے اور جاب میں کتنی ٹینشن ہوئی ہے' میں ہی جانتا ہوں۔۔۔ اب تو اداکاری میرا جنون اور میرا پروفیشن ہے۔

"یہ تو فل ٹائم جاب ہے۔ اس میں ٹینشن نہیں ہوتی آپ کو؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ جس جاب میں دلچسپی ہو' دل لگتا ہو اس میں ٹینشن نہیں ہوتی اور پھر اس فیلڈ میں مجھے لگتا ہے کہ آپ کو دوسرے کام کرنے کے لیے وافر مقدار میں ٹائم مل جاتا ہے۔۔۔ ایک شوٹ کے بعد دوسری شوٹ کے لیے کافی ٹائم مل جاتا ہے۔ کچھ سوچنے کا' کچھ سمجھنے کا' موڈ بنانے کا۔۔۔"

"ماشاء اللہ سے آپ کے سارے ہی سیریل ہٹ گئے۔ آپ کس کردار کو یا کہانی کو اپنے سے قریب سمجھتے ہیں۔"

"نہ کردار اور نہ ہی کہانی میری شخصیت کے قریب تھی۔۔۔ لیکن سب کردار میں نے اپنی خوشی سے کیے۔۔۔ کیونکہ سب میں پرفارمنس مارجن زیادہ تھا۔"

"زیادہ تر کن کرداروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ نیگٹو' پوزیٹو یا رومانٹک؟"

"کردار وہ جو حقیقت سے قریب ہو' کرنے میں مزہ آتا ہے۔ خواہ وہ نیگٹو ہو' پوزیٹو یا رومانٹک۔۔۔ رومانٹک کردار میں اگر سامنے والا اچھا رسپانس نہ دے تو پھر بہت غصہ آتا ہے اور کردار کرنا اور ڈائیلاگ بولنا مشکل ہوجاتا ہے۔"

"زیادہ اپنے ڈرامے دیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟"

"زیادہ تو اپنے ہی ڈرامے دیکھتا ہوں اور یہ دیکھنے

کے لیے دیکھتا ہوں کہ میں نے کہاں اچھا اور کہاں برا پرفارم کیا اور جہاں محسوس کرتا ہوں کہ کچھ اچھا نہیں کیا۔۔۔ وہاں اپنی اصلاح کرتا ہوں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے کہ کب' کہاں جنم لیا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔؟"

"جی 'جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں 20 ستمبر 1984ء میں پیدا ہوا۔ میرا پورا نام زاہد افتخار احمد ہے۔ والد کا تعلق راولپنڈی سے ہے' جبکہ والدہ کا تعلق لکھنؤ (انڈیا) سے ہے۔ والد صاحب آرمی میں تھے' تو میرا جنم بھی اسلام آباد میں ہوا۔ وہیں پلا بڑھا اور تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی' میں نے ایم بی اے کیا ہے مارکیٹنگ میں اور میرے تین بھائی ہیں صرف۔۔۔"

"فیملی اسلام آباد میں اور آپ یہاں؟"

"ہر انسان کو وہیں رہنا پڑتا ہے جہاں اس کا روزگار ہوتا ہے اور چونکہ میرا کام کراچی میں ہے تو مجھے کراچی میں ہی قیام کرنا پڑتا ہے۔"

"اور ازدواجی لائف کیسی گزر رہی ہے اور کتنے سال ہوگئے شادی کو؟"

"ماشاءاللہ سے پانچ سال ہونے کو ہیں اور تعلقات اچھے ہیں۔ اس لیے ماشاءاللہ سے دو بیٹوں کا باپ ہوں۔"

"گڈ! بیگم بھی جاب کرتی ہیں کیا؟"

"نہیں جی۔۔۔ بچے چھوٹے ہیں۔ ویسے وہ بھی ٹیلی کام انجینئر ہیں اور ہماری ملاقات بھی وہیں ہوئی جہاں ہم دونوں جاب کرتے تھے اور پھر باہم رضامندی سے رشتہ طے ہوا اور الحمدللہ۔۔۔ ہم ایک اچھی لائف گزار رہے ہیں۔"

"آج کل آپ کے تین سیریلز آن ایئر ہیں۔ ان میں کام کرنے والی لیڈ رولز میں جو خواتین ہیں ان کے لیے کچھ کہیں گے؟"

"ہاں۔۔۔ سب ہی اچھی ہیں۔۔۔ اصل میں مجھے ٹائم کی پابندی کرنے کی بہت عادت ہے۔ ایسے میں کوئی وقت کی پابندی نہ کرے تو مجھے غصہ آتا ہے' لیکن اس معاملے میں' میں نے صبا قمر کو بہت ڈسپلنڈ آرٹسٹ پایا۔ وہ ہمیشہ وقت سے پہلے سیٹ پر موجود ہوتی ہے اور یہی اس کی کامیابی کی وجہ بھی ہے۔"

"کھانے پینے کے معاملے میں کیا پوزیشن ہے؟"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "بہت شوقین ہوں۔۔۔ مگر میری ڈائٹ کا خیال میری بیگم ہی رکھتی ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں پرہیز نہیں کرپاؤں گا اور ایک اچھے اور اسمارٹ آرٹسٹ کے لیے پرہیز بہت ضروری ہے' تاکہ وہ موٹا نہ ہوجائے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے زاہد احمد سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ۔۔۔۔۔۔۔	ثنا امجد
میک اپ ۔۔۔۔۔۔۔	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ۔۔۔۔۔۔۔	موسیٰ رضا

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ آپ سب کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو حفظ و امان میں رکھے۔

زوباریہ خالد لاہور سے لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت بہت خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے "پیال ساز" پڑھا۔ ہر کردار کا نام بڑا اچھا اور مختلف ہے۔ باسل، یشار، سدیم، یشب، زیان، زل مجھے لگتا ہے کہ نانو نے باسل اور یشار کو لے کر پالا ہوا ہے۔ "خواب شیشے کا" میں "موحد" "مہماہ" کے پیچھے ہاتھ دھو کے کیوں پڑ گیا ہے، لیکن آخر میں جوڑی ان دونوں کی ہی بنتی ہے۔ ثمینہ اکرم اور فوزیہ ثمریٹ کے اشعار اچھے لگے۔ "فرحت اشتیاق" کہاں ہیں؟ وہ خواتین اور شعاع میں کیوں نہیں لکھ رہیں؟ ہم ان کو بہت مس کرتے ہیں۔

ج۔ پیاری زوباریہ! فرحت اشتیاق کی کمی تو ہم بھی محسوس کررہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

یاسمین حنفی سہراب گوٹھ کراچی سے لکھتی ہیں

"خواب شیشے کا" یہ قسط اچھی تھی اور اب مزہ آنے لگا ہے پڑھنے میں۔ "پیال ساز" ایمل رضا کے اس ناول کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ زبردست بہت زیادہ زبردست۔ مکمل ناول دونوں اچھے تھے۔ پچھلے ماہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کوثر خالد کے جوابات۔۔۔ ایک سوال کا جواب ختم نہیں ہوتا تھا۔ اگلے سوال کا جواب شروع ہوجاتا تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ موسم کے پکوان میں کیک بنانے کی ریسیپی دیں پلیز، جو بنا اوون کے بنتا ہے۔

ج۔ پیاری یاسمین! آپ کی فرمائش پوری کی جارہی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بنت حوا چوک سرور شہید سے لکھتی ہیں

18 مئی 2013ء کی شام میرے پندرہ سالہ بھائی (وہ بڑا ہے باقی بھائیوں میں سے) کا ایکسیڈنٹ ہوا، اکیڈمی سے آتے ہوئے۔ وہ فرسٹ ایر کا اسٹوڈنٹ ہے۔ ایکسیڈنٹ بہت سیریس تھا، دماغ پہ چوٹ آئی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹی اور دماغ باہر۔۔۔ وہ ڈیڑھ ماہ نشتر ملتان میں رہا۔ پہلے تین دن اس کی انگلی تک نہ ہلی، کوما کے نزدیک تھا۔ دس دن تک ڈاکٹرز نے آپریشن نہ کیا وہ پرامید نہ تھے۔ صرف ایک فیصد چانس تھا۔ ہم نے صدقات، تسبیحات، نوافل اور دعاؤں کا اہتمام کیا۔ دس دن بعد آپریشن ہوا۔ ڈیڑھ ماہ تک اس نے آنکھ تو کھولی، مگر بے ہوشی، پھر اشارے سے بات کی اور اب دو ماہ بعد بات کرنا شروع کی۔ چوٹیں اور بھی آئیں، مگر اللہ نے ہم پہ بہت کرم کیا اس کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔۔۔ ابھی چلتا نہیں ہے۔ سہارے سے اٹھاتے، بٹھاتے ہیں، مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے میرے بھائی کو شفا اور نئی زندگی عطا کی ان دو ماہ میں ہم سب بہت بدل گئے۔ اللہ کے قریب ہوگئے اور گھر میں اتنے مہمان آئے پتا چلا کہ خاندان کتنا اہم ہوتا ہے انسان کی اصل جڑ ہوتا ہے خاندان۔۔۔ وہ دادا کا پہلا پوتا اور ہم تین بہنوں کے کافی عرصے بعد پیدا ہوا منتوں دعاؤں سے۔۔۔ یہ سب اس لیے لکھ رہی ہوں کہ جن بہنوں کے گھر کوئی

پریشانی ہے' بیماری یا کچھ اور' مایوس نہ ہوں بس اللہ سے امید رکھیں' ہروقت دعا مانگیں۔ وہی تکلیف دینے والا اور کاٹنے والا ہے۔ اب اس کا میٹرک کا رزلٹ آیا اس نے 10th میں 91٪ نمبر لیے ماشاء اللہ۔ اللہ نے جہاں ایک طرف پریشانی دی پھر اسی کی طرف سے خوشی بھی دی۔ (الحمدللہ)

ج۔ آپ کو شعاع پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے آپ کے بھائی کو صحت و سلامتی عطا فرمائی۔ یہ واقعی معجزہ ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ برے وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں اور خاندان والے ہی ساتھ دیتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے مذہب میں صلہ رحمی کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

ثمینہ اکرم لیاری کراچی سے لکھتی ہیں

اب ان سب قاری بہنوں کا شکریہ' جو میری کمی محسوس کرتی ہیں اور میرے لیے دعا بھی کرتی ہیں۔ خاص طور پر شکریہ عائشہ انصاری (حیدر آباد) کا جنہیں میرے غم کا احساس ہے۔ شعاع کے توسط سے میں حیا بخاری (ڈی آئی خان) کی بھی احسان مند ہوں۔ حیا تم تو میرے لیے چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ میرے خالہ زاد بھائی اخلاق حسین آٹھ اگست کو شیر شاہ پر روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگیا تھا۔ وہ میری بھابھی کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ اللہ پاک اس کی بیوی اور تین چھوٹے بچوں کو' بہنوں کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین) آپ سب سے اخلاق کے لیے دعا مغفرت کی درخواست ہے۔

"رقص بسمل" یہ اسٹوری پڑھ کر لگ ہی نہیں رہا کہ اسے نبیلہ عزیز لکھ رہی ہیں۔ "خواب شیشے کا" ماضی اور حال کی کہانی ایک ساتھ پڑھنے کو مل رہی ہے۔ موحد نجانے کیا پلاننگ لے کر آفندی ہاؤس آیا ہے۔ اب تو میدان میں نمیر آفندی بھی آگیا ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کوثر خالد نے بہت منفرد لکھا۔ یہ ان کے انداز کا خالص پن ہے جو ان کی نوک قلم پر ہمیشہ سچ ہی آتا ہے۔ کوثر خالد جی تصنع اور بناوٹ سے پاک سچی اور کھری بات بیان کرتی ہیں اور ان کی ذات کا خالص پن مجھے اچھا لگتا ہے۔ ایسے منفرد لوگ نایاب ہوتے ہیں۔ ایمل رضا کی کہانی "پیال ساز" اس بلند پایہ کی لکھی گئی ہے کہ اس پر تبصرہ فرصت سے لکھا جانا چاہیے۔ اس لیے تبصرہ ادھار رہا۔ سیاہ حاشیہ کی آخری قسط پڑھ کر مزہ آگیا۔

ثمینہ! اللہ تعالیٰ سے مرحوم کے لیے دعاگو ہیں۔ کوثر خالد کا سادہ سا انداز ہمیں بھی بہت پسند ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نوال افضل گھمن نے کراچی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ادھ کھلی کھڑکی سے سرور بھرا شور کھڑکی سے آتی کبوتروں کی غٹرگوں... غٹرگوں... رات کے پچھلے پہر کا سکوت سے لبالب طلسم' ط کی دھنگا مشتی والی لاتعداد کروٹیں اور کمرے میں پھیلی ما سکیٹو کوائل۔ کی بھینی بھینی مہک اور شعاع کا ساتھ کتنی دلفریب ملاقات کرتے ہیں ہم شمارے سے۔ جی تو پہلی بات یہ کہ قابل احترام امثل جی! آپ کی ہمشیرہ کے درجات کی بلندی کے لیے بے شمار دعائیں۔

جناب جی کیا ہوگیا ہے۔ صفحہ نمبر 8 پر ام سعدی کا افسانہ میں تنہا ہوں اور صفحہ 257 صفحہ پر لکھا ہے میں تنہا نہیں۔ کیا ہوگیا ہے؟ خیر کوئی بات نہیں۔ "سیاہ حاشیہ" اپنی منزل کو پہنچا۔ ویل ڈن صائمہ جی۔ کیپ اٹ اپ۔ نایاب جیلانی واؤ پہلے تو لگا سی ٹی وی کا کوئی ڈراما ہے' مگر آگے جاکے واقعی الفاظ نایاب ہیں آپ کے لکھے ہوئے۔ پلیز عنیزہ جی' ثمرہ بخاری' نگہت عبداللہ جی' تنزیلہ ریاض' جبیں سسٹرز' رفعت سراج' میمونہ خورشید جی' آپ ٹیلی وژن سے ہٹ کر ہمارے لیے بھی لکھیں۔ کوئی افسانہ' ناولٹ جو ایمان کو تازہ کرے' کنیز نبوی جی پلیز سندھ کی روایت کو زنجیر ڈال کر شعاع تک لے آؤ۔

ج۔ پیاری نوال! آپ کو کراچی میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ کنیز نبوی کا ناول خواتین میں شامل ہے۔

کھواڑی سے نجمہ خان نے لکھا ہے

میں نے بہت مرتبہ قلم اٹھایا' لکھا' پڑھا پھاڑ دیا۔ ہمیشہ یہ سوچا کہ کہیں غلط نہ لکھوں کیوں کہ میری لکھائی بہت ہی گندی تھی اور ایک یہ ڈر ہے کہ جہاں ہم رہتے ہیں' دور دور تک کوئی لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا۔ اس لیے شرم

آتی تھی کہ جب لوگ میری لکھی تحریر پڑھیں گے تو کیا سوچیں گے بلکہ جاہل کہیں گے۔

ج۔ پیاری نجمہ! آپ کی لکھائی بہت اچھی ہے پوچھنے کی ضرورت نہیں اور آپ شعاع کے ہر سلسلے میں شامل ہو سکتی ہیں۔ آپ شعاع کے سلسلوں کے لیے اچھا انتخاب بھجوائیں ہم شامل کریں گے۔

ماریہ تبسم لکھتی ہیں

ستمبر کا شمارہ آج ہی اپنے شہر لالہ موسیٰ سے لے کے آئی ہوں آتے ہی بیٹھ گئی کیڑے مارنے یعنی خط لکھنے۔ اس کا ٹائٹل بھی بہت ہی زبردست ہے۔ دل کر رہا ہے' ماڈل کے گجرے اتار کے خود پہن لوں۔ ہنستی مسکراتی زندگی سے بھرپور ماڈل ایسے لگ رہا ہے جیسے کوئی ٹینشن تو اس کو ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد حمد' نعت ہمیشہ کی طرح بہترین۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں تو سیدھی دل پہ جا کے لگتی ہیں اس کے بعد تمام ناول' افسانے' ناولٹ سب ہی زبردست ہیں۔ "سیاہ حاشیہ" اس کا اینڈ بہت ہی اچھا رہا ہے۔ اب "پیال ساز" ہے اس کا تو نام ہی بہت پیارا ہے ایمل رضا کے نام کی طرح۔ نبیلہ عزیز' آپ بھی اب "رقص بسمل" کا اینڈ کردیں کیوں ہمیں بے موت مار رہی ہیں۔ آپ سے ریکویسٹ ہے کہ شاعری کے صفحات بڑھادیں اور خط لکھنے والی بہنوں سے عرض ہے کہ پلیز آپ شاعری کوئی نئی بھیجا کریں۔

ج۔ پیاری ماریہ! اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ماڈل کی طرح خوش و خرم رکھے۔ اتنی سی دیر کے لیے دنیا میں آتے ہیں' اب اتنے وقت کے لیے کیا ٹینشن لینی۔

اور آپ کی شاعری؟ بھئی ٹینشن دینی بھی نہیں چاہیے۔ بری بات ہوتی ہے ناں۔

نادیہ صدیقہ نے بونگہ بلوچاں سے لکھا ہے

نایاب جیلانی نے جب جب لکھا پیارا لکھا۔ ان کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عفت سحر طاہر بہت بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بہت مزے کا۔۔۔ بہت دلچسپ۔۔۔ اور پتا ہے اس رائٹر کے ناول میں کہانی ہوتی ہے اور بہت جان دار ہوتی ہے۔ کوئی فلسفے اور افسانوی سے مشکل الفاظ نہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ڈالتیں۔ یہ قسط بھی بڑی ہی پیاری تھی۔ خاص طور پر یہ جملہ "لو آگیا ہٹلر کا زنانہ ایڈیشن" اس پر اتنی ہنسی آئی کہ کیا بتاؤں۔ ٹاپ آف دا لسٹ ناول ہے یہ۔ ناول "ذرا ہٹ کے" واقعی "ذرا ہٹ کے" تھا بلکہ کافی ہٹ کے تھا اور لگتا ہے کافی ہٹ بھی ہوگا۔ افسانہ "آدھی روٹی" بہت اچھا لگا۔ قرۃ العین! آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ بہت خالص' حساس اور پیارے دل کی مالک۔ خوش رہو سدا۔ ان تینوں رائٹرز کی کہانیوں نے مجھے قلم اٹھا کر تبصرے پہ مجبور کردیا۔ "شب آرزو" اچھا ناول تھا۔ بس تھوڑا بوجھل پن تھا اس میں۔ "لاج" بھی اچھا لگا اور ہاں "جب تجھ سے ناتا جوڑا" پڑھا۔ ایسا لگا کوئی کہانی ہی پڑھ رہے ہیں۔ رومانٹک سی! اینڈ پہ جو شعر تھا بہت پسند آیا تھا۔ امید جی! میں لکھنے کے جراثیم موجود ہیں۔ اکثر پڑھنے میں آیا کہ کہانیوں میں یکسانیت ہے' گھسی پٹی باتیں وغیرہ' لیکن صرف اب کی بار (ستمبر) کے شمارے کے بارے میں ہی اگر بات کروں تو میں نے شعاع کی ہر تحریر پڑھی اور ہر تحریر کے اینڈ پہ ایک ہی بات ذہن میں آئی کہ "یار! اس پہ تبصرہ کرنا تو بنتا ہے نا!" مطلب سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک۔

ہم پانچ بہن بھائیوں میں سے تین کی' میری' نائلہ باجی اور میرے بھائی کی آواز کی بچپن سے بہت زیادہ تعریف ہوتی ہے۔ "آپ کی آواز پیاری ہے" اس جملے میں یکسانیت ہے' لیکن تینوں میں سے کسی کی آواز آپس میں نہیں ملتی۔۔۔ یہی انفرادیت ہے۔

ج۔ نادیہ! آپ کا تعزیتی خط امتل کو دے دیا ہے۔ ان کی جانب سے شکریہ قبول کیجیے۔

آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی' جتنا اچھا خط لکھا ہے اور جامع تبصرہ کیا ہے اگر کہانی بھی ایسی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

ثوبیہ نے شین باغ اٹک سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

"پیال ساز" ایک ایسی کہانی جس نے روح تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اتنا ظلم' اتنی زیادتی۔۔۔ ناقابل فراموش تحریر۔ "رقص بسمل" تیمور حیدر کا رویہ سب کو یقیناً ناقابل فہم لگ رہا ہوگا' لیکن میرے خیال میں اس نے جو کیا اور وہ جو کر رہا ہے' وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے کیوں کہ جب مان بھروسے اعتماد اور یقین کو ٹھیس پہنچتی ہے تو دل ایسے ہی کرچی کرچی ہوتا ہے۔ "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر کی جوائنٹ فیملی کے گرد گھومتی ایک اچھی تحریر ہے۔

عمیرہ عارف کا ناولٹ "ذرا ہٹ کے" ایک ہنستی مسکراتی تحریر جس نے یہ سبق دیا کہ "ہر چیز اعتدال میں ہی اچھی لگتی ہے" ایک آخری بات بتاؤں شامیر میرے اکلوتے بیٹے کا نام بھی ہے۔ اس سے پہلے جتنی بار خط لکھا آپ نے کٹنگ کر کے شائع کیا۔ اگر اس بار بھی کٹنگ کی گئی تو اگلی بار خط لکھتی ہی نہیں۔ یہ واضح دھمکی ہے یاد رہے۔

ج۔ بھئی ثوبیہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم دھمکیوں سے ڈرتے ورتے نہیں ہیں۔ خط کو اس لیے مختصر کیا جاتا ہے تاکہ دیگر بہنوں کو بھی موقع مل سکے۔ ویسے خط کی کٹنگ سے یہ بھی تو سمجھا کریں تاکہ ہم نے پورا پڑھا ہے۔ پورا نہ پڑھتے تو کاٹتے کیسے؟

"ہر چیز اعتدال میں اچھی لگتی ہے" زیادہ طویل خط شائع کیا گیا تو قارئین ہم کو یہ "سبق" یاد دلائیں گی۔

ماہوش طالب نے لاہور سے لکھا ہے

سرورق عمدہ تھا۔ سب سے پہلے بات ہو جائے افسانوں کی۔ "سابھا بکرا" نمبرون رہا مزاح کے ساتھ ساتھ سبق بھی لیے ہوئے تھا۔ میمونہ صدف "ام سعدی کے افسانے بھی اچھے تھے۔ منظر نگاری اور طرز تحریر خوب تھا۔ عندلیب زہرہ کا افسانہ بھی زبردست تھا۔ "آدھی روٹی" طرز تحریر تو عمدہ تھا مگر کہانی کا موضوع جان دار نہیں لگا اور آخر میں وہی روایتی پن کہ شوہر دوسری شادی کر کے آجائے، پہلی بیوی بیس سال بعد بھی اس کی ایک شرمندگی پہ شوہر کو معاف کر دیتی ہے۔ کہانیوں میں تو کم از کم عورت کو اس کا حق دلوادیا کریں کہ اس کی عزت نفس قائم رہے۔ ناولٹس میں "ذرا ہٹ کے" حقیقتاً" منفرد اور ہٹ کے تھا۔ بہت اچھا انداز تحریر مزاح بھی قائم رہا اور کہانی بھی اپنی حد میں رہی۔ "اتفاق" عجیب و غریب کہانی تھی۔ پوری کہانی اجلال ملک اور رامین شاہ ہی کا راگ الاپتی رہی۔ کوئی دوسری بات نظر نہیں آئی۔ بنت سحر کی تحریریں یکسانیت لیے ہوئے ہیں۔ "شہر خطا" نایاب جیلانی کا انداز تحریر بہت زبردست ہے، کہانی میں تجسس برقرار ہے، موضوع بھی منفرد ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ نایاب نے دیگر رائٹرز کی دیکھا دیکھی اپنی طرز تحریر میں بے وجہ انگریزی کو نہیں ٹھونسا۔ "شب آرزو" اچھا ناول تھا مگر مجھے سمجھ نہیں آئی ایک پولیس آفیسر کو اتنی فضول حرکتیں کرتے دکھانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ فوراً" سے برقعے میں ملبوس لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ جس کی حرکتیں مکالموں سے ہی مشکوک لگ رہی تھیں۔ اور ایک اہم بات میں نے اپنے افسانے خواتین ادارے میں بھیجے اور ابھی تک وہ پڑھے ہی نہیں گئے جب کہ دوسرے رسائل میں میری تحریریں چھپ رہی ہیں۔ کسی کے صبر کا اتنا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ کیا کوئی مذاق ہے؟ مجھے خوشی ہوگی کہ ایڈیٹر میرے خط کو سنجیدگی سے لیں۔

ج۔ پیاری ماہوش! ہمیں ہر ماہ بہت سی کہانیاں موصول ہوتی ہیں۔ طویل کہانیاں پڑھنے میں ضرور وقت لگتا ہے، لیکن مختصر کہانیاں اور افسانے جلد بلکہ عموماً" خطوط کے ساتھ ہی پڑھ لیے جاتے ہیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دن آپ کی کہانیاں ہمارے ادارے کے پرچوں میں بھی شائع ہوں گی۔ شرط یہی ہے کہ آپ کوشش جاری رکھیں۔ موضوعات نئے نہ ہوں، لیکن انداز ضرور نیا ہونا چاہیے۔

جہاں تک کہانیوں کے بارے میں نہ بتانے کی بات ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری وہ نو آموز مصنفین جن میں بہتر لکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، ہم انہیں صاف جواب دے دیں تو وہ مایوس ہو کر نہیں لکھیں گی اس لیے مصلحتاً" خاموشی اختیار کرتے ہیں اور انہیں مزید لکھنے کے لیے کہتے ہیں۔

آپ کے خط کو ہم نے سنجیدگی سے لیا ہے بلکہ ہر خط کو ہی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ ماہوش آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ ایسا ہی اچھا سا افسانہ لکھ کر بھجوائیں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔

کسی کو معاف کرنے کے لیے بہت بڑے دل اور بہت اعلا ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے عزت نفس کو ٹھیس نہیں لگتی پھر جہاں بات محبت کی ہو تو اس میں دوسرے کو بے وفائی کی سزا دی جائے تو انسان ساتھ ساتھ خود بھی سزا بھگتتا ہے۔

سارہ نورین نے چوک شاہ عباس ملتان سے لکھا ہے

میں 85ء سے خواتین اور شعاع کی مسلسل خاموش قاری ہوں۔ جب شعاع کا اجرا محمود ریاض صاحب نے کیا۔ میں نے خواتین کے ساتھ شعاع کو بھی باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ عظمت عزیٰ، نسیم سحر قریشی، ہما کوکب بخاری، رفعت سراج، نبیلہ نقوی، ذکیہ بلگرامی،

فارحہ ارشد اور بہت سی رائٹرز جواب نہیں لکھ رہیں سب کو پڑھا' لیکن موجودہ رائٹرز فرحت اشتیاق' فائزہ افتخار' عمیرہ احمد' نمرہ احمد' سائرہ رضا' ایمل رضا' نایاب جیلانی' عفت سحر طاہر' نبیلہ عزیز' فرزانہ کھرل' بنت سحر اور ان کے علاوہ بہت سی رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں۔ یہ آپ سب کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ اتنا اچھا شمارہ ہمیں پڑھنے کو ملتا ہے۔ آپ سب سے میرا عقیدت و احترام کا جو رشتہ ہے' وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اسے پہلا آخری خط سمجھ لیجیے کیوں کہ آپ کی محبت کا قرض چکانا تھا۔

ج۔ پیاری سائرہ! آپ ہماری اتنی پرانی قاری ہیں' یہ جان کر دلی مسرت ہوئی ہے۔ تین دہائیوں سے زیادہ مدت پر محیط اس عرصہ میں آپ کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہوں گی آپ مختلف ادوار سے گزری ہوں گی۔ مختلف مسائل کا سامنا ہوگا۔ گھر' بچوں کی ذمہ داریاں اور دیگر فرائض اس دوران شعاع اور خواتین سے آپ کا ساتھ برقرار رہا تو یہ ہماری کامیابی کی دلیل ہے۔ طویل رفاقت اسی صورت قائم رہ سکتی ہے جب ہم آپ کو مطمئن رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ نور فاطمہ کی یہ پہلی تحریر تھی۔

پہلا اور آخری خط والی بات بالکل اچھی نہیں لگی۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ شعاع میں دوبارہ بھی شرکت کریں۔

عنبر عتیق الرحمن نے شاہدرہ لاہور سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

خطوط کے نیچے جوابات شائع کیے جاتے ہیں۔ بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ سرورق اچھے ہوتے ہیں' لیکن بہت سی بہنوں کی طرح میرا بھی مطالبہ ہے کہ سرورق اور آخری صفحے پر جانداروں کی تصاویر نہ دیا کریں تاکہ نماز پڑھتے وقت اس کو مال مسروقہ کی طرح چھپانا نہ پڑے۔ اس کے بعد ہمیشہ کا شکوہ کہ اکثر قسط وار ناولوں کی غیر حاضری ہو جاتی ہے۔ مانا کہ مجبوری اور ہنگامی صورت حال کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے' لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ ایک قسط پیشگی منگوا کر رکھیں۔ "شعاع" کا یہ سلسلہ بھی بہت پسند ہے جس میں قاری بہنیں اپنے علاقے کا تعارف کرواتی ہیں۔ میں بھی اسی سلسلے میں اپنے پیارے علاقے "بے چارے" شاہدرہ کا تعارف کروانے لگی ہوں۔ 20 سال ہوئے جب نئے رشتوں سے منسلک ہو کر اس دیس کی باسی بنی۔ نئے نئے لوگوں کے ساتھ اس نئے علاقے سے بھی محبت کا رشتہ استوار کرلیا۔ شاہدرہ ایک بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ جو دریائے راوی کے پل سے شروع ہو کر پتا نہیں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے میں زندگی کی ہر سہولت موجود ہے۔ سرکاری اسپتال' سرکاری اسکول' ریلوے اسٹیشن' بارونق بازار' وسیع و عریض پارک وغیرہ موجود ہیں۔ جب شدید بارش کے دنوں میں شہر لاہور کی سڑکیں اور گلیاں تالابوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو گندے نالے کی بدولت یہاں نکاس کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہاں بہترین تعلیمی ادارے موجود ہیں اور ہر سال تمام کلاسز کا بہترین رزلٹ آتا ہے۔ خوبیاں تو بہت ہیں' لیکن ایک بات کا ذکر کروں گی کہ اس علاقے کو بہت پسماندہ سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ یہ علاقہ لاہور شہر کے دیگر علاقوں سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں ہے۔ اب ستمبر 2013ء کے شمارے پر تبصرہ۔ شکر ہے کہ سب قسطیں موجود تھیں "خواب شیشے کا" ابھی اس معیار تک نہیں پہنچا جس کی توقع "عفت سحر طاہر" سے رکھتے ہیں۔ "رقص بسمل" کے بارے میں ان تمام تبصروں سے متفق ہوں جو اس کی اکثر غیر حاضری اور "چنا منا" ہونے پر کیے جاتے ہیں۔ "بہال ساز" بہت زبردست تحریر ہے۔ نانو گلناب عالم ہیں ناں؟ اس ماہ بہت سے انکشافات ہوئے جنہوں نے دلچسپی اور تجسس کو بڑھا دیا ہے۔ عندلیب زہرہ کے انتظار میں' میں بھی سب قاری بہنوں کے ساتھ شریک ہوں۔ "آدھی روٹی" صرف آدھی روٹی سے محبت کے اظہار کے فلسفے کو بیان کرتی ایک بے تکی کہانی تھی۔ اختتام بہت غیر فطری لگا۔ جہاں دو سوکنیں پہلی ملاقات میں ایک دوسرے سے محبت سے پیش آرہی تھیں۔ اب باری ہے "شب آرزو" کی۔ اف! اس قدر گاڑھی اردو۔ اس قدر طویل طویل جملے۔ دو دو تین تین جملوں کو ایک جملے میں سمونا یقیناً" مصنفہ کی ہی ہمت ہے۔ پلاٹ پرانا تھا۔ اس لیے۔۔۔؟ "اتفاق نہیں" کی طوالت ہے جو کوفت ہوئی وہ آخر میں محبت کی پہچان ہونے سے ختم ہو گئی۔ "سانجھا بکرا" ہلکی پھلکی تحریر تھی اچھی لگی۔ مستقل سلسلے اچھے تھے۔ "نانو" بہت اچھا لگا۔ انداز بیان بہت دلچسپ ہے۔ "آئینہ خانے میں" واصفہ سہیل کے بریکٹ میں لکھے گئے جملے بہت اچھے لگتے ہیں۔ "پیارے نبی کی پیاری

باتیں پڑھ کر معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ بہت اچھا سلسلہ ہے۔

ج۔ پیاری عنبرا اتنی طویل رفاقت کے بعد آپ نے پہلی بار شعاع میں شرکت کی اور ہمیں خط لکھا۔ ہم آپ کو اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ شاہدرہ کے بارے میں جان کر خوش ہوئی۔ وہ علاقہ جہاں ضروریات زندگی کی سہولیات مہیا ہوں اور صفائی کا اہتمام ہو۔ وہ پسماندہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ لوگوں کی کم نظری ہے کہ وہ اسے پسماندہ سمجھتے ہیں۔

جامع تبصرہ سے ظاہر ہے کہ آپ کتنی دلچسپی اور شوق سے شعاع پڑھتی ہیں۔ قسطوں کے لیے آپ کا مشورہ بہت اچھا ہے۔ قسط شامل نہ ہونے سے ہمیں بھی بے حد کوفت ہوتی ہے۔ مصنفین سے ایڈوانس لکھوانا تو بڑی بات ہے اگر وقت پر قسط مل جائے تو ہمارے لیے یہ بھی بہت ہے۔ اکثر قسط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر ہی پرچا لیٹ ہوتا ہے کیونکہ ہماری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ قسط ضرور شامل ہو۔

حیا شہابی کنوری پاک سندھ سے لکھتی ہیں

آپی جان میں نے آپ کو ایک اسٹوری پارسل کی تھی جسے تقریباً پانچ ماہ ہوگئے ہیں پلیز مجھے بتائیے اس کا کیا بنا۔ آج کل میں ایک ناول لکھ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ہر ماہ تھوڑی تھوڑی آپ کو ارسال کرتی رہوں۔

پیاری حیا! آپ کی کہانی ہمیں موصول نہیں ہوئی۔ آپ ہمیں ناول مکمل کر کے پورا ساتھ بھجوائیں۔

رضوانہ شکیل راؤ۔۔۔ لودھراں

میں شعاع خواتین کی مستقل قاری ہوں۔ اس سے میری جان پہچان پانچویں کلاس میں ہوئی۔ میں اپنے والد صاحب اور اپنے شوہر کی بے حد ممنون ہوں جن کی وجہ سے شعاع کے ساتھ سفر جاری کیے ہوئے ہوں۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا امید بخاری کو پڑھ کر اچھا لگا اور مزید عمیرہ عارف نے بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیا میری تمام رائٹرز سے گزارش ہے کہ اس ٹینشن کے دور میں ایک موڈ فریش کرنے والی اسٹوری ضرور لکھیں۔ (باقی بہنوں کا کیا خیال ہے) ایمل رضا کا پیال ساز زبردست جا رہا ہے۔ ریما علی کا افسانہ عید مناؤ۔ زبردست حقائق پر مبنی افسانہ تھا ارسل کا پاکٹ منی جمع کر کے قربانی کرنے کا جذبہ قابل تحسین تھا۔ عندلیب زہرا تھیں جنہوں نے تمام وہ باتیں جو ہم اپنی رائٹرز کو کہنا چاہتے تھے آپ نے کہہ دیں۔ عشنا کوثر سردار کا ناول اتفاق نہیں۔ کچھ خاص نہیں تھا۔ اشعار میں فرزانہ سہیل کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اتنے عرصے کہاں تھیں فرزانہ جی؟ کوثر خالد جی خطوط میں شرکت کرتی رہا کیجیے' کچھ اپنا پن سا محسوس ہوتا ہے۔ فوزیہ ثمریٹ آپ کی امی کی طرح ہمارے گھر میں بھی یہی پچویشن ہے کہ رضوانہ کی کہانی چھپی ہے رسالے میں۔ ہاہاہا۔

پیاری رضوانہ! اسے ہم اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں کہ شعاع کی قارئین ہمیشہ شعاع سے منسلک رہتی ہیں۔ اگر کسی مصروفیت کی وجہ سے خط نہ لکھ پائیں تب بھی شعاع سے تعلق قائم رہتا ہے پھر فراغت پاتے ہی ہمیں خط لکھتی ہیں اور شعاع کے سلسلوں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔ فرزانہ سہیل کی طرح آپ بھی ہماری پرانی قاری ہیں۔ بہت خوشی ہوئی' آپ نے ہمیں یاد کیا۔ پرانی قارئین کے خط زیادہ عرصہ نہ ملیں تو ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

عائشہ وحید نے کراچی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

خط لکھنے پر مجبور "ایمل رضا" کے "پیال ساز" نے کیا۔ بھئی زبردست اتنی مہارت ماشاء اللہ جب کہ آپ ہمارے لیے ابھی بہت پرانی مصنفہ نہیں ہوئی ہیں۔ کتنی بار میں نے پلٹ پلٹ کر آپ کے نام کو پڑھا ہے کہ "ایمل رضا" نے ہی لکھا ہے نا۔ اتنی پختہ تحریر کہیں بھی جھول نہیں ہے۔ شاباش اب بات کرتے ہیں "عفت سحر" کے "خواب شیشے کا" کی۔ پلیز مہر ماہ کا رشتہ طلال سے ٹوٹنے نہیں دیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے مہر ماہ کی شادی موحد آفندی سے نہ ہو جائے۔ بنت سحر نے "لاج" لکھ کر واقعی اپنے نام کی لاج رکھ لی۔ مجھے یقین ہے کہ "دیا" نادیہ ہی ہو گی۔ ذرا ہٹ کے "عمیرہ عارف" نے واقعی ہٹ کر لکھا۔ افسانے سب اچھے تھے مگر میمونہ صدف بازی لے گئیں۔ مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔

پیاری عائشہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ کسی بھی کتاب کی قیمت اور منگوانے کا طریقہ پتا کرنے کے لیے اس نمبر پر فون کر کے پتا کر سکتی ہیں۔ 32735021

مروہ صفہ نے کالو خان ضلع صوابی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

خط کو پوسٹ کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ میری نو سال کی خاموشی سے بخوبی آپ کر سکتے ہیں۔۔۔ پلیز میرے خط کو حزف کیے بنا پورے کا پورا شائع کیا جائے۔ "میری آخری و پہلی خواہش"

شعاع۔ خواتین۔ کرن۔۔۔ کب سے پڑھنا شروع کیا؟ شاید چھ یا سات سال کی عمر سے اور آج میں بی۔ ایس میتھس کی طالبہ ہوں۔ یعنی آٹھ نو سال کی خاموش قاری۔

چھ ستمبر کو "ریناز" (دوست) سے شعاع لے لیا۔ خوشی کا جیسے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ کیونکہ پہلے مجھے ملا تھا پڑھنے کو۔۔۔ ہم کس طرح شعاع کو ایک ڈپارٹمنٹ سے دوسرے تک چکر دیتے رہتے ہیں یہ بذات خود ایک رسالہ کی آپ بیتی ہے۔ سرورق امیزنگ۔۔۔ "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" "پرفیکٹ" پہلا پڑاؤ ڈالا۔۔۔ عفت جی کے ہاں۔۔۔ جی جی "خواب شیشے کا" کی بات ہو رہی ہے۔۔۔ کہانی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مگر طلال اور مہر ابھی تک وہیں کھڑے ہیں۔۔۔ "پیالی ساز" سدیم، یشب اور زیان عالم۔۔۔ کیا کہوں؟ ایمل نے کچھ نیا انوکھا اور سب سے ہٹ کر کسی نئے طریقے سے لکھا ہے۔ جس میں نمیرا حمید کسی اوٹ سے چھپ کر جھانکتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ جیسے یہ جملہ "مکڑی جب نوزائیدہ شکار کے گرد تار بن دے تو بجلی آسمانوں میں چمکتی رہتی ہے"

ذرا ہٹ کے "عمیرہ نے سماج سے ذرا ہٹ کے لکھا۔۔۔ پر ذرا ہٹ کے ہنسایا۔۔۔ "لاج" بنت سحر نے قارئین کی لاج رکھ لی، لیکن پھر وہی ازل سے کمزور اور مجبور عورت کا انتظار جاناں۔۔۔

"اتفاق" عشا جی نے کچھ خاص نہیں لکھا "محبت محرم کے ساتھ ہو تو عبادت مگر نا محرم کے ساتھ رسوائی و ذلت کے سوا کچھ نہیں۔۔۔

افسانوں کے تو کیا کہنے۔۔۔ "متضرع آخرین" تو اولین تھی۔۔۔ عالم تنویم میں پہنچا دیا۔ (بقول نمرہ آہاہاہا) جب واپس لوٹے تو چہرہ بھیگا تھا۔

"خواب تھا۔۔۔" عندلیب کا ایک مکمل منفرد انداز۔۔۔ نہ شکوہ شکایت۔۔۔ نہ طنز و طعنہ نہ تعریف و تنقید، پھر بھی ہماری آواز دل کو مصنفاؤں تک پہنچا دیا۔

مروہ صفہ! پہلی اور آخری خواہش والی بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ خواہش زندگی کا دوسرا نام ہے۔ مرتے دم تک انسان خواہشوں کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔ تبصرہ پورا شائع کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ اس میں بہت ساری غلطیاں تھیں۔ آپ نے لکھا حالات نے نگار کو طوائف زادی بنا دیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ وہ بہت عزت کے ساتھ پروفیسر صغیر ربانی کے گھر پہ رہی۔ ہاں اس صدمہ نے اس کے ذہن کو متاثر ضرور کیا۔

ایمل رضا کی تحریر میں آپ کو نمیرا حمید کی جھلک نظر آئی۔ ان دونوں میں ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں کو زبان و بیان پر بہت عبور ہے۔ انوکھی تشبیہات، استعارے محاورے ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس لیے آپ کو ایسا لگا اشعار کی محفل میں آپ لوگوں کے ہی انتخاب کردہ اشعار شامل ہوتے ہیں۔ قارئین ہمیں اچھے اشعار بھجوائیں تاکہ آپ کی شکایت دور ہو سکے۔

ام سعدی

اس دفعہ فہرست پر پڑھی ایک سرسری نظر نے انجانی سی لازوال خوشی سے ہمکنار کیا۔ بہن بھائی کو موبائل پر تصویر کھینچ کے واٹس ایپ کیا۔ بھائی کے سر سے گزر گیا، بہن نے حوصلہ افزائی کی۔ چار دن تک میاں صاحب کے پیچھے لگ لگ کے زبردستی پڑھوایا اور پڑھ کر انہوں نے کہا فرصت میں سمجھا بھی دینا۔ اور میں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ (قطع نظر اس کے میرے میاں نہایت کو آپریٹو ہیں ہاں کتاب بینی میں ان کی دلچسپی صرف اپنے پیشے سے متعلق کتابوں میں ہے) آخر میں ہاجرہ ریحان کے لیے کہ ان کے افسانے مجھے تو صحیح معنوں میں افسانے لگتے ہیں۔ بہت اعلا

ام سعدی! سعدی کی والدہ ہونے کا شرف آپ کو حاصل ہے یہ بات بلاشبہ ایک ماں کے لیے بہت اہم ہوتی ہے لیکن ماں کی اپنی شخصیت بھی ہوتی ہے آپ اپنا نام لکھتیں تو ہمیں زیادہ اچھا لگتا۔ آپ کی پہچان آپ کے اپنے نام سے بنتی۔ آپ کا زرمینے گل والا افسانہ، اس ماہ شائع ہے۔

آپ طویل کہانیاں بھی لکھیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کوثر خالد کا جڑانوالہ سے خط لکھتی ہیں

حمد و نعت۔ ماہر قادری تو نام ہی اتنا اچھا ہے۔ اور شاعری تو ہماری روح کی غذا ہے۔ عید الاضحیٰ سروے۔ ثمرہ احمد کا تو لگا جیسے ہمارا ہی حال ہے۔ باقی بھی اچھے تھے۔ اقراء اس بار پہلے سانہ لکھ پائی۔ اس لیے ہم نے حصہ نہ لیا تھا۔ بس ایک عنوان میں ایک بار حصہ لینا کافی ہے تاکہ دوسروں کو موقع ملے۔

نبی کی باتیں۔ ماشاء اللہ بہت اچھا موضوع و علاج تھے۔ ناتا جوڑا ہے امید بخاری کا نام جگمگا رہا تھا۔ اور ہم سے بھی اچھا رہا۔ سچا رہا۔ میرے کتاب کمپوزر علی نے بے حد تعریف کی۔

"خواب شیشے کا" دیکھ رہے ہیں۔ "رقص بسمل" شروع ہو چکا ہے۔ "پہال ساز" اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایمل زندہ باد۔ "آدھی روٹی" زبردست۔ عشق و مجاہدوں کا حال اور بے وفائیوں کی داستان...... دنیا میں یہی دو رویے ہی تو ہیں۔ اس لیے یکسانیت لگتی ہے کچھ لوگوں کو۔ "تضرع آخریں" "لغت" کی مدد سے پڑھی۔ حیف ہے ایسے لوگوں پر...... اللہ ہدایت دے۔ غزل...... امجد اسلام امجد...... ام ثمامہ کی شاعری اچھی لگی۔ باقی ہمارے حسب حال نہ تھی بالکل...... اس لیے...... "باتوں سے خوشبو آئے" تو ثابت ہوا۔ یہی باتیں اچھی ہوتی ہیں۔ ان میں تو اپنا آپ ہی برا لگتا ہے کیوں بھئی طاہرہ عندلیب۔ سلام تو تمہارا مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ بہا یہی کافی ہے۔ کوثر خالد نزد چھنہ اسپتال گیلانی محلہ جڑانوالہ۔ ضلع فیصل آباد۔ میرا سروے پسند کرنے کا شکریہ۔ مگر شاید میری شاعری پسند نہیں آئی کسی بہنا کو۔ غصے والی کیا بات ہے۔ بلڈ پریشر ضرور بڑھانا ہے۔ اب چلتے ہیں فوزیہ کی طرف۔ فوزی جب خواتین اور شعاع میں تمہیں پڑھا (تعارف) ہم نے لکھا کہ تم ہماری آدھی بیٹی ہو۔ وہ یوں کہ ثمر ہمارے بیٹے کا نام ہے۔ ہم تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں فکر نہ کرو۔ بھابھی والی کو سلام کہو۔ ارم کمال تمہیں خصوصی سلام کہ ایک جملے میں شاعری بھی آگئی ہے۔

پیاری کوثر! آپ کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ آپ دوسروں کو بھی موقع دینا چاہتی ہیں۔ ہماری بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ تھوڑی سی ہی سہی مگر سب کو جگہ مل جائے لیکن آپ کے خطوط کے ہم ہی نہیں ہماری قارئین بھی منتظر رہتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آپ کے خط کہانی کی طرح ہوتے ہیں۔ مستقل قارئین شامل نہ کی جائیں ہمیں خود بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن کیا کریں، مجبوری ہے شاعری آپ کے حسب حال نہ تھی لیکن شاعر صاحب کے حسب حال تھی یہی سمجھ کر پڑھ لیں۔

کعبہ تمام مسلمانوں کا مرکز اور صراط مستقیم کا سمبل ہے۔ تمام مسلمان کعبہ کی سمت رخ کر کے نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں۔ صالحہ کو شدت سے احساس تھا کہ اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے اس نے ایک لادین کے ساتھ شادی کی جو جائز نہ تھی والدین کا دل دکھایا، انہیں ذلت و رسوائی کا تحفہ دیا اس لیے وہ بار بار تصور میں، خواب میں یہی دیکھتی تھی کہ اسے کعبہ نظر نہیں آتا۔

نسرین علی لکانوالہ میاں چنوں سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

پہلی شعاع پڑھتے ہی فشار خون بلند ہوا۔ کشمیریوں پر نافذ کیا جانے والا کرفیو ان پر زندگی کا دائرہ تنگ ہوتے دیکھ کر بھی ہمارے حکمرانوں کی زبانیں مقفل! مسلم ممالک میں سے کسی بھی ملک نے کشمیریوں پر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ذرا جسارت نہیں کی۔ حمد و نعت "سبحان اللہ" جب تجھ سے ناتا" میں امید بخاری کا احوال کسی افسانے جیسا ہی تو لگا۔ "شب آرزو" نور فاطمہ صاحبہ نے اچھے سے سلجھایا۔ مگر سکندر کو تھوڑا کمزور بنایا جبکہ ولن کے کردار تھوڑے جاندار اچھے لگتے ہیں۔ "تضرع آخریں" میمونہ صدف کا خوب صورت انداز بیان کہ قابل بیان نہیں۔ عندلیب زہرہ کی شکایتیں افسانے کے پیراہن میں پسند آئیں۔ "خط آپ کے" سے طاہرہ عندلیب سے بالکل اتفاق نہیں شعاع پرفیکٹ ہی ہوتا ہے۔ رات بہت زیادہ ہو گئی ہے 'اونگھ اونگھ کے میں گرنے والی ہوں' صحیح لکھا بھی نہیں جا رہا اس لیے اللہ حافظ۔

پیاری نسرین! اونگھ اونگھ کے غنودگی کے عالم میں بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ اپنی رائے کا اظہار کرنا ہر قاری کا حق ہے۔ خواہ تعریف ہو یا تنقید...... کوئی بھی چیز مکمل نہیں ہوتی جائز تنقید شعاع کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔

فرحانہ گوجرہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایمان افروز باتیں میری نالج میں بہت خوب صورت اضافہ کرتی ہیں 'خود کشی کے بارے میں پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آج کل اگر ضعیف مریض یا ایب نارمل مریض زیادہ گھر والوں کو تنگ کرتا ہے تو اسے نیند کی دوائی ڈاکٹر کے مشورے سے یا از خود دے دیتے ہیں تاکہ مریض تنگ نہ کرے۔ کیا ایسا کرنا گناہ نہیں؟

"پہال ساز" کیا کہیں جی صفحہ نمبر 92 سے 122 تک لفظ نہیں شان دار سچے موتی صفحہ قرطاس پر بکھرے پڑے ہیں ایمل رضا جی آپ کو ایسی دل موہ لینے والی کہانی لکھنے پر بہت بہت سلام عقیدت۔ "خواب شیشے کا" اس دفعہ تو عفت سحر نے چھکا ہی مار دیا مزہ آیا پڑھ کر۔ آپی میں آپ کی اتنی پرانی قاری ہوں پلیز ہماری طرف بھی نظر کرم رکھا کریں۔ اگر ایسی کہانیاں نہیں تو پلیز ان کو ہی ریپیٹ کر دیں۔ آپ کے لیے دعاگو۔ فرحانہ۔

پیاری فرحانہ! یہ تو آپ کسی مفتی سے پوچھیں ہمیں علم نہیں۔ آپ ہی کا تو خیال کر کے خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ کہانیاں دوبارہ شائع کرنا تو ہمیں اپنے قارئین پر ظلم لگتا ہے۔ کیوں کہ سب نیا اور بہت اچھا پڑھنا چاہتے ہیں۔ آئندہ بھی شریک محفل رہیے گا۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خطوط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

صبا طارق نے ڈاہر نوالہ سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں میں بہت سی باتیں سیکھیں۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہت اچھا سلسلہ ہے اور اس بار تو امید بخاری کے دلچسپ انداز نے بہت مزہ دیا۔ میں اور امی جان دونوں پڑھ کر خوب ہنسیں۔ نایاب جیلانی نے ہمیشہ کی طرح لاجواب لکھا ہے۔

میرا تو دل کرتا ہے کہ دنیا میں اتنی محبتیں اور خوشیاں بانٹوں کہ نفرت اور بغض کا نام ہی کسی کو یاد نہ رہے۔ آخری بات یہ کہنا چاہوں گی کہ اگر ا۔۔۔ میرا خط شائع نہ ہوا تو کوئی بات نہیں۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ میری رائے آپ تک پہنچ جائے گی۔

پیاری صبا! آپ نے جس طرح ہماری بات پر یقین کیا اور بھروسا رکھا یقین کریں ہمارے لیے تو یہی بڑی بات ہے۔ شمارے کی پسندیدگی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ دعاؤں کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔

محبتیں اور خوشیاں بانٹنے والے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتے۔ خوشی اور محبت اگر بانٹی جائے تو لوٹ کر واپس ضرور آپ کے پاس آتی ہے۔

شعاع کے ساتھ

ادارہ

انا خان، ہرینڈ داون

1 ۔ شعاع سے میری وابستگی کچھ ہی سالوں پہ محیط ہے۔ مجھے کھانا کھانے اور بنانے کا بہت شوق ہے۔ مجھے کھانا بنانے کی آسان ترکیب کہیں سے بھی مل جائے تو میں اس کو ضرور ٹرائی کرتی ہوں۔ میری یہ مشکل شعاع نے حل کردی۔ کچھ سال پہلے میری آپا صاعقہ جنہیں شعاع پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ان کا شعاع ایک دن میرے ہاتھ لگ گیا۔ شعاع کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک میری نظر موسم کے پکوان پر پڑی جو مجھے اچھی اور آسان لگیں اور وہیں سے شعاع سے ایسا تعلق جڑا کہ بس شعاع آج تک ساتھ ہے اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔ میرے بھائیوں کو جب کھانے کو مزے کی ڈشز ملیں تو اس لالچ میں ہر مہینے شعاع لاکر دیتے ہیں۔ (ہاہا)۔

2 ۔ میرا دن بھی باقی مسلمانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت سے شروع ہوتا ہے اور جب کبھی غلطی سے آنکھ نہ بھی کھلے تو اماں کی جوتی ایسی کمر پہ آتی ہے، تارے تو ویسے بھی چمک رہے ہوتے ہیں پھر دن میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہارون (میرا چھوٹا بھائی) اس کو اسکول کے لیے اٹھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس سب سے فارغ ہو کر ناشتے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ میرا کام صرف گھر کی ڈسٹنگ کرنا اور کپڑے استری کرنا ہے اور دن میں نت نئے کھانے بنانا۔ باقی سارا دن میں اور شعاع بس۔ پھر دو بجے کے قریب اسکول سے بھائی آتے ہیں، پھر ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنا میرا کام ہے۔

3 ۔ نمرہ احمد، سمیرا احمید، نایاب جیلانی، مریم عزیز یہ وہ رائٹرز ہیں جن کی کہانیاں کئی مہینوں تک دل میں نقش ہو جاتی ہیں اور نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ میری موسٹ فیورٹ کہانی "جنت کے پتے" ہے۔ جو میں بار بار پڑھ چکی ہوں۔ "یارم" سمیرا احمید میں امرحہ کے کردار میں اپنی جھلک نظر آئی۔

4 ۔ جو بھی مجھے پہلی دفعہ دیکھتا ہے کہتا ہے کہ لڑکی کتنی کم گو اور معصوم ہے۔ کبھی فضول بولتی ہی نہیں، مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوتی ہے کیونکہ میں تو خواب میں بھی باتیں کرتی ہوں۔ مجھے اقرا جھنجھوڑ کے اٹھاتی ہے کہ اللہ کی بندی چپ کر جاؤ، دن کو تھوڑا سر کھاتی ہو جو رات میں بھی سکون سے سونے نہیں دیتیں اور خامیاں تو گننے میں نہیں آتیں۔ جو دل میں ہوتا ہے فوراً بول دیتی ہوں اور خوبی یہ ہے کہ میں بہت سادہ ہوں، کسی کو بھی آسانی سے بے وقوف بنا سکتی ہوں۔ (ہی ہی ہی) کھانا بہت اچھا بناتی ہوں جو کہ میری ساری خامیوں پہ حاوی ہے۔

5 ۔ میرا پسندیدہ شعر

غور سے دیکھ میری معصومیت کو اے ابن آدم
حوا کی بیٹی ہوں تیرے ہاتھ کا کھلونا نہیں

اور پسندیدہ اقتباس:

"ہار جانے والے ان لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہوتے ہیں جو مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں کرتے۔"

ابھی تو پڑھنا شروع کیا ہے۔ شعاع، کرن، خواتین ڈائجسٹ سے ہی شروع کیا ہے جو کہ میری کزنز مونا، اقرا، سدرہ مل کے لیتے ہیں اور پڑھ کر ہم سب مل کر کہانیوں کو ڈسکس کرتے ہیں۔

حرا ملک ۔۔۔ وہاڑی

1 ۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا، تو میرے خیال کے پرندے کی پرواز جہاں جاتی ہے تو اس لحاظ سے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ جب چھوٹی تھی تو "پھول"

اور "نونہال" ابو سے ضد کر کے منگواتی تھی۔ جیسے جیسے شعور کی سیڑھیاں پروان چڑھتے گئے تو ان کی جگہ خواتین، شعاع اور کرن نے لے لی۔ میری بڑی بہنیں ساری تقریباً" (سوائے ایک کے) رسالے پڑھتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی باقاعدہ ہر ماہ نہیں پڑھتی تھی۔ یہ تو میں نے میٹرک کے پیپرز کے بعد پڑھنے شروع کیے۔ جب بھی بازار جاتی، پرانے رسالے لے آتی، لیکن گزشتہ چھ، سات ماہ سے ہر ماہ باقاعدگی سے شعاع پڑھنا شروع کیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے مہینہ گزر جاتا تھا اور میں اس رسالے کے دو، تین ماہ بعد وہ والا رسالہ لیتی۔ لیکن اب چونکہ باقاعدہ قاری ہوں تو سوچا کیوں نہ اس کے سلسلوں میں بھی شرکت کی جائے۔

دلچسپ واقعہ۔ میرے خیال میں تو یہ ہی ہے کہ میں اس وقت کافی چھوٹی تھی، تو رسالہ جس میں "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر" کی آخری قسط تھی۔ وہ میں نے سب سے چھپ کر چارپائی کے نیچے لیٹ کر پڑھی تھی اور اب تک ذہن پہ نقش ہے۔ پچھلے دنوں میں نے وہی رسالہ اپنی بڑی بہن کو لا کر دیا اور اسے یہ کہانی پڑھنے کو کہا اور ساتھ ہی یہ واقعہ بھی سنایا تو ہم دونوں خوب ہنسے۔

2 ۔ کچھ خاص نہیں ہے۔ صبح سویرے کالج جاتی ہوں۔ بیچلر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ دو ڈھائی بجے تک کالج سے واپسی، پھر ٹیوشن کے بچوں کو پڑھانا شام تین بجے تک۔ اس کے علاوہ صرف شام کا آٹا گوندھنا واحد گھریلو ذمہ داری ہے جو کہ میری ہے۔ باقی گھر میں تمام بہن، بھائیوں سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے میں کچن وغیرہ کا کوئی بھی کام نہیں کرتی۔ میری بہنیں ثمینہ، اقرا زندہ باد۔ اس کے بعد میں کالج کا کام کرتی ہوں۔ اسی دوران رات کا کھانا کھا کر نماز پڑھ کر کالج کا ٹیسٹ ہو تو وہ یاد کیا، ورنہ پھر شعاع و خواتین ہوتے ہیں اور ہم ! پھر میوزک سن لیا، موبائل سے۔

3 ۔ شعاع کی تحریر پڑھ کر دل الجھا تو نہیں البتہ سلجھ گیا ہے اور جو تحریر نقش ہو گئی ہے۔ وہ "جنت کے پتے" ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے لیے میں نے پتا نہیں کتنی بار بازار کے چکر لگائے اور مطلوبہ قسط والا رسالہ تلاش کر کے پڑھا تو میرے خیال سے اس ناول کے کردار حیا اور جہان سکندر میں اگر چاہوں بھی تو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جہاں تک کردار میں جھلک کی بات ہے تو نمل کی حنین میں مجھے کچھ اپنی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری اسٹوریز ہیں۔ نبیلہ عزیز، سائرہ رضا، عمیرہ احمد، عفت سحر طاہر، فرحت اشتیاق اور کنیز نبوی کی تمام کہانیوں کی میں دل سے معترف ہوں۔

4 ۔ میرے خیال میں تو ایک مکمل پرفیکٹ انسان سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں کوئی بھی نہیں اور یہ ایک اٹل حقیقت بھی ہے۔ تو میرے خیال میں تو مجھ میں ابھی خامیاں زیادہ ہیں اور خوبیاں کم۔

بارش مجھے پسند ہے مگر کبھی بھی بھرپور طریقے سے انجوائے نہیں کی۔ ہاں کالے کالے بادل اور ساتھ میں ٹھنڈی ہوا اور پھر ہلکی ہلکی بارش مزا دیتی ہے۔

پسندیدہ اقتباس بہت سے ہیں، لیکن صرف ان ہی دو پر اکتفا کرتی ہوں۔ اور "اگر تم سے کبھی کوئی کہے کہ انسان کی گئی نیکی گھوم پھر کر اس کے پاس ایک دن ضرور لوٹتی ہے تو یقین کر لینا کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔" (نمل، نمرہ احمد) "کیا کسی سے دل لگانا اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔" (کنیز نبوی، پکا پتا نہیں رائٹر کا) اور عمیرہ احمد کے "آب حیات" کا ایک ایک حرف مانند حیات ہے۔

مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ لہجے جب ۔۔۔ بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا

قرآن مجید ٹاپ آف دی لسٹ "پیر کامل" اور "تلوار ٹوٹ گئی" اور "ایمان، امید اور محبت" اب تک تو صرف یہ ہی پڑھی ہیں اور یہ ہی بیسٹ لگی ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی، ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہرماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہرماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کرلیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کردیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلالیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کردیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں، تائی جان مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں، ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کرلیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آفندی ہاؤس میں بے چینی سے فاران کا انتظار ہو رہا ہوتا ہے لیکن وہ نہیں پہنچ پاتے ان کا فون بھی بند ہوتا ہے۔ تیسرے دن مبین آفندی کا فاران آفندی کے فون پر رابطہ ہوتا ہے تو وہ آغا جان کو بتاتے ہیں کہ فاران آفندی اب اس دنیا

میں نہیں رہا ہے۔
آغا جان یہ خبر سن کر ٹوٹ گئے۔ فاران آفندی کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔ ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد پاکستان آگئے۔ مہراہ کی منگنی طلال سے طے ہو چکی ہے، جس پر تزئین حسد کرتی ہے۔ موحد اور ثمرہ آفندی ہاؤس آجاتے ہیں۔ موحد بہت ہینڈسم اور خوبرو ہے۔ آغا جان اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن موحد کو ان سب سے نفرت ہے۔ زرگل بائی کو قیمت دے کر وقار آفندی نے زرنگار سے شادی کرلی تھی، لیکن اس شادی کو آغا جان نے قبول نہیں کیا۔ یہاں نے کہا کہ وہ زرنگار کو طلاق دے دے۔ انہوں نے دوپٹا قدموں میں رکھ دیا۔ گھر کے دیگر افراد بھی مخالف تھے۔ صرف ثمرہ بھابھی جو فاران آفندی کی بیوی تھیں۔ وہ وقار کے ساتھ تھیں۔ وقار آفندی کا بیٹا نمیر آفندی سومیہ کا دوست ہے۔ سومیہ اسے پسند کرتی ہے۔ ثمرہ اچانک یہ کہہ کر دھماکا کردیتی ہیں کہ مہراہ اور موحد کا رشتہ آغا جان نے بچپن میں طے کر دیا تھا۔

ساتویں قسط

زرنگار کو وہ نوٹوں کی گڈی نہیں ہفت اقلیم کی دولت لگ رہی تھی۔
"اپنے بیمار شوہر کو دیکھ، اپنے زرد پڑتے چہرے اور معصوم بچے کو دیکھ۔ حسرتیں جس کی آنکھوں میں منجمد ہو رہی ہیں۔ جو خواہش کرنے کی عادت ہی نہیں پال سکا اپنے دل میں۔ باپ کے ہوتے یتیموں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے جو۔" زرگل بائی نشتر چلانے میں ماہر تھی۔ مگر یہ چرکا سیدھا زرنگار کے دل پر لگا۔ وہ تڑپ اٹھی۔
"اماں... کیسی منحوس باتیں کر رہی ہو۔ اللہ سلامت رکھے اس کے باپ کو۔"
"ہر ایک کو موت آنی ہی ہے زری! پر بندہ سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر تو نہ مرے۔ جتنا لڑ سکتا ہے تقدیر کے ساتھ اتنا تو لڑنا ہی چاہیے اسے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔
بھلا اسے کیا ہمدردی تھی ________ وقار آفندی سے جو اس کی بیٹی کو یوں مٹی میں رول رہا تھا۔
"میں نے کہا بھی تھا تجھے۔ گانے کے دو چار پروگرام پکڑ لے۔ دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جائے گی۔ اس عزت کا گھر بیٹھ کر تو نے جتنا اچار ڈالنا تھا ڈال لیا۔"
"اماں... وقار نہیں مانتے۔"
"اب معاملہ فقط تمہاری عزت کا نہیں رہا زری! اپنے معصوم بچے کی زندگی کا سوال اٹھاؤ اس کے سامنے۔ اسے اس دنیا میں لانے کے اگر ذمہ دار تم دونوں ہو تو اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی ذمہ داری بھی تم دونوں کی ہی ہے اور اگر تم چار پیسے کما کر اس کے خواب، اس کی حسرتیں پوری کر سکتی ہو تو کیوں نہ کرو؟" زرنگار چپ رہی۔ مگر اس قدر دل گیر انداز میں نمیر کے تذکرے نے اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔
"بھوک کے مارے خود مرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا زری۔ جتنا اپنے بچے کو بھوکا مرتے دیکھنا۔"
زرگل کی بات سن کر آٹے کا خالی کنستر اور دالوں کے خالی ڈبے اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔
آج اگر وقار کو تنخواہ نہ ملتی تو گھر میں فاقے کے بھرپور امکانات موجود تھے۔
"دیکھ زری، تیری ماں ہوں، اس لیے تیرا درد اٹھتا ہے تو بار بار سمجھانے آجاتی ہوں۔ مرتے ہوئے کے لیے جان بچانے کے لیے حرام کو بھی حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ پھر تم لوگ کیوں خودکشی پر راضی ہو؟"
"تم وقار کو جانتی ہو نا اماں۔ بڑے عزت دار گھرانے سے تعلق ہے ان کا۔"
"آخ تھو..." زرگل بائی نے حقارت سے ایک طرف تھوک دیا۔
"لعنت ہے ایسے عزت داروں پر جو کسی دوسرے کو عزت نہیں دے سکتے... ہنہ... بیچارے..." اس نے

تاسف سے کہا پھر طنز سے بولی۔
"اتنی بہت ساری عزت ہے ان کے پاس کہ اس میں سے ذرا سا حصہ اپنی بہو کے لیے نہیں نکال سکے۔۔۔ مردود۔"
زرنگار کے پاس اس طنز کا کوئی جواب نہ تھا۔
ہر طوائف ساری زندگی طوائف ہی بن کر رہنا نہیں چاہتی۔ مگر یہ ہمارے معاشرے کا رویہ ہے جو اسے شریفوں کے محلوں میں آنے نہیں دیتا۔
"بے کار کی ضد اور انا کا شکار ہے تیرا گھر والا۔ بیماری ہے ان غریب شریفوں میں۔ بیوی ان سے ذرا چار پیسے زیادہ کمانے لگے تو ان کی انا پر حرف آجاتا ہے۔ خون ابال کھا جاتا ہے ان کا۔"
"اماں۔۔۔ تھیٹرز' ڈراموں اور فلموں میں بھی تو لڑکیاں روپوں کے عوض ناچ ناچ کر کسی کی فرضی بیوی بن کر اور کسی کی بانہوں میں جھوم کر "عزت" کما لیتی ہیں۔ انہیں کوئی طوائف کیوں نہیں کہتا؟ مگر ایک طوائف عزت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے یہ کوئی نہیں چاہتا۔" وہ رو دی۔
"دہرے رویے ہیں اس معاشرے کے زری۔۔۔ شادیوں کے فنکشنز میں اپنی ناچتی ہوئی بچیوں پر پیسے لٹانے والے۔۔۔ ان شریفانہ مجروں کو برا نہیں سمجھتے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔
زرنگار دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔
"اس زندگی میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اماں۔۔۔ اگر اللہ نے ہمارا دوسرا جنم رکھا ہوتا تو اس سے درخواست کرتی' اب کے جنم مجھے بیٹی نہ کیجیو۔" وہ بات کے آخر میں ہنسی تو ٹوٹے کانچ کی سی کھنک اس کے لہجے میں تھی۔ زرگل بائی کو لوہا گرم لگا۔
"تو پھر ذہن بنا لے زری۔۔۔ بس ایک پاؤں گھر سے باہر نکالنا مشکل۔۔۔ اس کے بعد تو دیکھ۔ پھرکیاں لگ جاویں گی ان پیروں میں۔"
زرنگار نے احتیاط سے نوٹوں کی گڈی کو دوپٹے میں کسی متبرک شے کی طرح لپیٹ لیا تو زرگل بائی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کے بستر پاؤں پسار کے بیٹھی اور پرس میں سے پان کا لفافہ نکالنے لگی۔
اس نے دانہ ڈال کے نیچے جال بچھا رکھا تھا۔۔۔ اکثر تیز نگاہ پرندے پہلے شکار ہو جایا کرتے ہیں نا۔۔۔؟

✿ ✿ ✿

اور اب ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔۔۔ زرنگار ان نوٹوں کو سنبھال سنبھال چھپا چھپا کر تھک گئی۔
ناجائز کمائی کی طرح ناجائز بات کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ عجیب مشکل میں گھری تھی۔ مگر پھر نمیر کا اسکول نہ جانا بات شروع کرنے کی وجہ بن گیا۔
"نمیر کے اسکول کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے وقار؟" وہ اس کی بیماری کو دیکھتی تو ایسا سوال کبھی نہ کرتی مگر نوٹوں کی گڈی اسے ہمت دے رہی تھی۔
وقار نے ایک نظر اپنی چارپائی پر اوندھے منہ سوئے نمیر پر ڈالی۔ پھر زرنگار کو دیکھنے لگا۔ زخمی' دل میں اترتی' کاٹ کر رکھ دینے والی نگاہ۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ گھر کے حالات کیسے ہیں۔
"ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔۔۔"
"کیسے ہو جائے گا وقار۔ اس کی پڑھائی کا سال ضائع ہو جائے گا۔" زرنگار نے احتجاج کیا۔
"تو کیا کروں۔۔۔ اپنا آپ بیچ دوں؟" وہ چڑ کر بولا۔

"تو جا کے اپنا حصہ مانگیں جائیداد میں سے وقار۔ کم از کم ہمارا بیٹا ہی ڈھنگ کی زندگی جی لے۔" زرنگار کی آواز تیز ہوئی تو نمیر نے بے اختیار کروٹ لی۔

"فضول باتیں مت کرو زری۔ تھوکا ہوا چاٹ لوں واپس جا کر۔ سب کو ہنسنے کا موقع دوں۔"

"تو اب کون سا وہ لوگ رو رہے ہیں وقار؟... رو تو صرف ہم رہے ہیں۔ ان کے مقدر میں تو ہنسی ہی ہے بس۔" وہ آبدیدہ ہوئی پھر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔ اس نے طے کر لیا تھا اس معاملے میں وقار کے آگے کمزور نہیں پڑے گی۔

"پچھتا رہی ہو وقار آفندی کے ساتھ شادی کر کے؟" وقار ہنسا... خود پر... یہ خود اذیتی کی انتہا تھی۔

"پچھتاتی تو اب تک واپس لوٹ چکی ہوتی وقار..." بڑے حوصلے سے کہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ وقار کی چارپائی پر پائنتی بیٹھی تھی۔ نرمی سے اس کے پیر کو تھام لیا۔ خون کی کمی کے باعث اس کا پاؤں بالکل زرد لگتا تھا۔

"محبت کی ہے آپ سے وقار۔ کبھی بھی ہار نہ مانتی مگر... اولاد کا دکھ، اولاد کی محرومیاں دل چیر دیا کرتی ہیں۔ وہ کام بھی کروا دیتی ہیں جو انسان کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس کا بھرایا ہوا لہجہ بھاری تھا۔

دس سالہ نمیر کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ نہ سوتے ہوئے بھی سونے کی ایکٹنگ کرنا بہت مشکل تھا۔

ماں کے سارے الفاظ چاہے سمجھ میں نہ اترتے ہوں مگر اس کا رونا اس کے دکھ کا اظہار ہر بار نمیر کے معصوم سے دل کو عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

باپ کی بیماری گھر میں آئے دن مفلسی کے ڈیرے... وہ وقت سے پہلے سمجھدار ہو جانے والے بچوں میں سے تھا۔

"میں نے آپ سے کہا کہ اپنا جائز حق لیں مگر آپ نے نہیں مانا۔ اپنے محبت کرنے والے بھائی، اپنے دوستوں کی مدد تک آپ کو قبول نہیں ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں وقار کہ ہمارے جرم کی سزا ہمارے بچے کو کیوں ملے؟" وہ تڑپ رہی تھی۔

"دماغ خراب مت کرو زری۔" وہ اکتاہٹ سے بولا۔

"وقار...!!" اس کے آنسو تھم سے گئے۔

"اتنی بے حسی... اتنی لاتعلقی..."

"تو کیا کروں... مرتے جیتے جاتا تو ہوں کام پر۔ اس لاشے کو گھسیٹ کر جتنا کام کر سکتا ہوں، کر رہا ہوں۔" وہ پھٹ پڑا۔

"تم نے زندگی کو خود اپنے لیے سزا بنا لیا ہے وقار۔ ورنہ زندگی اس سے کہیں بہتر بھی ہو سکتی تھی۔" وہ بہت عرصے بعد آپ سے تم پر آئی تھی۔ وقار نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا اور اٹھ بیٹھا۔

"تم کیا سوچ کے بیٹھی ہو زرنگار۔ وہ بتاؤ؟"

"مجھ سے اپنی اولاد کے فاقے نہیں دیکھے جاتے وقار۔ تم اس کے لیے آسائشوں کا بندوبست کرو ورنہ مجھے کرنے دو۔" اس کی آواز میں لرزش نہیں تھی۔ مگر اس کی بات کوڑے کی طرح وقار کو لگی۔

ایک مرد کے لیے نامردی کا طعنہ... کہ وہ کما نہیں سکتا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے زرنگار کو دیکھ رہا تھا۔

"تم... تم کیا کرو گی...؟" اس کی آواز غم کے مارے پھٹ سی گئی تھی۔ "اپنا آپ بیچو گی...؟" وہ تلخ ہوا... زہر سے بھی زیادہ کڑوا۔ زرنگار دکھ سے مسکرا دی۔

"اپنا آپ تو تب بھی نہ بیچا وقار جب ایک طوائف کے کوٹھے پر تھی۔ اب تو سند یافتہ عزت دار ہوں۔ زر نگار وقار آفندی۔"

"تم میرے نام کو طعنہ بنا رہی ہو۔" مارے غصے کے اس کی رنگت لال پڑنے لگی۔

"میں تمہارا علاج کروانا چاہتی ہوں وقار۔ میں اتنی جلدی تم سے بچھڑنا نہیں چاہتی۔" وہ گھگھیانے لگی۔

اپنی چارپائی پر لیٹے دس سالہ نمیر آفندی کو ہمیشہ کی طرح ماں باپ کی بے بسی اندر ہی اندر رلائے جاتی تھی۔

"تو کیا کروں۔۔۔ کھلا چھوڑ دوں تمہیں بھیڑیوں کے بھٹ میں۔" اس کے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اسے یاد آیا' رات اس کی دوائی ختم ہو گئی تھی۔ اور انجکشن تو اتنے مہنگے تھے کہ دس میں سے محض دو ہی لگوا پایا تھا وہ۔

"تمہارے بعد بھی یہی ہونا ہے وقار۔۔۔" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی تو وقار آفندی ساکت سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کون سی جائیداد چھوڑ کے جاؤ گے میرے لیے۔ جس کے بل پر میں اپنا بچہ گھر بیٹھے پالتی رہوں گی۔۔۔ میں تو وہ عورت ہوں جو شاید اپنے مرد کی عدت بھی گھر بیٹھ کے پوری نہ کر پاؤں۔۔۔" بڑے حوصلے سے دل پر پاؤں رکھ کر اس نے وقار آفندی کے دل کو روندا۔

مگر یہ اس کی بے جا انا کو توڑنے کے لیے بے حد ضروری تھا۔

"اپنی زندگی میں ہی مجھے کسی قابل کر دو وقار۔۔۔ میں تمہارا درد سے تڑپتا وجود اور اپنے بچے کی آنکھوں میں پنپتی حسرتیں نہیں دیکھ سکتی اب۔"

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

وقار کی رنگت معمول سے زیادہ زرد پڑ گئی۔ اس کے لب سختی سے آپس میں بھنچے تھے جیسے کبھی نہ بولنے کی قسم کھائی ہو۔ نمیر بے آواز سسکنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"آہاں۔۔۔ کول موبائل آپی۔"

سب سے پہلے ملاحہ نے اس کا آئی فون دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔" جلدی سے اسے ٹالنے والے انداز میں کہہ کر اس نے موبائل لینا چاہا مگر اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"اوفوہ۔۔۔ چیک تو کرنے دیں ذرا۔۔۔ برتھ ڈے گفٹ ہے؟ یقیناً" طلال بھائی نے ایڈوانس میں ہی دے دیا ہو گا۔"

وہ موبائل چیک کرتی مسکراتے ہوئے' خود ہی اندازے لگا رہی تھی۔ مہپاہ گہرا سانس بھرتی بستر پر گر سی گئی۔

اس نے پکا سوچ لیا تھا کہ وہ یہ موبائل موحد کو واپس کر کے ہی رہے گی۔ آگے سے وہ خود چاہے ڈسٹ بن میں پھینکے یا سڑک پر۔ ابھی ایک بندے کے سوالوں کے جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔ باقی سب کو کیا بتائے گی؟

"بس کرو ملاحہ۔۔۔ کیا بچوں جیسا بی ہیو کر رہی ہو۔۔۔" وہ اسے موبائل میں "گھسے" دیکھ کر ٹوکے بنا رہ نہیں پائی۔

"ہونہہ۔۔۔" ملاحہ نے منہ بناتے ہوئے اسے موبائل لوٹایا تھا۔

"آپی۔۔۔ کیا سارے منگیتر ایسے مہنگے مہنگے گفٹس دیتے ہیں؟" کچھ سوچ کر ملاحہ کی آنکھیں چمکیں۔

"مہپاہ نے اسے گھورا۔ "کیا مطلب۔۔۔؟"

"مطلب یہ کہ پھر بندہ ایک آدھ منگنی تو کروا ہی لے۔" ملاحہ نے دانت نکالے۔ تو مہپاہ نے اسے ایک دھپ لگا دی۔

"چلو۔ بھاگو یہاں سے۔" درحقیقت اس کا دل برا ہو رہا تھا۔ بار بار یہ الفاظ سننا۔ منگیتر کا گفٹ۔۔۔ کسی گناہ سے کم تھا کیا۔

اور موحد آفندی کا یہ بدلا ہوا انداز۔۔۔ دشمن بدل کیسے گیا؟ اس کا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا۔

ملاحہ کے جانے کے بعد وہ شاور لینے گھس گئی۔

وہ تزئین تھی جو کسی کام سے کمرے میں آئی تو نکلتے نکلتے ٹھٹک گئی۔ بیڈ پر لاپروائی سے اوندھے پڑے آئی فون نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی۔ موبائل اٹھا کر دیکھا۔ ماڈل، کلر۔۔۔ حتیٰ کہ وال پیپر تک۔ وہی تھا۔

"وہ دن پیچھے جائیں تو۔۔۔" تزئین نے لب بھینچے۔

وہ موحد کو چائے کے لیے بلانے گئی تھی تب وہ بہت خوب صورت موبائل چیک کر رہا تھا۔

"آہاں۔۔۔ ایپل کا آئی فون سکس۔۔۔" وہ چونکا۔ پھر مسکرا دیا۔

"چوائس اچھی ہے تمہاری۔۔۔"

"یہ تو لیڈیز موبائل ہے۔ مرد اتنا بڑا موبائل ہاتھ میں یا جیب میں لیے گھومتے اچھے نہیں لگتے۔" تزئین نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے موبائل اس سے لیا اور معنی خیزی سے مسکرائی۔

"اوہ۔۔۔ تو اپنی فرسٹ لیڈی کو دینے والے ہو۔۔۔" وہ مسکراتا رہا۔

لائیو وال پیپر پہ چلتی پھرتی مچھلیاں انگلی کے ایک ٹچ سے گھبرا کر یوں بکھرتیں جیسے زندہ سلامت ہوں۔

"ویری نائس۔۔۔"

"تھینکس۔۔۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ طمانیت بھرا انداز اور پرسکون سی مسکراہٹ۔

تزئین نے گہری سانس بھری۔ اور موبائل کو بستر پر اچھال دیا۔

"تو یہ ہے تمہاری فرسٹ لیڈی۔۔۔ ہنہ۔۔۔ کچھ تو دیکھ کر گرتے موحد آفندی۔ وہ تو پہلے ہی کسی کی فرسٹ لیڈی بنی بیٹھی ہے۔" جلتی کلستی وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ موبائل ہاتھ میں لیے موحد کے کمرے میں جانے والی تھی جب دروازہ کھلا اور پرفیوم کی تیز اور دلکش مہک کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ مہواہ سٹپٹائی۔ اوپر سے اس کا مسکراتا انداز۔

"آہاہ۔۔۔ میں تمہاری ہی طرف آ رہا تھا۔"

(لو جی۔۔۔ ہم کون سا بچپن کے بیسٹ فرینڈ رہ چکے ہیں) مہواہ کھنکھاری۔

"ایکچوئلی میں یہ موبائل کے سلسلے میں آئی تھی۔"

"اسے استعمال کرنا کون سا مشکل ہے۔ میں سکھا دوں گا۔ ابھی تو ایک فیور دو۔ مجھے اچھی سی برانڈڈ کپڑوں کی شاپ بتاؤ۔۔۔ شاپنگ کرنی ہے مجھے۔"

"وہ تو بتا دوں گی۔ مگر یہ گفٹ میں نہیں لے سکتی موحد۔۔۔" مہواہ نے کہہ دیا تو گویا مشکل آسان ہوئی اور موحد نے اسے ایسے دیکھا جیسے سمجھ نہ پایا ہو۔

"کم آن۔۔۔ کیا مذاق ہے مہواہ۔۔۔ اچھا ابھی حساب کلیئر کر لیتے ہیں۔ تم نے جو میرے کپڑے برباد کیے ہیں ان کی شاپنگ کروا دو مجھے۔" وہ بڑی پیاری مسکراہٹ کا مالک تھا۔ مہواہ سٹپٹائی۔

"اس وقت جتنی رقم میرے پاس ہے اس برانڈ کی تو ایک ہی پینٹ آئے گی اس میں۔" وہ موحد کی پینٹ پر نظر

ڈالتے ہوئے گھبرا کر بولی۔ تو اس کی مسکراہٹ ہلکے سے قہقہے میں بدلی۔

پھر وہ اس کا ہاتھ تھام کر زبردستی باہر کی طرف بڑھا۔

"چلو۔۔۔ کوئی بات نہیں میں ادھار کرلوں گا تم سے۔ اب موبائل کو بھی کسی کھاتے میں ایڈجسٹ کرنا ہے نا۔"

"اللہ اللہ۔۔۔ وہ سڑیل بدتمیز اکھڑ سا موحد آفندی کہاں گیا؟" مہاہ کو حیرت کا دورہ پڑنے لگا۔

یعنی پھٹا پوسٹر اور نکلا ہیرو۔۔۔ کمال ہی تھا یہ تو۔

وہ اسے سیدھا آغا جان کے پاس لے گیا۔

"میں نے مہو سے کہا ہے کہ مجھے اچھی سی برانڈڈ شاپنگ کروائے۔" آغا جان نے چشمے کے اوپر سے انہیں گھور کر دیکھا۔

مسکراتا ہوا ان کا جان جگر۔۔۔ اور گھبرائی ہوئی مہاہ۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بیوقوف۔ یہ لڑکیوں کے کام تھوڑی ہیں۔ دو دن صبر کرلیتے گاؤں سے کبیر لوٹنے والا ہے۔ وہ جاتا تمہارے ساتھ۔" موحد کو پیار سے ڈانٹا۔

"مل لیں گے جی آپ کے کبیر صاحب سے بھی۔ بڑے چرچے سنے ہیں اس کے۔ مگر فی الوقت تو اس شاپنگ کی سخت ضرورت ہے آغا جان۔ اس بھوت نے سارے کپڑے برباد کردیے میرے کیوں مہو۔۔۔؟" موحد نے اطمینان سے کہتے ہوئے آخر میں مہاہ سے بھی گواہی لی تو وہ گڑبڑا گئی۔ مگر بات اپنی ذات پر آرہی تھی ساتھ دینا ہی پڑا۔

"ج۔۔۔ جی آغا جان۔۔۔ بہت ضروری شاپنگ ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر۔ جاؤ اور موحد! گاڑی دھیان سے چلانا بچے۔" ان کے انداز میں پیار ہی پیار تھا۔

"اف۔۔۔" وہ کرنے کے سے انداز میں گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی۔ موبائل اس نے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"کیا شے ہو تم موحد۔۔۔؟"

گاڑی اسٹارٹ کرتا وہ ہنسا۔ "اسے میں تعریف ہی سمجھوں نا؟" سن گلاسز آنکھوں پر فٹ کیے۔

"صحیح بات بتاؤں تو مجھے تمہارا یہ انداز ہضم نہیں ہورہا۔" تھوڑی دیر خاموش سفر کے بعد مہاہ نے صاف بات کرنے کی ٹھانی۔ موحد نے چہرہ موڑ کر گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"تم اس بے وجہ دشمنی میں خوش تھیں؟"

"مائنڈ مت کرنا۔ وہ دشمنی تم نے شروع کی تھی۔ تم آئے ہی پھولا ہوا منہ لے کر تھے۔" مہاہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو وہ بے ساختہ ہلکا سا قہقہہ لگا بیٹھا۔ مگر مہاہ سنجیدہ بیٹھی ناک کی سیدھ میں دیکھتی رہی۔ یعنی اسے باقاعدہ جواب چاہیے تھا۔

"میرے ہر موڈ کا ایک فیز ہوتا ہے۔۔۔ اس غصے کا بھی ایک پیریڈ تھا۔۔۔ اب گزر گیا۔"

"ہمم۔۔۔" مہاہ نے سمجھنے والے انداز میں سرہلایا۔ شاپنگ کے بعد وہ اسے لنچ کے لیے لے گیا۔

"موحد پلیز۔۔۔ آغا جان ناراض ہوں گے۔" مہاہ کا احتجاج ریسٹورنٹ میں داخل ہونے تک جاری رہا تھا۔ اور سامنے گاڑی میں گزرتے طلال کو شک سا ہوا مہاہ کے وجود کا۔۔۔ تو وہ بلا ارادہ ہی گاڑی پارکنگ میں لے آیا۔

"آغا جان بنا بتائے آنے پر ناراض ہوتے ابھی تمہارے سامنے ان کی اجازت سے لایا ہوں تمہیں۔" وہ اسے بہلاتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کرنے لگا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے موحد۔" وہ بے چارگی سے کہتی اب کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، محض اسے ویٹر کو آرڈر لکھواتے دیکھ رہی تھی۔

طلال اسے موحد کے ساتھ دیکھ کر بے حد بے یقینی کی کیفیت میں گھرا اور پھر اشتعال میں آیا۔

اور غصے میں انسان کی عقل سب سے پہلے جواب دے جاتی ہے۔ طلال نے بھی "موقع پر" مہواہ سے باز پرس ضروری سمجھی۔

بڑی مشکل سے وہ موڈ ٹھیک کرتا ان کی ٹیبل تک پہنچا۔

"ویسے اچھی بیویوں والی سب سے بڑی کوالٹی تمہارے اندر یہ ہے کہ شاپنگ کے دوران تم بارگیننگ بہت اچھی کرلیتی ہو۔"

موحد مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس پر مہواہ کی ہلکی سی ہنسی۔ طلال کی رگوں میں انگارے دوڑے۔ وہ ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔" بہت سرد مہر سا انداز۔ موحد اور مہواہ کے تاثرات یک لخت مختلف تھے۔ مہو کی رنگت اڑی۔ اس کے برعکس موحد نے کرسی سے ٹیک لگا کر اطمینان سے ٹانگیں پھیلالیں۔ گویا اٹھ کر "گھر کے داماد" سے ملنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا۔

"ایکسکیوزڈ (معاف کیا)" بے نیازی سے کہا تو اندر ہی اندر اپنی تلملاہٹ پر قابو پاتا طلال بمشکل اس کے منہ پر گھونسا مارنے کی شدید خواہش کو ضبط کرپایا۔

"اوہ۔۔۔ ہیلو! تم یہاں۔۔۔؟" مہواہ کی ساری توجہ طلال کے ماتھے کی تیوریوں پر تھی۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے والا تھا مہو۔۔۔ تم یہاں کیا کررہی ہو؟" اس نے بات کے دوران ایک قہر آلود نگاہ موحد پر ڈالی تو اس کا نہ پوچھا جانے والا سوال بھی مہواہ کی سمجھ میں آگیا۔

"وہ۔۔۔ میں شاپنگ کے لیے آئی تھی۔"

مہواہ گڑبڑائی۔ وہ درحقیقت اس صورت حال سے پریشان تھی۔ موحد اور طلال کے جیسے کشیدہ تعلقات تھے، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اصولاً تو مہواہ کو چاہیے تھا کہ وہ موحد کو لفٹ بھی نہ کراتی لیکن اگر گھریلو رشتہ داری دیکھتی تو اسے کچھ لچک دکھانا پڑتی تھی۔ مگر اب طلال کو یہ باریکی کون سمجھاتا۔

"اچھا۔۔۔! ریسٹورنٹس میں شاپنگ سینٹرز کب سے کھلنے شروع ہوئے؟ مجھے تو پتا نہیں چلا۔" وہ زہرخندہ لہجے میں بولا تو مہواہ کا حلق خشک ہوا۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔" وہ کرسی کھسکا کر اٹھی۔

"میری بات سنو طلال۔۔۔" اسے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ پھولتے پچکتے نتھنے لیے وہیں کھڑا رہا۔

"جو بات کرنی ہے یہیں کرو۔ "مسٹر اصول پسند" کے سامنے۔ جو لڑکی کو خود تو لے کر گھوم سکتے ہیں مگر اس کے منگیتر کے ساتھ اس کا کہیں جانا انہیں گناہ کے مترادف لگتا ہے۔" بے حد تلخی سے اس نے موحد پر طنز کیا۔

اور خدا گواہ ہے، جو موحد کے ماتھے پر ایک بھی شکن آئی ہو۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ ویسے ہی ٹیک لگائے بیٹھا گویا من پسند ٹی وی شو دیکھ رہا تھا۔

مہواہ کا دل ڈرا۔۔۔ کہ ان الفاظ پر موحد کا جانے کیا ری ایکشن ہو۔ فوراً ہی طلال کو ٹوک دیا۔

"طلال پلیز۔ وہ بات ختم ہوگئی۔"

"تمہارے لیے نا۔۔۔ میرے لیے نہیں ہوئی اور تم۔۔۔ اس آدمی کے ساتھ یہاں کیا کررہی ہو۔ گھر جاؤ فوراً۔"

اس کا تو جیسے دماغ ہی الٹ گیا تھا۔ موحد کا یوں اگنور کرنا بھی ہتک کا باعث بن رہا تھا۔ یوں جیسے وہ طلال کو کچھ

سمجھتا ہی نہ ہو۔

"طلال۔۔۔" مہپاره نے ناراضی سے اسے دیکھا۔ کتنی شرمندگی ہو رہی تھی موحد کے سامنے۔

بھلا برے اخلاق کا جواب بھی برا اخلاق ہی ہونا چاہیے؟ اور کچھ نہ سہی طلال مہپاره کی آنکھوں کی زبان تو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ دوسرے ہی پل ٹھنڈا پڑ گیا۔

"اوکے۔ فائن۔۔۔ جو جی میں آتا ہے کرو۔۔۔ ٹو ہیل ود۔۔۔" وہ جس طرح فوں فاں کرتا آیا تھا اسی طرح دندناتا ہوا چلا گیا۔ لوگوں کی نظروں کا خیال کر کے مہپاره اپنی نشست پر ڈھے سی گئی۔ موحد گہری سانس بھرتا سیدھا ہو بیٹھا۔

"پانی پیو اور ریلیکس کرو۔" نرمی سے مشورہ دیا۔ مگر مہپاره کا دل ہر شے سے یکلخت اکتا سا گیا۔ عجیب سی وحشت اسے گھیرنے لگی۔

"گھر چلیں اب بس۔" اس نے اپنے شولڈر بیگ پر ہاتھ رکھا۔

"کم آن مہپاره۔۔۔ کھانے کا آرڈر دیا ہوا ہے۔ ہر جگہ کے ایٹی کیٹس ہوتے ہیں کچھ۔" وہ خفا ہوا۔ مگر مہپاره جھنجلائی ہوئی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں تھکی ہوئی ہوں۔ آرام کرنا ہے گھر جا کر مجھے۔"

"ہر رشتے اور اس سے منسلک الجھنوں کو الگ رکھنا چاہیے مہپاره! ورنہ زندگی زیادہ الجھی ہوئی لگنے لگتی ہے۔" وہ پرسکون تھا۔

"وہ تمہاری وجہ سے اتنا ہائپر ہو رہا ہے۔ ورنہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا بندہ ہے۔" مہپاره نے اسے جتایا۔ اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔ کیوں منہ اٹھا کر چلی آئی موحد کے ساتھ۔

"ٹھنڈے مزاج کے بندے کا اس قدر آگ بگولہ ہونے کا منظر میں نے لائف میں پہلی بار دیکھا ہے ویسے۔" وہ ویٹر کو آرڈر لاتے ہوئے دیکھ کر تبصرہ کر رہا تھا۔ مہپاره ضبط کر کے رہ گئی۔

مگر یہ تو طے تھا کہ آئندہ کم از کم موحد آفندی کے ساتھ کہیں جانے کا وہ رسک نہیں لے گی۔

☼ ☼ ☼

موبائل پر طلال کا نام جگمگاتا دیکھ کر تزئین نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا۔

کب سے موبائل بج رہا تھا۔ تزئین کا دل آج اس قدر خراب ہو رہا تھا کہ کسی سے بھی بات کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

"دنیا کی ساری خوشیاں اللہ نے اس مہپاره آفندی کے لیے ہی رکھی ہیں ــــــ" اسے اللہ سے بھی شکوہ تھا۔

وہ مہپاره اور موحد کو اکٹھے جاتے دیکھ کر جلتی کلستی رہ گئی۔ پہلے موحد کے موبائل گفٹ کرنے کی جلن کیا کم تھی جو اوپر سے یہ سین۔۔۔

مگر کال کرنے والا بھی کوئی ڈھیٹ شخص تھا۔ وہ دانت پیستی ہوئی موبائل کی طرف آئی مگر طلال کا نام دیکھ کر ساری کوفت و بیزاری پل بھر میں اڑنچھو ہوئی تھی۔

"کیسے ہو۔۔۔؟" سلام دعا کے بعد تزئین کا موڈ بہت اچھا تھا۔

مگر دوسری طرف طلال کا موڈ خراب تھا۔ "مہو کہاں گئی ہے تزئین؟" لمحہ بھر کو وہ ٹھٹکی۔

"کیا ہوا طلال۔ خیریت ہے نا؟"

"میری خیریت کو بھاڑ میں ڈالو۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔" وہ بگڑے ہوئے انداز میں بولا تو تزئین نے فوراً
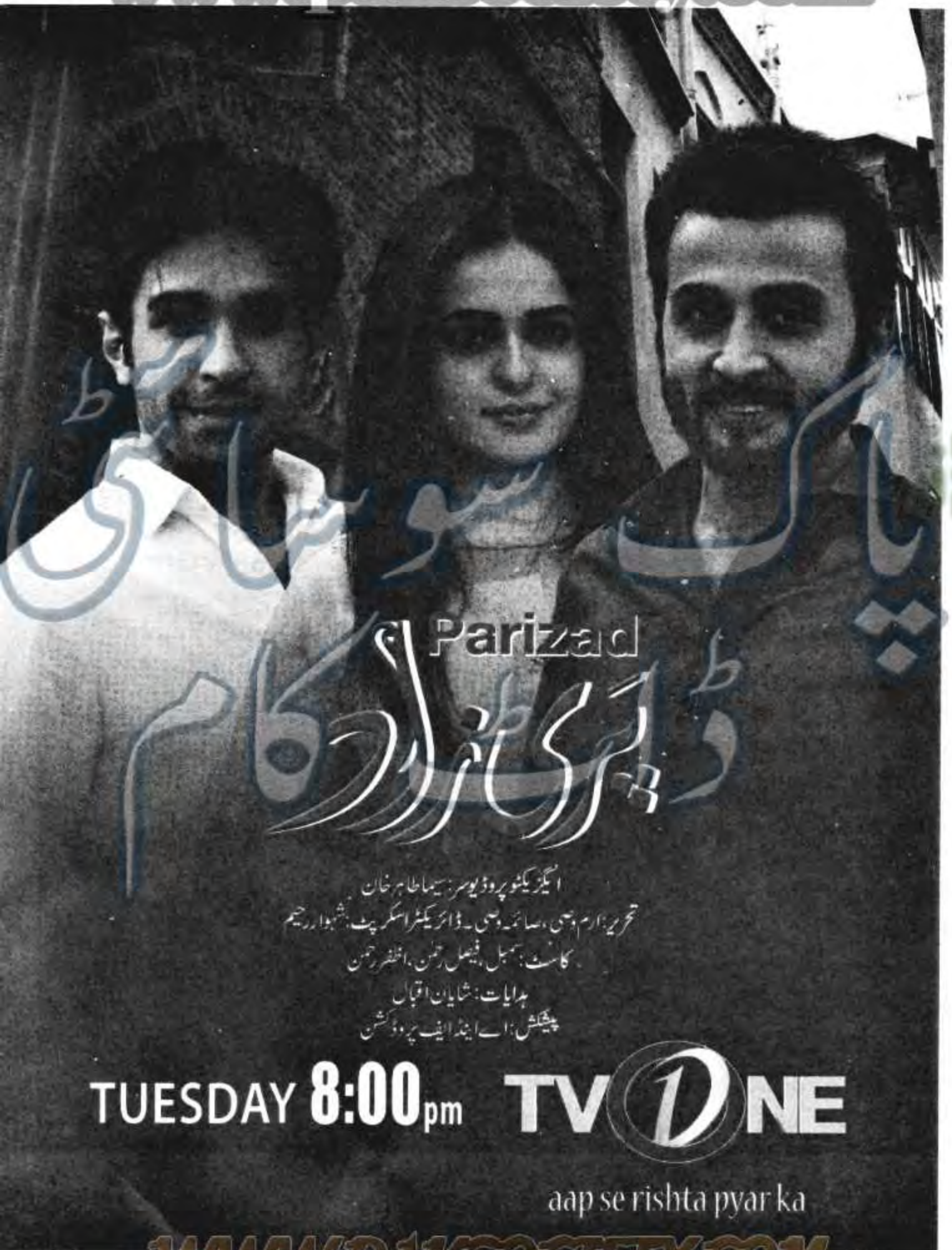
کیا توڑے گی پری زاد۔۔۔شادی کا بندھن یا محبت کی ڈور؟

پری زاد ایک ذہین اور خوبصورت لڑکی ہے جو لڑکیوں کی تعلیم کی زبردست حامی ہے۔اس کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے اپنے گھر کے خرچ میں ہاتھ بٹانے کے لیے وہ ایک اسکول میں پڑھاتی ہے اور سہ پہر میں پڑوس کی لڑکیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرتی ہے۔

وہ اسکول میں اپنے ایک کولیگ علی سے محبت کرتی ہے اور دونوں شادی کا خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت جب علی اپنا رشتہ بھیجنے والا ہوتا ہے پری زاد کے خاندان میں ایک ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جو پری زاد کو ایک اہم فیصلے سے دوچار ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ پری زاد کے بھائی کو ایک خطرناک مافیا اغوا کر لیتی ہے اور اس کی رہائی کے عوض بھاری معاوضہ طلب کرتی ہے۔اپنے گھر کی عزت بچانے کے لیے پری زاد کو ایک مالدار شخص منصور سے شادی کرنا پڑتی ہے جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ دو نوجوان لڑکیوں کا باپ ہے۔ منصور پری زاد کے بھائی کی رہائی کے لیے مطلوبہ رقم فراہم کر دیتا ہے پری زاد کو شادی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ منصور صاحب ایک سخت گیر انسان ہیں جو فرسودہ اور کٹر روایتی خیالات رکھتے ہیں اور وہ لڑکیوں کی تعلیم کے سخت مخالف ہیں۔ منصور صاحب کے گھر کا ماحول کافی گھٹا گھٹا سا ہے منصور صاحب کا بھانجا ارشد ایک عیار، لالچی اور سازشی شخص ہے جو ماموں کی دولت اور ان کی عزت پری زاد پر بری نظر رکھتا ہے۔ پری زاد اس پریشان کن زندگی میں اچانک علی واپس آتا ہے اور اسے منصور سے دامن چھڑانے اور اپنی شریک زندگی بننے کی پیشکش کرتا ہے۔اب پری زاد زندگی کے ایک اہم دوراہے پر کھڑی ہے کہ وہ کیا فیصلہ کرے۔

کیا وہ علی کی محبت کو خاندان کی بھینٹ چڑھا دے گی؟

کیا وہ سخت گیر اور فرسودہ خیالات کے مالک منصور کے گھر دو سوتیلی بیٹیوں کے ساتھ گزارا کر سکے گی؟

/TvOnePK TvOnePK.tv

جوڑتوڑ کرلیا۔

"وہ موحد کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی۔۔۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہیں؟"

"کہاں تو تم لوگ اس کزن کی شکل دیکھنے کو بھی راضی نہیں تھے۔ اور اب اسے اس قدر سر آنکھوں پہ بٹھایا جا رہا ہے۔"

وہ یقیناً حواس میں نہیں تھا ورنہ کم از کم یہ دیکھ لیتا کہ کہاں سر پھوڑ رہا ہے۔

"خیر۔۔۔ مائنڈ مت کرنا۔ مہو کو ہی عادت ہے سب سے فرینک ہونے کی۔ اس گھر میں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ وہ تو موحد کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے نہیں نکلتیں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"اسے کہہ دینا۔۔۔ مجھ سے بات بھی مت کرے۔ اتنا غصہ ہے مجھے اس پر۔" طلال کو تزئین کی بات نے اور متنفر کیا تھا۔

"نہ بھئی۔۔۔ تم خود بات کرلینا اس سے۔ مجھ سے تو وہ ویسے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ جب سے چچی آئی ہیں۔ وہ ان ہی کے آگے پیچھے جارہی ہے۔" اس نے ڈائریکٹ موحد کا نام نہ لیتے ہوئے بھی کام پورا ہی کیا تھا۔

"ذرا دیر بعد تم دونوں پھر سے ایک ہو جاؤ گے۔ اور میں مزید بری بنوں گی اس کی نظر میں۔"

"ابھی آئی نہیں گھر۔۔۔؟" ذرا توقف کے بعد طلال نے پوچھا۔

"تم کال کیوں نہیں کرلیتے اسے۔۔۔ تمہارا دیا ہوا موبائل استعمال کر رہی ہے وہ۔" تزئین نے جیسے لطف لیتے ہوئے ایک اور "سنگین باب" کھولا۔

"میرا۔۔۔ کون سا موبائل۔۔۔؟" وہ الجھا۔

"اب بنو مت۔۔۔ مہو کی برتھ ڈے کا ایڈوانس گفٹ۔ وہ تو سب کو دکھاتی پھر رہی ہے آئی فون سکس۔" تزئین مسکرائی۔

دوسری طرف سے اسی وقت لائن ڈراپ ہو گئی۔

لوجی۔۔۔ تزئین نے ہاتھ جھاڑے۔ اب آگے تمہاری قسمت مہ ماہ آفندی۔

☼ ☼ ☼

زرنگار نے نمیر کی فیس ادا کر کے نہ صرف اسے اسکول بھیجنا شروع کیا بلکہ ایک اچھے ڈاکٹر سے وقار کے چیک اپ کے لیے بھی وقت لے لیا۔ اور ابھی تک خاموشی سے سب تماشا دیکھتا وقار آفندی یوں بھوکے شیر کی طرح بپھرے گا' یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

"خبردار۔۔۔ خبردار جو حرام کا ایک بھی پیسہ مجھ پر لگانے کی کوشش کی تو۔"

"اماں نے مدد کے خیال سے دیے ہیں وقار۔ ہم لوٹا دیں گے انہیں۔ قرض سمجھ لیں۔" زرنگار نے لہجہ نرم رکھا۔ معذرت خواہانہ۔ وہ اسے مزید ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ایک طوائف سے قرض لوں گا میں۔ یہ حالات ہو گئے ہیں وقار آفندی کے۔" وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھا۔ خود پر ہنسا۔

زرنگار کو اس کی ہنسی نے رلا دیا۔ کیسا ہیرے جیسا شخص اس کے پیچھے مٹی ہو گیا تھا۔

"وقت اور حالات کی مجبوری کو سمجھو وقار۔۔۔ تمہارا دل نہیں کٹتا اپنے بچے کو دیکھ کر۔۔۔"

"بچوں کو بھوکا دیکھ کر مائیں طوائف نہیں بن جایا کرتیں زرنگار۔۔۔" وہ اس بری طرح پھنکارا کہ زرنگار خوفزدہ ہو گئی۔

"مجبوری میں تو حرام کو بھی حلال کہا گیا ہے وقار۔"

"بکواس مت کرو۔۔۔ زندہ ہوں ابھی میں۔ کم کما رہا ہوں تو کیا ہوا۔۔۔ مرا تو نہیں ہوں جو تم نے حرام کو خود پر حلال کرلیا ہے۔" آنکھ خشک تھی تو کیا۔۔۔ اس کے لفظوں سے لہو ٹپکتا تھا۔ وہ رونے لگی۔

"بس کرو وقار۔ کیوں اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں آزمائش بنا رہے ہو۔ میری ماں کا دیا مانا کہ حرام ہے۔ تمہارے باپ کا کمایا ہوا تو حلال ہے پھر وہاں سے کیوں نہیں مانگتے اپنا حصہ؟"

"جیتے جی مار ڈالا انہوں نے مجھے۔۔۔ اور اب تم بھی یہی کام کر رہی ہو۔"

وہ آزردہ تھا۔ "تم مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہو کہ میں نے غلطی کی تم سے شادی کرکے۔"

"غلطی تو تم اب کر رہے ہو وقار۔ زندگی کو بوجھ بنا رہے ہو تم۔ اپنے لیے۔۔۔ ہم سب کے لیے۔"

"ان سے حصہ مانگنے کے لیے مجھے اپنے وجود کے دو حصے کاٹنے پڑتے ہیں زرنگار۔۔۔ ایک تم اور ایک میرا بچہ۔۔۔ کہو پھر۔۔۔ کب جاؤں آفندی ہاؤس؟" وہ چلایا تھا۔ زرد رنگت لیے زرنگار خاموش ہوگئی۔

"میں مر جاؤں۔۔۔ پھر وہاں جانا۔ ان کے وارث کو لے کر اپنا حصہ مانگنے۔۔۔ شاید پھر ترس کھالیں اس پر کہ یتیم بچہ ہے۔" کف اڑاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ زرنگار روتے ہوئے اس کے شانے سے جا لگی۔

"بس کرو وقار۔۔۔ کیوں بے موت مارتے ہو مجھے۔"

"آغا جان سب جانتے ہیں زری۔ سب۔۔۔ میری بیماری سے واقف نہ ہوں مگر حالات سے تو اچھی طرح واقف ہیں ناں۔ پھر خود کو ہلکا کرنے کا فائدہ۔" وہ قدرے ٹھنڈا پڑا تھا۔

"ہم اپنی زندگی آپ بنا سکتے ہیں وقار۔ بس ایک بار مجھے کام کرنے کی اجازت دے دو۔ تمہارے صحت یاب ہوتے ہی میں سب چھوڑ دوں گی۔ چاہو تو تب کال کوٹھڑی میں ڈال دینا مجھے وقار۔ مگر مجھ سے "کوشش" کا اختیار مت چھینو۔" وہ اس کے سینے سے لگی سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔ اور وقار آفندی کا پرسکون لہجے میں جواب۔

"میرے مرنے کے بعد جو چاہے کرنا زری۔" وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وقار آفندی کی آنکھوں میں ضبط کی لالی اترنے لگی۔

۞ ۞ ۞

واپسی پر انتہائی قریب سے کسی شخص کی گاڑی نے اوور ٹیک کیا تو بچاتے ہوئے بھی موحد کی گاڑی دوسری گاڑی سے ہلکی سی رگڑ کھا گئی اور اس پر مستزاد ڈرائیور نے ذرا آگے جاکر گاڑی روک بھی دی۔

"تو ہیل ود۔۔۔" موحد بھنایا ہوا گاڑی سے نکلا تھا۔

"موحد۔۔۔ دفع کرو۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔" مہواہ اسے روکتی رہ گئی۔ اگلی گاڑی میں سے ایک لمبا تڑنگا خوش شکل سا آدمی باہر نکلا۔ موحد تیز انداز میں کچھ دیر اسے سناتا رہا۔ اس آدمی کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ مگر اس کی موحد کی گاڑی اور دوراگلی نشست پر بیٹھی مہواہ پر بار بار پڑنے والی نگاہ۔۔۔ مہواہ نے بے ساختہ اپنا کلچ اٹھا کر چہرے کے آگے رکھ لیا۔

اسے خیال آیا۔۔۔ سائیڈ مرر سے یہ گاڑی کافی دور سے ان کے پیچھے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ موحد اسی غصے میں آکر گاڑی میں بیٹھا۔

"ہوگئی گاڑی ٹھیک؟" مہواہ نے تحمل سے پہلا سوال کیا۔ موحد نے تیوری چڑھائی۔

"ابھی کرواؤں گا جاکر۔۔۔" پھر ٹھٹکا۔ "کیا مطلب؟"

"میں نے سوچا جاکر اتنی مغز ماری کرکے آئے ہو اپنا غصہ نکالا ہے، شاید اس سے گاڑی کا نقصان ٹھیک ہوگیا

ہو۔" وہ کمال اطمینان سے بولی۔

موحد نے اسے گھورتے ہوئے سن گلاسز آنکھوں پر چڑھائے اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"ویسے کافی دیر سے یہ گاڑی ہمارے پیچھے تھی۔۔۔" مہاہ نے اسے بتایا۔ تو وہ چونکا۔

"تم نے نوٹس نہیں کیا وہ بار بار ہماری گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔" مہاہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"وہ گاڑی کے پچھلے دروازے پر پڑی خراشوں کو دیکھ رہا تھا۔"

موحد نے اس کا دھیان بٹایا۔ "دیکھ تو رہا تھا نا۔۔۔" وہ تفاخر سے بولی۔

"ایک تو تم عورتیں بھی نا۔" موحد نے بڑبڑاتے ہوئے اسٹیئرنگ گھمایا تو وہ چیخ اٹھی۔

"کیا کہا۔ عورتیں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ تو چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو۔" وہ روڈ پر گاڑی لے آیا۔

"عورت کسے کہہ رہے ہو تم بار بار۔۔۔؟" مہاہ نے دانت کچکچائے۔

"تمہیں کہہ رہا ہوں بھئی۔۔۔ اور کون ہے یہاں۔" وہ حیران ہوا۔

"شرم تو نہیں آتی تمہیں۔ تمہیں لڑکی اور عورت کا فرق نہیں معلوم۔" وہ اس پر برسی۔

"بس اتنا ہی پتا ہے لڑکی لام سے شروع ہوتا ہے اور عورت عین سے۔" وہ کہتے ہوئے ہنس دیا تھا۔

مہاہ منہ پھلائے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

گاڑی چلاتے موحد آفندی کے ہونٹوں پر ابھی بھی ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

زرنگار نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔۔۔ اس دنیا نے وقار آفندی کا دل دکھایا تھا۔ اس کے اپنوں نے دکھایا تھا۔۔۔ مگر وہ جو نہیں بنے گی دل دکھانے کی۔ مگر وقار آفندی نے اس کا دوبارہ اعتبار ہی نہیں کیا۔ اور ایک روز چپ کر کے آنکھیں موند لیں۔

وہ روئی، بلکی، زمین آسمان ہلا ڈالے بین کر کر کے۔۔۔ گلے میں خراشیں پڑیں، آواز بیٹھ گئی۔ آنکھوں کے سوتے خشک پڑ گئے۔ مگر دکھ ہلکا ہونے میں نہ آتا تھا۔

وہ پرجوش جذباتی محبت کرنے والا انسان۔۔۔ آج منوں تلے مٹی میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو حرارت سے پُر یہ سینہ کبھی نہیں ملنے والا تھا اب۔۔۔ یہ جذبوں سے پُر آنکھیں محبت سے پکارنے والی آواز۔۔۔ یا اللہ۔ تو اب ساری عمر اس آواز کو ترسنے والی تھی وہ۔

"نمیر۔۔۔ اپنے بابا کو چھپا لو نمیر۔ یہ لوگ لے جائیں گے انہیں اور پھر تم کبھی ان کو دیکھ نہیں پاؤ گے۔ انہیں کہیں چھپا دو۔۔۔" اس کی باتیں عورتوں کا دل چیر رہی تھیں۔

"آج میری بادشاہت ختم ہو گئی وقار آفندی۔۔۔ میرا کھیل ختم ہو گیا۔ خود مر کے مجھے مٹی کر گئے ہو وقار اور اپنے بچے کو یتیم۔۔۔"

مگر جانے والے کبھی لوٹ کر آئے ہیں کیا؟

ہزاروں لاکھوں آوازیں دو بین کرو۔۔۔ سینہ پیٹو۔ اب انہیں اگلی منزل کی فکر۔ یہ دنیا تو تم لوگوں کے لیے چھوڑ دی اب انہوں نے۔

زرنگار نے مٹھی میں دبی پرچی کو دیکھا۔ اس پر آفندی ہاؤس کا فون نمبر لکھا تھا۔ مگر زرنگار نے کسی کو بھی اطلاع

نہ دی تھی۔

"ایک قبر ہی کی نشانی تو رہ جائے گی وقار آفندی۔ وہ لوگ تو مجھے تمہاری قبر پر بھی نہ جانے دیں گے۔" اور ماں باپ کے سارے دکھوں، سارے آنسوؤں کا گواہ نمیر آفندی تڑپ تڑپ کر رو دیا تھا۔

☼ ☼ ☼ ☼

انتہائی غیر متوقع طور پر طلال کی ماما اس سے ملنے آئیں تو "اتفاقاً" طلال بھی ساتھ تھا۔

مہپاہ جو طلال کی ناراضی کا سوچ سوچ کر آدھی ہو رہی تھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

"اچھا طریقہ سوچا ہے طلال بھائی نے ملنے کا آپی۔" ملاحہ نے مہپاہ کو گدگدایا تو تزئین نے محظوظ کن نظروں سے مہپاہ کی اڑی رنگت دیکھی۔

وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں گئی تو وہاں کا ماحول خوشگوار پایا۔ خواتین آپس میں باتوں میں مصروف تھیں اور تائی جان ساتھ ساتھ داماد سے بھی ایک آدھ بات کر لیتیں۔

اور ابھی طلال کی ماما اندر ہی تھیں جب وہ چائے پی کر باہر لان میں چلا آیا۔

"جائیں نا آپی۔ ابھی ابو لوگ آفس سے نہیں آئے۔ ایک ملاقات تو بنتی ہے نا۔ ان کی اتنی بہادری پر۔ گھر تک چلے آئے ہیں۔" ملاحہ اور فرزین نے اس کا پیچھا لے لیا تھا۔

"آغا جان تو اپنے کمرے میں ہیں ناں۔" مہپاہ نے یاد دلایا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے چاہنے والا جان جوکھوں میں ڈال کے ملنے آیا ہو۔ بس ویسا ہی تفاخر محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا... جا کے طلال بھائی کو اندر لے آئیں۔ آغا جان سے ملانے کے لیے۔ یہ تو کر سکتی ہیں ناں؟"

"ہم... ہاں... یہ ہو سکتا ہے۔" وہ کھلکھلا دی۔

"دو چار سیلفیاں بھی لے لینا اسی بہانے۔"

ملاحہ نے آئی فون زبردستی اس کے ہاتھ میں تھماتے باہر کی طرف دھکیلا تھا۔

وہ لان میں ٹہلتا ہوا دوسرے سرے پر گیا۔ پلٹا تو مہپاہ کو آہستہ روی سے آتے دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے اس کے مقابل آیا تھا۔ مہپاہ نے برافروختہ ہو کر اسے دیکھا۔

"تمہارے آج کے انداز کو میں کیا سمجھوں مہر!... یہ رشتہ نبھانے کا کون سا طریقہ ہے؟" وہ لفظوں کو چبا کر بولا۔

مہپاہ نے گہری سانس بھری۔

"تم اپنے انداز پر بھی غور کرتے طلال۔"

"میں...؟"

وہ جیسے حیرت زدہ سا ہو گیا۔ "مجھے غور کرنا چاہیے تھا؟" پھر وہ غرا کر بولا۔

"اور اس شخص نے جو بیہودگی میرے ساتھ کی تھی وہ بھلا دی ہے تم نے۔ اسی لیے اس کے ساتھ پکنک منائی جا رہی تھی۔"

"آغا جان نے کہا تھا مجھے اس کے ساتھ جانے کے لیے طلال۔" وہ تحمل سے بولی۔

"تم نے بھی جو کچھ ریسٹورنٹ میں کہا وہ موحد کے کیے گئے عمل کا منہ توڑ جواب تھا۔ پھر اب یہ غصہ کیوں؟"

"میں برداشت نہیں کر سکتا مہر! کہ تم اس شخص کے ساتھ نظر آؤ۔" وہ جذباتی ہونے لگا۔

"اوکے... ٹھیک ہے بات ختم بس۔"

مہاہ نے جیسے کچھ طے کرلیا تھا۔ طلال نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ میں تھامے آئی فون کو۔

"نیا موبائل لے لیا تم نے۔۔۔ میں نے سوچا تھا تمہیں برتھ ڈے گفٹ دوں گا۔" طلال کی بات پر مہاہ کا دل اچھل کر حلق تک آیا۔

ابھی ابھی اسے ٹھنڈا کیا تھا اور یہاں پھر سے گرما گرم ٹاپک کھلنے والا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔" اس کا انداز مبہم تھا۔

جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اور سچ سننا اور برداشت کرنا طلال کے بس سے باہر کی بات تھی۔

"بہت مہنگا ہے۔۔۔"

"ہوں۔ بس کوئی اتنا خاص نہیں۔" وہ بمشکل مسکرائی۔

"اندر چلیں۔ آنٹی بور ہو رہی ہوں گی۔"

"تم نے خریدا ہے یا کسی نے گفٹ کیا ہے مہر۔۔۔؟" وہ بالکل سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔

"اوفوہ۔۔۔ اب یہ کیا پوچھنے والی بات ہے طلال۔" وہ جھنجلائی۔ در حقیقت اسے طلال کا بدلا ہوا انداز بہت چبھ رہا تھا۔

"اتنا مہنگا گفٹ کون دے گا بھلا۔" وہ اسے ٹالنا چاہ رہی تھی۔

"تمہاری بہن اور کزنز بڑی متاثر ہو رہی تھیں کچھ دیر پہلے کہ میں نے ایڈوانس برتھ ڈے گفٹ دیا ہے تمہیں اور وہ بھی اتنا قیمتی۔"

وہ تلخ اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تو مہاہ سُن رہ گئی۔

"میں نے کسی کو نہیں کہا کہ یہ تم نے مجھے دیا ہے۔" وہ بمشکل بولی۔

"یہ بھی نہیں کہا کہ یہ تمہیں موحد آفندی نے دیا ہے۔" طلال نے تلخی سے کہا۔

"ہم فیملی ہیں طلال! کزن ہے میرا۔ اگر مجھے کچھ گفٹ کرتا بھی ہے تو سو واٹ؟"

"پھر یہ کہ پرابلم چھپ کر دینے میں ہے مہاہ! تمہارے گھر میں بھی کوئی نہیں جانتا کہ یہ موبائل تمہیں کس نے گفٹ کیا ہے۔ مجھے بھی تم بتانے سے ہچکچا رہی ہو۔ تو پھر اس تعلق کو میں کس کھاتے میں ڈالوں؟" وہ تلخی سے پوچھ رہا تھا۔ اب بات کھل ہی گئی تھی تو مہاہ صاف گوئی سے بولی۔

"اگر میں تمہیں بتاتی تو تمہیں اچھا نہ لگتا طلال۔۔۔ اور جہاں تک گھر والوں کی بات ہے تو انہوں نے موبائل دیکھ کر خود ہی اندازہ لگانا شروع کر دیا کہ یہ تم ہی نے دیا ہو گا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔"

"یہی تمہاری غلطی ہے مہر۔ تم نے چھپانا کیوں چاہا موحد آفندی کو طلال کے پردے میں؟"

اس کی غلط فہمی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مہاہ کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

اسے اپنی فاش غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔

موحد اور طلال کے درمیان موجود خلیج کو پُر کیے بنا اس نے موحد کا دوستی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ غلط کیا تھا۔

"اس نے سوری کر لیا تھا مجھ سے طلال۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"یہ سوری اسے مجھ سے کہنا چاہیے تھا مہر۔ اور تم جانتی تھیں کہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگے گی پھر بھی تم نے اس کا تحفہ قبول کر لیا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا۔"

"آئم سوری طلال۔۔۔ میں اسے واپس کر دوں گی۔ یہ موبائل میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

مہاہ نے اسے یقین دلایا تو وہ لب بھینچے تیز قدموں سے چلتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔
مہاہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جی چاہا ہاتھ میں پکڑا آئی فون کسی پتھر پہ کھینچ مارے۔

☼ ☼ ☼
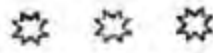
زر گل بائی کا دل دکھ گیا۔ جوان بیٹی بیوہ ہو گئی تھی۔ مگر اس کی عدت پوری ہونے تک اس کے جذبات ہی نہیں خیالات بھی بدل گئے۔

"بس کر دے زری۔ اب ختم کر یہ سوگ اور نحوست گھر سے۔" زر گل بائی نے ناک چڑھاتے ہوئے پان کی بیڑی منہ میں ڈالی اور چباتے ہوئے بولی۔

"ڈائریکٹر' پروڈیوسر انتظار کر رہے ہیں تیرا۔"

"اماں...!"

زر نگار نے سوچی نگاہوں سے خفگی سے ماں کو دیکھا۔

"ہیں... کیا اماں؟ مار وہ ڈائریکٹر تو جان کھا لے گا میری' چار ماہ سے تیرے گھر کا خرچہ پانی اٹھا رکھا ہے اس نے۔"

اس نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ کن اکھیوں سے زر نگار کی اڑتی رنگت دیکھی اور پھر واویلے میں مزید اضافہ کیا۔

"اب تک تو سود بیاج بھی چڑھا لیا ہو گا اس حرام خور نے۔ یہ لوگ بھلا کس کے سگے ہوتے ہیں۔"

"تم جانو اور تمہارا کام اماں۔ مجھے نہیں پتا تم کہاں سے لا لا کر پیسہ خرچ کرتی رہی ہو۔ میں نے تو نہیں منگوایا تم سے۔"

زر نگار نے صاف گوئی سے کہا تو زر گل بائی اپنی رونے کی اداکاری بھول کر چمک کر بولی۔

"اوہو... تو چار ماہ سے تجھے اور تیرے بیٹے کو کیا اپنی ران کی بوٹیاں کھلا رہی ہوں میں۔ یا وہ تیرا فقتا میاں دمڑیاں دبا گیا تھا صحن میں۔" زر نگار تڑپی۔

"اماں... کوئی ایسے یاد کرتا ہے مرنے والوں کو۔"

"ایسے ویسوں کو ایسے ہی یاد کیا جاتا ہے۔" وہ طنزاً بولی۔ تو زر نگار نے عزم سے کہا۔

"جو کام میں نے وقار کی زندگی میں نہیں کیا اماں' وہ اس کے بعد بھی نہیں کروں گی۔ حرام کر گیا ہے وہ مجھ پر۔ اس بارے میں سوچنا بھی نہیں۔"

"اوئی ماں..." زر گل بائی نے مارے تحیر کے ہونٹ پر انگلی رکھی۔

"اے میں کہوں... کون سا خزانہ دبا پڑا ہے تیرے گنے... جس کے بل پہ اتنا اکڑ رہی ہے کہ حلال' حرام کا فرق نظر آنے لگا تجھے۔"

"وہ تو اس کی زندگی میں ہی نظر آنے لگا تھا اماں۔ بس شیطان بہکاتا رہتا تھا۔ اب وہ نہیں ہے تو احساس ہونے لگا ہے کہ میں کتنی آسانی سے حرام کمانے کی راہ پر نکل سکتی ہوں... اس خیال نے ہی لرزا کے رکھا ہوا ہے مجھے۔"

"مرتے ہوئے کے لیے کیا حرام اور کیا حلال۔ تجھ پر سب واجب ہے زری۔ معصوم یتیم بچے کی پرورش کرنی ہے تو نے۔"

زر گل نے مسکین اور ہمدردانہ شکل بنائی۔ تو زر نگار نے جھرجھری سی لی۔

"مت بہکاؤ مجھے اماں۔ پہلے ہی اسی کشمکش میں پڑ کے بہت بڑا نقصان کر بیٹھی ہوں میں۔" وہ آزردہ تھی۔

مگر زر گل بائی کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ اس کے بڑھاپے کا سہارا ایک بار پھر اس کی تحویل میں آ سکتا

تھا اگر زرنگار اپنے دماغ پر لگے زنگ کو اتار دیتی تو۔
"تو میں کون سا غلط کام کروانے لگی ہوں تم سے۔ گانے کے پیسے دے گا ڈائریکٹر بس اور تمہارے بھلے کی ہی بات ہے۔ اس یتیم کا مستقبل بھی سنور جائے گا۔"
وہ برا مان کر بولی۔ تو زرنگار نے سنجیدگی سے ماں کو دیکھا۔
"اگر تم واقعی اس "یتیم بچے" کا مستقبل سنوارنا چاہتی ہو اماں تو مجھے خود پر لگا طوائف کا ٹھپہ اتار لینے دو۔ میں ایک بیٹے کی ماں ہوں اماں۔ اسے کوٹھے پر نہیں بٹھانا میں نے بلکہ زندگی کی مشینری کا ایک کار آمد پرزہ بنانا ہے اور اس کے لیے حرام کی نہیں حلال کی کمائی کام آئے گی۔"
"باتوں سے پیٹ نہیں بھرا کرتے زرنگار۔"
وہ کھرے انداز میں بولی تو زرنگار افسردگی سے مسکرا دی۔
"جانتی ہوں اماں۔۔۔ مگر اب زرنگار پرانی راہوں کو بھول چکی ہے۔ تم بھی بار بار اس کی راہ کھوٹی کرنے مت آؤ۔"

"اری پاگل۔ سٹھیا گئی ہے کیا؟ کون سا من و سلویٰ اترے گا تیرے گھر میں، جو حلال کر کے تو اور تیرا بیٹا کھائیں گے۔ ذرا میں بھی تو سنوں؟" زرگل جھنجلائی تھی۔
"میں وقار کے بھائی کو فون کروں گی اماں۔ انہیں سارے حالات بتاؤں گی۔ ان کا بڑا پیار تھا وقار سے۔"
زرنگار کی آواز بھرانے لگی۔
زرگل بائی نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"درد سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تیرا وقار آفندی۔۔۔ کوئی پیار کرنے والا نہ آیا اس کا علاج کروانے۔ ہنہ بھائی۔"
"وہ الگ معاملہ تھا اماں۔۔۔ مرحوم جانے اور اس کے گھر والے۔ مگر میں ایک کوشش ضرور کروں گی اپنے بیٹے کو اس کا جائز حق دلوانے کی۔"
اس نے مصمم ارادہ ظاہر کیا تھا۔
زرگل بائی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں تاسف بھی تھا اور ترحم بھی۔

☆ ☆ ☆
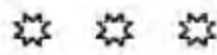
آفندی ہاؤس میں محض وقار کی موت کی خبر کا فون آیا اور ایک کہرام مچ گیا۔ آغا جان جو ابھی تک انا کے اونچے تخت پر چڑھے بیٹھے تھے۔ ان کے سینے میں دراڑیں پڑ گئیں۔
ان کا لاڈلا۔۔۔ ماں کا سب سے پیارا بیٹا۔۔۔ جان سے چلا گیا تھا۔ ناراض ہو کر گھر سے گیا۔۔۔ اور پھر دنیا سے ہی چلا گیا۔ فاران آفندی نے فی الفور زرنگار سے رابطہ کیا۔
گھر کی حالت۔۔۔ مکینوں کی کسمپرسی چیخ چیخ کے بیان کرتی تھی۔ وہ بھتیجے کو گلے لگا کر اونچی آواز میں رو پڑے۔
آغا جان کو بتایا تو وہ سُن سے ہو گئے۔
"اس حرام خور۔۔۔ کوٹھے والی نے ایسے کیسے دفنا دیا میرے بیٹے کو؟"
"بابا جان۔۔۔ بہو ہے آپ کی۔ بہت پیارا پوتا ہے آپ کا۔" فاران نے بھاری ہوتی آواز میں ان کے ذہن کو دوسری طرف لگانے کی سعی کی۔ مگر ان کی زرنگار سے نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ وقار آفندی کی موت کی خبر نہ دینا اس کا گناہ بن گیا تھا۔

"آپ مجھے ہی بتا دیتیں... آخری ملاقات ہی کر لیتے۔ شکل دیکھ لیتے اس کی۔" فاران نے دکھی دل کے ساتھ زرنگار سے شکوہ کیا تھا۔

"ہنہ... زندہ کی شکل دیکھنا تو گوارہ نہ تھی کسی کو بھائی صاحب۔ مجھے کیا خبر اسے مرے ہوئے دیکھنے کی آپ لوگوں کو آرزو ہوگی۔" دکھ سے بلبلاتی بین کرتی آواز۔ فاران آفندی کو لگا ان کا سینہ چر گیا ہے۔

"میرا کچھ غلط ارادہ نہ تھا بخدا۔ میں جانتی تھی آغا جان کو ذرا سی بھی بھنک پڑی تو وہ میرے وقار کی میت اٹھوا کر لے جائیں گے۔ اور مجھے وہاں داخل بھی نہیں ہونے دیا جائے گا۔" وہ ایک لحاظ سے صحیح کہہ رہی تھی۔

اب زیادتی کس کے ساتھ ہوئی' یہ فیصلہ کون کرتا؟ اپنی اپنی جگہ دونوں فریق درست تھے۔

فاران آفندی نے اپنا پورا زور لگالیا مگر آغا جان اپنی ضد سے ایک انچ نہیں ہٹے تھے۔

"اب اس گھر میں ناچنے گانے والیاں آکر بسیں گی؟"

صدیقہ بھابھی اس معاملے میں آغا جان کی گویا دست راست تھیں ماں جی بیمار ہوئیں اور وقار کا غم سینے میں لیے دنوں میں چٹ پٹ ہو گئیں۔

"آغا جان کی ضد لے گئی ماں جی کو..." ثمو نے دبے لفظوں کہا تھا مگر آغا جان کا دل مزید پتھر ہو گیا۔

"اس خبیث عورت کی وجہ سے میرے گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ تباہی مچ گئی۔ میری زندگی میں وہ کبھی بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔" انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

فاران آفندی نے اپنا پورا زور لگالیا۔ دلائل کی ساری گٹھڑی ان کے سامنے کھول دی۔ مگر ان کی نہ' ہاں میں نہیں بدل سکی۔

کچھ لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے کیونکہ وہ حقیقت کو دلائل کے باوجود تسلیم نہیں کرتے۔ نشانیاں ظاہر ہونے کے باوجود وہ منکر رہتے ہیں۔

آغا جان کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

بیٹے اور بیوی کی موت نے ان کا دل نرم کرنے کے بجائے مزید سخت کر دیا تھا اور وہ زرنگار سے اور متنفر ہو گئے تھے۔ ان کے خیال میں وہی عورت ان کے گھر کی تباہی کا باعث تھی۔

ثمو سے مشورے کے بعد فاران آفندی نے زرنگار کو ماہانہ خرچ بھجوانا شروع کر دیا۔ نمیر کے ساتھ ان کا لگاؤ فطری اور بے پناہ تھا۔

"زرنگار کو آغا جان کے سامنے آنا چاہیے فاران۔ ایسے ساری عمر بے نام تو نہیں رہ سکتی نا وہ... اور نہ ہی اس کا بچہ۔ خاندان انسان کی پہچان ہوا کرتا ہے۔" ثمو نے فاران کو نئی راہ دکھائی۔

"آغا جان تو اسے دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ کہاں اس کا اس گھر میں دعوے سے آنا۔" فاران مایوس تھے۔

"پوتے کو دیکھ کر بھی ان کا دل نہ پگھلے گا فاران۔ کتنا خوب صورت بچہ ہے وقار کا۔" وہ جوش سے بولی۔

مگر فاران کو آغا جان سے کسی نرمی کی امید نہ تھی۔ ابھی تک ایک بار بھی انہوں نے نمیر آفندی سے ملنے کا شوق ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ آفندی ہاؤس میں زرنگار کا تذکرہ کرنا ہی منع تھا۔

☆ ☆ ☆

"موحد... کہاں ہوتے ہو تم؟ مجھے تو لگتا ہے جناب سے ملنے کے لیے مجھے بھی اپائنٹمنٹ لینی پڑے گی۔" ثمو نے خفگی سے کہتے ہوئے اس کے تہ کیے ہوئے کپڑے بستر پر پٹخے۔

"ارے... رے..." وہ بوکھلا کر ان کی طرف آیا۔ فوراً ان کے شانے پر بازو پھیلا لیا۔

"اتنی ہی۔۔ ناراضی؟"

"اس سے بھی زیادہ ہے۔" وہ سنجیدہ تھیں۔ "یہاں آکر تو ہم ایک دوسرے سے دور ہوگئے ہیں۔"

"اچھا سوری۔۔ بلکہ سو سوری۔" اس نے ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑا تھا۔ پھر انہیں اپنے بستر پر بٹھایا۔ کرسی گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھا۔

"اب بولیں۔۔ بلکہ جتنا ڈانٹنا ہے ڈانٹ لیں۔"

"ڈانٹنا نہیں ہے شہزادے۔ بات کرنی ہے ضروری۔" وہ پیار سے اس کا رخسار چھو کر بولیں۔ "مگر تم دستیاب ہی نہیں ہو رہے۔"

"حکم کریں ماما۔" وہ فرمانبردار بنا بیٹھا تھا۔ اور ایسے موقع پر ثمرہ کی آنکھ کا کونا ہمیشہ نم ہو جایا کرتا تھا۔

"حکم نہیں۔۔ ڈسکشن کرنی ہے۔" وہ قصداً" مسکرائیں۔

"جی۔۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" اس نے خود کو مزید متوجہ ظاہر کیا۔ ثمرہ کو اس پر پیار آیا۔

"سومیہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" آگے جھک کر ان کی بات سنجیدگی سے سنتا موحد جیسے کراہ کر سیدھا ہوا۔ بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آر یو سیریس ماما۔۔؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔ ثمرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آر یو شیور کہ آپ مجھ سے اسی "ضروری" ٹاپک پر بات کرنا چاہ رہی تھیں؟" اس نے پھر پوچھا۔ جیسے یقین نہ ہو کہ ثمرہ یہ سوال اس سے کر سکتی ہیں۔

"کیا بکواس ہے یہ موحد۔" اب کی بار وہ ضبط کرتے ہوئے بھی ہنس دیں۔

"اتنی اچھی دوست ہے تمہاری۔ پسند بھی کرتی ہے تمہیں۔"

"اور آپ کیا چاہتی ہیں وہ مجھے پسند کرنا بند کر دے؟" وہ سنجیدہ تھا۔

"دوست اچھی بیوی ثابت ہوتی ہے موحد۔" ثمرہ نے ناصحانہ انداز میں کہا تھا۔

"جبکہ میرا خیال آپ کے خیال کے الٹ ہے ماما۔ بیوی بن کر وہ دوستی بھی جاتی رہتی ہے۔" وہ لقمہ دیتے ہوئے بولا۔

"تم اپنے کڑوے کریلے جیسے لقمے دینا بند نہیں کر سکتے؟" ثمرہ نے تحمل سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ بھی تو مذاق ختم نہیں کر رہیں۔"

"میں سیریس ہوں موحد۔ مجھے تمہارے لیے سومیہ بہت پسند ہے۔"

"مگر میں اسے اس لحاظ سے پسند نہیں کرتا ماما۔" اب کی بار موحد کا جواب بہت صاف اور کھرا تھا۔

"میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں موحد۔۔ مہراہ سے پہلے۔" ثمرہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بیساختہ بولا۔

"مہراہ سے پہلے۔۔؟ مہراہ کے ساتھ کیوں نہیں؟" ثمرہ کے ارد گرد کوئی دھماکا سا ہوا تھا۔ ان کی شکل دیکھ کر موحد قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جب مہراہ کی ہوگی تب کیوں نہیں۔ ایک ساتھ — دو شادیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک ہی گھر میں۔" ثمرہ کی سانس میں سانس آئی۔

"وہ صدیقہ بھابی کی بیٹی ہے۔ ان ہی کی طرح زبان دراز اور بے حس۔" موحد کو وہ لڑاکا بلی یاد آئی۔ جس کی رنگت گلابی اور بال سیاہ تھے۔

"سومیہ اچھی ہے موحد۔ اس کے بارے میں سوچو۔"

"وہ واقعی اچھی ہے ماما۔ میں اس بارے میں سوچ چکا ہوں۔ مگر آئم سوری۔ مجھے ابھی شادی کرنی ہی نہیں۔"
"تو جب تک شادی نہیں کر رہے، سومیہ کے بارے میں سوچتے رہو۔ پھر تمہیں احساس ہو گا کہ وہ تمہیں کتنا پسند کرتی ہے۔" ثمرہ نے مشورہ دیا۔
"اب میں بھی بیسیوں لوگوں کو پسند کرتا ہوں ماما۔ سب کے ساتھ شادی تو نہیں کر سکتا نا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"سنجیدہ ہو جاؤ موحد۔"
"او کے مام۔" اس نے انہیں سیلوٹ کیا۔
"میں ایک ہفتہ دے رہی ہوں تمہیں خوب سوچ بچار کر لو۔" وہ جانے کے لیے اٹھیں۔
"اور جواب آپ کو یقیناً "ہاں" میں چاہیے ہو گا؟"
اس نے ہلکا پھلکا طنز کیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ موحد آفندی کی نگاہوں میں سوچ کی پرچھائیاں اترنے لگیں۔

☼ ☼ ☼
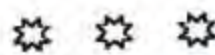
سلور گرے لینڈ کروزر پورچ میں آ کر رکی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد ہما ڈینٹ سا بندہ نیچے اترا۔ فرزین الٹے پیروں اندر کی طرف بھاگی۔
"الٰہی خیر۔ کیوں زلزلہ لانے کے درپے ہو؟" ملاحہ نے نوٹس سمیٹتے ہوئے پھولی سانسیں لیے بھاگ کر آتی فرزین کو گھورا۔
"زلزلہ آ نہیں رہا۔ زلزلہ آ چکا ہے۔ ادھر۔ لینڈ کروزر کھڑی ہے پورچ میں۔" اس نے سانس درست کرتے ہوئے شوخی سے بتایا تو ملاحہ کا ہاتھ بے اختیار اپنے دل پر گیا۔
اس نے بے یقینی سے فرزین کو دیکھا۔
"کبیر۔۔۔؟"
فرزین نے اثبات میں سر ہلایا تو ملاحہ کی آنکھوں میں ستارے سے اُتر آئے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ماورا خان

"کیا آپ زندگی کے اس سفر میں میرا ساتھ دیں گی علینہ سرفراز!" شارق احمد کے کیے گئے بظاہر اس سادہ سے سوال نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا۔ بہت دور کئی سال پیچھے دھکیل دیا ہے، جب میں بہت چھوٹی تھی سترہ اٹھارہ سال کی، تمہاری نظر میں بے وقوف بچہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ، بہت آسان ہوتا تھا تمہارے لیے، کسی کی دل آزاری کرنا، یہ سوچے بغیر کہ دوسرے کے بھی کچھ احساسات ہوسکتے ہیں۔

سوچتے سوچتے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور ماضی کی گہرائیوں میں کھو گئی۔

جب وہ ایک شوخ و چنچل اور شرارتی سی لڑکی تھی، نہ گزرے ہوئے کل کا غم تھا نہ آنے والی کل کی فکر، بڑے بھائیوں اور ماں باپ کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی، جب کھل کھلا کر ہنستی تھی تو گویا چہرے پر گلاب کھل اٹھتے تھے، اپنے بچپن کی دوست سارا کے ساتھ، جب دونوں لان میں سائیکل چلایا کرتی تھیں اور کبھی کبھی گیٹ سے باہر بھی نکل جاتی تھیں تو امی کی ڈانٹ سننا پڑتی کہ "خدا کا خوف کرو اب تم بچی نہیں ہو۔" لیکن پھر بھی ہم نگاہ بچا کر نکل ہی جاتے تھے۔

"سارا!" میں سارا سے مخاطب ہوتی۔ "یہ بھی خوب ہے کہ جب اپنی مرضی کرو تو تم بچی نہیں ہو اور گھر کے کاموں میں دل لگاؤ بڑی ہو گئی ہو اور جہاں کسی بات میں بولے تو پھر فوراً "چپ کرا دیا جاتا ہے کہ بچے نہیں بولتے بڑوں کی باتوں میں۔" میں بڑبڑاتی رہتی اور سارا ہنستی رہتی میری باتوں پر۔

ہمارے گھر سے دو گھر چھوڑ کر ایک بڑا خوبصورت سا بنگلہ تھا جس کا گیٹ ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا، لیکن آج جب میں اور سارا ایک دوسرے کے پیچھے سائیکلنگ کرتے ہوئے تیزی سے گزر رہے تھے تو ایک دم میرے پیر بریک پر تھم گئے۔ میرے پیچھے سارا گرتے گرتے بچی۔

"توبہ ہے علینہ! یہ کیا حرکت ہے؟ چلتے چلتے ایک دم رک گئیں اور یہ کیا حرکت کر رہی ہو، کسی کے گھر میں جھانکنا کتنی بری بات ہے۔"

مجھے تو جیسے سارا کی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی تھی اور میں کھلے ہوئے سیاہ گیٹ کے اندر کھڑی کرولا کے اندر بیٹھتے ہوئے ڈیشنگ اور اسمارٹ سے شخص کو دیکھے جا رہی تھی۔

"میں تو اسے بھوت بنگلہ سمجھ رہی تھی، یہاں تو لوگ رہتے ہیں۔"

اور پھر یہ ہمارا معمول بن گیا کہ کالج سے آتے جاتے بنگلے کا جائزہ ضرور لیتے تھے۔

میں اور سارا لان میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

"سارا! تم نے دیکھا یہ کتنا ہینڈسم شخص ہے، میں تو حیران ہوں بالکل ہیرو کی طرح۔"

"بس بس۔" سارا جل کر بولی "ایک تو ہر ایرے غیرے کو دیکھ کر تمہارا تبصرہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

"اور تم! پتا نہیں کس دنیا کی باسی ہو، لگتا ہے دل نہیں ہے تمہارے سینے میں۔"

دن گزرتے گئے ہم اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ پتا نہیں کیوں میں جب بھی تمہارے گھر کے سامنے سے گزرتی تو گویا ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتی تھی۔

امتحان سر پر تھے اور پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگ

رہا تھا۔ امی جوس نکال نکال کر پلاتیں کہ "میری بچی کمزور ہو گئی ہے پڑھ پڑھ کر۔" سارا اور میں اکٹھے مل کر تیاری کیا کرتے تھے۔ سارا بالکل ہمارے گھر کے فرد کی طرح تھی۔ اس طرح دن گزرتے گئے اور میں سیکنڈ ایئر میں آگئی ان ہی دنوں میں جب میں اور سارا شاپنگ کر کے آئے تو لان میں بھائی جان کے ساتھ اس ڈیشنگ سے شخص کو دیکھ کر تو جانو مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ گر پڑے اگر سارا نہ سنبھال لیتی تو میں تو گر گئی ہوتی' کچھ چل کر اور کچھ بھاگ کر ہم دونوں نے لان عبور کیا تو امی ہماری بوکھلائی ہوئی حالت دیکھ کر پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

"وہ۔۔۔ وہ امی لوہ بھائی جان کے ساتھ لان میں کون ہے؟" میں نے پھولی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

"فرحان (بھائی جان) کا کوئی اسکول کے زمانے کا دوست ہے' یہیں ہمارے گھر کے قریب ہی گھر لیا ہے انہوں نے' فرحان سے ملاقات ہوئی تو ملنے چلے آئے' لیکن تم کیوں پریشان ہو؟" امی نے ساری تفصیل بتاتے ہوئے پوچھا۔

"ایسے ہی امی' میں تو بس یونہی پوچھ رہی تھی۔" اور یہ جان کر کہ تم بھائی جان کے بچپن کے دوست ہو مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا کہ بھائی جان تمہارے گھر یا تم ہمارے گھر۔ اور تو اور امی ابو اور چھوٹے بھیا سے بھی تمہاری خوب نبھ رہی تھی' بس ایک میں ہی تھی جو دور دور سے تمہیں دیکھتی رہتی تھی یا کبھی کبھی جب چائے سرو کرتی تو تم ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈال لیتے تھے اور مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر لے آتے' پھر مجھے پتا چلا کہ تمہارا نام شارق ہے' شارق احمد' حال ہی میں تمہارا اس شہر میں ٹرانسفر ہوا ہے اور تم کالج میں پڑھاتے ہو' ڈاکٹریٹ کی تھی تم نے' امی ابو کا انتقال ہو چکا ہے صرف ایک بڑی بہن ہیں جو اسٹیٹ میں رہتی ہیں' مجھے تمہارے اکیلے پن پر واقعی بڑا رحم آیا۔

میں اکثر سارا سے تمہارا ذکر کرتی بلکہ ہماری گفتگو کا زیادہ تر موضوع تم ہی ہوتے تھے۔ کتنی اچھی تھی تمہاری پرسنالٹی' عجیب سا سحر تھا تمہاری شخصیت میں۔

"توبہ کرو' وہ بھائی جان کے دوست ہیں' تمہارے لیے لائق احترام۔" سارا مجھے چھیڑتی۔

"تو میں کیا کہہ رہی ہوں۔ عزت کرتی ہوں ان کی۔" میرے جواب پر سارا چپ ہو جاتی۔

ہمارے لان میں ایک طرف آسٹریلین طوطوں کا پنجرہ تھا میں اور سارا انہیں دانہ ڈال رہے تھے اور کسی بات پر ہنستے بھی جا رہے تھے' تم فرحان بھائی کے ساتھ اندر آ رہے تھے' مسکرا کر ہمیں دیکھنے لگے اور میں تمہیں اس طرح دیکھ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور تم

میری اس حرکت پر تو کھلا گئے۔

ایک دم بھائی جان سے مخاطب ہوئے کہ۔ "علینہ کے مزاج میں بچپنا بہت ہے۔" "مجھے بڑا عجیب سا لگا تمہارا یہ بہو اور پھر اسی طرح آتے جاتے ملتے جلتے' چائے پیتے ہوئے تم اکثر مجھے۔ "ہائے بے بی" کہتے تو میں اندر تک سے جل جاتی ہوں۔ پتا نہیں کوئی بوڑھی روح سمائی ہوئی ہے تمہارے اندر' میں تمہیں بچہ لگتی ہوں۔" میں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔

ایک دن ہم لان کی سیڑھیوں پر بیٹھے اپنی دوستوں کی باتیں کر رہے تھے کہ یکدم سے تمہارا خیال دل میں آ گیا۔

"یہ شارق احمد مجھے بالکل لفٹ نہیں کراتے۔"

"ظاہر ہے فرحان بھائی کے دوست ہیں' تمہیں بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کریں گے نا۔" اور میں دوست ہوتے ہوئے بھی سارا کو یہ نہ بتا سکی کہ میں تمہیں اپنے دل میں بہت اونچی جگہ بٹھا چکی ہوں۔

اگر کبھی تم مسکرا کر مجھ سے بات کر لیتے تھے تو گویا وہ لمحات میرے لیے کسی خزانے سے کم نہ ہوتے تھے۔

ہمارے سیکنڈ ایئر کے ایگزامز کے بعد امی ابو تو بڑے ابا کے پاس یو کے چلے گئے۔ امی نے مجھے بہت لے جانا چاہا لیکن میری ایک ہی ضد تھی کہ ابھی نہیں جاؤں گی آپ ہو کر آجائیں۔

امی ابو کے جانے کے بعد تو فرحان بھائی اور تمہاری محفلیں زیادہ ہی جمنے لگیں۔ تم کالج کے بعد اکثر ہمارے ہاں نظر آتے' پھر کافی دن ہو گئے تم دکھائی ہی نہیں دیے۔ بڑے بھائی جان سے پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

ایک دن یونہی سارا کے گھر سے آتے ہوئے تمہارے گھر کے گیٹ پر نظر پڑی تو کھلا ہوا دیکھا' پتا نہیں مجھے کیا ہوا' بے سوچے سمجھے اندر چلی گئی۔ اتنا خوب صورت لان اور پھر کوریڈور سے گزرتے ہوئے' آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر آئی تو کرصفائی کر رہا تھا تو سامنے سے تم آگئے' تمہارے چہرے پر پھیلی ہوئی بیزاری کی لکیریں صاف نظر آرہی تھیں' ماتھے پر پڑے بل اور پھر تمہارا چہرہ اک دم غصے سے لال ہو گیا۔

"یہ کیا۔۔۔ میں حیران ہو کر تمہیں دیکھ رہی تھی کہ مجھے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے تمہیں برا لگ رہا تھا میرا آنا۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" نہایت خشک لہجے میں گویا ہوئے۔

"گھر جائیے۔" اور میں ایک دم سے اس صورت حال سے پریشان' منہ سے ایک لفظ نہ نکل پایا۔

"جی۔۔۔ وہ میں ایسے ہی یہاں سے گزر رہی تھی تو گیٹ کھلا دیکھا تو آ گئی۔"

"بہت خوب۔" تم استہزائیہ انداز میں بولے۔ "کسی کا بھی گیٹ کھلا ہوا دیکھیں گی آپ تو اندر چلی جائیں گی؟" میں تمہارا یہ روپ دیکھ کر پریشان ہو گئی' آنکھیں ایک دم بھر آئیں' خود پر قابو نہیں رہا۔ الٹے قدموں گھر کی طرف بھاگی اور سیدھی اپنے کمرے میں آکر ٹھہری' یا اللہ اتنی بے عزتی' کیا بگاڑا تھا میں نے ان کا' ذرا بھی تو لحاظ نہیں کیا۔

اور اپنی اس خاطر پر جو تمہارے گھر جا کر ہوئی میں دنوں اداس رہی۔

پھر موقع پاتے ہی سارا سے دل کی بھڑاس نکالنی چاہی۔

"سنو سارا!"

"ہوں۔" بالوں میں کلپ لگاتے ہوئے سارا نے جواب دیا۔

"یہ بتاؤ کیا میں بہت بری لگتی ہوں؟"

"کیا مطلب؟" سارا واقعی نہیں سمجھی۔

"وہ۔۔۔ وہ بھائی جان کے دوست ہیں نا! پتا نہیں کیوں مجھے اچھا نہیں سمجھتے' بات بھی ٹھیک طرح سے نہیں کرتے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" سارا نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ایسے ہی بس' میں نے اندازہ لگایا ہے۔" اور اس دن کی اپنی بے عزتی ہونے کی بات گول کر گئی' کیوں کہ مجھے پتا تھا کہ سارا یہ بات جا کر ضرور امی سے کہہ دے

کی یا شاید میری انا اور خودداری آڑے آ رہی تھی، سارا بھی بڑی تیز تھی فوراً "تاڑ" گئی۔

"سچ بتاؤ؟ تم نے ان سے کچھ کہا تھا کیا؟" بھلا وہ کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی اور پھر میں ہار گئی۔ دل جو بھر آیا تھا اس واقعے کی وجہ سے، ساری بات سارا کو سنا دی اور وہ میری اس بات پر حیرانی سے مجھے دیکھے گئی پھر ایک دم بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں چائے وائے دینے کی اور تم ان سے ریزرو رہا کرو۔" اور پھر واقعی میں ان سے ریزرو ہی رہنے لگی بلکہ کوشش کرتی کہ اگر سامنا ہو جائے تو ان کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہ دیکھوں، میرے اس خفا خفا سے رویے کو بھی تم نے اہمیت نہ دی بلکہ تم نے آنا بھی کم کر دیا۔ پھر سنا کہ آج کل تم پروفیسر حنا کے ساتھ بہت دیکھے جا رہے ہو، یہ خبر سارا کی بہن فضہ نے دی جو تمہاری یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اسی نے بتایا کہ ڈاکٹر شارق کا میڈم حنا سے افیئر چل رہا ہے، اسٹوڈنٹس کو تو ایسی باتوں کی کھوج رہتی ہے جہاں کسی ٹیچر کی کسی میل ٹیچر سے فرینڈشپ دیکھی اور رائی کا پہاڑ بنا دیا اور تمہارا تو واقعی پہاڑ نکلا۔

"ان کی خاص فرینڈشپ ہے میڈم حنا سے۔ لگتا ہے شادی کر رہے ہیں ان سے۔" فضہ بولے جا رہی تھی، یہ سوچے بغیر کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے پھر میں رکی نہیں اور دل پر ایک عجیب سا بوجھ لے کر گھر آ گئی۔

اس بات کو کافی مہینے گزر گئے، ابو اور امی واپس آ گئے تھے، امی ایک دن پوچھ ہی بیٹھیں۔

"یہ تمہیں آج کل کیا ہو گیا ہے نہ کھانا ٹھیک سے کھاتی ہو اور نہ کہیں آؤٹنگ کی ضد کرتی ہو، ہر وقت کمرے میں بند۔ چلو اٹھو، چینج کرو، سارا بھی آئی تھی، تمہیں پوچھ کر چلی گئی۔ تم سو رہی تھیں۔"

اب کیا بتاتی امی کو کہ ان کی لاڈلی کو عشق ہو گیا ہے، وہ بھی یک طرفہ۔۔۔ اگلے دن میں اور سارا برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ سارا میرے چپ رہنے سے بور ہونے لگتی تھی، وہ میری واحد ہمراز تھی۔

"یار علینہ! اب بس بھی کرو، کب تک لوگوں کو مناؤ گی، یہ انکل ٹائپ لوگ ہوتے ہیں نا ایسے ہی ہوتے ہیں، خشک اور رومانس لیس۔" اس اصطلاح پر میری ہنسی نکل گئی۔ "سنو! لان کا سمر کلیکشن آیا ہے، چلیں؟"

"نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

"ارے ہاں!" سارا چیخی۔ "یاد آیا، کل فضہ کی یونیورسٹی میں فنکشن ہے فضہ کہہ رہی تھی علینہ کو بھی لے آنا۔ خوب انجوائے کریں گے، کنسرٹ ہے۔ بڑے بڑے گلوکار آ رہے ہیں۔" اور مجھے۔۔۔ ایسا لگا کہ جیسے ڈوبتے کو امید کی کوئی کرن ہاتھ آ گئی یا شاید تمہیں پروفیسر حنا کے ساتھ دیکھنے کا شوق ہو رہا تھا یا تمہیں دیکھے کافی دن بیت گئے تھے، بہرحال جو بھی تھا میں نے فوراً "ہاں" بھر لی امی نے جو کافی دن بعد میرے چہرے پر رونق دیکھی تو جھٹ جانے کی اجازت دے ڈالی۔

ادھر ابو نے تایا ابو کے ساتھ یوکے میں اپنا بزنس سیٹ کر لیا تھا۔ فرحان بھائی بھابی اور بچوں نے ساتھ یوکے جا رہے تھے، چھوٹے بھیا کے ایگزامز ہو رہے تھے، دن بڑے بور گزر رہے تھے کہ ایسے میں یونیورسٹی کے فنکشن میں انوائیٹ کیا جانا بڑا اچھا لگا۔

یونیورسٹی میں بہت رش تھا، سارا میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتے ہوئے لے جا رہی تھی۔

"کیا ہے چھوڑو بھی۔۔۔" ابھی میرا جملہ منہ میں ہی تھا کہ سامنے سے تم اور حنا آتے ہوئے نظر آئے۔ لگ رہا تھا کافی بے تکلفی ہے دونوں میں، تم مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے اور پھر میڈم حنا تمہاری کسی بات پر زور سے قہقہہ مار کر ہنسی تھیں۔ مجھے ان سے جیلسی محسوس ہوئی، یک لخت مجھے سامنے دیکھ کر تم ٹھٹکے یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوا تھا لیکن اگلے ہی لمحے تم یوں پاس سے گزر گئے گویا جانتے ہی نہ تھے اور اپنے اس بری طرح اگنور کیے جانے پر عجیب سی شرمندگی محسوس ہوئی، کم از کم بات ہی کر لیتے یا حنا سے میرے دوست کی بہن کہہ کر تعارف ہی کروا دیتے یا کچھ نہیں

تو صرف میری طرف دیکھ کر مسکرا ہی دیتے' لیکن تم نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا شارق احمد! تمہاری آنکھوں میں شناسائی کی لہر تک نہ آئی' سارا نے ہلکے سے میرا ہاتھ دبایا جیسے تمہارے اس سلوک پر مجھے تسلی دے رہی ہو' پھر میں وہاں رکی نہیں فورا" سر درد کا بہانہ کر کے سارا کے ساتھ گھر آ گئی' میری وجہ سے سارا کا پروگرام بھی خراب ہوا۔

پھر فضہ کی زبانی ہی پتا چلا کہ تم حنا کے ساتھ چھٹیوں پر گئے ہوئے ہو اور یہ کہ شادی کر رہے ہو۔ اب میں تمہارے لیے صبر کر چکی تھی اور تمہیں بھولنے کی ناکام کوششوں میں لگ گئی۔

تم تعطیلات سے واپس آئے تو تمہارے ساتھ حنا نہیں تھیں' فضہ سے ہی پتا چلا کہ وہ کویت چلی گئی ہیں۔ اپنے پیرنٹس کے پاس۔

بقول اسٹوڈنٹس کے کہ "شاید دونوں میں بنی نہیں' بریک اپ ہو گیا ہے۔"

"ظاہر ہے' ایسے خشک آدمی کے ساتھ کون رہ سکتا ہے۔" میں بڑبڑائی۔

"کیا؟" فضہ بولی۔

"کچھ نہیں' میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی ہوں۔"

ان ہی دنوں جب ابو آئے ہوئے تھے تو میں ابو کے ساتھ گھر کی کچھ چیزیں لینے جا رہی تھی۔ تم گاڑی اندر لے جا رہے تھے' فورا" روک کر اترے' ابو نے بھی گاڑی روکی' اترے۔ تم بڑے تپاک سے ابو سے مل رہے تھے' سب کی خیریت پوچھ رہے تھے اور فرحان بھائی کے آنے کے بارے میں' ابو بھی بڑی دلچسپی سے تمہیں تفصیلات بتا رہے تھے اور میں گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس شخص کے کتنے روپ ہیں اور حنا کے کیس کے بعد تو میں تمہاری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے آپ کو تمہارے خلاف کرتی رہی اور تب چونکی جب ابو نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر تمہاری تعریف میں کچھ کہا۔

"ہونہہ۔" ابو کو ان کی حقیقت کا کیا پتا' میرے دل میں ایک عجیب سی خلش رہتی تھی۔ تمہارے لیے

نیگیٹو فیلنگ کے باوجود تمہیں دل سے نکال نہیں پاتی تھی۔ پھر بہت سارے دن' مہینے سال ایسے گزر گئے جیسے زندگی میں آئے ہی نہ تھے' امی کا پریشر میرے اوپر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"شادی کر لو علینہ' تمہارے ابو کے بہت اچھے جاننے والے ہیں' لڑکا دبئی میں ڈاکٹر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود انہوں نے کہا ہے تمہارے لیے' اب اگر تم نے ہمارا کہنا نہیں مانا تو تم جانو اور تمہاری زندگی' ساری عمر تو تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے ہم۔"

سارا کی شادی ہوئے بھی پانچ سال گزر گئے تھے' اس کے دو بچے بھی ہو گئے' وہ جب بھی آتی میری شادی کے لیے زور دیتی اور میں ٹال جاتی۔

بڑے بھائی کو UK کی آب و ہوا راس نہیں آئی لہٰذا مع فیملی پاکستان واپس آ گئے' چھوٹے بھیا نے ایم بی اے کے بعد ابو کا بزنس سنبھال لیا تھا' وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ سیٹ ہو گئے۔ امی میرے لیے بہت فکر مند رہنے لگی تھیں لیکن میں کیا کرتی؟ تمہارے بعد آنکھوں میں کوئی بچا ہی نہیں۔ میرے ساتھ تمہارا سلوک' بیزاری' اس کے باوجود پتا نہیں کب اور کیسے تم دل میں کھب گئے تھے اور میں اپنی انا کے خول میں بند فرحان بھائی سے تمہارے بارے میں کبھی پوچھ بھی نہ سکی اور پھر پوچھ لینے سے حاصل بھی کیا ہو جاتا۔

پھر آہستہ آہستہ میں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ بھائی جان کے توسط سے مجھے بڑی اچھی جاب کی آفر ہوئی جسے میں نے فورا" قبول کر لیا حالانکہ چھوٹے بھیا نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ آفس آ جایا کرو تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔ لیکن مجھے تو جیسے مشکلات اچھی لگتی تھیں' جبکہ امی بھی کافی ناراض ہوئیں کہ فرحان کو میرا بالکل خیال نہیں ہے اور مجھے پیار میں سب نے بگاڑ دیا ہے۔ زندگی ایک نئے رخ پر چل پڑی تھی۔

بڑے بھائی اور بھابی باتیں کر رہے تھے۔ میں کافی بنا رہی تھی کہ مجھے تمہارا نام سنائی دیا۔ میرے ہاتھ کچھ رک سے گئے۔ بھائی کہہ رہے تھے

"شارق آیا ہوا ہے۔ آج کھانے میں ذرا اہتمام کر لینا۔"

"اچھا! کب آئے یہ حضرت؟" بھابی ہنس کر بولیں۔ "یہ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر میں بھی آرام ملے گا اور اکیلا پن بھی دور ہو جائے گا۔ اتنی اسٹیبلش فیملی ہے۔ کیا کمی ہے ان میں یا پھر شادی پہلے کر چکے ہیں۔"

"نہیں بھئی! کہاں کی ہے شادی؟ عجیب آدمی ہے۔ آج سے نہیں شروع سے ہی ایسا ہے اپنے آپ میں مگن رہنے والا۔ انٹروورٹ شخصیت میں نے پوچھا تھا ایک بار لگا تھا کہ کوئی ہے اس کی زندگی میں۔ اس نے کچھ نہیں بتایا میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا دوبارہ پوچھنا۔"

"تم بھی کسی کو چاہ سکتے ہو۔" بڑی حیرت کی بات تھی یہ میرے لیے۔

"شام کو بھابی نے کھانے پر خاصا اہتمام کر ڈالا۔ بھائی جان نے مجھے اتنی بار بلایا کہ آخر کار آنا ہی پڑا' کھانے کی ٹیبل پر تم بھیا' بھابی اور امی کے ساتھ خاموش سے بیٹھے تھے۔ امی کافی دیر سے تمہارا جائزہ لے رہی تھیں' آخر بول پڑیں۔

"کیا بات ہے شارق بیٹا! بہت خاموش ہو۔"

"کچھ نہیں آنٹی.... بس ایسے ہی۔" تم نے بڑی آہستگی سے جواب دیا اسی انداز میں جو تمہارا خاصہ تھی۔ بھائی جان ہنس کر بولے۔

"بھائی شادی کر لے کب تک اکیلا رہے گا۔" تم مسکرا دیتے کبھی کبھی سرسری سی نظر میرے اوپر ڈال لیتے' سوچ رہے ہو گے کہ اب میں تمہاری طرف دیکھ کر مسکراتی نہیں' نہ ہی کوئی بات کرتی ہوں بقول تمہارے "اوٹ پٹانگ باتیں" جب کہنے اور سننے کو کچھ رہ ہی نہ جائے تو خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے اور پھر خودداری کا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے پھر جب تمہیں میری پرواہ نہیں تو مجھے بھی تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ کھانا کھا کر میں تو اٹھ کر چلی گئی پھر مجھے نہیں پتا کہ میرے پیچھے کیا باتیں ہوئیں۔

دن رات ایک جیسے گزر رہے تھے' زندگی میں کوئی امنگ' دلچسپی نیسے نظر ہی نہیں آتی تھی' پھر ان ہی بور دنوں میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بڑے ابا کے پاس چلی جاؤں' ویسے بھی وہ مجھے بہت یاد کر رہے تھے۔ اپنی بیٹی سمیرا کی شادی کے بعد بالکل اکیلے ہو گئے تھے۔ سوائے امی کے کسی کو اعتراض نہ تھا۔ بقول امی کے۔

"پہلے تمہاری شادی ہو گی' بعد میں کچھ اور سوچنا۔" لیکن میں سوچ چکی تھی' ابو اور بھائی جان کے ساتھ مل کر فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسے میں تم نے میری زندگی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں گویا پتھر پھینک کر ہلچل مچا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں تمہارے خلاف کوئی فیصلہ کرتی' بھابی کی ہنستی ہوئی شرارتی آنکھیں' امی کا مطمئن اور پرسکون چہرہ بہت کچھ کہہ گیا۔ تو گویا مجھ سے بات کرنے سے پہلے تم میرے گھر والوں سے مجھ سے شادی کے بارے میں کہہ گئے تھے' جب ہی ڈنر والے دن تم کافی دیر تک بیٹھے رہے تھے' اسی دن یہ سب باتیں سب کے درمیان ہوئی تھیں اور تم آج مجھ سے پوچھ رہے تھے' میں نے تمہیں کوئی جواب نہیں دیا اور سیل فون بند کر دیا۔

آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ آنسوؤں کا خزانہ سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ کیوں آ رہے تھے یہ آنسو میری آنکھوں میں' کیا اس لیے کہ میں تم سے تمہارے جیسا سلوک کرنے والی تھی یا انا پہ لگنے والی پرانی چوٹ رلا رہی تھی۔

میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی' گود میں فون پڑا تھا' آنکھوں پر ہاتھ رکھے میں روئے جا رہی تھی' ہلکی سی آہٹ پر مڑ کر دیکھا تو شارق احمد سر پر کھڑے تھے' میں تو شاید تم پر برسنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

"آپ کو.... آپ کو ہمت کیسے ہوئی یہ سب کہنے کی .... آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو' جب اور جیسا چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ میں نے ایسا کب کہا۔" شارق مسکرا کر گویا ہوئے۔ وہی مسکراہٹ جس پر میں جی جان سے فدا ہو گئی تھی۔ میں ایک دم لڑکھڑانے لگی پھر ہمت کر کے بولی۔

"ڈاکٹر حنا سے شادی کیوں نہیں کی آپ نے۔"

"کیوں؟ کیوں کرتا بھئی۔" شارق بولے۔ "ایک تو شادی شدہ بچوں کی اماں اور میرے عزیز دوست کی بیوی۔"

"پر آپ ان کے ساتھ ساتھ تو ہوتے تھے نا بہت کچھ سنا تھا آپ کے بارے میں۔" میں نے خجالت مٹائی۔

"ارے وہ کویت مائی گریٹ کر رہی تھیں ان کے شوہر کی جاب وہیں تھی، بڑی مشکلات اٹھا کر تو وہ جا سکی ہیں۔ ظاہر ہے سارے انتظامات میں نے ہی کروائے تھے... پھر لوگوں کو تو عادت ہوتی ہے باتیں بنانے کی۔"

"آپ نے کبھی تردید کیوں نہیں کی۔" میں پھر بولی۔

"کیا ضرورت تھی۔" شارق احمد اعتماد سے بولے۔

"اور... اور وہ... مجھ سے بیزاری۔" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا، تو شارق ہنس دیے۔ پھر سمجھانے والے انداز میں بولے۔

"علینہ۔" انہوں نے پہلی بار میرا نام لیا تو میں خوشی سے جھوم اٹھی لیکن ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"تم بہت چھوٹی تھیں مجھ سے، عمر کا یہ فرق میں جانتا تھا۔ اس لیے اچھا نہیں لگتا تھا کہ تم کوئی قدم اٹھاؤ۔ تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات مجھ سے پوشیدہ نہیں تھے... اور... اور میں ڈرتا تھا کہ کہیں میرے اظہار سے یہ نہ ہو جائے کہ میری واپسی ممکن نہ رہے، چھپاتا تھا اپنے احساسات کو تم سے، تمہیں اگنور کر کے، تمہیں ڈانٹ کے ورنہ تو پہلے ہی دن سے تمہاری سادگی اور لاپروائی مجھے پسند آ گئی تھی، ہنستی مسکراتی علینہ۔"

میں حیرت سے آنکھیں کھولے شارق کو دیکھ رہی تھی، پھر نظریں نیچی کر کے بولی۔

"اب بھی تو عمر میں فرق ہے۔"

"اب تم بھی میچور ہو۔" شارق بولے۔

لیکن علینہ سرفراز ہار ماننے والی نہیں تھی۔ دونوں ہاتھوں سے آنسو صاف کیے اور بولی۔

"میں جا رہی ہوں پاکستان سے، مجھے آپ تو کیا کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ میرے دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں، پلیز آپ جائیں یہاں سے۔" میں نے آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے شارق کو دیکھ کر کہا۔

اندر سے بھائی جان، شارق کی آمد پر باہر آئے تھے اور انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

"اف خدایا، یہ کیا ہو رہا ہے۔" میں نے سوچا۔ امی نے آ کر مجھے پیار سے گلے لگایا اور بولیں۔

"بیٹا کافی دن پہلے جب میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ سارا کا فون آیا تھا تو اس نے کافی باتیں کیں مجھ سے، میں تمہارے لیے فکر مند تھی، لہٰذا سارا نے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ شارق سے تمہارے رشتے کی بات کریں اور اس سے پہلے کہ ہم کوئی فیصلہ کرتے شارق نے خود فرحان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا اور شارق سے بہتر رشتہ تمہارے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔"

"لیکن... لیکن آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا امی۔" میں نے شکوہ کیا تو امی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی تھی تمہاری مرضی۔"

"کیا...؟" میں حیرت سے بولی۔

"ہاں! سارا نے بتایا تھا۔"

"اف سارا کی بچی چھوڑوں گی نہیں اسے۔"

"کیوں اس کا کیا قصور اس نے تو بھلائی ہی کی ہے نا!"

"لیکن... امی میں اب ایسا کچھ نہیں چاہتی، آپ انہیں منع کر دیں۔"

"بے وقوف مت بنو۔ اگلے ہفتے وہ اپنی بہن کو لے کر ہمارے گھر آ رہا ہے۔ ساری باتیں طے ہو جائیں گی اور ان شاء اللہ جلد ہی شادی بھی کر دوں گی۔"

"امی۔" میں نے امی کی گود میں سر رکھ دیا۔

جاتے ہوئے شارق احمد نے جو یوں امی سے لاڈ اٹھواتے دیکھا تو... دیکھ کر مسکرا دیے، ویسی ہی مسکراہٹ جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

☆

وہ پسینے سے یوں تربتر تھی کہ سر کے بال تک گیلے ہو چکے تھے۔ دایاں کندھا دکھنے لگا تو اس نے بیگ وہاں سے اتار کر بائیں کندھے پہ لٹکایا۔ پیسے بچانے کی اسے عادت تھی اور ہر گرہستن کی طرح اپنی اس عادت کے ساتھ وہ خوش اور مطمئن تھی۔ ٹیکسی کے بجائے رکشا لیتی اور جہاں رکشا والی بچت ممکن ہوتی تو وہ بھی ضرور کرتی۔ سودا سلف اور کپڑا، جوتا لیتے وقت خوب بھاؤ تاؤ کرتی۔ دس روپے بچانے کی خاطر گھنٹوں بحث کر سکتی تھی وہ... مگر گھر میں اسے چپ لگ جاتی تھی۔ شدید چپ... یہ اس کی اماں کا دیا ہوا سبق تھا۔ رخصتی کے

وقت وہ اس کے گلے لگیں تو بچھ لفظی نصیحت کی۔
"یاد رکھنا ایک چپ سو سکھ۔" اس نے وہ ایک چپ پلو سے باندھ لی مگر وہ۔ سو سکھ۔۔۔؟

یہ سب سوچتے ہوئے نہ چاہنے کے باوجود اس کے لبوں سے ٹھنڈی آہ نکلی۔ ماضی کے سترہ سال اس نے وہ سکھ ڈھونڈتے ہوئے گزارے تھے، مگر ابھی تک وہ اسے مل نہیں سکے تھے۔

ہو سکتا ہے مستقبل قریب کی ہی کسی گھڑی میں چھپے ہوں۔ اس نے خوش امیدی سے سوچا اور گھر کے دروازے پہ لگے لٹو کو گھڑی وار گھمایا، گھر آگیا تھا، روزانہ یوں ہی سوچوں کے تانے بانے بنتی وہ گھر پہنچ جاتی تھی۔

"السلام علیکم!" آواز کو حد ادب میں رکھتے ہوئے اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم۔ میرا موبائل نہیں مل رہا۔"

روزانہ یہی کرخت آواز استقبال کرتی، مگر آج وہ روزانہ سے زیادہ ڈری، کیونکہ آواز معمول سے کہیں بلند تھی۔ یعنی اماں غصہ میں تھیں۔

"یہیں کہیں ہو گا اماں جی!" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے پرس ان کے پاس تخت پہ رکھا اور خود واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر باہر آئی تو پرس الٹا ہوا تھا۔ ہر شے بکھری پڑی تھی اور اماں بڑے دھیان سے اندرونی جیبیں چیک کر رہی تھیں۔ پیسوں والی جیب سے سو کے تین پچاس کا ایک نوٹ برآمد ہوا اور کچھ سکے کھڑکھڑائے۔

"کہاں گیا میرا موبائل؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"میں چائے پی کے فوراً ڈھونڈتی ہوں۔"

"رہنے دو، تم اب بس چائے ہی اڑاؤ۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

"میں ابھی دیکھ دیتی ہوں۔" وہ کہہ کر مڑنے کو ہی تھی کہ اماں نے اس کی کلائی زور سے مروڑی۔

"تمہارے دیکھنے سے ہی تو یہ دن آیا ہے۔"

"جی۔۔۔" جو اس کی سمجھ میں آرہا تھا وہ سب سمجھنے کو اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"جانے کب سے نظر تھی تمہاری۔"

"اماں جی۔۔۔؟" بے یقینی اور دکھ اس کی آنکھوں میں آکر ساکت ہو گئے۔

"ارے کیا اماں جی۔۔۔ اماں جی۔۔۔ بتا مجھے کہاں ہے میرا موبائل؟" انہوں نے اس کی کلائی کو زور سے جھٹکا دیا۔

"آپ کہیں رکھ کے بھول گئی ہوں گی۔" اب کی بار وہ بس ذرا سا منمنا سکی۔

"میں بوڑھی ہوئی ہوں، پاگل نہیں۔"

انہوں نے جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑی، وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور تخت کے پائے کے پاس جا گری۔ اماں صحن سے برآمدے میں چلی گئیں۔ گرل کے اس پار سے کبھی ان کے بڑبڑانے کی آواز آتی، کبھی چلانے کی، مگر وہ وہیں بیٹھی رہی، بالکل ساکت، پھر اماں پاؤں میں چپل اڑسے اس کے قریب سے ہو کر گیٹ سے باہر چلی گئیں۔ باہر کھڑے ہو کر گیٹ کے لٹو کو انہوں نے مخالف گھڑی وار گھما کر اپنے تئیں دروازہ اچھی طرح سے بند کیا تھا۔ عاکفہ گیٹ کی آواز سے چونکی اور گیٹ کی سمت دیکھا۔

"اماں جی ٹھیک سے کنڈی چڑھا کر سویا کریں نا، اتنی لمبی دوپہر ہوتی ہے آج کل۔"

تین دن قبل اس نے اماں سے یہ بات کہی تھی، جب جمعہ کے دن وہ اسپتال سے آدھی چھٹی کر کے لوٹی تو سنسان لمبی دوپہر میں اماں گیٹ کو محض لٹو گھما کر بند کیے گہری نیند سوئی ہوئی تھیں اور اماں نے جواباً کہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ آآ تو اب مجھے عقل مندی کی باتیں تم سکھاؤ گی بی بی؟ سو رہی ہوتی ہوں، مری نہیں ہوتی، سمجھیں؟" تب تو وہ چاہے کچھ سمجھی نہ تھی، آج اس کے چودہ طبق ضرور روشن ہوئے تھے۔

اذان کی آواز آئی تو اس نے جھٹ سے تخت پہ پڑی

چیزیں بیگ میں ڈالیں اور وضو کرنے چلی گئی۔ آج تو نماز مکمل کرنا بھی محال ہو گیا تھا۔ ذہن بھٹک بھٹک کر اماں جی کی باتوں کی طرف چلا جاتا۔ ابھی جب وہ میرے پاس سے گزر کر باہر جا رہی تھیں۔ تب بھلا کیا کہا تھا؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"بہن کو دے آئی ہو گی نا اٹھا کر..."

نماز مکمل ہو گئی تھی۔ اس نے سوچوں میں غلطاں ہی سلام پھیرا۔

"مجھے معاف کر دے میرے رب، میرے مالک مجھے معاف کر دے۔" اس نے اپنے رب کے آگے ہاتھ جوڑے اور پھر سجدے میں گر گئی، آنکھوں میں برف ہوئی تکلیف قطرہ قطرہ پگھلتی رہی، وہ سجدے میں گری بے آواز روتی رہی۔ دل بھر کے رو لینے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہوا تب سجدے سے سر اٹھایا۔

"روٹی بنا دو گی ڈاکٹرنی صاحبہ یا اس عمر میں وہ بھی خود بنانی پڑے گی؟" ابھی اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ اماں کی پکار سنائی دی۔ جانے وہ کب واپس آئی تھیں۔ اس نے بنا دعا مانگے ہی جاء نماز اٹھا دی۔

☼ ☼ ☼

اس کا تعلق ایک امیر کبیر گھرانے سے تھا۔ والدین کی پہلی اولاد تھی۔ لہٰذا نازوں میں پلی اور بے حد لاڈلی تھی۔ بیاہ کے آئی تو اتنا جہیز لائی کہ دور دور تک چرچے ہوئے، مگر اپنی زبان اماں کے ہاں چھوڑ آئی تھی۔ اسے یاد پڑتا تھا کہ اس کی اماں خود بھی بڑی بدمزاج اور تیز زبان ہوا کرتی تھیں۔ وقت رفتہ رفتہ انہیں ٹھوکریں لگاتا گیا۔ سبق سکھاتا گیا، پہلے وہ کچھ نرم خو ہوئیں، پھر خوش مزاج اور پھر خوش گفتار۔

اس کی شادی طے ہوئی تو ہر وقت وہ اسے یہی سمجھاتیں کہ... "دیکھو میری بدزبانی سے نہ میرا معاشرے میں مقام بنا، نہ سسرال میں اور نہ ہی میاں کے دل میں۔ تم ایسی غلطی نہ کرنا۔" اور رخصتی کے وقت بھی انہوں نے باقی ماؤں کی طرح نہ اس کا ماتھا چوما، نہ ڈھیروں دعائیں دیں تو فقط ایک نصیحت کی...

"ایک چپ سو سکھ..." اور پھر جب تک وہ حیات رہیں انہوں نے اس پہ کڑی نظر بھی رکھی۔ کبھی جو کہیں سے سن لیتیں کہ عاکفہ کے ہاں کچھ کہا سنی ہو گئی ہے تو فوراً" فون کھڑکاتیں اور صاف کہتیں کہ زبان درازی کی تو مجھے اماں نہ کہنا۔

صرف ایک بار نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی زبان سے کوئی جملہ ادا ہو گیا تھا۔ تو اماں نے سخت کلاس لی۔ اس نے اماں کو صفائی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اماں میں جانتی ہوں ایک چپ سو سکھ، مگر مجھ سے چپ نہیں رہا گیا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے بیٹی، چیزیں ہمارے علم میں ہوتی ہیں، مگر ہر عمل میں نہیں لاتے، تم چپ کی پریکٹس کیا کرو، مسلسل کیا کرو، تب ہی سکھ ملے گا، میں نے چپ نہ رہ کے رشتے کھوئے ہیں، آسانیاں کھوئی ہیں، مقام کھویا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تمہیں بھی ٹھوکر لگے، تب تم پہ صحیح غلط واضح ہو، میں چاہتی ہوں کہ میری نصیحت ہی تمہارے لیے مشعل راہ ہو اور تم ٹھوکروں سے بچی رہو۔" اور پھر اس دن کے بعد سے اماں نے اپنی زیر نگرانی اس کو چپ کی پریکٹس کروائی، مرتے دم تک کرواتی رہیں، اگر اس سے ——— چھوٹی موٹی چوک بھی ہو جاتی تو فوراً" دماغ درست کرنے آ جاتیں اور پھر وہ نہ رہیں۔ مگر تب تک عاکفہ چپ رہنے کی عادی ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھانا کھانے کے بعد وہ خواہ مخواہ ہی ٹی وی کے آگے آن بیٹھی، حالانکہ نہ تو اسے ٹاک شوز کا شوق تھا، نہ پرائم ٹائم ڈراماز میں دلچسپی تھی، مگر آج نہ نیند آ رہی تھی، نہ کتاب پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا اور تو اور اس نے بیٹے، بہن اور شوہر کو میسیج تک نہ کیے۔ جو اس کے لیے دن بھر کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ بظاہر اس کا رخ ٹی وی کی طرف تھا، مگر نہ وہ اسے سن رہی تھی، نہ دیکھ رہی تھی۔ گزشتہ سترہ سالوں میں اس نے کیا کچھ نہ سہا تھا، کیا کچھ نہ دیکھا تھا۔ تن تنہا، محض ایک چپ کے

سہارے۔۔۔ وہ بیاہ کے آئی تو شوہر کے تین چھوٹے بھائی اور ایک بہن سب ہی تقریباً" جوان تھے' وہ ایف اے پاس تھی۔

ایک روز اچانک میاں ایک نرسنگ کورس میں اس کا داخلہ کرا آئے۔ میاں اکیلے کمانے والے تھے۔ لہٰذا کورس کے فوراً" بعد اس نے ایک اسپتال میں نوکری کرلی۔ اللہ نے جلد ہی ایک بیٹا عطا کردیا۔ ادھر سب سے بڑے دیور اور نند کا بیاہ شروع ہوگیا۔ بیاہ تو چند دنوں کی مصروفیات تھیں' مگر اس پہ جو خرچ ہوا اسے بھرتے بھرتے ان دونوں میاں' بیوی کو سالوں لگے۔ پھر بھی دیورانی سے اسے یہ سننے کو ملا کہ بھابھی گھر کا کوئی کام نہیں کرتیں' سارا دن میں ہی کھپتی ہوں وغیرہ وغیرہ۔

ساس اور نند منصف بنیں۔ علی الصبح اور شام کے بعد کے لیے انہوں نے تمام بڑے بڑے کام الگ کیے' جیسے فرش دھونا' کپڑے دھونا' سالن بنانا' آٹا گوندھنا اور باقی سارا دن کے کام چھوٹی کے حصے آئے۔۔۔ وہ چپ رہی' خیر چھوٹی پھر بھی لڑ جھگڑ کر الگ ہی ہوئی اور چونکہ وہ چپ رہتی تھی۔ لہٰذا اس نے بہتوں کو خود کے لیے گھنی اور میسنی جیسے لفظ بولتے سنا۔

پھر چھوٹے دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ہوئیں۔ قرض ابھی اترا نہ تھا کہ ان کی بیویوں کو حصہ لے کر پرسنلی اسٹیبلش ہونے کی فکر ہوگئی۔ دل تو اس کا بھی بہت چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے کچھ جوڑ کر رکھے یا کم از کم اپنے کمرے میں اے سی ہی لگوالے' مگر اس کی خواہشیں چپ کے تالے کے پیچھے پڑی رہیں۔ گھر بکا' رقم تقسیم ہوئی اور وہ اماں جی کے ساتھ ایک نسبتاً" چھوٹے اور سادہ گھر میں آبسی۔

وہ ملنے ملانے والوں کو بتانا چاہتی تھی کہ اماں جی نے خود اس کے ساتھ رہنا پسند کیا' مگر اماں ہر ایک کو یہی سناتیں کہ اس کا شوہر شہر سے باہر ہے' اس لیے مجبوراً" اس کے ساتھ رہنا پڑا اور وہ چپ چاپ سنے جاتی۔ ادھر میکے میں بھی اس کے پانچوں بھائی یکے بعد دیگرے شادی کے بعد الگ ہوتے گئے۔ اس کی چھوٹی بہن ابھی فرسٹ ایئر میں تھی کہ اماں کا انتقال ہوگیا۔ وہاں بھی چاروں الگ گھر بنا چکے تھے۔ اماں اور نجمہ چھوٹے والے کے ساتھ رہتی تھیں۔ اماں اللہ کو پیاری ہوئیں تو بھائیوں نے طے کیا کہ نجمہ سب کے ہاں مہینہ مہینہ رہا کرے گی' تاکہ کسی ایک پہ بوجھ نہ بنے۔

باپ کی چھوڑی گئی وراثت سے ان سب کے حصے میں اتنا اتنا ضرور آیا تھا کہ سب ہی مالی طور پر اچھے خاصے مستحکم تھے' مگر نجمہ کے ماں' باپ نہ رہے تھے۔ لہٰذا اب اسے بوجھ ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس کا بہت بار جی چاہا کہ نجمہ کو لاکر اپنے گھر ٹھہرالے' تاکہ روز روز کے آنے جانے سے اس کی پڑھائی تو کم از کم متاثر نہ ہو' مگر چپ آڑے آجاتی۔

☼ ☼ ☼

اماں جی اٹھتے بیٹھتے محمد ولی کے اکلوتے ہونے پہ پریشان ہوتی رہتیں۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ ان کی پریشانی اتنی بڑھی کہ وہ محمد ولی کے لیے نئی امی لانے کے معاملے میں سنجیدہ ہوگئیں۔ عاکفہ اگر پہلے چپ اوڑھے رہتی تھی تو اب گہری چپ اوڑھے رہنے لگی۔ اگر انہیں کوئی لڑکی اپنے حساب کی مل جاتی تو لڑکی والوں کو ان کا حساب کتاب پسند نہ آتا۔ ایک دفعہ بات کچھ آگے چلی تو محمد ولی کے سب سے بڑے چچا نے آکر اماں سے خوب بحث کی اور بالآخر انہیں مزید پیش قدمی سے باز رکھنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

خیر ایک آدھ سال بعد اماں کو پھر سے جوش آیا' مگر پھر خود ہی سنبھل گئیں کہ اب تو محمد ولی کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اس کے ابا کی شادی کا سوچنا چھوڑا اور اس کی شادی کے متعلق سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہیں۔ عاکفہ کے ساتھ ان کی لڑائی ہمیشہ رہی' شادی کے سترہ سال بعد بھی وہ اپنی پسند سے سبزی تک نہ لاسکتی تھی۔ جو اماں جی کہتیں' وہی لاتی' وہی پکاتی۔ ناپسند ہوتا تب بھی وہی کھاتی۔ لوگوں کے ساتھ

کیسا لین دین رکھتا ہے اس سے بھتیجے بھتیجیوں کو کس قسم کے تحائف ان کی آمین یا سالگرہ پہ بھجواتے ہیں۔ سب اماں جی ہی طے کرتیں۔ وہ چپ ہی رہتی۔ مگر آج تو اس کا دل بھر آیا تھا۔ تمام کام کاج سے فارغ ہو کر اس نے کمرے کی کنڈی لگائی۔ بکسے سے پرانا البم نکالا اور اماں کی تصویر کو گلے لگا کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

"اماں کہاں ہیں میرے حصے کے سو سکھ؟ کہاں ہیں؟ بتا مجھے، تیری چپ آج بھی میرے پلو سے بندھی ہے، مگر وہ سو سکھ کہیں نہ ملے مجھے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور اسی رونے دھونے میں اس کی نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

پھر جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ اسے فون کی بیل سنائی دی، بڑی ہی مشکل سے وہ خود کو ذرا سا جگا سکی اور فون آن کیا۔

"ہیلو۔"

"کہاں تھیں تم؟ کتنے میسج کیے میں نے۔" محمد ولی کا باپ چھوٹتے ہی بولا۔

"میسج ٹون آف تھی، ولی کے ابا اور میں سو گئی تھی۔ پتا نہیں کیسے۔" ولی کے ابا کی غصیلی آواز نے اس کی آدھی نیند تو فوراً بھگا دی تھی۔

"بس سوتی ہی رہنا۔ یہاں میں کتنی مشکل میں ہوں، کس قدر پریشان ہوں، کوئی احساس نہیں ہے تمہیں۔"

"سوری۔ وہ میں دراصل۔"

"پتا ہے میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہا تھا، تاکہ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو، مگر دن کو تم گھر میں ہوتی نہیں اور شام کو تمہیں کام بہت ہوتے ہیں، جو وقت بچے اس میں سو جاتی ہو۔"

وہ تلخی سے بول رہا تھا۔ عاکفہ کا حلق تک نمکین ہو گیا، مگر وہ چپ رہی، بتا بھی نہ سکی کہ وہ بھی ہرٹ ہوئی ہے، گھنٹوں روئی ہے۔

"گاڑی لگ گئی تھی باس کی مجھ سے۔" اس کی چپ کو مزید ندامت تصور کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

عاکفہ کا رنگ ایک دم فق ہو گیا۔

"وہ نئی گاڑی جو آپ کے باس نے پرسوں ترسوں ہی زیرو میٹر نکلوائی تھی؟"

"ہاں۔ وہی!" قدرے ست سا ہو کر اس نے جواب دیا تھا۔ عاکفہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا بولے، کیسے تسلی دے۔

"وہ پہر سے اس کے پیچھے لگا ہوں، ابھی ٹھیک ہوئی ہے۔ خرچ بہت ہو گیا ہے۔ اور باس ناراض بھی خوب ہوئے۔"

"اللہ خیر کرے گا۔" وہ بس یہی کہہ سکی۔

"ہاں! بس دعا کرنا بہت ساری۔ اور تم ٹھیک ہو؟"

اس کے آخری تین لفظوں پہ عاکفہ جیسے تڑپ کر رہ گئی۔ دل میں گھاؤ لگا تھا اور گہرا بھی کافی تھا۔ درد کا اثر اتنی جلدی کہاں زائل ہوتا۔ اوپر سے زخمی دل بری طرح بدکا۔ کھل کر بیان ہونے کو بے تاب ہوا، مگر عاکفہ نے اسے "گھر" کا چپ کی گولی دی۔

"جی الحمدللہ۔ آپ پریشان مت ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم پھر سو جاؤ۔"

"جی ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ!" فون بند ہوا تو اسے پھر سے بے طرح رونا آیا۔ کچھ دیر فون ہاتھ میں لیے چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر کوئی خیال آنے پہ واٹس ایپ کھولا۔ محمد ولی کا لاسٹ سین بارہ سنتالیس کا آ رہا تھا اور اب ایک ہونے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ یعنی امکان تھا کہ وہ جاگ ہی رہا ہو گا۔ اس نے وائس میسج کرنے کے لیے مائیک کے نشان پہ انگوٹھا رکھا۔ کچھ بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ پھر کچھ سوچ کر اس نے اس کی پروفائل کھولی تو نظر اسٹیٹس کی طرف بھٹکی۔

"بری ہینٹرنگ گرینڈ ٹیسٹ۔ دعا کرنا سب۔" وہ جو بولنے کو ہی تھی، نئے سرے سے چپ ہو گئی۔ یہ اسٹیٹس اس نے یقیناً آج ہی کہیں اپ ڈیٹ کیا تھا،

کیونکہ جمعہ کی شام سے آج بدھ تک تو اس کا شیڈول "انجوائنگ ویک اینڈ" ہی تھا۔ اب وہ کیسے اس کو ڈسٹرب کرتی۔ وہ موبائل تکیے کے نیچے رکھ کے چپ کر کے لیٹ گئی۔ نیند اب اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور چپ... چپ نے اس کے اندر شور برپا کیا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اسپتال سے چھٹی لے کر نجمہ کی طرف چلی آئی تھی۔ اس مہینے وہ منجھلے بھیا کے ہاں تھی۔ جو عاکفہ کو بہت قریب پڑتا' سو اس نے غنیمت جانا۔ ہمیشہ وہ نجمہ کی خبر گیری کرنے' اس کے ساتھ ضروری چیزوں کے لیے بازار جانے یا اس کے ہی کسی اور کام سے آیا کرتی تھی' پہلی بار وہ اپنا دل بہلانے آئی تھی اور یہاں آکر تو اس کا دل دکھ سے جیسے بھر گیا۔

"عظیم تمہیں شرم نہ آئی' ارے اپنی بھی تو تین بیٹیاں ہیں' ان کے ساتھ بھی یہی کرو گے کیا؟" وہ ابھی دم بھی نہ لینے پائی تھی کہ عظیم دکان سے بھاگا بھاگا چلا آیا اور لگا اسے ایک رشتے کی بابت بتانے' تین بچوں کے باپ کا رشتہ... اس کا دل کٹ کے رہ گیا' وہ خود پہ قابو نہ رکھ سکی' مگر عظیم ڈھٹائی سے بولا۔

"تو کیا کروں' شریف لوگ کہاں ملتے ہیں آج کل..."

"اچھے لوگوں کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ بھاگ دوڑ تو کرنی ہی پڑے گی۔ پھر ہی مناسب رشتے ملتے ہیں۔"

"اچھا تو باجی پھر تم بھاگ دوڑ کرلو میں تو دشمن ہوں نا اس کا۔"

"جو کر رہے ہو' وہ دوستی بھی تو نہیں ہے۔" فوراً دل کا دکھ بیان ہوا۔

"تو کیا کریں باجی؟ نقاش بھائی کا سالا بھی تو اچھا خاصا تھا تمہیں ہی پسند نہ آیا۔" وہ لاتعلقی اور بے زاری سے بول رہا تھا۔ عاکفہ اب کچھ بول نہ سکی۔ نہ شکوہ' نہ نصیحت' نہ جذباتی بلیک میلنگ... بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سب کو بٹھا کر ڈھیر سارا سمجھائے' مگر یہاں سمجھنے والا تھا کون' اس بے زاری اور لاتعلقی میں ایک پہ سیر تھا تو باقی سب سوا سیر۔ بہن کی شادی پہ خرچ کرنا تو ایک طرف اس کے روزمرہ کے جوتی کپڑے پہ بھی وہ لوگ خرچ نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ معصوم دن بہ دن مرجھاتی جارہی تھی۔ عاکفہ دل میں ڈھیروں تاسف لیے اس کے پاس آبیٹھی۔ وہ گیلری میں پڑے ننھے سے پنگھوڑے میں آڑی ترچھی لیٹی تھی۔

"نجمہ..."

"جی باجی!" اس کے پکارنے پہ وہ سیدھی ہوئی' ہاتھ سے لباس درست کیا جو بیسیوں نہیں' بلکہ سیکڑوں بار کا دھلا ہوا لگتا تھا۔

"یہاں سوتی ہو کیا؟" پوچھتے ہوئے اس کا دل لرز رہا تھا اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"ارے نہیں باجی! بس جب دل گھبرا جائے تو ادھر تازہ ہوا میں آجاتی ہوں۔" نجمہ کے جواب دینے پہ اس کی جان میں جان آئی' ورنہ پوچھتے سے وہ خود خوف زدہ تھی کہ اگر اس کا جواب ہاں ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ کر ہی کیا سکے گی؟ کسی سے بات تک تو نہ کرپائے گی۔

"چلو اندر... لان کا سوٹ لائی ہوں تمہارے لیے... شفون کا دوپٹا تو نہیں ہے' مگر پرنٹ بڑا اچھا ہے۔"

"تو کیا ہوا باجی؟ شفون کے دوپٹے تو ٹھہرتے ہی نہیں' لان والے کی تو بعد میں قمیص بھی بنائی جاسکتی ہے۔" وہ سمجھ داری سے کہتے ہوئے اس کے سنگ چل رہی تھی اور عاکفہ کا جی چاہا' ابھی کے ابھی کسی دیوار سے اپنا سر ٹکرائے اور بار بار ٹکرائے۔ بھلا وہ محمد ولی کے سب سے چھوٹے چچا کی دفعہ بول کیوں نہ پائی تھی' بہت جھکاؤ تھا اس کا نجمہ کی طرف' سب ہی کو محسوس ہوتا تھا۔

اماں تو کئی بار تلخ ترش بھی کہہ دیتیں اس حوالے سے' مگر وہ کیا کرتی اسے شرم آرہی تھی اور اماں نے بھلا اسے کہاں حق دیا تھا رائے دینے کا مشورہ دینے کا اور محمد ولی کے چچا نے جب خود سے اماں کو کہا تب بھی

اس نے سب دیورانیوں کے طعنے تشنے چپ چاپ سن لیے تھے اور بولی نہیں' ناہاں میں' ناہی ناں میں۔۔۔

اپنی اماں کے ایک چُپ سو سکھ والے فارمولے کے عین مطابق چپ رہی اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا نجمہ کو رخصت کرتے وقت وہ اماں والی نصیحت اسے کرپائے گی یا نہیں۔۔۔ معصوم نجمہ جس نے بہاروں سا بچپن دیکھا' مگر اس کی نوخیز جوانی کو یتیمی اور مسکینی دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بہن! یہ ذرا پیڑھی پکڑا دیں۔" یہ کسی کی رسم قل تھی۔ باقاعدہ دعا ابھی شروع نہ ہوئی تھی اور سفید چادروں پہ رکھی گھٹلیوں کو خواتین کچھ دیر پڑھتیں اور پھر کچھ دیر باتوں میں لگ جاتیں۔ ایک عمر رسیدہ صحت مند خاتون باقی لوگوں سے قدرے ہٹ کر ایک کونے میں بیٹھی تھیں کہ ایک خوش شکل' خوش لباس عورت نے ان سے پیڑھی مانگی۔

"یہ لیں۔۔۔" عمر رسیدہ خاتون نے پیڑھی بڑھائی' دوسری محترمہ ان کے ساتھ ہی پیڑھی رکھ کر بیٹھ گئیں۔

"اصل میں جوڑوں کا درد ہے نا تو اس لیے۔۔۔ ورنہ مناسب تو نہیں لگتا۔" وہ شائستہ خاتون محض پیڑھی لے کر بیٹھنے پہ شرمندہ تھیں۔ دوسری خاتون ہولے سے ہنس دیں اور بولیں۔

"ارے چھوڑو بہن! آج کل کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اور ہم تم ایسی باتوں پہ بھی جھجکتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔۔۔ لوگ اور ان کے رویے بہت عجیب سے ہوگئے ہیں میں تو پریشان ہو کر رہ جاتی ہوں۔"

"چلو' سب نے اپنی اپنی قبر میں جانا ہے' خود ہی اپنا حساب دیتے رہیں گے۔"

"جی یہ تو ہے' مگر ہم خواتین تو قبر سے بھی جب تک دور ہی رہنا چاہتی ہیں کہ جب تک اولاد زندگی میں سیٹل نہ ہو جائے اور اولاد۔۔۔" وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئیں۔ ان کے چہرے پہ دکھ کے سائے لہرانے لگے۔

"اللہ خیر کرے گا' خیر کی امید رکھنی چاہیے۔" بڑی خاتون نے انہیں تسلی دی۔

"ان شاء اللہ۔۔۔" وہ جانے کتنی بھری بیٹھی تھیں کہ گلوگیر ہوگئیں۔

"کتنے بچے ہیں ماشاء اللہ سے؟"

"تھے تو چار۔۔۔ ایک رہ گیا ہے۔۔۔ باقیوں کی شادی ہوگئی۔"

"دل چھوٹا نہ کرو بہن! اب جو ایک ہے نا تمہارے پاس' دیکھنا چار سے بڑھ کر چاہے گا۔ چار سے بڑھ کر خیال رکھے گا۔"

"خیال تو وہ سب بھی رکھتے تھے۔۔۔ مگر۔۔۔" انہوں نے گہری سانس خارج کی۔ "اب کیا پتا آنے والی کس راہ پہ لگائے اسے۔۔۔ دعا کیجیے گا۔"

"ہاں ہاں' ضرور میں دعا کروں گی' تم پریشان مت ہو۔ آنے والیوں کو واقعی بہت سی راہیں آتی ہیں جانے کن راہوں پہ چڑھا دیں۔ میرے ساتھ بھی یہی سب ہوا' مگر ایک ہے میرے پاس اللہ کی نعمت۔۔۔ بیٹیوں سے بڑھ کر۔۔۔ سچ کہوں' اف تک نہیں کرتی۔"

"ماشاء اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔ اللہ سب کو ایسی بہوویں دے۔" کم عمر خاتون حقیقتاً" متاثر ہوئی تھیں۔

"ارے آپ کا بیٹا کرتا کیا ہے؟" عمر رسیدہ خاتون نے کوئی خیال آنے پہ اچانک پوچھا۔

"میرا بیٹا؟ ہائی وے میں ملازم ہے' سرکاری نوکری ہے' کیا کوئی رشتہ ہے آپ کی نظر میں۔۔۔" وہ تو جیسے کھل ہی اٹھی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ ایک رشتہ ہے تو سہی!" عمر رسیدہ خاتون نے کہا۔ ان کی نظروں میں کسی کا پریشانی سے ستا چہرہ گھوم رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی پلیز۔۔۔ میرے لیے۔۔۔ میری خاطر۔۔۔" محمد ولی لجاجت سے کہتا عاکفہ کے گھٹنے پکڑے فرش پہ بیٹھا

تھا۔ کیا کچھ تھا اس کی بولتی آنکھوں میں... امید... مان... بھروسا... عاکفہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔

"امی میں جانتا ہوں، پھپھو ہمیشہ آپ سے بہت روڈ رہی ہیں، مگر میری خاطر امی... پلیز امی... میری پیاری امی!" کتنا عزیز تھا نا اس کو یہ چہرہ... اس کی مسکراہٹ... اس کی تروتازگی...

"کب چلیں؟" عاکفہ نے محبت سے اس کے گال پہ ہاتھ پھیرا اور پھر پوچھا تھا۔

"آج... ابھی... اسی وقت امی... چلیں؟" کہتے کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس نے عاکفہ کی ہاں ناں کا بھی انتظار نہیں کیا، اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً" کھینچتا ہوا اسے لاؤنج سے باہر لے گیا۔ وہ بھی ہنس رہی تھی، خوش تھی۔

محمد ولی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ آنکھیں موندے بیٹھی وہ سوچ رہی تھی کہ ماہ و سال بھی کیسے پر لگا کے اڑے نا! کل جو ولی اس کی گود میں سوتا تھا آج وہ اس کا رشتہ لینے جا رہی تھی۔ اس کی دادی حیات ہوتیں تو... وہ نم دیدہ ہوئی۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں دو لڑکیاں پسند کر رکھی تھیں کہ ان میں سے کوئی ایک جو اگر محمد ولی کو بھا جائے تو کیا ہی خوب ہو... مگر کیا کرتی؟ پھول سے محمد ولی کو مرجھائے ہوئے کیسے دیکھ پاتی، سو دل کی دل میں ہی رکھی اور چپ چاپ اس کے ساتھ چل دی۔

جانے آپا حمیدہ کیا کہیں؟

عمر میں بڑی نند کے متعلق سوچتے ہوئے بھی وہ گھبرائی، بالکل ایسے، جیسے شادی کے اولین دنوں میں وہ آپا حمیدہ کی تیز، ایکسرے کرتی نظروں کے سامنے آنے سے بھی گھبرا جایا کرتی تھی۔ پچھلے دنوں وہ محمد ولی کے چاچوں میں سے سب سے بڑے کے بیٹے کا رشتہ بڑی سہولت سے ٹھکرا چکی تھیں، حالانکہ اس کی نوکری محمد ولی کی نوکری سے زیادہ اچھی تھی اور اس کے باپ کا جمع جتھا بھی محمد ولی کے باپ کے اثاثوں سے کہیں زیادہ تھا۔

"امی آئیں بھی..." محمد ولی کی پکار پہ وہ چونکی۔ وہ اس کی طرف کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ عاکفہ کو تو پتا ہی نہ چلا کہ وہ کب پہنچے اور کب محمد ولی گاڑی پارک کر کے باہر نکلا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتی محمد ولی کے سنگ آپا حمیدہ کے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ آپا سامنے ہی صوفے پہ بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ محمد ولی ان کا پہلا پہلا بھتیجا تھا۔ لاڈلا تو انہیں بے حد تھا۔ لہٰذا اسے دیکھتے ہی وہ فوراً" اٹھیں۔

"محمد ولی، میں صدقے جاؤں، کتنے دنوں بعد چہرہ دکھایا۔" اسے چوم چاٹ کے فارغ ہوئیں تو دھیان تھوڑا عاکفہ کی طرف گیا۔

"آؤ نا تم بھی... بیٹھو، کھڑی کیوں ہو۔" عاکفہ کے لیے اتنا استقبال بھی غنیمت تھا، وہ مسکراتی ہوئی سر کو خم دیتی صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"نارو... نارو... کام وام چھوڑو اور کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔" با آواز بلند انہوں نے نوکرانی کو ہدایت کی۔

"پھپھو! میں ایک کال کر کے آتا ہوں..." محمد ولی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ ماں کو نظروں ہی نظروں میں کہہ گیا کہ پلیز فوراً" سے پیشتر... عاکفہ کو اس کے اتاؤلے پن پہ ہنسی آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر نارو ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آئی۔ فروٹس، بسکٹ، جوس، وہ سب کچھ ایک ساتھ ہی لے آئی تھی۔ آپا نے ٹرالی اس کی طرف کھسکائی۔ لمحے بھر کے لیے اس کی نگاہ بیش قیمت کراکری میں کھب سی گئی۔

"بچے کیسے ہیں آپا؟" اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔

"ٹھیک ٹھاک ہیں، ماشاءاللہ... تازیہ گئی ہوئی ہے، صبیح کا ایڈمیشن کرانے۔"

"اچھا... یونیورسٹی نہیں گئی تازیہ؟"

"نہیں وہ احمر کا کوئی ٹیسٹ تھا، وہ چھٹی کر نہیں سکتا تھا اور صبیح گھبرا رہا تھا اکیلے جاتے ہوئے کہ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔"

"دلہن اب وہ بھی کالج میں آگیا ہے تو اس میں بھی کانفیڈنس آجائے گا۔"

"ہاں... احمر اور نازیہ بھی اسے یہی کہہ رہے تھے کہ تم تو ہم دونوں سے بھی زیادہ پُراعتماد ہو جاؤ گے۔"

آپا بتا رہی تھیں اور اس کی نظریں بار بار ان کی کلائیوں پہ پھسلتیں... وہ گھر میں عام طور پہ ہی اتنا سونا پہنے رہتی ہیں' اسے پہلے بھی پتا تو تھا ہی مگر آج محسوس کچھ زیادہ ہو رہا تھا۔

"آپا... میں تو سوال کرنے آئی تھی آپ سے..." اس کی نگاہیں کلائیوں سے ہٹیں تو بیش قیمت پردوں پہ جا کے اٹکیں۔

"نازیہ بیٹی کے لیے..." اسے تمہید باندھنا بالکل نہ آئی تھی۔ خلاف توقع آپا فوراً" ہی پھٹ نہ پڑیں' بلکہ رسان سے بولیں۔

"دیکھو عاکفہ... محمد ولی مجھے بہت عزیز ہے... لیکن..."

عاکفہ بغور انہیں سُن رہی تھی۔ لاؤنج کے کھلے دروازے سے محمد ولی لان میں ٹہلتا نظر آتا تھا' فون اس کے کان سے لگا تھا' مگر جانے وہ کسی سے بات بھی کر رہا تھا یا بس یوں ہی وقت گزار رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عاکفہ ہوٹل کے استقبالیہ پہ کھڑی مہمانوں کو ریسیو کر رہی تھی۔ تین بچوں کے سنگ آتی ایک خوش پوش صحت مند خاتون کو دیکھ کر وہ تو جیسے خوشی سے نہال ہی ہو گئی۔

"شکر ہے' تم پہنچ آگئیں' میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔" آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے عاکفہ بولی۔

"پہنچنا تو تھا ہی... میرے راجا کا ولیمہ ہے آخر..." وہ جدید تراش والے بالوں کو ہاتھ سے سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

"ارے اسے تو دیکھو' یوں لگ رہا ہے جیسے ولیمہ اسی کا ہو۔ عاکفہ کی نظر اس کے پہلو میں کھڑے بچے پہ گئی تو اس نے فوراً" اسے گود میں اٹھالیا اور اس کے دونوں گال چومے۔

"ہاں نا باجی! اس کی تو ضد تھی کہ میں بالکل ولی بھیا کے جیسا لگوں۔"

"اور ان دونوں مہارانیوں کو دیکھو... خالہ کے ہاتھ تک نہیں آئیں فوراً" بھیا بھابھی کے پاس اسٹیج پہ پہنچ گئیں۔" عاکفہ نے نجمہ کی بیٹیوں کی جانب اشارہ کیا۔

"توبہ! باجی جب اظہر کی کال آئی نا کہ انہیں چھٹی نہیں مل رہی تو ان دونوں نے تو رو' رو کر اودھم مچادیا۔ باجی' آپ نے خواہ مخواہ ہی دو دن کا گیپ دیا بارات اور ولیمہ میں... اچھا ہوتا کہ تب ایک ہی چکر میں سب بھگتا جاتے' اب دیکھیں نا اظہر نے اتنی کوشش کی' مگر ایک ہفتے میں دو دفعہ چھٹی تھوڑے ہی ملنی تھی۔" عاکفہ اس کے تفصیل سے بتانے پہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی... کچھ بول ہی نہ سکی۔ نجمہ کو فوراً" ان ہونی کا احساس ہوا۔

"اب پریشان نہ ہونا باجی... آتو گئی ہوں نا... بس میں تو ایسے ہی کچھ بھی کہہ دیتی ہوں... سوری!"

"میں کبھی تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر پائی نا۔ گاڑی بھی نہیں بھجوا سکی آج..."

"گاڑی نہیں بھجوائی' تو کیا ہوا؟ میں آتو گئی ہوں نا۔" نجمہ نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ عاکفہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا' وہ اسے نظر بھر کے کم ہی دیکھتی تھی کہ کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔ شوہر کے دیے اعتماد اور ساس سے ملی ماں جیسی محبت نے اسے پُراعتماد تو بنایا ہی تھا' بے حد پُرکشش بھی کر دیا تھا۔

"آتو گئی ہو' لیکن وہی بات کہ میں آج بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکی۔" "پتا ہے باجی! میرے پاس آج جو کچھ بھی ہے' تمہاری وجہ سے ہی ہے۔"

"میری وجہ سے کیسے...؟" وہ بے پناہ حیران ہوئی۔

"ہاں باجی تمہاری وجہ سے... تمہاری جیب کی وجہ سے' تمہاری سعادت مندی کی وجہ سے... اظہر کی ماں

نے مجھے ایسے ہی تو پسند نہیں کرلیا۔ تمہاری ساس سے کہیں ملاقات ہوئی تھی ان کی تو انہوں نے اظہر کی امی کو بتایا کہ میری بہت اچھی، بہت صابر، بہت نفیس ہو اپنی بہن کے لیے ہمہ وقت پریشان رہتی ہے تو جب ہی تو آئی تھیں اظہر کی امی رشتہ لے کے۔"

"کیا سچ؟" اسے یقین نہ آتا تھا۔

"ہاں باجی! بالکل سچ۔ اور اظہر کی امی نے سوچا بڑی بہن اتنی اچھی ہے تو چھوٹی میں بھی کچھ گن تو ہوں گے ہی۔" عاکفہ نے فرط جذبات سے اسے گلے لگالیا۔

"پتا ہے، مجھے بھی آج ہی یہ بات پتا چلی۔ ابھی جب میں گاڑی میں ذکر کررہی تھی نا کہ اللہ میری باجی کی خوشیوں کو نظر سے بچائے، انہوں نے بہت سخت حالات بھی دیکھے ہیں۔ تو تب میری امی جان نے باتوں باتوں میں یہ انکشاف کیا۔"

"ارے وہ ساتھ آئی ہیں۔ مگر کہاں ہیں؟"

"وہ کارڈ لینے گئی ہیں۔ میرا کریڈٹ ختم تھا تو کہنے لگیں، میں ہی لے آتی ہوں، تمہارا کیا بھروسا، محمد ولی کے ولیمہ پہ بھی اس کو دکانوں کی دوڑیں لگوانا شروع کردو۔" نجمہ نے ہنستے ہنستے بتایا۔ عاکفہ بھی اس بات پہ ہنس دی۔

"اب میں دولہا، دلہن کے پاس چلتی ہوں۔ اکلوتی خالہ ہوں، اسٹیج پہ بیٹھنا چاہیے نا ان کے ساتھ۔"

"ہاں ٹھیک ہے اکلوتی خالہ، جاؤ ارمان پورے کرو جاکر۔"

وہ جانے کے لیے مڑی تو عاکفہ نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے سکھ کی بہت دعا کرتی تھی، اس کے سکھ سے بہت سکھی تھی۔ مگر اندر ہی اندر اسے یہ قلق ہمیشہ سے رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ کر نہیں سکی بھی، ڈھنگ کا کوئی ایک رشتہ بھی تو نہ ڈھونڈ پائی۔ مگر آج یہ انکشاف ہزاروں، لاکھوں سکھوں سے بڑھ کر فرحت بخش تھا کہ نجمہ کے سکھ درحقیقت اس کے ہی مرہون منت تھے۔

"تھینک یو اماں!" وہ دل ہی دل میں اپنی اماں سے مخاطب ہوئی۔ تب ہی اس کی نظر محمد ولی کے ابا اور آپا حمیدہ پہ پڑی۔ دونوں ساتھ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور اسے یاد آیا، آپا حمیدہ نے اس دن اس کے سوال کے جواب میں کہا تھا۔

"دیکھو عاکفہ۔ محمد ولی مجھے بہت عزیز ہے۔ لیکن۔ خالی اس کی نوکری کو دیکھوں تو کبھی رشتہ نہ دوں۔ بہت عزیز ہے مجھے، مگر میری بیٹی سے بڑھ کر تو نہیں۔ اور اگر تمہارا گھر دیکھوں تو تب بھی تمہیں انکار کردوں۔ مگر میرے سامنے تو تم ہو، میں تمہیں دیکھ رہی ہوں اور میں نے برسوں سے تمہیں دیکھا ہے۔ اب مجھے اپنی بیٹی کا سکون دکھتا ہے۔ مجھے تسلی ہے وہ تمہارے گھر میں خوش رہے گی۔ مجھے اطمینان ہے کہ وہ سکھی رہے گی۔ تم نے خود آج تک کسی کو دکھ نہیں دیا، تو آئندہ کیا دوگی۔ یا وہ کیسے کسی کو دکھ دے گا جو تمہاری گود میں پلا ہے۔

پیسہ۔ زیور۔ گھربار۔ لوگ سب کی یقین دہانی کرواتے ہیں، مگر مجھے جو اپنی بیٹی کے لیے سب سے بڑھ کر چاہیے ہے اس کی یقین دہانی تم ہو نا میرے پاس۔" عاکفہ آپا کے الفاظ یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئی۔ اس دن جب وہ جواب کے ساتھ لوٹی تو محمد ولی کے چہرے پہ جانے کتنے رنگ تھے اور آنکھوں میں کتنے ہی جگنو! اور یہ دنیا کے کسی بھی سکھ سے بڑھ کر ہی تو تھا۔

ایمل رضا

ایک بوڑھا وجود برگد کے ذریعے اپنے شکوے اپنے پیاروں تک پہنچا رہا ہے۔

نانو ہینڈی کرافٹ کا کام کرتی ہیں۔ انار کلی بازار میں وہ ایک دکان بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ نانو یشار اور باسل دونوں بھائیوں کی سرپرست بھی ہیں۔ یشار نفسیات کا ڈاکٹر ہے اور اپنا کلینک چلاتا ہے۔ باسل اس کا چھوٹا بھائی اس کا اسسٹنٹ ہے۔ دونوں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے فرانس جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات زِل سے ہوتی ہے۔ زِل اپنے ڈیڈ کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ لاتعداد ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہے اور اب یشار کو آخری امید سمجھ کر اس کے پاس آتی ہے۔ علاج کے دوران باسل اور زِل کی کئی ملاقاتیں ہوتی ہیں، جس کے باعث دونوں میں محبت کا جذبہ پنپنے لگتا ہے۔

حال کی کھڑکی بند ہوتے ہی ماضی اپنا در وا کرتا ہے جہاں نگار ایک جرات مند اور نڈر لڑکی موجود ہے۔ یونی ورسٹی کے پہلے دن کے مذاق کی بدمزگی کے بعد اسے اپنے کلاس فیلوز زیان عالم اور اس کے گروپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب زیان عالم یونین کے صدر کی حیثیت سے الیکشن لڑتا ہے تو نگار اس کے مخالف مصباح کو سپورٹ کرتی ہے۔ نگار کی نظر میں زیان عالم ایک برے کردار لڑکا ہے۔ جس کی والدہ گلناب عالم بھی متنازعہ شخصیت کی مالک ہیں۔ ہال میں ہوتی تقریر

کے دوران نگار' زیان کو اس کی ماں کے گرے ہوئے کردار کا طعنہ دیتی ہے اور زیان بدلے کے طور پر نگار اور حسن کی تصویریں' یونی ورسٹی کے نوٹس بورڈ پر لگا دیتا ہے۔ نگار غصے میں گرم چائے کا کپ زیان کے منہ پر دے مارتی ہے۔ زیان غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ نگار کو اغوا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پروفیسر صغیر ربانی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔

نگار گھر آتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے.... زیان عالم کا....

یشار زل کو پاکستان آنے کے لیے کہتا ہے کہ وہ پاکستان آکر اپنے دادا' داد کی قبریں تلاش کرے. زل پاکستان آچکی ہے۔ نانو زل سے کہتی ہیں کہ وہ ان کے گھر رہ لے ہجس پر زل نانو کے گھر رہنے لگتی ہے۔ باسل اور زل میں محبت بڑھنے لگتی ہے۔ باسل زل کو شادی کے لیے پرو پوز کر دیتا ہے۔

حسن نگار کو چھوڑ کر امریکہ جا چکا ہے۔ نگار یونی ورسٹی کے تمام واقعات اپنے باپ کو بتا دیتی' جسے سمجھ کر وہ گلناب عالم کو زیان عالم کے رشتے کے لیے انکار کر دیتے ہیں۔ نگار کے والد یار کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے' جہاں اتفاق سے زیان عالم موجود ہوتا ہے اور وہ خدا یار کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آخر کار نگار زیان سے شادی کے لیے مان جاتی ہے۔ شادی ہو چکی ہے۔ دونوں سیر کے لیے سیاحتی مقام پر آئے ہیں۔ نگار زیان کو پسند کرنے لگی ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ زیان کے ساتھ یشب اور سدیم کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ زیان ان دونوں دوستوں کی موجودگی میں نگار کو طلاق دے کر اپنی اصلیت کا نقاب الٹ دیتا ہے۔ زیان کا چہرہ اس قدر بھیانک ہو گا۔ نگار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس کی گردن دبوچ کر اس پر شراب الٹ دیتا ہے۔ تین شیطان صفت انسان حوا کی عزت پر غالب آجاتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد نگار اس ریسٹ ہاؤس سے نکلنے میں کامیاب ہو پاتی ہے۔ وہ رحمٰن' رحیم' ہادی خدا سے اب "عادل" بننے کا تقاضا کرتی ہے لیکن زیان کی بچھائی بساط میں ابھی صرف مہرے ہی آگے کو کھسکے ہیں۔ نگار کی شکست کا لمبا کھیل باقی ہے۔ گلناب عالم بالآخر زیان کی سنائی کہانی پر یقین کر لیتی ہیں۔

نگار گھر آتی ہے تو ہمایوں بھیا اور زلیخا بی اس پر لعن طعن کرتے ہیں کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں زیان کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ

بھاگ گئی تھی۔ ہمایوں نگار کو زبردستی گلناب عالم کے گھر لاکر ان کے پیروں میں پٹختا ہے۔ نگار کی کسی بات کا یقین نہیں کیا جارہا۔ اس کے آنسو بے فائدہ ہیں۔ زیان آتا ہے اور نگار پر یہ الزام ثابت کردیتا ہے کہ وہ اس سے شادی پر خوش نہیں تھی۔ اس نے خدایار کے کہنے پر شادی کی۔ اور اب وہ اس سے طلاق چاہتی ہے۔ نگار زیان عالم کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔ زیان طیش میں آجاتا ہے اور نگار سے زبردستی کرتا ہے۔

"اللہ کی ڈھیل کو اس کی کمزوری نہ سمجھو۔" صغیر ربانی عین موقع پر پہنچ کر زیان کے منہ پر تھپڑ مار کر کہتے ہیں۔

زنل باسل کو شادی کے لیے ہاں کہنے کے لیے شطرنج پر "یس" لکھواتی ہے۔ نانو باسل اور زنل کی محبت سے واقف ہیں۔ مصباح کا قتل یشب نے کیا تھا۔ زنل کو یہ بات معلوم ہوجاتی ہے۔ یہ خبر اس کے لیے حیران کن اور دل توڑ دینے والی ہے۔ اسے اپنے ڈیڈ کی معصومیت پر دکھ ہے کہ سب نے مل کر اس کے ڈیڈ کی زندگی میں زہر گھولا اور انہیں ذہنی مریض بنادیا۔ نانو زنل کو نگار کو کھانا دے کر آنے کا کہتی ہیں۔ تب حال کی نگار، برگد کے سامنے بیٹھا بوڑھا جو دادا اپنے کمرے میں چلا رہا ہوتا ہے۔ "میری عزت کے ساتھ کھیلنے والے وہ تین تھے۔" "سدیم یشب اور زیان عالم" زنل پر یہ لفظ بجلی بن کر گرتے ہیں۔

پانچویں قسط

قوسی سلاخ دار کھڑکی سے باہر چرند، پرند، برگد شاخیں، پتے، جتائیں، کونپلیں سب اکٹھے ہو کر اندر جھانکنے لگے۔۔۔ تالاب کے پانی میں جمی کائی اچھلتی اچھلتی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

آنکھیں پھاڑے ہوئے نگار اسے دیکھنے لگی جو آہستگی سے قدم اٹھاتا۔۔۔ اندر داخل ہوا تھا۔ ایک دھماکا نجانے کہاں ہوا اور شیشے سے بنا ریسٹ ہاؤس کرچی کرچی ہو کر زمین بوس ہوگیا۔ خستہ حال فریادی مسجد اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ طاقچے میں رکھا قرآن مجید پھر سے اس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ اسے اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا وجود اس بار نہ کانپا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا۔۔۔ وہ خود تخت سے اٹھی اور تیزی سے اس تک پہنچ گئی۔ گردن سیدھی کرکے وہ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگی۔ جیسے پہچان کا یقین مزید پختہ کررہی ہو۔

اردگرد کی ہر چیز پرانے وقت سے جاملی۔ گم گشتہ لمحوں نے۔۔۔ حال سے جیسے ملاپ کرلیا اور ایک ایک چیز نے اپنی اپنی گواہی دینی شروع کی۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔ "دروازہ کھولو نگار بیٹی!" زلیخا بی کی آواز جھکڑ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ جیسے ایک نہیں بیک وقت دس دس زلیخائیں بول رہی ہوں۔

"وہاں ڈھولک بجنا بھی شروع ہوگئی ہے۔" آواز بول کر دور ہٹتی گئی۔

"چھوڑ بھی دو ہاتھ کوئی دیکھ لے گا۔"

"دیکھنے دو۔۔۔" حسن نے کہا تھا۔

"وہ فقرہ دوبارہ بول دو نا۔۔۔ وہ جو تم نے اس رات اس لڑکے سے بولا تھا کہ۔ چھوڑ بھی دو ہاتھ کوئی دیکھ لے گا۔" ہوا میں درجن بھر بھیڑیئے ایک ساتھ چنگھاڑے۔

"میں اس رشتے سے انکار کسی صورت نہیں کروں گی۔"

"میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں۔۔۔ اور نگار سے معافی چاہتا ہوں۔" فرشتوں کو اپنی معصومیت اس بات پر کم لگی ہوگی۔

"پہاڑ کچھ ایسے راز رکھتے ہیں جو ان پر آشکار ہو چکے ہوتے ہیں۔"

"پہاڑ بے بس بھی ہوتے ہیں۔۔۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا۔" کسی بازگشت نے اسے لاجواب کیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"پتھر پہاڑ سے نیچے گر جائے تو وہ پتھر ہی رہتا ہے مگر پہاڑ کا حصہ نہیں۔"

پتھر پر جالا سا تھا۔۔۔ مکڑی کا جالا۔

جھولتا جھولتا مکڑی والا لاکٹ اس کے منہ پر آلگا اور اس کی ساری جان اس کے جسم سے نکل کر اس پر ماتم کرنے لگی۔ اس نے مختلف آوازوں کو خود پر روتے ہوئے سنا۔

سب نے اپنی اپنی گواہی دے دی تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ نانو سمیت آنے والا بھی اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس نے اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرایا۔

"تم۔۔۔ زیان عالم۔۔۔ تم۔" لہجے میں کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں' پھر بھی نانو کے دل میں پورا خنجر اتر گیا۔ فضا میں بجتے ستاروں کی ساری تاریں ٹوٹ گئیں۔ اور زیان عالم نے گردن جھکالی۔

"تم کو تو آنا ہی تھا۔۔۔ زیان عالم۔۔۔ تم کو تو اب آنا ہی تھا۔۔۔ جلد یا بدیر۔۔۔" ایک غرور کے ساتھ بتایا گیا۔۔۔ ایک تکبر کے سے انداز میں۔

"وہ جو رحمن ہے۔۔۔ رحیم ہے۔۔۔ باری ہے۔۔۔ ہادی ہے۔۔۔ جس کے ننانوے نام ہیں۔ مگر بے شمار صفات۔۔۔ وہ کیسے نہ سنتا بھلا۔۔۔ بتاؤ تم کو تو آنا ہی تھا۔"

وہ نجانے کس کس سے ہم کلام تھی۔ نانو نگار کی صورت دیکھنے لگیں۔ انہیں نگار کے ایسے تعلقات پر خوف آیا تھا۔

"نگار! میں تم سے معافی۔۔۔"

"معافی۔۔۔ کس بات کی معافی۔۔۔؟" وہ ہنسی کھوکھلی ہنسی ہنسی۔۔۔ کمرے کے در و دیوار سہم کر پیچھے کو سرک گئے۔ کھڑکی سے باہر سیاہ بادلوں کا اندھیرا چھا گیا۔ آج وہ بھی بنا کسی موسم کے اکٹھے ہو گئے تھے۔ نانو نگار لیکن برسنے کے لیے نہیں۔۔۔ نہ ہی اپنی گونج سنانے کے لیے۔ آج وہ کچھ سننے کے لیے یہاں تک آئے تھے۔

"جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا۔۔۔ اس بات کی معافی۔۔۔" التجا' آنسو' بے بسی۔۔۔ آواز میں سب کچھ شامل تھا۔

"تم نے تو میرے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ مجھے تو اللہ سے شکوہ ہے اس نے عدل کیوں نہ کیا۔ صغیر ربانی سے شکوہ ہے۔ انہوں نے کیوں جھوٹ بولا کہ۔۔۔ انصاف کا خون نہیں ہوتا۔۔۔ زلیخا بی سے ہے۔ انہوں نے کیوں کہا کہ وہ رحمن ہے۔ رحیم ہے۔۔۔ ہمایوں سے ہے۔۔۔ اس نے میری بات کا یقین کیوں نہ کیا کہ انتقام کا کالا موتیا آنکھوں میں اتر آئے تو بہت زیادہ خون بہا ادا کرنا پڑتا ہے۔ خدا یار سے ہے انہوں نے کیوں نہ بتایا کہ کیسے رنگوں۔"

"اللہ نے عدل کیا۔۔۔ عدل ہوا نگار۔۔۔ سلیم کینسر سے مر گیا۔ وہ مرتے دم تک پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہا۔۔۔ میں تنہائی کا قیدی بن کر رہ گیا۔ اس گناہ نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھے بہت بھیانک سزا دی ہے۔ اللہ نے تم نہیں جانتیں تم نے مجھے کیسے کیسے پریشان کیا۔ تمہارے چہرے نے تمہاری یاد نے میری نیندیں حرام کی ہیں۔ میرا سکون چھین لیا ہے۔ میری تمام خوشیاں مجھ سے چھن گئیں۔ تمہارے رونے کی آواز میرے کانوں کو چیرتی رہی۔ تمہاری التجاؤں نے میرے دل میں سوراخ کر دیے۔ تمہارے آنسوؤں"...

"میرے بابا کا ایکسیڈنٹ کروایا تم نے۔۔۔ مصباح کو قتل کروایا۔۔۔ یہ اس سب کا بدل ہو گا۔۔۔ میرا نہیں۔"

"تم مجھے جو مرضی سزا دے لو نگار۔۔۔ پر مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا یار بھی سکون سے مرنا چاہتے تھے۔۔۔ زلیخا بی بھی۔۔۔ میں بھی۔" وہ جو کہہ رہی تھی۔ اس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

"نگار!" اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ ایک دم سے اس کے قدموں میں گر گئے۔

"اللہ کے لیے ہی مجھ پر رحم کرو۔" نگار نے خود کو پرے کیا تھا۔ "اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو وہ بھی نہیں کرے گا۔"

"نہیں۔۔۔ میرا اور اس کا حساب کتاب الگ الگ

ہے اب... میں اس کے نافرمانوں میں سے ہوں... میں معاف کرنے کے درجے سے گر گئی ہوں۔"

وہ خود سے کہتی ہوئی پیچھے ہوئی۔ نانو نے پھر سے گھبرا کے اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت حیرت اور دکھ تھا۔

"تم میری تسلی کے لیے کہہ دو "تم نے مجھے معاف کیا۔"

نانو نے روتے ہوئے زیان عالم کو کندھوں سے تھام کر اٹھایا تھا۔

"کہا نا... اب میں معاف نہیں کر سکتی... اب وہ ہی معاف کر سکتا ہے... مجھے بھی اور تمہیں بھی... اب وہ جو چاہے کرے... وہ آخری شکوہ تھا... اب میرا دامن خالی ہے... اپنے لیے بھی۔" وہ جیسے پھر سے پرانے آسن پر بیٹھ گئی۔

"میں بہت گناہ گار ہوں... مجھے اللہ سے پہلے تم سے معافی چاہیے۔"

"تم مجھ سے زیادہ گناہ گار نہیں ہو... میں نے اسے چال ساز کہا ہے... زلیخالی کو مکارن... صغیر ربانی کو جھوٹا... خدا یار کو۔" وہ پیچھے ہوتے ہوتے اور نجانے کہاں دیکھتے دیکھتے واپس اپنے تخت پر پہنچ چکی تھی۔ سب کو اتنا سب کچھ نہ دینے پر جیسے اسے اب شدید رنج ہو رہا تھا۔

"میں نے اپنی مرضی کو اس کی رضا کے آگے فنا بھی کیا تو اتنا بڑا شکوہ کر کے..." وہ رونے لگی۔ "اب تو مجھے بھی معافی مانگنی ہے اس سے..." وہ خود سے بولی... "وہ آخری شکوہ تھا... آخری پیغام... سب تنگ آ چکے ہیں۔ بادل، بجلی، آندھی، برگد اور میں بھی..." وہ اپنی کھڑکی تک گئی اور باہر منہ کر کے تیز آواز میں چلا اٹھی۔

"بے شمار صفات والے... وہ آخری شکوہ تھا...

آخری پیغام... اس کے بعد صرف رحم چاہیے اور کچھ نہیں۔" اور تخت پر بیٹھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

بوڑھا شہتوت ایسے جھول رہا تھا جیسے زمین کے بھیتر سے کوئی اس کی جڑوں کو ہلا رہا ہو۔ ایک پیغام جو بہت دور سے آیا تھا۔ اسے سن کر دل کی شکل والی چھوٹی چھوٹی پتیاں کانپ رہی تھیں۔ پرانی چھال اتر گئی تھی۔

زل کے بیڈ کے پیچھے کی کھڑکی ہوا کے کسی جھونکے کی طاقت سے پوری کی پوری کھل گئی اور اندھیرے کمرے میں روشنی کی کرنیں ایسے وارد ہوئیں جیسے سورج سارے کا سارا صرف اسی کھڑکی کے باہر موجود تھا۔ زل نے آنکھیں کھولیں تیز روشنی میں چند لمحے تو اسے کچھ نظر ہی نہ آیا۔ پھر اس نے دیکھا... وہ جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رک گیا تھا۔

یشار سورج اور ہوا کے اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں اور منہ سے بند تھی زل التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے وقت کا خوف تھا۔ اس سے کراہت کا اظہار تھا اور اس کی نسبت اپنے وجود سے بھی۔

اس کی طرف بڑھتے یشار کے ہاتھ جامد ہو گئے۔ اندھیرے کا گناہ جیسے روشنی میں پہنچ کر ساری دنیا پر آشکار ہو گیا ہو۔ اس نے اپنا وجود گڑھے میں دھنستا ہوا محسوس کیا اور خود پر برستے پتھر اسے نظر آنے لگے۔

اس کے سامنے بے بس زل تھی۔ اس کی ماں کے گناہ گاروں کی بیٹی... اس کے بھائی کی محبت... اس کے باپ کو سزا دینے کے لیے اس نے اسے اغوا کر لیا تھا اور اب وہ اس کی آہ و بکا اس کے باپ کو سنوانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ مرے نہ تو پاگل تو ضرور ہو جائے۔ اور اس کی آہ و بکا کے وقت وہ خود اپنے کان کیسے بند کرے گا۔ خود کو بہرا ہونے سے کیسے بچا پائے گا۔ وہ عجیب

کشمکش سے گزر رہا تھا۔ سب کچھ تو ٹھیک جا رہا تھا تو کیا ایک روشنی نے سارا کام خراب کر دیا تھا؟ اندھیرے میں اس کا ضمیر بھی اندھا ہو چکا تھا اور اب سب

حسیات جاگ گئی تھیں۔

اس معصوم سے روتے چہرے کو وہ آج بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ یک لخت اسے محسوس ہوا اس چہرے میں بہت کچھ اس کے اپنے چہرے جیسا ہے۔ وہی سیاہ آنکھیں... وہی ناک، وہی ہونٹ، ویسی ہی پیشانی... حیرت سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے لگا اس کے چہرے کے بنیادی حصوں کو اللہ نے زمل کی شکل میں نسوانیت کا روپ دے دیا ہے۔

دائیں بائیں ہاتھوں سے بند تھی... منہ سے جکڑی زمل اسے اپنے ہی وجود کا حصہ لگی۔ اور اپنے وجود کے ساتھ کوئی کیسے زیادتی کر سکتا ہے بھلا... پھٹی پھٹی آنکھوں سے زمل کو دیکھتے ہوئے وہ الٹی چال چلتا ہوا پرے ہونے لگا۔

زمل حیرت سے سب دیکھ رہی تھی اور کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

ہوا کے دوسرے جھونکے نے اسے سب سمجھا دیا۔ جب دروازہ پار کرنے سے پہلے یشار کے چہرے سے کپڑا ہٹا اور اس سے پہلے کہ وہ خود کو چھپا پاتا، زمل نے دیکھ لیا کہ وہ اس کا کوئی دشمن نہیں... نانو کا نواسا... نگار آنٹی کا بیٹا... اور باسل کا بھائی یشار ہے۔

☆ ☆ ☆

"خدایار کا انتقال ہو گیا۔ چار ماہ بعد زلیخا بی بھی ان کے پاس پہنچ گئیں اور ہمایوں کراچی شفٹ ہو گیا۔ سال دو سال بعد آجاتا ہے... نگار اور اس کے بچوں سے ملنے... دو تین دن ہی قیام کرتا ہے بس... صغیر ربانی باسل کی پیدائش سے چند روز پہلے اس دنیا سے چلے گئے تھے۔"

نانو آنسو صاف کرتے --- اور روتے روتے نگار کی زندگی کا خلاصہ بیان کر رہی تھیں۔ چند دنوں سے آنکھیں بھی ڈھیٹ ہو چکی تھیں۔ جانے کیوں بہے جاتی تھیں۔

"نگار زندگی بھر پھر دوبارہ کبھی سنبھل نہ سکی... اس کی تکلیف کم ہونے کے بجائے جیسے روز بروز بڑھتی گئی۔"

"مجھے بھی اپنی تکلیف کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ناسور بن چکی تھی، سدیم کینسر سے مر گیا یا شاید احساس جرم سے... پہلے وہ چھوڑ کر گیا مجھے..." وہ رکے... پھر بولے، آواز اس قدر بھیگ چکی تھی کہ زیادہ تر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

"نہیں... سدیم نہیں... پہلے میری ماں نے چھوڑا مجھے۔" وہ خلاؤں میں دیکھتے دیکھتے ماضی میں گم ہو گئے۔ "میں اسی قابل تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی... میں نے گناہ ہی ایسا کیا تھا۔" زیان عالم بولے اور نانو ٹیبل کی سطح کو گھورتی رہیں۔

"لیکن وہ جا کر واپس بھی تو آسکتی تھیں... وہ میرے منہ پر سو تھپڑ مار لیتیں... ان سے معافی مانگ لیتا اور بس... لیکن اتنی بڑی سزا... یہ سزا... اس سے بڑھ کر تھی جو میں نے نگار کے ساتھ کیا... کہاں کہاں تلاش نہیں کیا میں نے انہیں... فرانس جا کر بھی بے چین رہا لیکن وہ کہیں نہیں ملیں۔"

وہ بولتے رہے اور نانو سنتی رہیں... ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ---- کیا بولیں۔

"سدیم کے بعد بادیہ... یشب... اور اب آخر میں تنہا رہ گیا... میں تنہا رہ گیا... میں نے جو کیا، اس کی سزا بھگت لی... میں مسلسل تکلیف میں مبتلا رہا ہوں... مجھے میرے اپنوں نے سزا دی... اللہ کی سزا تو ابھی باقی ہے شاید... میری ماں تمام عمر کے لیے مجھ سے بدظن ہو گئی... یشب میرا دوست تھا... اور وہ ہی میری بیوی کے ساتھ..."

وہ پھر سے رونے لگے... نانو میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر انہیں چپ کراتیں... ان کا اپنا ذہن ماؤف ہو رہا تھا... ایک بہت بڑے طوفان کی دھمک وہ سن رہی تھیں... بہت بڑا شہاب ثاقب گرنے والا تھا۔ کل رات خواب میں انہوں نے اس شہاب ثاقب کو ٹوٹتے ہوئے تو دیکھ لیا تھا اور اب وہ تیزی سے

اسے اپنے گھر کی طرف بڑھتا ہوا بھی محسوس کر رہی تھیں۔۔۔ یشار، باسل اس گھر میں آنے والے تھے۔ وہ جب اپنی ماں کے مجرم کو اس گھر میں دیکھیں گے تو کیا تب یہ گھر بنیادوں سمیت اکھڑ نہیں جائے گا۔۔۔؟

ان کا دل کیا کہ آگے بڑھ کے گھڑی کی سوئیوں کی رفتار کو روک لیں۔ وقت نہ گزرے۔۔۔ کوئی نہ آسکے اس گھر کے اندر۔۔۔ کوئی نہ آسکے۔۔۔ اور کوئی باہر بھی نہ جاسکے۔۔۔ سب جامد ہو جائے۔

"زمل بھی۔۔۔ اور اب زمل بھی۔۔۔ وہ بھی تو نہیں رہی اب میرے پاس۔۔۔ اس نے بھی مجھے چھوڑ دیا ہے سب کی طرح۔" نانو نے نظریں اٹھا کر اس زار و قطار روتے ہوئے شخص کو دیکھا۔ انہیں اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ اتنا کہ ان کے دل نے الٹی گردش کرنی شروع کر دی تھی۔

"زمل نے تمہیں نہیں چھوڑا۔۔۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔"

"میں اس کی نظروں میں گر چکا ہوں۔۔۔ مجھے پتا ہے اب وہ میرے منہ پر تھوکنا بھی نہیں چاہے گی۔"

"وہ ایسی نہیں ہے۔۔۔ تم اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔"

"وہ سب جان چکی ہے۔۔۔ اب وہ میرے لیے پہلے جیسے جذبات نہیں رکھتی ہو گی۔۔۔ وہ تو رب کے خلاف کام کرتی ہے۔۔۔ پھر اپنے باپ کے خلاف کیسے نہیں ہو گی وہ۔۔۔ کیسے معاف کرے گی مجھے۔۔۔"

"تم ایسا مت سوچو۔۔۔"

"نگار کہتی ہے کہ میں اللہ سے معافی مانگوں۔۔۔ میں اللہ سے معافی کیسے مانگوں؟ میں اس کے پاس اپنا گناہ گار چہرہ لے کر کیسے جاؤں۔۔۔؟ یہ چہرہ تو میں اب زمل کو بھی نہیں دکھا سکتا۔۔۔ اللہ کو کیسے دکھاؤں گا۔"

"اللہ صورتیں نہیں دیکھتا زبان! اس کے نزدیک معافی اور توبہ کا احساس ہی افضل ہے۔۔۔" نانو کی آنکھیں پھر سے لبالب بھر گئیں۔

"میں توبہ کرنے کے لائق بھی نہیں رہا اب۔۔۔ معافی مانگنے کے بھی نہیں۔۔۔ نہ نگار سے، نہ اپنی ماں سے۔۔۔ نہ اللہ سے۔" چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

"شاید میرے پاس توبہ کرنے کی مہلت بھی نہیں ہے۔۔۔ میں موت کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔"

"ایسی باتیں مت کرو زبان۔۔۔!" نانو کی کانپتی آواز نکلی۔ "اللہ معاف کرنے والا توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔۔۔ تم سچے دل سے اللہ کو پکارو۔۔۔"

"ہاہاہا!" اس نے پاگلوں کی طرح زوردار قہقہہ لگایا اور پھر لگاتی ہی چلی گئی۔

لہلہاتے کھیتوں کی فصل حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے پرے شفاف آسمان تھا۔ کیا کمال کا کھیل کھیلا گیا تھا اس کے ساتھ۔ پھر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ دھپ سے زمین پر گری اور گھٹنوں میں منہ دے کر رونے لگی۔

بڑی رازداری اور خاموشی سے آج صبح اسے رہا کر دیا گیا تھا۔ جب سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ یشار ہے۔ وہ بالکل مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے کوئی واویلا نہیں کیا تھا۔ خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اللہ کے حضور فریادیں نہیں بھیجی تھیں۔ سب کچھ تو واضح ہو گیا تھا۔ یقیناً" یشار سب جان گیا تھا اور اب اس کے باپ کے کیے کا بدلہ اس سے لے رہا تھا۔ لفٹ میں اسی نے اس کے منہ پر نم رومال رکھ کر اسے بے ہوش کیا تھا۔ اور یہاں تک بھی اسے وہ ہی لایا تھا۔

کل رات اس کے قدموں کی آہٹ پا کر اس کی آنکھ کھلی۔۔۔ اس نے ایسا ہی ظاہر کیا جیسے وہ سو رہی ہے۔ باری باری اس کے دونوں ہاتھ کھول دیے گئے۔ کپڑا اب وہ خود بھی ہٹا سکتی تھی۔ اپنے چہرے سے بھی اور یشار کے چہرے سے بھی۔ آنے والے کو دھکا دے کر وہ باہر بھی جا سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ اب وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یشار کیا کرتا ہے۔ وہ اس بدلے کو کہاں تک لے کر جاتا ہے۔ کھانے کے چند پارسل بیڈ

پر رکھ کر وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔

زل نے وہ کھانا کھا لیا تھا۔ وہ بھوکی تھی اور بھوک سے احتجاج کرنے کی کوئی وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ سارا کھانا کھا گئی۔ اب اسے صبح کا انتظار تھا۔ یشار کی دوبارہ آمد کا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آگے وہ کیا سوچ رکھتا ہے۔ کیا وہ اس کا اغوا کر کے اس کے ڈیڈ کو بلیک میل کر رہا ہو گا۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اب جو ہونا ہو گا وہ ہو گا۔ اسے اب اس کمرے سے باہر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ لیکن یشار پھر وہاں دوبارہ نہیں آیا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ باہر کی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ دہلیز پر اس کا ہینڈ بیگ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ہینڈ بیگ کھولا۔ ہر چیز موجود تھی۔ دروازے سے باہر جھانکا تو باہر سناٹا تھا۔۔۔ روشن سناٹا۔

تو کیا اسے آزاد کیا جا رہا ہے۔ جوتی پہن کر وہ بڑی آہستگی سے باہر نکلی اور خاموش راہداری پار کر کے صحن میں آ گئی۔ وہ جگہ بڑی عجیب تھی۔ مٹی کی دیواروں سے بنا گھر۔۔۔ زل کو وہ کوئی پرانا قلعہ محسوس ہوا۔ جس کے چاروں طرف کی زمین بنجر تھی اور بہت دور ہریالی۔۔۔

گھر کا بیرونی گیٹ بھی کھلا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے یشار بھائی! یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ اپنے ہاتھ کی لکیروں کا جال مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آسکا۔۔۔ آپ کے جال کی گرہوں کو کیسے سمجھ پاؤں گی میں؟"

یہ سب سوچتے سوچتے وہ بیرونی گیٹ سے بھی باہر نکل آئی اور اب گھٹنوں میں منہ چھپائے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

کیا کرنے جا رہی تھی وہ۔۔۔ اور اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔۔۔ اس کا دل چاہا نگار آنٹی کی طرح آج وہ بھی ایک پیغام بھیجے۔۔۔ پوری قوت سے چلا کر۔۔۔ اپنے کسی پیارے کو نہیں۔۔۔ بلکہ اپنی قسمت لکھنے والے کو۔۔۔ وہ اس سے پوچھے۔۔۔ ان دو راتوں کا حساب۔۔۔ جو اس نے باہر انجان جگہ پر گزاری تھیں۔۔۔ ان دو راتوں کے بارے میں جس کسی کو بھی پتا چلے گا کیا وہ اس کی پاک دامنی پر یقین کرے گا۔۔۔ یہ یقین تو اب اسے بھی اپنے اوپر نہیں رہا تھا۔

☆

"آپ زل کو بلا دیں۔۔۔ وہ کہاں ہے۔ میں آخری بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کچھ زیادہ بتا کر نہیں گئی مجھے۔۔۔ کسی دوسرے شہر گئی ہے۔۔۔ اس کا نمبر بھی بند جا رہا ہے۔۔۔ لیکن شاید یشار کو پتا ہے اس کا۔۔۔ اس نے کہا ہے کہ وہ آ رہی ہے۔" نانو نے بتایا اور زیان عالم نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"آپ مجھ سے وعدہ کریں۔۔۔ میرے مرنے کے بعد آپ زل کا خیال رکھیں گی۔۔۔ جس طرح آپ نے نگار کا رکھا۔۔۔ اپنی بیٹی سمجھ کر۔" زیان عالم نے ایسے التجائیہ لہجے میں کہا کہ نانو کے آنسو مزید متواتر ہو گئے۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو زیان۔۔۔ تم خود زل کا خیال رکھو گے۔"

"زل نے مجھے باسل کے بارے میں بتایا ہے۔۔۔ وہ باسل سے بہت محبت کرتی ہے۔۔۔ آپ دونوں کی شادی کرا دیجیے گا۔ اسے یہاں رکھ لیجیے گا۔ اس کی ماں کے پاس نہ بھیجیے گا۔ زل خود بھی شاید یہیں رہنا چاہتی ہے۔۔۔ باسل اچھا لڑکا ہے میں مل چکا ہوں اس سے وہ زل کا خیال رکھے گا۔"

"ہاں' وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔۔۔" نانو خلا میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

صبح اس گھر میں زیان عالم کی آمد سے پہلے۔۔۔ نانو نے بہت ہمت کر کے باسل کو فون کیا تھا۔

"میں ایئرپورٹ کے لیے نکل رہا ہوں۔۔۔ گھر آ کر بات کرتے ہیں۔" اس نے دو ٹوک کہا اور اس کے لہجے نے نانو کو تشویش میں مبتلا کیا۔

"گھر آ کر کیا بات کرتے ہیں۔" وہ فکر مند ہوئی تھیں۔ بے خبر نانو نہیں جانتی تھیں کہ باسل تو کچھ جانتا ہی نہیں۔ اور جو جانتا ہے۔ جان گیا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔

کاش نانو نگار کی اس بات کہ "یشار زیان کا بیٹا ہے" سے پرے بھی کچھ سوچتیں' بات بتانے سے پہلے والی اس کی بے چینی کو کوئی اہمیت دیتیں۔ جسے انہوں نے اس کی ذہنی بدحواسی جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔ یا شاید وہ راز ہی اتنا بڑا ان پر کھلا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچنے کی قوت ہی نہیں رکھتی تھیں۔

انہوں نے یشار کو بھی فون کیا تھا۔

"کل رات سے کہاں ہو تم یشار...؟"

"میں آرہا ہوں..." یشار نے بڑی دیر بعد جواب دیا۔ اس کی آواز نے نانو کو چونکایا۔

"زمل کا کچھ پتا ہے..."

"وہ بھی جلد ہی آجائے گی..."

اور اب سارے آنے والے تھے۔

"آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض تو نہیں..." انہوں نے بھیگی آنکھوں سے پوچھا' نانو نے اپنی آنکھوں کے آنسو ضبط کرتے ہوئے "نفی" میں گردن ہلائی۔

"آپ کسی کو کچھ مت بتایئے گا... زمل کو بھی منع کر دیجیے گا... اور نگار... اسے منا لیجیے گا... وہ مان جائے گی نا... میری موت کے بعد تو ضرور مان جائے گی وہ... اسے اللہ کا واسطہ دیجیے گا... وہ میرے کیے کی سزا میری بیٹی کو نہ دے... اس کی خوشیوں کو قتل نہ کرے۔"

نانو کا ہاتھ تھامے وہ کہے جا رہے تھے۔

"آپ سب کی نانو ہیں نا... آپ زمل کی بھی نانو بن جایئے گا۔" نانو نے چونک کر زیان عالم کو دیکھا۔

"کیا آپ زمل کی نانو بن جائیں گی؟" نانو خاموش رہیں۔

"میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت زمل سے کی ہے... بدقسمتی سے میں اسے کبھی کوئی خوشی نہ دے سکا... آپ وعدہ کریں کہ آپ اس سے اس کی یہ خوشی نہیں چھینیں گی۔ اسے کوئی دکھ پہنچا تو میری روح کو چین نہیں آئے گا۔"

"تم ریلیکس ہو جاؤ زیان... تم خود سب سے بات کرنا... باسل آنے والا ہے' سب آنے والے ہیں..."

یشار بھی... اور یشار تو..." نانو مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ اور جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھیں... ان کے دل کی حرکت بند ہونے لگی تھی۔

"میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں..." کہہ کر وہ بنا زیان عالم کی بات سنے جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"کل رات سے کہاں ہو تم یشار؟" نانو پوچھ رہی تھیں۔ یشار نے اپنے آنسو صاف کیے۔

"میں آرہا ہوں۔"

"زمل کا کچھ پتا ہے؟"

"زمل..." وہ سوچنے لگا اور اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ یقیناً "اس وقت تک وہ وہاں سے باہر نکل چکی ہو گی۔

"وہ بھی جلد ہی آجائے گی۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

سوجی آنکھیں پھر سے چھلکیں۔ کل کے فیصلے پر اس نے صبح ہی عمل درآمد کر لیا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی تھی۔ اتنے سے وقت میں ہی اس کے کھاتے میں نجانے کتنے گناہوں کا اندراج ہو چکا تھا۔ جو وہ مزید دیر کرتا تو شاید مکمل جہنمی ہو جاتا۔

اب اپنے ضمیر سے آنکھیں ملانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا ضمیر تو ویسے بھی نازک جھلی کی طرح کا تھا۔ ذرا سی گرم سرد ہوا کو محسوس کر لیتا تو دونوں پہلی والی حالت میں نہ آپاتا۔ اب تو پھر اس کے اندر کا چور چیخ چیخ کر اس کا جرم اس کے دماغ کی رگوں میں لاوے کی صورت بہا رہا تھا اسے قرار کیسے آتا...

کیا کرنے والا تھا وہ...؟ کیوں...؟ یہ فیصلہ اس نے کیسے کر لیا کہ اپنی ماں کی بے حرمتی کا بدلہ وہ خود لے گا۔ وہ یہ کیسے بھول گیا تھا کہ اس کائنات کا ایک رب بھی ہے۔ جس کی حکمت اس کی سوچ سے کہیں بڑھ کر ہے۔

یشار نے یہ کھیل بنا سوچے سمجھے کھیلنا شروع کیا

تھا۔ اس نے نانو کی ساری بات سنی اور وہ اپنی ماں کے حوالے سے اپنے جذبات میں اندھا ہو گیا۔ باسل کو اسلام آباد روانہ کر کے وہ زمل کو اغوا کر کے اپنے ایک دوست کے آبائی گھر لے گیا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ یہ کھیل کھیل نہ رہا۔۔۔ اس کے باپ کے کیے کے بدلے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی ذات کا قاتل بھی بننے لگا۔ جب تیز دھوپ میں اس کا ضمیر جاگا۔

وہ ایسا تو نہیں تھا۔ یہ سب کرنے کی سوچ کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کے اندر۔ نانو نے اس کی تربیت کیا ایسی کی تھی۔ انہوں نے تو ہر ایک مرحلے پر دونوں کی بڑے اچھے سے رہنمائی کی تھی۔

کل رات اس کی غیر حاضری کے باعث نانو نے بارہا اسے کال کی۔ اس نے ان کی کال ریسیو نہیں کی۔ اسے ڈر تھا نانو اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے سب جان جائیں گی۔ وہ جان جائیں گی کہ ان کا نواسا گناہ کر چکا ہے۔ یا گناہ کے ارادے کا مرتکب تو ضرور ہی ہو چکا ہے۔ اسے ایک خوف یہ بھی تھا کہ نانو اس بار بھی کوئی راز نہ فاش کر دیں اور اب کی بار وہ سانس لینے کے قابل بھی نہ رہے۔

زیان عالم جس کا وہ علاج کر رہا تھا۔ دوسرے مریضوں کی طرح جس کے لیے وہ اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ماں کی خوشیاں ختم کرنے کا ذمہ دار تھا۔۔۔ اور اس کی بیٹی ان کے گھر ہی موجود تھی۔۔۔ سب جان لینے کے بعد اس نے یہ غلطی تو کرنی ہی تھی۔۔۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس نے خود کو تسلی دینا چاہی لیکن دے نہ سکا۔

تمام عمر نگار نے ایک کمرے میں بند رہ کر کوئی سزا کاٹنے کی سی زندگی گزار دی تھی۔ وہ تو خود نفسیات کا ماہر تھا۔ اپنی ماں کا علاج کرنا کیسے نہ جانتا۔ اپنی ماں کی ذہنی کیفیت کی وجہ کیسے نہ جان پاتا۔۔۔ اگر نانو اسے منع نہ کر دیتیں۔۔۔ اپنے سر کی قسم نہ اٹھواتیں تو۔۔۔

"تمہاری ماں کا علاج اب صرف اللہ ہی کر سکتا ہے۔" نانو نے کہا تھا۔

یشار نے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے۔ وہ

شاید زندگی میں پہلی بار رو رہا تھا۔۔۔ اور اس رونے کی وجوہات کتنی زیادہ تھیں۔۔۔ نگار، زل اور اپنا ضمیر۔۔۔

☼ ☼ ☼

نانو کی آنکھوں کے آگے جیسے دھند چھا گئی تھی۔ انہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک گلاس پانی بھرنا ان کے لیے مشکل تر ہو گیا تھا۔ نجانے یہ کس کس بات کے خوف کی بے چینی تھی۔ جو ہاتھوں سمیت ان کا پورا وجود بھی کانپ رہا تھا۔

سنک کا نلکا کھولا تو اسے کھلا ہی رہنے دیا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالنے لگیں تو کچھ سامان نیچے گر گیا۔ گلاس میں مشروب کا پاؤڈر حل کرنا چاہا تو ڈبہ الٹ دیا اور آخر میں گلاس ضبط کی انتہا کے باعث ان کے ہاتھ میں ہی ٹوٹ گیا۔ انہیں اپنے منتشر رویے کا تب احساس ہوا جب گلاس ٹوٹنے کی آواز ان کے کانوں میں گئی اور کانچ کی نوک نے ان کی انگلی سے خون جاری کر دیا۔

چھوٹے سے کچن میں جیسے طوفان آیا ہوا تھا۔ خون نکلتی انگلی تھام کر وہ ایک آہ بھر کر رہ گئیں۔ یہ بے ضرر چوٹ انہیں اتنی شدید محسوس ہوئی جیسے دھرتی پر کدال مار مار کر کوئی آج ہی کنواں نکال لینا چاہتا ہو۔

باہر برآمدے میں ایک آدمی بیٹھا تھا۔۔۔ زیان عالم جو رو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اس نے زندگی ایک اذیت میں گزاری ہے۔ ایک مسلسل تکلیف میں اور اندر ایک نگار بیٹھی تھی۔۔۔ جو زندگی بھر ان کے سامنے ہی چلاتی رہی تھی۔ اس کا درد ان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس کے روگ نے انہیں جوگ دے دیا تھا۔ کھڑکی سے پرے میدان کا بادشاہ تھا۔۔۔ برگد۔۔۔ جو شاید۔ خود غرض تھا۔ موٹی چھال کو اپنے کانوں پر چڑھا کر وہ بہرہ ہو جانے کی کیا خوب اداکاری کرتا رہا تھا۔

نانو نے اپنی خون بہاتی انگلی سنک کے تیز دھار والے نلکے کے نیچے کر دی۔ اور ٹکٹکی باندھ کر باہر دیکھنے لگیں۔ کیا وہ بھی اسی درخت کی طرح خود غرض تھیں۔ بہری ہو چکی تھیں۔۔۔ انہیں لگا برگد کا ایک ایک پتا ان پر ہنس رہا ہے۔۔۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اب ہی تو اصل آزمائش کا وقت آیا ہے۔

نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ وہ جانتی تھیں اذیت میں تھیں نگار۔۔۔ زیان اور تیسری وہ خود۔ انہیں اپنی تو کوئی پروا نہیں تھی۔۔۔ اور باقی سب کی اذیت کا حل چپکے سے ان کے ذہن میں وارد ہوا تھا۔۔۔ وہ آنے والے وقت کو روک سکتی تھیں۔ گرنے والے شہاب ثاقب کا رخ اپنے گھر سے کہیں اور کر سکتی تھیں۔ بس نانو کو اپنے سر ایک گناہ ہی تو لینا تھا۔ وہ لمحہ شیطانی تھا یا خود احتسابی نانو اس لمحے کی قید سے آزاد نہیں ہو سکی تھیں۔ وہ ضرور انصاف کریں گی نگار کے ساتھ۔۔۔ انہوں نے سوچا اور پھر ہمیشہ کی طرح جلد ہی فیصلہ کر لیا۔ جلد فیصلہ کرنے میں نانو کی قوت ارادی بڑی زبردست تھی۔

اپنے کمرے سے جا کر نانو نیلا تھوتھا (زہر) لے آئیں۔ جو تو ادویات بنانے میں کام آتا تھا۔

گلاس کو انہوں نے ٹھنڈے پانی سے بھرا۔ پھر اس میں زہر ملایا۔ جوس پاؤڈر اور اپنے آنسو بھی۔۔۔ اس بار کچھ غلط نہ ہوا۔۔۔ بلکہ پہلے والا طوفان بھی جیسے تھم گیا۔ زیان عالم کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ تینوں چیزوں کو پانی میں گھولنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

دو سڑکوں کے درمیان کی نہر سوکھی تھی۔ اور نیچے کی گندگی ابل کر باہر آ گئی تھی۔ نہر کے دائیں بائیں ایستادہ درخت پانی کی تلاش میں مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ یا شاید وہ خود ایسی کیفیت میں مبتلا تھی کہ اسے ہر چیز اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے رواں دواں تھی اور اسے گھر پہنچنے کی بالکل بھی جلدی نہیں تھی۔ گھر واپس جانے کا فیصلہ بھی بہت دیر سوچنے کے بعد ہوا تھا۔ وہ نانو کا سامنا کیسے کرے گی۔ وہ تو ان سے شہر سے باہر جانے کا کہہ کر آئی تھی۔ پھر اس کی حالت دیکھ کر کیا وہ پوچھیں گی نہیں کہ وہ دو دن کس قبر میں گزار کر آ رہی ہے۔ اس بار تو اس سے جھوٹ بھی نہیں بولا جائے گا۔ اسے ڈر

تھا ان کے گلے لگ کر وہ رونے لگ جائے گی۔

باسل... وہ گھر آچکا ہو گا اور اسے سب بتا دینے کا مرحلہ جوں کا توں ہو گا... یشار بھائی وہ ان کا سامنا کیسے کرے گی۔ وہ نہیں جانتے پر وہ تو انہیں دیکھ چکی تھی۔

یہ سب تب کی صورت حال تھی اگر اس کے باپ کے بارے میں ابھی تک یشار ہی جان پایا تھا اور اگر سب جان چکے تھے تو پھر تو اس کا اس گھر میں جانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ وہ وہاں جا کر یقیناً" اس سے زیادہ ذلیل و رسوا ہونے والی تھی۔

باسل اور یشار اسے دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیں گے۔ نانو بھی اسے گلے لگانے کے بجائے اس کے منہ پر تھوک دیں گی۔

اگر اس کے اغوا کا مقصد اس کی عزت کے ساتھ کھیلنا ہی تھا تو وہ پیچھے کیوں ہٹ ... اپنی مظلومیت کو لے کر اس کے پاس کچھ تو ہوتا کہ دیکھو میرے باپ نے تمہاری ماں کے ساتھ اگر یہ سب کیا ہے تو اسی ماں کے بیٹے نے میرے ساتھ بھی یہ سب کر لیا۔ حساب برابر ہو گیا۔

اور درمیان کے تیس سال...؟؟؟

کیا نانو 'باسل اس سے اس کی بابت نہیں پوچھیں گے۔ کیا وہ اس کے لیے گھر کے دروازے دل سمیت کھولے رکھیں گے۔

سوچتے سوچتے وہ پاگل ہونے لگی۔ اس کے پاس اس وقت کوئی بے جان کھلونا بھی تو نہیں تھا جس کے گلے لگ کر وہ رو سکتی۔

ٹیکسی رواں دواں تھی۔ وہ حبیب اللہ روڈ سے کافی فاصلے پر تھی جب اس کا موبائل فون بج اٹھا۔ ڈیڈ کی کال تھی۔ اس نے ریسیو نہیں کی۔ وہ ایسی حالت میں نہیں تھی کہ ڈیڈ سے بات کر سکتی۔ موبائل بند ہو کر دوبارہ بجنے لگا... تیسری بار... اور چوتھی دفعہ اس نے فون اٹھا لیا۔

"زمل... میری جان...!" اسے حسب توقع ڈیڈ کی آواز سنائی دی... پر یہ آواز آج اتنی تھکی ہوئی اتنی زور سے آ رہی تھی کہ زمل لمحے بھر میں اپنی ساری پریشانیاں بھول گئی۔

"کہاں ہو تم زمل؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی ان کا دم گھونٹ رہا ہو۔

"ڈیڈ... آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"جلدی آجاؤ زمل... میرے پاس..." زمل کے دل کی دھڑکنیں بڑھیں۔

"ڈیڈ... سب ٹھیک تو ہے؟... ڈیوڈ کہاں ہے؟"

"میں مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں زمل!"

اکھڑے سانسوں کے ساتھ کہا گیا۔ اور ٹیکسی سمیت سڑک بھی زمل کے قدموں تلے سے نکل گئی۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں ڈیڈ... میں جلد ہی آجاؤں گی اب... اور اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی" بولتے بولتے وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں باسل کے گھر میں ہوں..." بتایا گیا۔ زمل کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"کیا؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "آپ نانو کے گھر میں ہیں...؟"

"ہاں... تم مجھے یہاں ہی بلانا چاہتی تھیں نا؟"

"آپ... وہاں... تو کیا آپ نگار آنٹی..." وہ پوچھ نہ سکی اور رونے لگی۔

"سوال مت کرو جان... میری سانسیں اکھڑنے لگی ہیں... میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"خود کو سنبھالیے ڈیڈ... خدا کے لیے... میں آ رہی ہوں۔" روتے روتے اس نے فون بند کیا اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی۔

"گاڑی تیز چلائیے... پلیز..."

☆ ☆ ☆

سفر سوچ سے زیادہ طویل ہو گیا۔ اتنا وقت تو اسے فرانس سے لاہور آنے میں نہیں لگا تھا جتنا اسی شہر میں رہتے ہوئے حبیب اللہ روڈ آنے میں لگ گیا۔ وہ گھر کے قریب پہنچی تو اس کا موبائل دوبارہ سے بج اٹھا۔ تیزی سے وہ گھر کا دروازہ کھولتی۔ بھاگتی ہوئی اندر داخل

ہوئی۔

زیان عالم برآمدے میں لگے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اور اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کا آدھا جسم نیچے ڈھلکا ہوا تھا۔

"ڈیڈ...!" وہ چلاتی ہوئی ان کے قریب گئی۔

"زمل... میری جان آ گئیں تم۔" وہ بمشکل بولے "میرے قریب ہو جاؤ زمل... میرے سینے کے ساتھ لگ جاؤ... اس طرح موت کی سختی مجھ پر کم ہو جائے گی۔"

"ڈیڈ... کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اس نے مجھے معاف نہیں کیا... مجھے خدا کے روبرو کر دیا... اس نے مجھے معاف نہیں کیا۔" انہوں نے بتایا۔ زمل کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں ڈیڈ!"

"نہیں... اب میں پریشان نہیں ہوں... اب میں سکون میں ہوں... میں اللہ سے ہی معافی مانگوں گا... اس کے پاس جا کر۔"

"ایسی باتیں مت کریں ڈیڈ... خدا کے لیے ایسی باتیں مت کریں..." ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں سختی سے بھینچتے ہوئے وہ آنسوؤں کے ساتھ التجا کرنے لگی۔

"تم میرے لیے دعا کرو گی نا زمل... جیسے تم سدیم کے لیے کیا کرتی تھیں۔"

"میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی ڈیڈ...! میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے ان کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

"اب مجھے مت روکو زمل... میں تنگ آ گیا ہوں اپنے گناہوں سے بھاگتے بھاگتے۔"

"آپ کو میری خاطر زندہ رہنا ہے ڈیڈ... میری خاطر... اپنی بیٹی کی خاطر۔"

"تمہارے پاس اب بہت سے لوگ ہیں... تم واپس مت جانا... یہیں رہ لینا... میں نے بات کر لی ہے... باسل... اچھا... لڑکا ہے۔"

ان کی آواز رک رک کر نکلنے لگی۔ زمل کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ ٹیبل پر پڑا گلاس خالی تھا۔ پانی لینے وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگی... جلدی جلدی سے اس نے گلاس بھرا اور اسی تیزی سے وہ باہر جانے لگی تھی جب اچانک سے وہ رک گئی۔

کچن کی شیلف پر بلیو وڑائل کی شیشی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے شیشی کو ہاتھ میں پکڑ کر آنکھوں کے سامنے کیا اور اس کا چہرہ بگڑ کر بھیانک ہو گیا۔ چند لمحے وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

"میرے ڈیڈ کو زہر دے دیا گیا... زہر دے دیا گیا میرے ڈیڈ کو..." اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔

"نانو...!" پھر وہ پوری قوت سے چلا اٹھی۔ "آخر آپ نے اپنی بیٹی کا بدلہ لے ہی لیا میرے ڈیڈ سے..." دکھ، غم، صدمے اور غصے سے اس کا پورا وجود تپنے لگا۔ بے بسی سے روتے روتے وہ واپس باہر آئی۔ پانی کے گلاس کو اس نے ڈیڈ کے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔

"اس تردد کو چھوڑ دو زمل... میری نظروں کے سامنے ہو جاؤ... میں مرتے وقت تمہارا چہرہ آنکھوں میں بسا کر جانا چاہتا ہوں۔"

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا ڈیڈ... آپ کو کچھ نہیں ہو گا..." گردن میں بازو ڈال کر اس نے ان کا سر اوپر اٹھایا اور ان کے ادھ کھلے ہونٹوں پر پانی انڈیلنے لگی۔ اسے پتا تھا اب ان چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈیڈ بالآخر اس سے دور چلے جائیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

"میرے سینے کے ساتھ لگ جاؤ زمل... موت کی بگھی میرے بہت قریب آ چکی ہے۔ بہت بھیانک گھوڑا ہے اس بگھی کا... ہیبت ناک... اس کی آنکھیں خوں خوار ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے کی زمین پھولوں سے مہک رہی ہے۔ میں وہ مہک محسوس کر رہا ہوں۔" وہ خود سے بڑبڑائے۔ زمل ان کے سینے کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔

"میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی ڈیڈ!" بے چارگی سے اس نے کہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ڈیڈ۔۔۔ ڈیڈ۔۔۔" وہ ان کے سینے سے اٹھی۔ اور دیوانہ وار ان کے گال تھپتھپانے لگی۔ سانسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بولنے کی بھی۔۔۔ لیکن ناکام ہو رہے تھے۔

"ہوش میں آئیے ڈیڈ۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ میرے لیے۔"

تب ہی برآمدے میں دو افراد اکٹھے داخل ہوئے۔ گھر کے دروازے سے باسل۔۔۔ اور اندر کمرے سے نماز پڑھ کر آتی نانو۔۔۔ آج ان کی نماز اور ان کی دعا۔۔۔ دونوں بہت طویل تھیں۔

دونوں نے زیان عالم کو صوفے پر گرے اور زل کو ان کا وجود ہلاتے جلاتے دیکھا اور سکتے میں آ گئے۔

"کیا ہوا؟۔۔۔ کیا ہوا؟" دونوں نے کہا۔ نانو تیزی سے زل اور زیان عالم کی طرف بڑھیں۔ زل نے نخوت سے انہیں پرے کیا اور غصے سے چلائی۔

"دور ہو جائیں نانو۔۔۔!" نانو لڑکھڑا کر دور ہوئیں۔ یک لخت ان کا چہرہ چٹان ہوا تھا۔ باسل حیرت کی انتہا پر پہنچا۔ سارا منظر دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا زل۔۔۔؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"تمہاری نانو نے میرے ڈیڈ کو زہر دے دیا ہے باسل۔۔۔!" روتے روتے زل نے دہائی دی تھی۔

زل کی بات سن کر بھی باسل جیسے کچھ نہیں سمجھا' اس نے نانو کو دیکھا۔ جو کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھیں۔

"تم کیا کہہ رہی ہو زل۔۔۔؟" بھیگی آنکھوں۔۔۔ بھیگی آواز سے نانو نے پوچھا۔ وہ دوبارہ سے اس کے قریب ہوئیں۔ زل نے پھر سے انہیں شدت سے پرے کیا تھا۔

"میں سب جانتی ہوں نانو! آپ نے نگار آنٹی کا بدلہ لیا ہے۔۔۔ اپنی بیٹی کا۔۔۔ میرے ڈیڈ کو زہر دے کر۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو زل؟" نانو بھی رونے لگیں۔

"میں نے کچن میں زہر دیکھ لیا ہے نانو۔۔۔ کیا آپ نے ایسا نہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔ نانو خاموش ہو گئیں۔ ان کے گناہ کا ارادہ اس طرح آشکار ہو جائے گا' وہ نہیں جانتی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ میں نے زہر ملایا تھا۔۔۔ پر میں نے وہ پانی بہا دیا۔ زیان کو نہیں دیا۔" انہوں نے اعتراف کیا۔ باسل نانو کو ایسے دیکھنے لگا جیسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

"جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔۔۔" زل چلائی۔ نانو نے سر جھکا لیا۔

زیان عالم کو زہر دینے کا فیصلہ جتنی جلدی ہوا تھا' اتنی جلدی ختم بھی ہو گیا۔ وہ فیصلہ سلیمانی کی طرح ٹھوس تھا تو مور پنکھ کی طرح نازک بھی۔ انصاف کا جو ترازو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس ترازو کی ڈوریاں ان کے ہاتھ میں ہی جل گئی تھیں۔ نگار نے اسے خدا کے روبرو کیا تھا۔۔۔ ان کے تو نہیں۔۔۔ پھر نگار کا بدلہ لینے کا انہوں نے خود کیسے سوچ لیا۔ وہ زہر دے دیتیں اگر تھوڑی دیر تک بے ضمیر ہی رہتیں تو۔۔۔ اپنی ذات کے سارے ہی عقدے ان پر عیاں تھے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ زہر ملا پانی بہا کر وہ بڑی دیر تک کچن میں کھڑی روتی رہی تھیں۔

اور اللہ کو ان کا یہ ارادہ کرنا بھی برا لگا تھا شاید جو زل کو ان چھپے ہوئے لمحوں کا پتا چل گیا تھا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا نانو۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ میرے ڈیڈ معافی مانگنے ہی تو آئے تھے۔۔۔ پھر آپ نے ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" وہ روتے روتے بولتی گئی۔

"نانو! زل کیا کہہ رہی ہے۔ کون سی معافی۔۔۔ کیسا بدلہ' یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ خدا کے لیے کوئی مجھے بھی کچھ بتائے۔" باسل نے نانو کے وجود کو جھنجھوڑا۔

"میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی نانو! کبھی بھی نہیں۔۔۔ اس معصوم چہرے کے پیچھے آپ اتنی بھیانک۔۔۔ ہیں۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ ورنہ میں اپنے ڈیڈ کو یہاں بھی نہ بلاتی۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا زل۔۔۔ میرا یقین کرو۔۔۔" نانو بے بسی سے رونے لگیں۔

"اپنے گناہ کو مت چھپاؤ نانو۔ بتادیں کہ آپ نے میرے ڈیڈ کو زہر دیا ہے۔" زمل پھر سے اپنے ڈیڈ پر جھکی۔ عین اسی وقت زیان عالم نے ہچکی کی صورت آخری سانس لی اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

"ڈیڈ... !" زمل کی آنکھیں بنجر ہو گئیں۔ آواز خاردار جھاڑیاں... ڈیڈ جا چکے تھے۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ یہ حقیقت ماننے میں اسے ایک عرصہ درکار تھا۔ ان کے سینے سے لپٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں زہر کیسے دے سکتی ہوں..." نانو نے سکتے میں جاتے ہوئے کہا۔ اور مزید ایک اور جملہ بولا۔ جس نے باسل کو اپنی جگہ پر پتھر کا کر دیا۔ اور روتی زمل کو بھی چونکا دیا۔ وہ اپنا رونا بھول گئی۔ اور ڈیڈ کے سینے سے سر اٹھا کر حیرت سے نانو کو دیکھنے لگی۔

نانو نے وہ فقرہ دوبارہ دہرایا۔ اور پھر اسے دہراتے دہراتے برآمدے سے باہر نکل گئیں۔ گھر کا دروازہ کھول کر گھر سے باہر بھی...

سنسان سڑک پر تیزی سے بھاگتے بھاگتے اور وہی فقرہ کہتے کہتے انہوں نے اپنے دونوں بازو کھول لیے۔ جیسے سورج کو اپنی آغوش میں بھر لینا چاہتی ہوں۔ بانس کے درختوں سے گھرا حبیب اللہ روڈ اس فقرے کی بازگشت سے کافی دیر تک گونجتا رہا۔ نانو بھاگتی رہیں بھاگتی رہیں۔

"ایک ماں اپنی سگی اولاد کو زہر کیسے دے سکتی ہے ایک ماں اپنی سگی اولاد کو زہر کیسے دے سکتی ہے..." اور چلاتی رہیں... چلاتی رہیں... "ربا۔" صدمہ سے چکرا کر گلناب عالم گرم سڑک پر گر گئیں۔

☼ ☼ ☼

"نگار... نگار... کوئی نگار کا بتائے مجھے... کوئی اس کے پاس لے جائے مجھے..." گلناب عالم دیوانوں کی طرح صدائیں لگا رہی تھیں۔ جنونیوں کی طرح چل رہی تھیں اور بھٹکے ہوؤں کی طرح ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک رہی تھیں۔

"سنو... ایک لڑکی تھی نگار نام تھا اس کا۔ گوری سی، لمبے بال بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، خوب صورت سی... جس کو پہلی بار دیکھ کر میں خود حیران رہ گئی تھی۔"

"ایسی تو کوئی لڑکی نہیں رہتی یہاں..." انہیں جواب ملا۔ اور بار بار یہ ہی جواب ملا۔ ان کی دیوانگی بڑھنے لگی۔ اب وہ ایسی رہی بھی کہاں ہوگی۔ کیا اس کا روپ، اس کی خوب صورتی اس کی آنکھوں کی روشنی باقی بچی ہوگی۔

"سنو... سنو... ایک لڑکی ہے... نگار نام ہے اس کا... جلی ہوئی رنگت... مردہ چہرہ... بدصورت، پھٹکاری ہوئی سی... ماتھے پر تقدیر کا بہت بڑا زخم ہے۔" وہ روتی رہیں... ایک ایک سے پوچھتی رہیں... لوگ ان پر ترس کھا کھا کر آگے بڑھتے گئے۔ انہیں کسی نے بھی نگار کا پتا نہ دیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ نگار کے محلے تک آئیں۔

"نگار کہاں ہے... مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے... یہاں رہتی تھی وہ... یہ سامنے والا گھر تھا اس کا۔"

"نگار؟ ہو گی اپنے پرانے عاشق کے پاس۔" ان کے دل میں بیک وقت ہزاروں سوئیاں پیوست ہوئیں۔

"ایسا نہ کہو... خدا کے لیے ایسا نہ کہو... وہ ایسی نہیں تھی... وہ تو بہت..."

"خدا یار مر گیا... زلیخا بیچاری مر گئی... اس کا بھائی بدنامی کی وجہ سے دوبارہ کبھی یہاں نہ آسکا... پورا گھر دنوں میں اجڑ گیا۔ اس سب کی ذمہ دار ہے وہ... اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ ایسی نہیں تھی..." اتنی... بے چینی سے اس لڑکی کو تلاش کرتے... دیکھ کر لوگوں نے گلناب عالم کو کوئی سٹھیائی ہوئی بڑھیا سمجھا۔

"نہیں... وہ ذمہ دار نہیں... وہ ذمہ دار نہیں ہے۔"

"اچھا تو کون ہے...؟" بے تحاشا منہ کھلے۔ وہ

اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔
"میں ہوں۔۔۔ میں ہوں اس سب کی ذمہ دار۔۔۔"
انہوں نے اعتراف کیا۔
"میں ایک بیٹے کی تربیت نہ کر سکی۔۔۔ خود میں ڈوبی رہی۔۔۔ اپنی ذات کو مختلف رنگوں سے سجاتی رہی۔۔۔ ان میں بسی رہی۔۔۔ کھوئی رہی۔۔۔ میں ہوں اس سب کی ذمہ دار۔۔۔ ٹھہرو تمہیں سب بتاتی ہوں۔۔۔ کب شروع ہوا سب' سالوں پہلے جب مجھے ایک بیماری نے آن لیا تھا۔۔۔ خود پرستی کی بیماری' ستائش کی تمنا' سراہے جانے کی آرزو۔۔۔ جس دن میں اپنے حسن کی بدولت سراہی نہ جاتی' میری طبیعت خراب ہونے لگتی مجھے اپنے حسن پر قصیدے چاہیے ہوتے۔۔۔ میں چاہتی تھی کہ ہر کوئی میری آنکھوں کی گہرائیوں پر غزلیں لکھے۔۔۔ میرے حسن و جمال میں گم ہو جائے۔۔۔ میں سب کو گرویدہ رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ اپنی اداؤں سے عشووں سے۔۔۔ لباس سے۔۔۔ ان سے دوستیاں کرنا مجھے اچھا لگتا۔۔۔ میں چوراہے کی وہ شمع تھی جسے اپنے اردگرد ہزاروں پروانے درکار تھے۔۔۔ مجھے ان کے بغیر قرار نہ آتا۔۔۔ یہ بیماری بڑھتی ہی گئی اور میں سب کچھ بھول گئی۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ اپنا گھر بار۔۔۔ اپنا شوہر اپنا بیٹا اور اپنا عورت ہونا بھی۔" وہ بولتے بولتے ٹھہریں۔۔۔ جی بھر کے روئیں۔۔۔ پھر دوبارہ شروع ہوئیں۔
"اس بیماری کا علاج تھا۔۔۔ پر مجھے مریضہ بنے رہنا تھا۔۔۔ اور پھر ایک دن میں وہ ناگن بن گئی جس نے پہلے اپنے شوہر کو ڈسا۔ پھر گھر بار کو۔۔۔ اور پھر اپنے ہی بیٹے کو۔۔۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔۔۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔۔۔ میرا سایہ بھی غلیظ ہے۔۔۔ یہ جس پر پڑ گیا اس کو برباد کر دے گا۔۔۔ زندگی جہنم بنا دے گا اس کی۔۔۔ کیونکہ آج اس جہنم کی آگ میں میں خود جل رہی ہوں۔۔۔ آج میرے بیٹے نے مجھے بدچلن کہا ہے۔۔۔ لوگ کہتے تھے۔ میں ان کی پروا نہیں کرتی تھی۔ میرے بیٹے نے زندگیاں اجاڑ دیں۔۔۔ وہ ایسا کیسے نہ کرتا۔۔۔ ہاں وہ ٹھیک کہتا ہے وہ مجھے کیسے بتاتا۔۔۔ کب بتاتا۔۔۔ مجھے تو فرصت ہی نہیں ملی کبھی اس کے لیے۔

میں تو اپنے نفس کی پوجا میں گم رہی ہر وقت۔۔۔ بتایا نا میری بیماری کیسی تھی۔۔۔ مجھے ان سب کی ضرورت تھی۔۔۔ صرف بیٹے کی نہیں۔۔۔ میں اس کے دل کا حال جاننے کے لیے کبھی اس کے پاس گئی ہی نہیں۔۔۔ کیسی عورت ہوں میں۔۔۔ کیسی عورت ہوں میں۔۔۔ کیا کہیں گے مجھ جیسی عورت کو۔۔۔ کوئی بتاؤ۔۔۔ کوئی تو بولو۔۔۔ کیا کہیں گے مجھ جیسی عورت کو۔" وہ چیخ چیخ پوچھنے لگیں۔ محلے کے لوگ ان کا یہ دیوانہ پن دیکھتے رہے۔ وہ اس وقت پاگل معلوم ہو رہی تھیں۔ اور وہ حلیے سے امیر ظاہر نہ ہو رہی ہوتیں تو شاید کوئی بھی ان کی بات نہ سنتا اور ممکن تھا کہ رات کے اس وقت جو تماشا انہوں نے لگا رکھا تھا اس پر انہیں پتھر مار کر بھگا دیا جاتا۔

☼ ☼ ☼

اگلے بہت سے دن نگار کی تلاش میں ہی گزرے تھے۔ نگار کے نام کی پکار کرتے کرتے وہ بے دم ہونے لگیں تو وہ پروردگار کے نام کی فریاد کرنے لگیں۔
"کوئی مجھے خدا کے پاس ہی لے جائے۔۔۔ کوئی مجھے اس کا پتا ہی بتا دے۔۔۔ وہ کہاں ملتا ہے۔ کون سا گھر ہے اس کا۔"
"اس کا گھر مسجد ہے اور رہتا وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔"
"وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے؟" یہ جان کر انہیں خوف لاحق ہوا۔
"سچ بتاؤ۔۔۔ پھر تو وہ اس وقت بھی قریب ہو گا جب میں گناہوں میں غرق ہوں گی۔ میں بے خبر تھی وہ باخبر ہے۔ یعنی وہ سب جانتا ہے۔ کس قدر بے شرم ہوں میں۔۔۔ اب میں اس سے معافی کیسے مانگوں۔۔۔ کس قدر بڑے ہیں میرے جرم کہ ان کا اعتراف بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ کس قدر زیادہ ہیں' ان کو یاد بھی نہیں رکھا جا سکتا۔۔۔ ایک ایک گناہ کا نام لے کر توبہ کیسے کروں۔۔۔ کوئی رہ گیا تو۔۔۔ کتنے ہی تو رہ جائیں گے۔ ایک بس یہ نہ رہ جائے۔۔۔ بس اس کی توجہ مل جائے۔۔۔ میرے اللہ

مجھے نگار سے ملوا دے یا مجھے موت دے دے۔"

وہ کراچی بھی جانا چاہتی تھیں۔ وہ اس بار تھکنے والی نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید نگار ہمایوں کے ساتھ ہو۔ اتنا سب کچھ ہوا۔ دو سال بھی تو گزر گئے۔ شاید ہمایوں' نگار کو اپنے ساتھ لے گیا ہو۔۔۔ اور اگر وہ وہاں بھی نہ ہوئی تو۔۔۔ وہ اس دنیا میں ہی نہ ہوئی تو۔۔۔ زمین کے اندر اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ بچی ہوں گی۔ یا اللہ میں اپنی بخشش کس کے پاؤں پکڑ کر کرواؤں گی۔۔۔ کفارہ کیسے ادا کروں گی۔

یونیورسٹی میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو نگار کے بارے میں کچھ جانتا۔ "ایسی لڑکیوں" کے "ایسے واقعات" تو یاد رکھے جاتے ہیں لیکن شاید ٹھکانے نہیں۔ پھر بھی وہ روز یونیورسٹی جاتیں۔ ہر چہرے سے اس کے بارے میں دریافت کرتیں۔ وہ تھکتی نہیں تھیں۔ ہاں اس کی تلاش میں سودائی ضرور ہو گئی تھیں۔ پیروں کے چھالوں میں ٹیس اٹھتی تو انہیں راحت لگتی۔ لوگ انہیں دیکھ کر ہنستے تو انہیں سکون ملتا۔ مرنے کے بعد کی سزا کو وہ ہی زندگی میں جھیل رہی تھیں۔ تیز دھوپ نے ان کی رنگت جھلسا دی۔ پانی میں نظر آتے اپنے ہی عکس کو دیکھ کر وہ خود کو پہچان نہ پائیں۔ اس کے باوجود وہ خوش تھیں۔

ایک عورت کو روز یونیورسٹی کے چکر لگاتے دیکھ کر ایک پروفیسر نے ترس کھا کر اور صغیر ربانی سے وعدہ خلافی کر کے انہیں صغیر ربانی کے گھر کا ایڈریس دے دیا۔

"جس لڑکی کا آپ پوچھ رہی ہیں' وہ ان کے گھر ملے گی۔ وہ اب ان کی بیوی ہے۔" دکھ سے گلناب عالم چند لمحے بت بنی رہی تھیں۔ نوجوان نگار اور اس کے باپ کی عمر کا اس کا شوہر۔ صغیر ربانی۔۔۔ جسے وہ ایک بار اپنے گھر دیکھ چکی تھیں۔

ایڈریس ملتے ہی گلناب عالم نے لمحے بھر کی بھی دیر نہیں کی تھی۔ جیسے وہ موت کو اپنے بالکل قریب دیکھ رہی ہوں۔ وہ حبیب اللہ روڈ کی طرف بھاگیں۔ نہیں جانتی تھیں کہ وہاں ایک اور دکھ ان کا منتظر ہے۔

جس وقت وہ پروفیسر صغیر ربانی کے گھر پہنچیں تھیں۔ اسی وقت وہاں سے پروفیسر صغیر ربانی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ نگار چند عورتوں کے درمیان سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ نگار کو پہچاننے میں گلناب عالم کو کئی زمانے بیت گئے۔ کیا یہ وہی نگار تھی جسے پہلی بار دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔ گوری سی لمبے بال' بڑی بڑی آنکھیں' کتابی چہرہ۔ خوب صورت سی۔۔۔

ہاں۔۔۔ یہ وہی نگار تھی۔۔۔ ان کے بیٹے کے نام سے چند دن منسوب رہ جانے کے بعد' یہ اب پرانی پہچان میں نہ آتی تھی۔ جلی ہوئی رنگت' مردہ چہرہ' بدصورت پھٹکاری ہوئی سی۔۔۔ ماتھے پر تقدیر کا بہت بڑا زخم' یہ تو ان کے وسوسوں سے بھی زیادہ بھیانک شبیہہ تھی۔

گلناب عالم نے ڈر کے مارے اپنا چہرہ کپڑے سے چھپا لیا۔ نگار کہیں ان کو پہچان کر ان کے منہ پر تھوک نہ دے سب کے سامنے۔۔۔ اس بات کا انہیں ڈر نہیں تھا۔ وہ تھوک بھی دیتی تو انہیں برا نہ لگتا' کم ہی لگتا۔ انہیں ڈر اس بات کا تھا کہ نگار ان کو خود سے معافی بھی نہیں مانگنے دے گی۔

شام کے وقت جب گھر تقریباً" خالی ہو گیا تو وہ اس کے قریب ہوئی تھیں۔ نگار کی گود میں ڈیڑھ سالہ یشار تھا۔ جو رو رہا تھا۔ نگار' یشار کو چپ نہیں کروا رہی تھی۔ نہ ہی خود کوئی حرکت کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں وہ گلناب عالم کو مردہ وجود لگی۔ جیسے ایک جنازہ تو اس گھر سے نکل گیا ہو اور ایک ابھی باقی ہو۔

"نگار!" نگار کے سامنے بیٹھ کر انہوں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ مردہ وجود نے پتھر آنکھیں اٹھائیں۔ اس پتھر عکس میں کچھ نہیں تھا۔ بس ایک رنگ کافوری تھا۔ گلناب عالم خوف زدہ ہوئیں۔

"نگار! میں گلناب۔۔۔ گلناب عالم۔۔۔" اس کی ایسی حالت دیکھ کر گلناب عالم کو شبہ ہوا کہ جیسے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے۔ انہوں نے اپنی پہچان کرائی۔ نگار کی آنکھیں سکڑیں۔

"میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں نگار۔۔۔ اس جرم کی جس کی تلافی ناممکن ہے۔" انہوں نے خود کو اس

کے آنسوؤں پر کر ادیا۔ نگار نے ذرا سی جنبش سے خود کو پرے کیا۔ حیرت سے گلناب عالم کو دیکھا۔ جیسے واقعی نہ پہچان سکی ہو۔

"ایسے مت کرو نگار۔۔۔ خود کو مجھ سے دور مت کرو مجھے معافی اہتمام کے ساتھ مانگ لینے دو۔" وہ رونے لگیں۔ نگار نے کچھ نہیں کہا۔ یشار اونچی آواز سے رونے لگا۔

"میں بے خبر تھی نگار! میرا یقین کرو۔۔۔ مجھے کسی بات کا علم نہیں تھا۔۔۔ زیان نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔ اس نے جو کہا میں نے وہ ہی کیا۔ میرا قصور نہیں تھا اس میں نگار۔۔۔ مجھے سب چند ہفتوں پہلے ہی پتا چلا ہے۔" انہوں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"میں شرمندہ ہوں۔۔۔ میں نے زیان جیسے بیٹے کو جنم دیا۔۔۔ میں گناہ گار ہوں کہ اس کے ارادوں سے انجان رہی۔۔۔ میں بہت بری ہوں نگار! میں بہت بری ہوں۔۔۔ اس سب کے لیے میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکتی۔۔۔ پر تم۔۔۔ تم مجھے معاف کر دو نگار۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ ورنہ میرا دل غم سے پھٹ جائے گا۔"

انہوں نے روتے روتے نگار کی منت کی۔ اپنی بے خبری کی وضاحت کی۔ اور پھر کرتی ہی رہیں۔ یشار مزید اونچی آواز سے رونے لگا۔

"کچھ بولو نگار۔۔۔ کچھ تو بولو۔۔۔ لوگوں کی طرح تم بھی مجھے گالیاں دے لو۔۔۔ میرے منہ پر تھوک دو۔۔۔ لیکن مجھے احساس جرم سے نہ مارو۔"

نگار کا ان کی کسی بات پر کوئی رد عمل نہیں تھا۔ وہ پہلی والی حالت میں ہی بیٹھی ان کو سنتی رہی تھی۔ گلناب عالم نہیں جانتی تھیں کہ ان کے گھر کے بڑے ہال کے بڑے روشن فانوس کے نیچے ہی تو اس نے تاعمر زبان کی بندش کی قسمیں اٹھائی تھیں۔ پھر اب وہ کیسے بول سکتی تھی۔ گلناب عالم کی بے قراری مزید بڑھنے لگی۔ نگار کچھ بھی سہی۔۔۔ مگر بولے۔ ان کا دل سکڑنے لگا۔ نگار کے مجسمے کو توڑنے کے لیے وہ آخر کس چیز کا خراج ادا کرتیں؟ انہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی۔ ساری التجائیں بے کار گئیں۔ نگار نے ان سے ایک لفظ تک منہ کہا۔

یشار اب اتنی اونچی آواز سے رونے لگ گیا تھا کہ اس کی آواز گلناب عالم کی آواز پر غالب آنے لگی تھی۔ نگار اسے چپ نہیں کروا رہی تھی۔ وہ شاید بہری ہو چکی تھی۔ گلناب عالم روتے روتے تھک گئیں۔ انہوں نے نگار کو دیکھا۔ التجا سے ممنت سے حیرت سے۔

گھر کی خاموش فضا میں یشار کے رونے کی آواز پھیلتی رہی۔ پھر یک لخت نجانے کیا ہوا۔ ایک جادوئی سا لمحہ اس گھر میں وارد ہوا۔ اس جادو کا ہدف گلناب عالم تھیں۔ نگار کی گود سے یشار کو گلناب عالم نے اپنی گود میں بھر لیا اور خود بھی روتے روتے اسے چپ کرانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

گلناب عالم اس گھر میں رہنے کا ارادہ کر کے نہیں آئی تھیں۔۔۔ انہیں تو بس معافی چاہیے تھی۔ کسی بھی طرح۔۔۔ اپنے دل کا سکون چاہیے تھا۔ اپنی دحشت کا قرار چاہیے تھا۔ وہ ازالہ کرنا چاہتی تھیں۔ اپنے بے خبری جیسے گناہ کا وہ کفارہ ادا کرنے کی خواہاں تھیں۔ کسی بھی شکل میں۔۔۔ خواہ سالوں نگار کی ملازمہ بن کر رہیں اور پھر وہ ملازمہ بن گئیں۔

باسل کی پیدائش کے دن انتہائی قریب تھے۔ گلناب عالم یشار کے ساتھ ساتھ نگار کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھیں۔ یہ جان کر انہیں دکھ ہوا تھا کہ نگار کے "اپنے" اگر باقی نہیں بچے تھے تو صغیر ربانی کے بھی نہیں تھے۔ جو ایسے وقت میں نگار کے پاس آسکتے۔ اسے سنبھال سکتے۔۔۔ شاید اللہ نے یہ کام ان کے لیے ہی سنبھال کر رکھا تھا۔ ان سے ہی کروانا تھا۔

محلے کی عورتوں اور دایہ نے جب ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور نگار کی کیا لگتی ہیں تو چند لمحے ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دیں۔

"میں اس کی ماں ہوں۔۔۔" خود بخود ہی ان کے منہ سے نکلا تھا۔

"اس کی ماں تو سنا ہے مر گئی۔"

"کیا ماں صرف وہ ہی ہوتی ہے جو کوکھ سے پیدا کرے۔" انہوں نے کہہ تو دیا تھا لیکن خود احتسابی کے کٹہرے میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ اگر واقعی ماں صرف کوکھ سے پیدا کرنے والی نہیں ہوتی تو کیا اب وہ نگار کی ماں بن کر دکھائیں گی؟ ایک کھیل ان کے بیٹے نے نگار کے ساتھ کھیلا تھا۔ ایک تقدیر نے۔۔۔ وہ کس کے کھیل کا حصہ تھیں۔ اپنے بیٹے کے یا تقدیر کے۔۔۔ جلد ہی فیصلہ ہو گیا۔

"مجھے گناہ گاروں کی صف میں کھڑا نہیں رہنا یا اللہ مجھے اتنا حوصلہ دے کہ میں اپنے گناہوں کی کالک دھو سکوں۔" وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ سے فریاد کرتیں۔

ان کی دعا شاید قبول کرلی گئی تھی۔ اللہ نے نہ صرف انہیں ہمت اور صبر عطا کیا۔ بلکہ ان کا دل بھی بدل دیا۔ نور سے گندھا ایک اطمینان تھا جو ان کے قلب میں اتار دیا گیا تھا۔ اپنی پچھلی زندگی پر ان کی نظر جاتی تو انہیں خود سے کراہیت محسوس ہوتی۔ کیسی زندگی جیتی آئی تھیں وہ۔۔۔ وہ خود سے نظریں نہ ملا پاتیں۔ گناہوں کی بے چینی جو ہر وقت ان کا احاطہ کیے رہتی اب اس کی جگہ سکون کی چادر تان دی گئی تھی۔

سب اللہ کی طرف سے ہوا تھا۔ انسان سچے دل سے توبہ کرلے تو کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کے لیے سیدھے راستے واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

کب وہ اس گھر میں رہنے لگیں۔ کب وہ دونوں بچوں کی سرپرست بن گئیں۔ نگار نے کب انہیں قبول کیا۔ یہ سب کچھ لمحوں میں تو نہیں ہوا تھا۔ اگر دنوں یا مہینوں میں بھی ہوا تھا تو انہیں خبر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اللہ کے حضور زندگی میں شاید پہلی بار سجدہ ریز ہوئیں۔ اللہ نے انہیں ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ جو وہ چاہتی تھیں۔ اپنی غلطیوں کے ازالے کا۔۔۔ اب وہ اس نادر موقع سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتی تھیں۔

ایک سال بعد وہ اپنے پرانے گھر گئی تھیں۔ زیان کے پاس۔۔۔ وہ زیان کو اس کے گناہوں کا احساس دلانا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنے گناہوں کا اعتراف کرے۔ نگار سے معافی مانگ لے۔ آخرت کے عذاب سے خود کو بچالے۔ لیکن وہاں جا کر انہیں پتا چلا تھا کہ زیان سارا گھر بار بیچ کر فرانس جا چکا ہے۔ ایک سوراخ ان کے دل میں ہوا تھا' اس کے باوجود انہوں نے زیان کو تلاش نہیں کیا۔ انہیں پتا تھا خدا جب ان سے راضی ہو جائے گا۔ ان کی آزمائش ختم کر دے گا۔ وہ اپنے بیٹے سے مل لیں گی۔

ہمایوں' نگار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک عرصے کے بعد اس گھر میں آیا تھا۔ اور گلناب عالم کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ گلناب عالم نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ اب کچھ چھپایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ انہوں نے ہمایوں کو ساری بات بتادی۔ ہمایوں غصے سے پاگل ہو گیا۔

"تو پھر اب آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔" وہ دھاڑا۔ گلناب عالم کو اس سے اسی رویے کی توقع تھی۔ نگار اس کی بہن تھی۔ سب جان لینے کے بعد وہ انہیں ایک لمحہ بھی اس کے پاس بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

"زیان نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔۔۔ اور میں نے زیان کو۔۔۔ میں یہاں آخرت میں اپنی بخشش کے لیے آئی ہوں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ میں آپ کو اپنی بہن کے پاس رہنے دوں گا۔" اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں حق ہے۔ تم مجھے دھکے مار کر باہر نکال سکتے ہو۔ نگار کو اپنے ساتھ لے کر جا سکتے ہو' پر میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ ایسا مت کرنا۔ ہم سب نے ویسے بھی نگار کی زندگی میں کچھ باقی نہیں چھوڑا۔۔۔ بچے مجھ سے مانوس ہو چکے ہیں۔ نگار نے شاید۔۔۔ شاید مجھے معاف کر دیا ہے۔ جو وہ میری چند ایک باتوں کے جواب دے دیتی ہے۔ میں ہر چیز سے لاعلم تھی۔۔۔ خدا یار کی طرح۔۔۔ زلیخا بی کی طرح۔۔۔ تمہاری طرح' پھر میں تم سے زیادہ قصوروار کس طرح ہوئی۔۔۔ تم تو اس کے اپنے تھے۔" ہمایوں لاجواب ہو گیا تھا۔

"میں تم سے بھی معافی مانگتی ہوں۔۔۔ تم چاہے مجھے

ساری زندگی معاف نہ کروں۔ پر مجھے اس گھر میں رہنے دو۔۔۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔۔۔ نگار کے لیے کیا بہتر ہے۔۔۔"

گلناب عالم کی التجا کے باوجود ہمایوں نے نگار سے کراچی جانے کی بات کی تھی۔ لیکن نگار جس آسن پر بیٹھ چکی تھی اس میں مقام کی تبدیلی کی اجازت نہیں تھی۔

غصے سے، خود پر جبر کر کے یا گلناب عالم کو معاف کر کے، ہمایوں کراچی واپس چلا گیا تھا۔ خالی ہاتھ۔۔۔ اور گلناب عالم دن بدن اپنی جان نیشار اور باسل دونوں بھائیوں میں منتقل کرتی رہی تھیں۔

قصہ گلناب عالم عرف نانو یہاں ختم ہوا چاہتا ہے۔

☼ ☼ ☼

چوتھی اور آخری سلیب کو قبر کے چوکھٹے میں نصب کرتے ہوئے گورکن قبر سے باہر نکل آیا۔ پھر مٹی، بھس اور پانی کے گارے کو کھرپی سے اچھال اچھال کر وہ درزیں بند کرنے لگا۔ ایک ایک کر کے ساری درزیں پُر ہوتی گئیں اور زمل کا دل جیسے بند ہو گیا۔ اس نے خود کو کنویں میں گرتا ہوا محسوس کیا۔ ایسے کنویں میں جہاں سے اس کی آواز کو بھی باہر آنے میں سالوں لگ جاتے۔

کسی بزرگ نے اسے کندھے سے تھام کر ہلکے سے ہلایا۔ پھر قبر پر مٹی ڈالنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بھیگی اور دھندلی آنکھوں سے بزرگ کے اشارے کو سمجھا اور اپنے ہاتھوں میں خشک مٹی بھر کر بند ہو چکی قبر کے دہانے پر ڈال دی۔ اس کے پہل کی دیر تھی۔ بہت سے مردوں نے یہ عمل کرنا شروع کر دیا۔ سب اپنے اپنے حصے کی مٹی ڈالنے لگے۔ سب اپنی اپنی قبر بھرنے لگے۔ وہ احسان جو آنے والے وقت میں ان پر چڑھنا تھا وہ اس کو پہلے سے ہی ادا کر رہے تھے۔ مٹھی بھر ڈلتی مٹی سے قبر اونچی ہونے لگی۔ اور وہ ڈیڈ کے وجود کو تاریکیوں میں گم ہوتا دیکھتی رہی۔

نانو قبر کے سرہانے اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ تا قیامت جیسے وہاں سے نہ اٹھنے کا عزم کر کے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے مٹی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ تو پرسوں پہلے اپنے بیٹے کو اپنے سینے میں دفن کر چکی تھیں۔ انہیں اللہ کی طرف سے دوبارہ ملن کا انتظار تھا اور جس طرح سے دوبارہ ملن ہوا تھا اس سے کہیں بہتر تو وہ جدائی ہی تھی، جسے وہ سالوں سے سہتی چلی آ رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کی یہ جدائی ان سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے اس کی پہلی جدائی کو ہی اپنے دل میں زندہ رکھا اور اس جدائی پر پتھر ہوئی بیٹھی رہیں۔

مٹی ختم ہو گئی۔ ہاتھ رک گئے اور گورکن کا بیلچہ بھی۔ ٹیلے نے قبر کی شکل اختیار کر لی۔ گورکن نے اس پر پانی کا چھڑکاؤ کرنا شروع کر دیا۔ پھر آخر میں پھولوں کی چادر ڈال دی۔ سب مل کر فاتحہ پڑھنے لگے۔ زمل نے بھی اپنے بے جان ہاتھ بلند کیے تھے۔ کل سے اب تک، بہت بار رونے کے باوجود بھی اس کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ آج "دریا" اس کی آنکھوں میں بھر آیا تھا۔ کبھی نہ ختم ہونے والا۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے پھر سے چھلکے اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"صبر سے کام لو زمل!" یہ الفاظ کہنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ روتی رہی۔

فاتحہ پڑھ کر سب نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور اپنی اپنی جگہوں سے ہلے وہ اپنے ہاتھوں کو مکمل طاقت لگا کر بھی مزید اوپر نہ کر سکی اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ خود بھی گر گئی۔

"بس کرو بیٹی۔۔۔ سنبھالو خود کو۔۔۔ خدا کی مرضی کے آگے ضد نہیں باندھا کرتے۔" اس بزرگ نے کہا۔

وہ خدا کی مرضی کے آگے ضد کہاں باندھ رہی تھی۔ وہ تو خدا سے بس یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں؟

گیلی قبر پر بکھرے سرخ دہکتے لہو رنگ پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس نے خدا کی بارگاہ میں یہ فقرہ بار ہا دہرایا۔

لوگ رفتہ رفتہ جانے لگے تھے۔ نانو اسی طرح بیٹھی تھیں۔ ضبط کی انتہا سے انہوں نے اپنی آنکھیں

موندی ہوئی تھیں۔ انہیں آنکھیں دوبارہ کھولنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔

سورج اپنے درمیانی زاویے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ درختوں کے پتے گرمی کے موسم کا راگ الاپنے لگے تھے۔ سب لوگ ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ سنسان قبرستان میں آخر وہ دونوں تنہا رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس دن کی شام خون آشام تھی اور رات شب ظلمات... کمرے کی دیواروں کا پردہ کیے سب الگ الگ اپنے اپنے ماتم میں مصروف رہے۔ وہ اپنے دکھ میں پہلے بھی اکیلی تھی اور اب بھی۔ وہ اس غم میں تنہا نہیں تھی تو اسے اپنے تنہا ہونے کا احساس ضرور ہو رہا تھا۔ ڈیڈ کی موت کے صدمے کے ساتھ ساتھ اس ساری صورت حال نے بھی اسے چھلنی کر دیا۔

رات میں نانو اس کے کمرے میں آئیں۔ ان کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ زل کل سے بھوکی تھی۔ وہ جانتی تھیں۔ انہوں نے ٹرے اس کے قریب رکھ دی۔ اور خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔ دونوں کا دکھ مشترک تھا۔ پھر بھی دونوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک دوجے کے گلے لگ کر رو سکتیں۔ بڑی دیر اسی طرح خاموشی میں گزر گئی۔

"تھوڑا کھانا کھا لو زل...!" کافی دیر... تک بھی زل نے کھانے کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھایا تو نانو نے کہا۔ زل نے سامنے دیکھتے دیکھتے ایک دم سے انہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا... درشتی... نانو ڈر سی گئیں۔

"کیسی ناراضی تھی آپ کی نانو... کہ آپ نے دوبارہ کبھی پلٹ کر میرے ڈیڈ کی خبر ہی نہ لی..." اس نے رندھی آواز میں شکوہ کیا۔ اور نانو کی سانسوں کی آمد و رفت بے ترتیب ہو گئی۔

"اللہ کو تو ڈیڈ کو سزا دینی ہی تھی... اور آپ نے بھی اس میں بھرپور حصہ ڈالا..." نانو سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

"اٹھائیس سال گزار دیے آپ نے اپنے بیٹے کے بغیر... ناراضی کے اصولوں میں اتنی کامل تھیں آپ؟"

وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"میری عبادتوں میں کوئی کوتاہی رہ جاتی ہے شاید۔ جو کوئی نہ کوئی غلطی میری ذات سے ہمہ وقت منسوب رہتی ہے۔" بھری آنکھوں سے نانو نے خلا میں دیکھتے ہوئے جیسے خود سے کہا۔

"ان کے پاس تنہائی تھی... احساس گناہ تھا... تکلیف تھی... سزا تھی۔ دکھ، رنج سب تھے... بس ایک آپ ہی نہیں تھیں۔"

"میں کیسے ہوتی اس کے پاس... اللہ نے مجھے بھی تو سزا کے عمل سے گزارنا تھا۔ اس کی جدائی دے کر۔"

"کیا آپ کو ان کی جدائی کا غم رہا...؟ کیا آپ کو ان کی موت کا دکھ ہے؟" زل نے پوچھا۔ نانو نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"اتنا پتھر دل تو مت سمجھو مجھے زل..." انہوں نے جیسے التجا کی۔ زل خاموش ہو گئی۔

کیا پا لیا تھا اس نے پاکستان آ کر... سب ختم ہو گیا تھا۔ کیا اس سب سے بہتر وہ دن نہیں تھے جب وہ ڈیڈ کا علاج کرانے جگہ جگہ دربدر ہوتی تھی۔ مختلف ڈاکٹرز سے ملتی تھی... ڈیڈ کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی۔ ڈیڈ کے لیے فکر مند تھی۔ اب تو کوئی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ ہر پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ پھر کیوں دل کا قرار کوسوں دور چلا گیا تھا۔ جسے حاصل کرنے کے لیے درمیان میں کانٹوں بھری مسافت تھی۔ اور اسے طے کرنا زل کے لیے مشکل تھا... بہت مشکل...

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح وہ سب کے اٹھنے سے پہلے قبرستان کے لیے نکل چکی تھی۔ اپنے ڈیڈ سے ملنے... جن کی قبر کے پھول ابھی بھی تازہ تازہ سے لگتے تھے۔ پھولوں کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے وہ جیسے ڈیڈ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس صبح کے بعد اس نے یہ معمول بنا لیا۔۔۔ ہر روز صبح و شام دونوں وقت وہ ڈیڈ کے قریب گزارتی۔ دن کی شروعات اور دن کا اختتام وہ یہیں کرتی۔ وہ ان کے پاس بیٹھتی۔۔۔ انہیں یاد کرتی۔۔۔ ان سے باتیں کرتی۔

اس نے انہیں ان دنوں کی باتیں بتانی شروع کیں جب وہ پاکستان آنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ یہ باتیں ایسی تھیں جو شروع ہو کر اب ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ اس نے اب کی بار ان سے جھوٹ نہیں بولا۔ ڈیڈ کو سب سچ سچ بتا دیا۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ ان کے پرانے سامان کی تلاشی لیتی رہی تھی۔۔۔ یشار بھائی نے کہا تھا اسے ایسا کرنے کو۔۔۔ وہ پاکستان دادا دادی کی قبریں تلاش کرنے آئی تھی۔ وہاب عالم اور گلناب عالم کی۔۔۔ جتنی شدت سے وہ قبریں تلاش کرتی اسے اتنی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ خدا نے اس کی دعا سن لی ہے۔ اس کی شدت کا خدا کو بھی خیال ہے۔

گلناب عالم سے خدا نے اسے جلد ہی ملوا دیا تھا۔ ہاں لیکن کسی اور روپ میں۔۔۔ وہ اس زندہ ہستی کے گھر رہنے لگی جس کی وہ قبر تلاش کر رہی تھی۔ اس نے ڈیڈ سے شکوہ کیا کہ اگر وہ غلط بیانی نہ کرتے تو وہ گلناب عالم تک جلد ہی پہنچ سکتی تھی اور پھر۔۔۔ پھر کیا؟ پھر شاید سب جلدی ہی ہو جاتا۔ ڈیڈ کی موت بھی۔۔۔ وہ اللہ کی حکمت کے آگے بے بس ہو جاتی۔

اس نے انہیں بتایا کہ وہ ان کے پرانے گھر کیوں گئی تھی۔ ان کی یونیورسٹی بھی۔۔۔ وہ ان کے پرانے ملازم سے بھی ملی۔۔۔ یہاں وہاں جو جو گفتگو ہوئی وہ ڈیڈ کو بتاتی رہی۔ نگار آنٹی سے ہوئی خاموش ملاقاتوں کا احوال بھی اس نے انہیں بتایا۔۔۔ نانو کی شفقت۔۔۔ اور یہ بھی کہ اسے کب پتا چلا کہ نگار آنٹی کے ساتھ اس کے ڈیڈ نے۔۔۔

جب یہ سب ختم ہو گیا تو اس نے ان کے مرنے کے بعد کے حالات بتانے شروع کر دیے۔۔۔

نانو۔۔۔ وہ کیسی ٹوٹ گئی ہیں کہ اب وہ دوبارہ کبھی نہیں جڑ سکیں گی۔ ان کو جوڑنے کے لیے کوئی طبا شیر دستیاب نہیں۔ انہوں نے دکان پر جانا کم کر دیا ہے۔ گھر پر کام کرنا بھی۔۔۔ ان کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا۔ وہ کھانا بھی بے دلی سے بنانے لگی ہیں۔ خود ان کی خوراک کافی کم ہو چکی ہے۔ اکثر وہ ٹیبل پر بیٹھ کر سامنے پڑے کھانے کو بس دیکھتی ہی رہتی ہیں۔

وہ اس بیٹے کی جدائی کا غم منا رہی ہیں جس سے وہ برسوں سے جدا تھیں لیکن شاید آنسوؤں کی ڈوری کسی کی سانسوں کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ کیا انہیں پہلے کام کرتے وقت۔۔۔ کھانا بناتے وقت۔۔۔ کھاتے وقت۔۔۔ اپنے بیٹے کا خیال نہیں آتا تھا۔ تب وہ کیا سوچ کر خود کو تسلی دیتی ہوں گی یہ کہ وہ "جہاں بھی ہو گا خوش ہو گا۔" تو پھر وہ اب بھی یہ ہی کیوں نہیں سوچ لیتیں کہ "وہ جہاں چلا گیا ہے۔۔۔ وہاں مطمئن ہو گا۔"

یشار۔۔۔ وہ کمرے کی چار دیواری میں قید ہو گیا ہے۔ وہاں سے باہر نہیں نکلتا۔ کسی کا سامنا نہیں کرتا۔۔۔ پردے گرائے۔۔۔ لائٹس بند کیے وہ اپنی ذات کو کھوج رہا ہے۔۔۔ دن کی رخصت اور رات کی آمد سے بے خبر وہ جیسے وقت کی بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنا بھید کسی کو نہیں بتانا چاہتا۔۔۔ کوئی شخص اتنا مضبوط کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے جذبات کا پردہ چاک نہ ہونے دے۔ کیا وہ پتھر ہیں۔۔۔ یا ایسا موم جو لچک دار تو ہوتا ہے لیکن پگھلتا نہیں۔۔۔ نفسیات کا علم کیا انسان کو ایسا ہی دو رخا کر دیتا ہے کہ انسان اندر سے جس قدر مرضی ٹوٹ پھوٹ رہا ہو لیکن باہر آشکار نہ ہونے دے۔

اگر واقعی ایسا ہی ہے تو وہ بھی اب نفسیات کا علم حاصل کرے گی وہ ارادہ باندھنے لگی تھی۔

اور باسل۔۔۔؟ وہ کہاں ہے۔۔۔ وہ کہاں ہے؟ وہ شہر سے باہر کیوں چلا گیا ہے۔ وہ کس چیز سے بھاگ رہا ہے۔ کس کا سامنا کرنے سے ڈر رہا ہے۔ وہ تو زل کے بخار پر اتنا زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ کیا اب اسے اندازہ نہیں کہ زل کو اس کی کس قدر ضرورت آ پڑی ہے۔ اسے ایک ایسا کندھا درکار ہے۔ جس پر وہ سر رکھ کر رو سکے۔ ایک ایسا جذباتی آسرا جس سے وہ اپنے دل کی باتیں بانٹ سکے۔

لیکن وہ تو غائب ہو گیا تھا۔ نجانے مزید کتنے عرصے

کے لیے۔۔۔ وہ کیا کر رہا ہے۔۔۔ کیا سوچ رہا ہے۔۔۔ وہ آخر ناراض کس سے ہے۔ نانو سے یا اس سے یا اپنے آپ سے۔۔۔ یا وہ گھر سے دور رہ کر کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مثبت یا منفی۔۔۔ تو آخر اس فیصلے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی محبت ایسی۔۔۔ بے رقعت تو نہ تھی کہ وہ اسے دنوں نظر انداز کیے رکھتا۔

اپنی اتنی بے وقعتی پر اسے روز رونا آتا۔۔۔ اور اس کی باتوں میں باسل کا ذکر جب جب آتا قبر گیلی ہو جاتی۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ایسا اس کے آنسوؤں کی وجہ سے ہوتا ہے یا قبر خود روتی ہے۔

☼ ☼ ☼

کیاریوں میں لگے پودے بڑے دنوں سے توجہ کے منتظر تھے۔ اس نے مرجھائے ہوئے پھولوں اور مردہ پتوں کو الگ کیا اور پودوں پر پانی کی بارش کرنے لگی۔

"بارش تیز ہو رہی ہے۔" پانی کو دیکھتے ہوئے اسے کچھ یاد آیا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ تمہیں بھیگنے نہیں دوں گا۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔" باسل نے جواب میں اسے کہا تھا۔

اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وسیع صحن خالی تھا۔

"تو یہ آواز لاشعوری تھی۔" اپنے لاشعور پر افسوس کرتی وہ پودوں کو پانی دیتی رہی۔

"تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے بارش میں بھی بھیگنے نہیں دو گے۔۔۔ پھر اب کہاں جا چھپے ہو۔ جب میں آنسوؤں سے بھیگ رہی ہوں۔"

پانی کیاری سے اچھل کر اس کے پیروں پر گرا۔ وہ کب سے ایک ہی جگہ پر کھڑی پانی برسائے جا رہی تھی۔ چونک کر وہ پرے ہوئی۔ اور پائپ سائیڈ پر پھینک کر تخت پر بیٹھ گئی۔

"اگر تم کبھی یہاں سے اس طرح جاؤ کہ واپس نہ آ سکو تو سب سے زیادہ کس چیز کو مس کرو گی۔"

وہ باسل کی باتوں کو پورے اہتمام سے یاد کرنے لگی۔ کیسا سوال پوچھا تھا اس نے۔ تب اس نے یہ سوچا تھا کہ اسے اس جگہ سے اس طرح دور جانا ہی کیوں پڑے کہ یہاں کی چیزوں کو یاد کرنا پڑے اور باسل کمال کا محبوب تھا۔ وہ خود تو یہیں ہی تھی اور وہ خود اس طرح دور ہو گیا تھا کہ اسے بالآخر اسے یاد کرنا ہی پڑا تھا۔

اسے تب سچ بتا دینا چاہیے تھا۔ جب اس نے پوچھا تھا کہ "میں کسی گنتی میں نہیں آتا؟"

اسے بول دینا چاہیے تھا کہ تم سانسوں میں ہو اور سانسوں کو کون گنتا ہے بھلا۔ شاید اب اسے احساس ہو جاتا کہ وہ زمل کی سانسوں میں ہے۔ اس لیے اس سے دور نہ رہے یا شاید وہ اس کے دم نکلنے کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

تخت پر بیٹھی وہ خالی آسمان اور اپنے ارد گرد مجنونانہ انداز سے دیکھتی رہی۔ تب ہی اس کی نظر یشار پر پڑی۔ زمل نے دکھ سے یشار کو دیکھا۔ چند روز میں ہی اس کی حالت کس قدر بدل گئی تھی۔ یا بگڑ گئی تھی۔ کمرے کی بند فضا نے اسے پژمردہ کر دیا تھا۔

کھڑکی میں بیٹھا وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا یا شاید کہیں بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ یشار ربانی تھا اسی لیے اس طرح سے بیٹھا تھا۔ یشار عالم ہوتا تو شاید اس وقت اپنے کیے پر نادم نہ ہوتا۔

زمل سوچنے لگی نجانے اس گھر میں کتنی کھڑکیاں ہیں اور کتنے درخت۔ کون کون کھڑکی کے آگے بیٹھے گا۔ کون کون درخت کو کھوکھلا کرے گا۔ کیا برگد کی موت کافی نہیں ان سب کے لیے۔۔۔ ہم سب کے لیے۔۔۔ کیا یہ کہانی اگلی نسل تک بھی جا پہنچی ہے۔ کوئی ظلم کے انصاف میں بیٹھا ہے۔ کوئی ظلم کے احساس میں، کوئی ایک کھڑکی باسل کی بھی منتظر ہو گی۔ ایک زمل کی بھی اور شاید ایک نانو کی بھی۔

بہت سوچ سمجھ کر زمل اپنی جگہ سے اٹھی اور یشار کے پاس پہنچ گئی۔ کھڑکی سے پرے زمل کو ایکدم اپنے سامنے دیکھ کر یشار چونکا۔ وہ اس چیز کا سامنا ہی تو نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی لمحے کے خوف نے ہی تو اسے کمرے میں قید کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

زمل نے سلاخ تھامے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ

دیا۔ یشار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر یہ آنسو چھلکے ۔۔۔ زل نے باری باری یشار کی دونوں آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔ پھر سلاخوں کے ساتھ جڑے اس کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑ دیا۔ یشار نے بھی اس کے دونوں ہاتھ جذبات کی مضبوطی سے تھام لیے۔

آسمان میں سفید فاختائیں چکر لگانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈیڈ کی وفات کا بیسواں دن تھا۔ جب حسب معمول شام کے وقت قبرستان سے اس کی واپسی ہوئی۔

حبیب اللہ روڈ کی وسیع بند گلی کے آخر میں کوئی طوفان اس کی آمد کا منتظر تھا۔ جیسے ہی وہ گلی کے اندر داخل ہوئی۔ بند گلی نے پوری دنیا کی اراضی کو سمیٹ لیا۔ زل نے باسل کو دیکھا اور باسل ۔۔۔ وہ تو وہاں کب سے اسے دیکھنے کے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔

دھک دھک زمین نے اپنی دھڑکن زل کو سنائی۔ یہ دھڑکن بڑی خوف ناک تھی۔ یا تو زمین کا دم نکلنے والا تھا۔ یا زمین آج اوپر والوں کو چھوڑنے والی نہیں تھی۔ دوسرا قیاس درست تھا۔ کیونکہ زل ہوا میں کوہ آتش فشاں کی راکھ کو اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اب جلد ہی روشن دھماکہ ہونے والا تھا۔۔۔ آگ کا دھماکہ۔۔۔

وہ اسے پورے بیس دنوں کے بعد آج دیکھ رہی تھی۔ زل کی جان اس کے نچلے دھڑ سے نکل گئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔ وہ بھی تو اسے بیس دنوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔ کیا اس کی حالت بھی ایسی ہی تھی ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہ تو بہت مضبوطی سے پام کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اس کی مضبوطی میں جرات اور بغاوت جھلکتی تھی۔ زل کو اس کے قریب جانے سے خوف سا محسوس ہوا۔ اس کی جان اس کے حلق تک آگئی۔

وہ کب سے باسل کو ہی تو تلاش کر رہی تھی۔ اسی سے تو ملنا چاہ رہی تھی۔ اب جب وہ اس کے سامنے کھڑا تھا تو وہ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے اس کے پاس کیوں نہیں جا پا رہی تھی۔ ایک ایک قدم پر ایک ایک زندگی گزار کر وہ باسل تک پہنچی اور وہاں پہنچ کر اس کی ساری زندگیاں ختم ہو گئیں۔

درخت کے تنے کے ساتھ اس کے تمام سوٹ کیسز جڑے ہوئے تھے۔ حیرت سے زل اپنے سوٹ کیسز کو اور باسل کو دیکھنے لگی۔ اپنی ماں کی ہی طرح باسل کی آنکھوں سے بھی محبت کا ہر جذبہ کافور ہو چکا تھا۔ اور اس کی ڈراؤنی آنکھوں میں اس کے لیے پہچان کی کوئی رمق باقی نہیں بچی تھی۔ کیا سوٹ کیسز میں اس کی محبت بھی رکھ دی گئی تھی جو اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ محبت کو "لازما" کوئی مادی چیز ہونا چاہیے تھا۔ محبوب ملتا یا نہ ملتا "انسان محبت کو تو اپنے پاس سنبھال کر رکھتا۔

"یہ تمہارا پاسپورٹ ۔۔۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا اس کا پاسپورٹ اس کے سوٹ کیسز پر اچھالا۔۔۔ جو لڑھکتا ہوا زمین پر گر گیا۔

"تم واپس چلی جاؤ ۔۔۔" اس نے کہا۔ زل جانتی تھی اسے "دفع ہو جاؤ" بہت مہذب انداز سے کہا گیا ہے۔ اس نے حیرانی سے باسل کو دیکھا۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ یہ فیصلہ کر کے واپس لوٹا تھا؟ کیا خوب واپسی ہوئی تھی اس کی۔

"باسل؟" نم آواز کے ساتھ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"مزید سوال جواب کی گنجائش نہیں۔" ہاتھ آگے کر کے اس نے اسے بولنے سے روکا۔ ڈیڈ کو فوت ہوئے بیس دن گزر چکے تھے۔ بیس دن بعد ملک الموت ایک بار پھر آگیا تھا اس کے پاس ۔۔۔ اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ شاید یہ موت کا پہلا وار تھا۔

"گنجائش نہیں یا اجازت نہیں؟" اس نے پوچھا۔ باسل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے نظریں پرے کیے وہ زمین کو گھورتا رہا اور وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ محبت کی ایسی تذلیل نے اسے نڈر بنا دیا تھا شاید۔

"مجھے میری غلطی تو بتا دو باسل!" اس نے کہا۔

باسل نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے ڈیڈ کو ان کے کیے کی سزا مل گئی ہے۔۔۔ پھر اب تم مجھے کیوں سزا دے رہے ہو۔۔۔ تم کیوں عادل بن رہے ہو۔"

"وہ سزا نہیں، قدرت کا عمل تھا۔"

"وہ یہاں معافی مانگنے ہی آئے تھے باسل!" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میری ماں کے ساتھ جو جو ہوا، اس کا کفارہ معافی کے الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔"

"موت بھی کفارہ نہیں۔"

"اپنی ماں کی صداؤں کو میں فراموش نہیں کر سکتا زمل!"

"اور محبت کو فراموش کر سکتے تھے اور یہ کام تم نے فوراً ہی کر لیا۔" تڑپ کر اس نے کہا۔ اس کے دل سے ہوک اٹھ رہی تھی۔

"یہاں سے چلی جاؤ زمل!" باسل نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ اس کے پاس شاید اس کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ لیکن ایک جواب واضح تھا۔۔۔ لاتعلقی کا۔۔۔ زمل اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

"میرے ڈیڈ نے اپنی ساری زندگی بہت تکلیف میں گزاری ہے باسل۔۔۔ تم ان کی حالت سے واقف رہ چکے ہو۔" اس نے بلکتے ہوئے کہا۔

"کیا میری ماں سے زیادہ؟" اس نے الٹا سوال کیا اور اس سوال نے اسے لاجواب کر دیا۔

"اور اگر یہ سب تمہیں بہت بعد میں پتا چلتا تو۔" زمل نے پوچھا اور باسل اس "بہت بعد" کا مطلب بخوبی سمجھ گیا۔ پہلی بار اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ زمل سہم کر پرے ہو گئی۔

"کیا سننا چاہ رہی ہو زمل!" آنکھیں سرخ کیے وہ پوچھنے لگا۔

"اب شروعات کر ہی چکے ہو تو اختتام تک بھی پہنچا دو باسل!" اس کی آنکھوں کی نمی باہر کو چھلکی۔ اس تذر التجا نے جیسے باسل کو مزید طیش دلایا۔ اس کا چہرہ کرخت ہو گیا اور تیز آواز کے ساتھ چلاتے ہوئے اس نے اپنی

"مجھے یہ سب سال بعد پتا چلتا یا دس سال بعد۔۔۔ ہمارا رشتہ چاہے جتنا مضبوط ہو چکا ہوتا۔ میں اسے ختم کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں لگاتا۔" وہ ٹھہرا پھر جیسے اس نے اس کی مکمل تسلی کرنا چاہی۔

"میں تمہیں اسی وقت طلاق دے دیتا۔" غصے میں چیختے ہوئے اس نے سب کہہ دیا اور کیا واقعی زمل یہ سننا چاہ رہی تھی؟ اگر ایسا ہی تھا تو اب اس کے کان کیوں پھٹنے لگے تھے۔ یہ آواز اتنی تیز تو نہیں تھی کہ کانوں کے پردوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی چیر دیتی۔ یا لفظوں میں نیزے نصب تھے۔

اور آنسو ضبط کرتے کرتے اسے محسوس ہوا کہ اس لڑکے نے واقعی میں اسے کھڑے کھڑے طلاق دے دی ہے اور اب اس کا اس لڑکے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ اسے محبت کے عقد کو توڑنے کے لیے ان تین لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا رویہ ہی کافی تھا۔ زمل کے لیے جیسے اب اس سے نظریں ملانا حرام ٹھہر گیا۔ جھک کر زمین سے اس نے اپنا پاسپورٹ اٹھایا۔ دونوں طرف سے اس کی گرد کو صاف کیا۔ پھر سوٹ کیسز کے ہینڈل تھامنے سے پہلے وہ رکی اور باسل کی پشت پر نصب گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"میں نانو اور نگار آنٹی سے۔۔۔" اس کے لہجے میں آخری الوداعی التجا تھی۔ باسل نے اس کا راستہ روک لیا۔

"ان دونوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔۔۔" ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کیا گیا۔ کہ وہ یہ بات سمجھ لے، اچھی طرح سے ذہن نشین کر لے وہ صرف تعلق ہی نہیں توڑ رہا تھا بلکہ پرایا بھی ہونے لگا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی زمل کی آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔

"اتنے سنگ دل تو مت بنو باسل۔۔۔ نانو کا ہر کام تم نے خراب کیا اور دل کو پتھر کرنے میں اتنی مہارت!"

"یہ میری فراخ دلی تھی۔ میں نے اتنے دن تک

تمہیں اس گھر میں رہنے دیا ہے۔ تمہارے غم کا احترام کیا ہے میں نے۔"

تو یہ وجہ تھی اس کے اتنے دن گھر سے باہر رہنے کی۔ ورنہ فیصلہ تو شاید وہ اسی وقت کر چکا تھا جب اسے ساری بات پتا چلی تھی۔

"میں چاہتا تو تمہیں اسی دن گھر سے باہر نکال سکتا تھا۔"

تو وہ اب کیا کر رہا تھا۔ کیا وہ اب ایسا نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس دن اور اس دن میں کیا فرق باقی بچا تھا۔ اگر اسے ایسا ہی کرنا تھا تو اسی دن کر لیتا۔ وہ دونوں سوگ اکٹھے منا لیتی۔ ڈیڈ کی موت کا بھی اور اپنی محبت کی موت کا بھی۔

"تم جا سکتی ہو۔۔۔" وہ اس کی صورت نہیں دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ مسلسل خود پر اس کی نظروں کی تپش محسوس کر رہا تھا۔ بری طرح سے۔ زل نے سوٹ کیسز کے ہینڈل تھام لیے۔ کیا وہ جاتے جاتے مزید کچھ کہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا اور اس سے "واپسی" کے لیے چلا بھی نہ گیا۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے باسل۔۔۔ تم تو میرے جواب کے منتظر۔۔۔"

"مجھے اس محبت پر شرمندگی ہے۔۔۔ تم سے محبت کرنے پر میں خود سے ساری زندگی مقدمہ بازی کرتا رہوں گا۔۔۔ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

بس۔۔۔ اب وہ اس سے زیادہ اپنی محبت کو رسوا نہیں کروا سکتی تھی۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اس کی زندگی سے اگر اس نے اپنا نام خارج کرا لیا تھا تو اس بات چیت کے بعد اپنی محبت بھی خارج کرا رہا تھا۔ زل تہی داماں ہوتی جا رہی تھی۔ ڈیڈ جا چکے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ سب ختم ہو چکا تھا یہ بھی مکمل ختم ہو گیا تو وہ اپنی باقی کی زندگی کس کے سہارے گزارے گی۔ یہ سوچ کر اس نے باسل کی طرف سے اپنا رخ موڑا اور مردہ چال سے چلنا شروع کیا۔

اپنے پیچھے اس نے نانو کے گھر کا دروازہ بند ہو جانے کی آواز سنی۔ جبکہ وہ کسی اور ہی آواز کی منتظر تھی۔ "رک جاؤ۔ ٹھہر جاؤ، مت جاؤ۔" ایسا کچھ بھی نہ کہا گیا۔

اور گلی کی شروعات تک پہنچتے پہنچتے وہ ارد گرد سے بے گانہ ہو گئی۔ وہ موت کا آخری وار تھا۔۔۔ آگے لا محدود اندھیرا تھا یا بے پناہ روشنی۔۔۔ کسے خبر؟

دو دن ہوٹل میں قیام کر کے وہ تیسرے دن فرانس واپس چلی گئی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ام سعدی

ابا میاں اور زرمینے گل

کئی دنوں کی بے زاری اور بھید بھری خاموشی کے بعد اماں آج اٹھ کھڑی ہوئیں اور ناشتے کے بعد ہی گودام کا رخ کیا جہاں اماں کے جہیز کی ٹین کی پیٹی کئی سالوں سے پڑی اونگھ رہی تھی۔ آج وہ بھی ہڑبڑا کے جاگی' بازو پھیلا کے انگڑائی لی اور جمائی روکے اشتیاق سے اماں کو تالا کھولتے دیکھنے لگی۔ ویسا ہی اشتیاق جو ہر بار زرمینے گل کی معصوم آنکھوں میں اُمڈ آیا کرتا' مگر آج زرمینے گل کی سبز شربتی آنکھیں اداس تھیں' جیسے ویرانے میں کوئی کائی زدہ تنہا جھیل۔

پیٹی کیا کھلی' ایک کے بعد ایک نوادرات کا ظہور ہونے لگا۔ برسوں کی محنت' اماں کی زرمینے گل کے ساتھ بندھی واحد دلچسپی اس کا جہیز جمع کرنا۔

کراچی سے خریدی گئی سندھی کڑھائی کی چادریں' اپلک ورک کے پلنگ پوش' گلگت سے منگوائے گئے چائنا کے ڈنر سیٹ' کانچ کے گلدان' لکڑی کی آرائشی لڑیاں' پشاور کے باڑے سے منگوائے گئے فرانسیسی پتھر کا ڈنر سیٹ' افغانی قالین' جاپانی اسمگل شدہ کپڑا اور جانے کیا کیا' مگر زرمینے گل ان سب سے بے نیاز ٹیک ٹیکسلا سے لائے گئے سنگ مرمر سے تراشے ہاون دستے کو دیکھے گئی۔ ان سب مختلف النوع بیش قیمت چیزوں سے قیمتی' ابا میاں کی اس کے جہیز کے لیے خریدی گئی واحد چیز' کیسی مہک رہی تھی' ابا میاں کے شفقت سے اٹے بوڑھے وجود کی مہک سے۔

☆ ☆ ☆

ابا میاں اور زرمینے گل' جانے کب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوگئے۔ مورخ اس بارے میں خاموش ہے' کچھ شواہد اس امر کی جانب نشان دہی کرتے ہیں کہ چونکہ اماں اپنی بڑھاپے کی اس غلطی پر (اشارہ بجا طور پر زرمینے کی طرف ہے) شرمندہ' کئی روز تک منہ چھپائے چھپائے پھریں اور ازالے کے طور پر ننھی سی شربتی آنکھوں والی زرمینے گل سے لاتعلقی اختیار کرلی بوجوہ کہ اماں دو عدد نواسوں اور ایک نواسی کی نانی کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ترقی کے زینے عبور کرنے کے بعد دادی اماں کا رتبہ پانے والی تھیں کہ زرمینے گل نے آکے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

نتیجتاً" زرمینے گل کو غیر شادی شدہ چھوٹی آپا نے گود لے لیا اور ابا میاں کو بعد از ریٹائرمنٹ وقت گزاری کا نیا مشغلہ ہاتھ آگیا۔ بڑی آپا' سدا کی خود غرض' منتقم مزاج' کینہ پرور' کم عمری کی شادی کا تاوان ابھی تک موقع بے موقع' ابا میاں اور اماں کو طعنے دے دے کر' گلے پر چھری رکھ کر بھرواتی آرہی تھیں اور اکلوتے بھیا ہمیشہ کے جذباتی' زرمینے گل کی پیدائش پر جوشیلی اور حوصلہ شکن کٹیلی تقریریں کرکے عزیز از جان اہلیہ کی جوش طبعی اور دل لگی کا سامان کرتے رہے۔

بڑی آپا اور بھیا تو ننھی زرمینے گل سے خار کھانے لگے' مگر یہ تمام حالات و واقعات جہاں اماں کے حوصلے پست کرنے کا سبب بنے وہیں ابا میاں کی ہمت اور حوصلے جواں ہوگئے۔ اب تمام چشم بصیرت رکھنے والوں نے دیکھا کہ جہاں جہاں ابا میاں' وہاں وہاں زرمینے گل۔

نہلانا دھلانا' کھلانا پلانا' چھوٹی آپا کے ذمے تھا' گھمانا پھرانا' کھیل کھلانا ابا میاں کے سر اور ان سب سے

پڑے۔ شام پڑتے ہی ابا میاں کے شیشے جڑے تخت والے پلنگ پر زرمینے گل آنکھیں موندتے ہی ابا میاں کی سنائی گئی کہانیوں کے اس جہان جا پہنچتی جہاں صرف وہ اور ابا میاں ہوتے، نہ بڑی آپا کی کٹیلی نگاہیں، نہ بھیا کے طنزیہ جملے اور نہ بھابھی کی تمسخرانہ ہنسی۔

اماں جانی نے ساری جوانی اپنوں سے دور ابا میاں کی دو ٹکے کی نوکری (بقول اماں) کے پیچھے کراچی جیسے شہر میں گنوا دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایبٹ آباد واپسی پر اب اماں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ مطلب برسوں کی تشنگی مٹانے کو، وہ اب کوئی تعزیت، پرسہ، عیادت، مبارک، سلامت، خبر گیری قضا کرنے کی روادار نہ تھیں۔ ناشتے کے بعد شٹل کاک برقعہ سر پر جمائے بہن کا ہاتھ پکڑے نکل کھڑی ہوتیں اور مغرب کی خبر لاتیں کہ یہ بھی ماں کی بچپن کی تربیت تھی کہ مغرب کے بعد گھر سے باہر نہ رہنا بچے "سو بلاؤں کا نزول ہوتا ہے اور کبھی کبھی اتفاقاً" کہیں جانے کا کوئی موقع نہ ہوتا تو ہٹ لسٹ پر براجمان افراد کی عیادت کو پہنچ جاتیں اور یہ ہٹ لسٹ — ابدی حیات کی راہ میں دیدہ و دل فرش راہ کیے زیادہ بیمار اور کم بیمار افراد کی درجہ بندی تھی۔

خیر، تو بات ہو رہی تھی ابا میاں اور زرمینے گل کی۔ اب دیکھیے تو ابا میاں سگریٹ سلگائے اپنی مخصوص نشست پر براجمان ہیں اور زرمینے بی بی گڑیوں کا گھر سجائے اسی برآمدے کے دوسرے کونے میں۔ ابا میاں کی سگریٹ کی ڈبیاں خالی ہوتیں اور زرمینے گل کی گڑیوں کا جہیز بجتا رہتا۔ صوفے، پلنگ، میزیں، الماریاں۔ ابا میاں بازار جا رہے ہیں اور زرمینے گل دو پونیاں لہراتے ہوئے پیچھے پیچھے۔

گرمیوں کی خوش گوار شامیں، ابا میاں اور زرمینے گل کی سامنے والے پہاڑی پر گزرتیں اور جب پہاڑی کے پیچھے والے میدان میں فوجی چاند ماری کی مشقوں کے بعد بکھرنے والے چھروں کے خالی خول، زرمینے گل جمع کرتی جاتی تو ابا میاں بھرپور ساتھ دیتے۔

وقت دھیرے سے آگے سرکا، چھوٹی آپا بیاہی گئیں۔

اماں کے سفارتی دوروں کا دائرہ اور بڑھا، بڑی آپا کے ماتھے کی شکنیں گہری اور مستقل ہوتی گئیں۔ بھیا نے اپنے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں بھابھی کے پاس بطور امانت رکھوا دیں، مگر ابا میاں اور زرمینے گل اپنے ہی دائرے میں گول گول گھومتے رہے۔ ابا میاں کو السر ہوا تو زرمینے گل نے ابا میاں کا مورال بلند رکھنے کے لیے خود بھی یخنی اور دلیے کی خوراک اپنائی۔ ابا میاں نے بیماری کی وجہ سے روزے قضا کیے تو زرمینے گل نے یہاں بھی بھرپور ساتھ دیا۔ وقت کا پہیہ گول گول گھومتا رہا۔ اور وہ جو قدرت کا اصول ہے کہ دائرہ ٹوٹ گیا۔

ابا میاں ٹوٹ کر ستارہ ہو گئے اور زرمینے گل ٹوٹا ہوا تارہ۔

اب زرمینے گل اس بھرے پرے گھر میں تنہا رہ گئی۔ گھٹنوں سبز۔۔۔ کانچ، نمکین پانیوں میں ڈولتے رہتے اور ایک ہی عکس تحریر ہوتا۔ ابا میاں کا۔

عدت کے زمانے میں گھر بیٹھنے والی اماں بھی خاموشی کی اس زبان میں زرمینے گل کی غم گسار و دم ساز ہو گئیں۔ عدت کے بعد اماں کے مشن کی نوعیت بدلی اور تلاش رشتہ کے عنوان سے ہم کنار ہوئی۔ خدانخواستہ اپنے لیے نہیں بلکہ زرمینے گل کے لیے۔

ایک سنہری، روپہلی شام زرمینے گل نے کسی کے نام کی سنہری، دھاتی انگوٹھی کے بدلے اپنی قیمتی زندگی گروی رکھ دی۔ کس کے نام؟ یہ غیر ضروری ہے۔

اب آگے چلیے تو شادی کی تیاریوں کا شور و غوغا مچتے ہی ابا میاں کے سایۂ عاطفت سے نئی نئی محروم زرمینے گل نے گھر کی گلابی فضاؤں کو سیاہ پڑتا محسوس کیا۔ گھر کے بڑے کمرے میں روز بروز بہن بھائیوں کی بیٹھکیں ہونے لگیں۔ زور و شور سے بحث چلتی، شادی کے خرچے، بھلے وقتوں میں ابا میاں کے دیے گئے قرضے، بڑی آپا کے تیز طرار جملے، بھیا کی جوشیلی جذباتی تقریریں، بھابھی کی تمسخرانہ دل جلاتی ہنسی، چھوٹی آپا کی خاموشی، زرمینے گل کی آنکھیں اور دل بھرے بھرے رہنے لگے۔ چھلکتے جام اور ایک تو کیلا سماعت کو کاٹتا، دل کو زخمی کرتا فقرہ جو آج کل تواتر سے کانوں میں پڑنے لگا۔

"بڑھاپے کی اولاد، عذاب کی صورت چھوڑ گئے ابا میاں۔"

کبھی ترتیب بدلتی، کبھی کہنے والا، مگر معنی وہی رہتے، اذیت بڑھتی رہتی اور پس منظر میں موسیقی کی طرح بھابھی کی طنزیہ ہنسی، زرمینے گل کی خاموش آنکھوں کی اداسی بڑھنے لگی اور اماں کی اداس آنکھوں میں جامد حیرت بھرا سوال کہ۔۔۔

"یا رب، ایک بیٹی باپ کے بغیر بیاہنی بھاری پڑ گئی۔"

ڈھیروں جہیز تو جمع تھا۔ بڑا بڑا سامان دے دلا کر، چار لوگوں کی دعوت طعام کے بعد رخصت ہی تو کرنا تھا۔ بڑی آپا اپنی بڑی اولادوں کے بیاہ کے بعد جھکی کمر کا شکوہ کرتیں اور بھیا اپنی اولاد کی مہنگی تعلیم کا۔ بلا مبالغہ ہر ہر موقع پر ابا میاں نے زرمینے گل کے لیے پس انداز کی گئی رقم میں سے کچھ حصہ دونوں کے حوالے کرتے وقت کہا تھا کہ "یہ زرمینے گل کی امانت ہے خیانت نہ کرنا۔"

مگر اب امانت کو حق کا نام دے کر ہڑپ کرنے کے بعد قرض کو احسان کا نام دینے پر زور تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ بھی ایسی ہی ایک بھید بھری شام تھی۔

مغرب کی جانب سے اٹھتے زرد بادلوں کے بگولے نے بعد عصر ہی سارے فلک پر پھیل کر حبس اور گرد کے راج کو اور تقویت بخشی تھی۔ لمبے کمرے میں آج پھر سے بیٹھک جمی تھی۔ جب چائے کی طشتری تھامے بیٹھک کی طرف بڑھتے زرمینے گل کے قدم ذرا سے تھمے اور طشتری اس کے ہاتھوں میں کانپی جب اپنی لاڈلی تین سالہ سب سے چھوٹی بیٹی لائبہ کو گود میں اٹھائے، بھیا اس کی پونیاں کستے ہوئے اپنے ازلی جوشیلے انداز میں بولے۔

"نو لاکھ جمع کروائے ہیں عزیزی کے میڈیکل کے، ڈیڑھ لاکھ عبدالمعید کی سمسٹر فیس ہے۔ کہاں سے کروں دھوم دھام سے شادی، پانچ لاکھ کہاں سے لاؤں۔ ابا میاں خود تو چلے گئے۔ یہ بڑھاپے کی اولاد ہمارے سر چھوڑ گئے۔" لائبہ کے پھولے پھولے گالوں پر بوسہ دیتے بڑی آپا کی طرف تائیدی انداز میں دیکھا۔

"ہاں بھئی۔ ہمیں تو کم عمری میں بیاہ دیا، کبھی پوچھا تک نہ، اس کھرچن کے لیے جانے کیا کیا جمع کر رکھا تھا، وہ تو ہم دونوں نے پھر بھی کافی کچھ نکلوا لیا تھا، مگر اماں کے پاس اب بھی بہت کچھ ہو گا۔"

اپنے پر غرور، نخوت بھرے انداز میں، ہر موقع پر حق

سے زیادہ وصول کرنے والی بڑی آپا کی بدگمانیوں کی حد نہ تھی۔ خاموش بیٹھی چھوٹی آپا کی نظر یک دم زرمینے گل پر پڑی جو سج سج' ناپ تول کر قدم رکھتی آرہی تھی۔ طشتری میز پر رکھتے ہوئے اس نے ایک نظر بہن بھائیوں پر ڈالی جو ذرا بھی شرمندہ نہ تھے' ڈھٹائی کی حد تھی۔

لائبہ' بھیا کی گود میں چڑھی' ان کی جیب سے جھانکتے بٹوے سے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ پورے حق سے' وہ حق جو زرمینے گل ابا میاں پر جتاتی تھی۔

زرمینے گل کا دل بھر آیا' مگر عقب میں وہ بھابھی کے چہرے پر چھلکتی تمسخرانہ مسکراہٹ محسوس کر سکتی تھی جو ماضی میں ابا میاں اور زرمینے گل کے التفات سے جلتی کلستیں' اب وہی التفات لائبہ اور اپنے میاں میں دیکھ کر فخر محسوس کرتیں۔

زرمینے گل بھرے' چھلکتے دل کے ساتھ ابا میاں کی مخصوص نشست پر آبیٹھی' سامنے دوسرے کونے میں جہاں کبھی وہ گڑیوں کا گھر سجاتی' اب وہاں بھیا کے بچے عزمی' عبدالمعید اور چھوٹی آپا کے بیٹے لڈو کھیل رہے تھے۔ عبدالمعید بھیا کا اکلوتا' لاڈلا بیٹا' ویسا ہی جذباتی جوشیلا' ہار نہ ماننے والا اور بے ایمانی پر ایمان رکھنے والا اس وقت بھی جوش جذبات سے سرخ پڑ رہا تھا۔

کھیل انتہا پر تھا۔ آخری دو' دو تین تین گوٹوں کے ساتھ۔ عزمی زرمینے گل کو دیکھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر پرزور انداز میں بلانے لگا' مگر زرمینے گل کا دل اس وقت ہر چیز سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ ورنہ یہ بھتیجے بھتیجیاں اور بھانجے تو اس کے عزیز دوست تھے۔ عبدالمعید کا جوش آخری سروں پر تھا جب لاؤنج کے کھلے دروازے سے بڑی آپا اور بھیا باہر نکلے۔

شاید بڑی آپا جا رہی تھیں' زرمینے گل انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ پیچھے پیچھے بھابھی تھیں' ہمیشہ والی دل جلاتی مسکراہٹ سجائے' تب ہی بہن بھائیوں کو کھیلتا دیکھ کر لائبہ بھیا کے ہاتھوں سے نکلی اور اسی سمت دوڑی' مگر جاتے پاؤں پھسلا کہ کیا' وہ منہ کے بل دور جا گری' ہار جیت کے منطقی فیصلے کے بغیر تمام کی تمام گوٹیں ہاری ہوئی فوجوں کی طرح ادھر ادھر منتشر ہو گئیں اور قبل اس کے لائبہ چیخ کے احتجاج کرتی۔ اکلوتے لاڈلے جوشیلے بھیا عبدالمعید نے ایک جھٹکے سے لائبہ کو اٹھا کر سیدھا کیا اور پھر ایک زناٹے دار تھپڑ کی گونج ہر طرف ابھری' مگر اس سے زیادہ بھیا کے تیزی سے بڑھتے قدموں کو اس کے منہ سے نکلے نوکیلے لفظوں نے جامد کیا تھا جو کہہ رہا تھا۔

"ایک تو یہ مسلط ہو گئی ہم پر کسی بلا کی طرح' ہر وقت کا عذاب۔ بڑھاپے کی اولاد۔" وہ پاؤں پٹختا وہاں سے نکل گیا۔

وقت' ہم میں سے ہر کسی کے کہے الفاظ اپنے کشکول میں جمع کرتا جاتا ہے' وقت پڑنے پر کسی تھپڑ کی مانند واپس منہ پر مار بھی دیتا ہے' مگر کیا اتنی جلدی!

دروازے کی چوکھٹ میں ششدر سی بھابھی کسی تصویر کی طرح ساکت تھیں' اپنی ازلی تمسخرانہ مسکراہٹ کے بغیر' بے جان چہرہ لیے۔ بھیا کے قدم جامد زمین کے سینے میں گڑے رہ گئے۔ وہ بڑھ کر روتی لائبہ کو اٹھا بھی نہ سکے۔ وہ تو بس زرمینے گل کی نمی چھلکاتی کائی زدہ جھیلوں میں کھو گئے۔

پس منظر میں لائبہ کی روتی چیخ آواز تھی' پیش منظر میں زرمینے گل کی آنسوؤں بھری خاموش سبز آنکھیں اور بھیا کی آنکھوں میں لائبہ اور زرمینے گل کے چہرے مدغم ہونے لگے' ایک ابھرتا' دوسرا ڈوبتا' کبھی دوسرا ڈوبتا' پہلا ابھرتا...

نام الگ' چہرے الگ' زمانے الگ' مگر کردار ایک ہی اور سامنے لگے دیوار گیر شیشے میں انہیں اپنے عکس کے بجائے ابا میاں کا عکس نظر آیا' ویسے ہی کنپٹیوں کو چھوتے سفید بال' ویسا ہی قدوقامت' جھکے کندھے اور وہی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتا زرمینے گل کے لیے محبت و شفقت کا سمندر۔

سائرہ رضا

جب وہ ملے

مکمل ناول

اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو دیکھا۔ سنہری گتے پر سرخ اور پیلے پھول تھے۔ سرخ جھولتا ربن۔۔۔ اور کارڈ کھلتے ہی خوشبو کا جھونکا۔۔۔ اس نے طویل سانس بھر کے کارڈ کو تپائی پر رکھ دیا۔ جہاں کارڈز کا ایک ڈھیر پہلے ہی پڑا تھا۔

اور ایک اور۔۔۔ اب تو گنتی بھی بھول گئی تھی۔ ایک سے ایک خوب صورت کارڈ، رنگ اور پھول۔۔۔ دلچسپ و حیران کن بات یہ تھی، کوئی بھی پھول یا رنگ دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ نت نئے رنگ اور ایسے پھول جو اس نے کبھی دیکھے نہیں تھے۔ کیا وہ دیوسائی کے میدانوں کا چکر لگا آیا تھا؟

کچھ کارڈ ہاتھ سے بنے ہوئے تھے۔

اور پھر یکدم جھماکا سا ہوا۔

"اگر جو کارڈز کی قبولیت کو اس نے "ہاں" سمجھ لیا ہے؟"

یہ تو واقعی غلطی ہوئی۔ وہ پوچھ سکتا ہے۔ مجھے دھوکے میں کیوں رکھا۔ کیوں رکھے میرے کارڈز۔۔۔؟ لیکن پہاڑ کے منہ پر بھی تو نہیں مار سکتی تھی نا۔ جواب تو میں دے لوں گی۔ زیادہ ضروری یہ ہے کہ اسے روک دوں' ورنہ وہ اسی طرح لگا رہا تو اس کمرے میں میرے رہنے کی جگہ کم پڑ جائے گی۔

اب وقت آگیا تھا کہ وہ جواب طلبی کرتی۔

ہوم۔۔۔

☆ ☆ ☆

صوفیہ دادی نے لیلیٰ بیگم کی نواسی کے لیے جب اخفش سے بات کی تھی تو اخفش نے انکار نہیں کیا تھا اور اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر انہوں نے لیلیٰ بیگم پر اپنا عندیہ ظاہر کر دیا تھا۔ بلاب میں اس کا جو روپ سامنے آیا تھا۔ وہ اس کے ذہن پر بری طرح چھا گئی تھی کہ کسی اور کے لیے سوچنا بھی اخفش کے لیے محال تھا۔ اخفش انکاری تھا اور صوفیہ دادی پریشان۔۔۔

"آپ یقین کریں' میں نے اس کی مرضی جانتے ہوئے لیلیٰ کے کان میں بات ڈالی تھی۔ اسے امید دلائی تھی اور اب یہ اس ذکر سے یوں بھاگتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔" صوفیہ دادی کی خشم ناک نگاہیں اس پر تھیں' جو نبیحہ اور ایبک کے ساتھ کھیل میں مگن تھا۔

"آپ سن رہے ہیں نا میری بات۔۔۔؟" شوہر کی عدم دلچسپی پر ٹوکا۔

"بالکل بالکل۔ جب آپ بولتی ہیں تب میں سر دھنتا ہوں ہمیشہ سے۔۔۔"

انہوں نے ایبک کی ننھی سی کھلونا کار کو اپنی کشادہ ہتھیلی پر چلانا شروع کر دیا۔

"ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے تم مجھے کیوں نہیں دیکھتے؟" صوفیہ دادی جان نے اخفش کو مخاطب کیا۔

"جی۔۔۔ جی آپ۔۔۔ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں دادی جان۔۔۔؟"

"ہاں!" انہوں نے دانت کچکچائے۔

"سال ہونے والا ہے۔ تمہاری دلچسپی جان کر۔ بلکہ تم سے عندیہ لے کر ہی میں نے لیلیٰ کے بڑھے ہاتھ کو تھاما تھا۔ اب وہ مجھ سے آگے کا پوچھتی ہے کیا جواب دوں۔ فون بیل تک سے گھبرانے لگی ہوں۔ اب اس کا پاکستان آنے کا ارادہ بن رہا ہے۔ وہ پوچھے گی تو کیا جواب دوں گی؟"

صوفیہ دادی کا لہجہ تیز اور پریشانی سے بھرپور تھا۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"آپ معذرت کر لیجئے گا۔"

"معذرت۔۔۔؟"

"اس میں مشکل کیا ہے؟" وہ بالکل پرسکون تھا۔ "یہ آپ دونوں کے بیچ کا ایک خیال تھا۔ نہ کوئی باقاعدہ بات تھی نہ وعدہ۔۔۔ نہ اعلان۔۔۔ خیال بدل بھی تو جایا کرتا ہے۔۔۔"

"تو برخوردار! یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ "خیال" بدلا کیسے' کیوں اور کس نے؟" اشتیاق احمد کے جملے غیر سنجیدہ سے تھے' مگر انداز قطعاً "نہیں' وہ گاڑی رکھ کے پوری طرح متوجہ ہوئے تھے۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔۔۔ فی الحال۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"پسندیدگی دکھائی تھی تب ہی تو میں نے۔۔۔" صوفیہ دادی کی آواز مدہم ہو گئی' جملہ بھی پورا نہ کر سکیں۔

وہ دیکھ کر رہ گیا۔ دادی کے انداز کی افسردگی اور شرمندگی اسے شرمساری سی محسوس ہوئی۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں خود انہیں منع کر دوں گا۔"

"اور وجہ کیا بتاؤ گے؟" اخطب نے صاف بات کرنے کا سوچا اور وہ واقعی سوچ میں پڑ گیا۔

"میں۔۔۔" بالآخر کہہ ہی دیا۔ "میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔" جملہ پورا ہوتے ہی اسے یوں لگا جیسے کندھوں سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ جب کہ نوین اور اخطب نے ایک ساتھ بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ آیا وہ سچ

کہہ رہا تھا یا محض جان چھڑانے کے لیے بات اڑائی تھی مگر نہیں یہ سچائی ہی تھی جو مسکان بن کر لبوں پہ ناچ اٹھی تھی اور چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ اتنا خوش کن تصور… کون تھی وہ جس کا فقط خیال… چہرے کو چمکا دے، آنکھوں کو جگمگا دے۔

اشتیاق احمد کے چہرے پر سکون اترا۔ چلو الجھی ڈور کا ایک سرا تو ہاتھ آیا۔

مگر تب ہی نگاہ بیگم پر پڑ گئی جو شدید صدمے کے زیر اثر ساکت رہ گئی تھیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو۔ ان سے زیادہ خوش کوئی نہ ہوتا۔

مگر یہ وہ وقت تھا جب لیلیٰ بیگم ہر روز کال کرتی تھیں۔ انہیں شادی کے حوالے سے اپنے منصوبے بتاتیں۔ اپنی تیاریاں، اپنی خواہشیں، اپنے خواب اور صوفیہ بیگم ویسے ہی کم گو تھیں۔ دوسرے وہ انہیں بولنے کا موقع بھی نہیں دیتی تھیں۔

"اب کیا ہوگا؟" ان کے سفید پڑتے رنگ کو دیکھ کر سب کو پہلی بار گھبراہٹ ہونے لگی۔

☼ ☼ ☼

لیپ ٹاپ گھٹنوں پر رکھے، ایک ہاتھ کی بورڈ پر چل رہا تھا تو دوسرے میں کاغذ قلم تھا۔ بڑے انہماک سے کام ہو رہا تھا۔ جب دھپ کی آواز سے ایک بند لفافہ اس کے بائیں جانب پہنچا گیا اس کا ہاتھ بہکا اور کاغذ پر لکیر کھنچ گئی۔ اس بدتمیزی پر نو وارد کو ٹھیک ٹھاک سنانے کے لیے اس نے سخت غصے سے سر اٹھایا۔ اگلے ہی لمحے غصہ غائب اور حیرت آمیز مسرت چہرے کو روشن کر گئی۔

"تم…!" اس نے لیپ ٹاپ گود سے اتارا۔ وہ اب ادھر کم آتی تھی۔ اس کی موجودگی میں تو آتی ہی نہیں تھی اور اس پر یہ کہ اسے مخاطب کرنا۔

"ہاں میں…!" اس نے سینے پر بازو لپیٹ کر کڑی نگاہ سے اسے دیکھا۔ پھر آنکھ کے اشارے سے پٹخے ہوئے لفافے کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ… میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ تم ہی تو لائی ہو۔"

"ہاں تم مجھے اس طرح پریشرائز نہیں کر سکتے۔"

"کس طرح…؟" وہ واقعی نہیں سمجھا۔

"اس طرح…" اس نے بھنویں اچکا کر پھر لفافے کو دیکھا۔ یعنی لفافے کو دیکھنا پڑے گا۔ اس نے جھک کر اٹھا لیا وزنی بھی تھا۔

"اوہ…!" لفافے کا منہ کھلتے ہی اسے پتا لگ گیا۔ یہ کارڈز تھے وہ تمام کارڈز جو اسے وہ وقتاً "فوقتاً" دیتا تھا۔

"یہ تو…"

"یہ صحیح نہیں ہے۔"

"کارڈ صحیح نہیں ہیں؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"تمہارا طریقہ صحیح نہیں ہے۔" اس نے دانت کچکچائے۔

"اوہ۔ تو پھر میں بھیجوں اپنے دادا… دادی، چاچا… چاچی کو تمہارے گھر… صحیح طریقہ تو پھر یہی ہے۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" اس نے انگلی اٹھائی۔

"جس حساب سے تم مجھے کارڈز دے رہے ہو نا، اب صرف مدر ڈے اور فادر ڈے کا کارڈ دینا باقی ہے۔ ہولی، دیوالی اور کرسمس تک کے تو دے چکے ہو۔ عید شب برأت کو تو جانے دو۔"

"کیوں خوامخواہ۔ مجھے ابھی ہی پتا چلا ہے کہ ورلڈ ہارٹ ڈے، کینسر ڈے، ٹی بی ڈے کے بھی کارڈ چھپتے ہیں۔"

"تو وہ بھی تم مجھے دو گے؟" وہ غصہ بھول کر شدید حیرت سے پوچھ بیٹھی۔ وہ جواب کے بجائے سر تسلیم خم کر گیا۔

"یعنی مجھے زچ کرنے کے لیے تم آخری حد تک جاؤ گے۔"

"نہیں، تمہیں منانے کے لیے میں آخری حد تک جاؤں گا۔"

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

"خیر اتنے دنوں بعد آئی ہو' بیٹھو تو سہی۔" اس نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے کشن کو یونہی جھاڑا۔

"تمہیں لگتا ہے میں بیٹھوں گی؟"

"لگتا تو خیر نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اتنی مزاج آشنائی تو ہے۔"

"خوب' تو یہ بھی جانتے ہوں گے۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ تو کیا تم میری شکایت لے کر جاؤ گی؟" اسے مزا آنے لگا۔

"کیا کہو گی۔۔۔ اور کہو گی کس سے آنی سے یا دادی جان سے۔۔۔ بلکہ نہیں تم دادا جان سے کہو گی۔ ایم آئی رائٹ۔۔۔؟" وہ جیسے بوجھ لینے پر خوش ہوا۔

"لیکن یہ بتاؤ کہو گی کیا۔۔۔؟ میرا مطلب ہے شروع کہاں سے کرو گی۔"

وہ اسے جی بھر کے چھیڑ رہا تھا۔ اور بس یہیں آکر اس کی بولتی بند ہوتی تھی۔۔۔ اور عقل کے در کھل جاتے تھے۔ بولنے کا مطلب تھا پھنسنا۔ اتنی بے وقوف نہیں تھی وہ۔۔۔ یہ معاملہ اب کسی اور ہی طریقے سے حل کرنا پڑے گا۔

وہ جھٹکے سے پلٹی۔

"اپنے کارڈز تو لے جاؤ۔" وہ رکی نہیں۔

"اگر جو کسی کے ہاتھ لگ گئے تو۔۔۔ میرا کام آسان ہو جائے گا۔" وہ خوشی سے بتانے لگا۔

"اوہ۔۔۔!" وہ شعلہ بنی پلٹی۔۔۔ اس کے ہاتھ پر جھپٹا مار کے لفافہ سنبھالا۔ اور تن فن کرتی نکل گئی۔

ادھر اس کے لبوں کی شریر مسکراہٹ سمٹتے سمٹتے گہری سنجیدگی میں بدل گئی۔ مذاق' لاپروائی کا مظاہرہ اور بات تھی۔ مگر یہ معاملہ اب یوں لٹکانے کا بھی نہیں تھا۔ ایک سال کی مدت کم نہیں ہوتی۔ اتنا تو بدل لیا تھا اس نے خود کو' اسی کے لیے نا' اور اسے احساس تک نہیں۔

✡ ✡ ✡

"تم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا نوال؟" مسلسل بولتی نوین کو اچانک ہی اس کی بے تحاشا خاموشی محسوس ہوئی۔

"آں۔۔۔ کیا۔۔۔ اچھا۔۔۔!" وہ بری طرح چونکی۔

"کیسا تبصرہ۔۔۔؟" وہ ایبک کو کھانا کھلا رہی تھی۔ پوری کی پوری گھوم گئی۔

"یہی کہ اخفش کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ اور اس نے نازک کے لیے منع کر دیا ہے۔ یقین کرو' میری تو میری' گھر میں کسی کی بھی بے یقینی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔"

"اب جانے بھی دو نوین! صبح سے کتنی بار دہرا چکی ہو۔" زینت بیگم نے اکتاہٹ سے کہا۔ "جوان لڑکا ہے۔ لڑکی کو پسند نہیں کرے گا تو کیا گائے' بکری کو چاہے گا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مجھے تو تمہاری حیرت پر حیرت ہو رہی ہے۔ کیوں نوال۔۔۔؟"

ایک تو ہر کوئی اس کی رائے جاننے کا مشتاق تھا۔ وہ جی بھر کے جھنجلائی۔

اشتیاق احمد نے وقتی حیرانی کے بعد فخر سے گردن تانی تھی۔ انہیں پوتے کی یہ مردانگی پسند آئی تھی۔

"پسند کرنا۔ محبت کرنا' اظہار کرنا' مردوں کا ہی شیوہ ہوتا ہے۔ بہت خوب!" وہ جھوم رہے تھے۔

اخطب کی حیرت کا دورانیہ ذرا طویل رہا مگر پھر اس نے بھی لاپروائی سے کہہ دیا۔ "زندگی اس نے گزارنی ہے۔ جو اس کی پسند۔ اب کوئی اسے نازک کے لیے نہیں کہے گا۔"

سب سے زیادہ بے چینی و بے یقینی نوین کو تھی۔

"اتنا چھوٹا سا میرے سامنے کا بچہ۔۔۔ بچپن میں اپنی ذرا ذرا سی تکلیف پر میرے پاس آتا تھا۔ ارے اپنے ہاتھوں میں پنسل پکڑ کے میں نے اسے لکھنا سکھایا۔ اور اب کہتا ہے اسے کوئی پسند ہے اور مجھے خبر تک نہیں۔۔۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔"

"یہ دنیا کا انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ حیران تو آپ یوں ہیں۔ جیسے آگ نے آپ کا ہاتھ نہیں جلایا۔۔۔ یا چار بالٹی پانی سے نہالیں اور مجال ہے ذرا سی بھی گیلی ہوئی

ہوں۔ جیسے ڈونلڈ ٹرمپ نائب ہو گیا ہو۔ جیسے ریل کے ٹوائلٹ میں پانی موجود ہو۔ جیسے کریلے کی بیل پر انگور لگ گئے ہو۔ جیسے ...!"

"آ... باس..." توین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ویسے وہ لڑکی ہو گی کون... سوچنے کی بات ہے نا، جس نے اخفش کے دل کو جیت لیا۔"

"ہاں تو آپ سوچیے مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں۔" وہ لیٹ گئی منہ پھیر لیا۔ کشن رکھ لیا۔

"خیر اب سوچوں گی نہیں... کان پکڑ کے اسی اخفش کے بچے سے پوچھوں گی۔ ہاں!"

توین نے پوچھ کر ہی دم لینا تھا۔ تو پھر کیا ہو گا؟ نوال کی نیند تو گیا تو تے چڑیاں سب اڑ گئے تھے۔

✿ ✿ ✿

توین نے پوچھنا تھا کہ نہیں... مگر سب نے پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیا۔ نوال کی ناک میں دم۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے نوال؟" اخطب نے باقاعدہ بلوا کر گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ وہ فوراً چوکنا ہو گئی۔ گردن بھی نفی میں زور و شور سے ہلائی۔

"نہیں بالکل نہیں۔"

"اچھا!" اخطب کے انداز میں بے یقین مایوسی آ گئی۔ نوال بھاگی، کاریڈور کے اختتام پر لان کی جانب کھلتی کھڑکی تھی جس کی چوکھٹ پر کہنی ٹکائے ہتھیلی پر ہاتھ جمائے دور کسی غیر مرئی نقطوں کو تکتی صم' بکم' سی صوفیہ دادی... کتنے روز سے ان کی سی ڈی اس ایک موڈ میں پھنسی تھی نوال نے دبے قدموں سے نکل جانا چاہا۔

"نوال... ادھر آؤ بچے...!" ان کی آواز میں کسی پرانے کلاسیکل راگ سا درد تھا۔

"جی دادی جان!" وہ سارے خدشات بھلا کر پیش ہو گئی۔

"تم تو بڑی سمجھ دار بچی ہو نوال۔"

"جی دادی...!" اس نے جی جان سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں... بس سر میں درد ہے ذرا۔" انہوں نے سر مسلا۔

"وہ، میں بام لگا دوں؟" صوفیہ دادی نے جواب کے بجائے سر پیچھے ڈال دیا۔ وہ بھاگ کر بام لے آئی۔ اور پوری ہمدردی سے لگی رگڑنے... اور ان سے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگی۔

"لان کے سوٹ بھی کتنے مہنگے ہو گئے ہیں ناں... ایگزیبیشن سے لائی تھی یہ والا... تین ہزار سے اسٹارٹ تھے۔ میں تو بھاگ آئی۔ اسٹوڈنٹ ہوں۔ باپ ریٹائرڈ ہے۔ کہاں سے پورے کروں گی۔ پھر خاص میرے لیے اس نے پچاس روپے کم کیے تب میں مانی اور تین سوٹ لیے پورے ڈیڑھ سو روپے بچائے۔ اچھی شاپنگ سینس ہے ناں میری۔"

صوفیہ دادی کا غم زدہ چہرہ مزید الم کی تصویر ہو گیا اور کوئی وقت ہوتا تو ہنس ہنس کر دہری ہو جاتیں۔

"میں اب جاؤں... تھوڑا کام ہے۔ آپ بھی چل کر کمرے میں آرام کریں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"میں چھوڑ آؤں آپ کو۔" اس نے ان کی وہیل چیئر کے ہینڈلز پکڑے مگر ساری مکاریاں طراریاں، دھری کی دھری رہ گئیں۔ صوفیہ دادی نے ہینڈل پر جما اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے سامنے کر لیا۔

"تمہیں آئیڈیا ہے کہ وہ کون ہے؟"

"وہ... کون وہ...؟" اس نے تجاہل برتنا چاہا۔

"اوہ، وہ لڑکی جسے اخفش نے پسند کیا ہے۔"

"اوہ میرے خدا...!" انہیں تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا۔ مگر یہ بھی کہاں ممکن تھا۔

"میں کیسے بتا سکتی ہوں دادی جان!" خیالات سے قطع نظر اس کے لہجے سے شہد ٹپکا۔ "مجھے کیا پتا۔"

"اس لڑکی کا پتا کرو نوال۔"

"اچھا...!" اس کی آواز مردہ ہو گئی۔

"تو پھر کب...؟"

"آپ ہاتھ چھوڑیں گی تب ہی تو جاؤں گی ناں...

پتا کرے۔"

"اوہ۔۔۔!" انہوں نے جلدی سے ہاتھ چھوڑا۔۔۔ بی بی نوال یوں بھاگیں جیسے جان بچی سو لاکھوں پائے۔ مگر مصیبت ٹلی تھوڑی تھی۔ جب وہ خطرے کی حدود۔۔۔ مطلب اپنے اور ان کے لان کی درمیانی دیوار پھاندنے ہی والی تھی تب میرون شرٹ بلو جینز میں باڑھ کے پاس اپنے پریشان بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے اشتیاق احمد کی نظر اس پر پڑی۔ باچھیں چر گئیں اسے بھی مسکرانا پڑا۔

"میں بہت پریشان ہوں نوال۔"

"ہاں میں بھی۔۔۔"

"کیوں تم کیوں۔۔۔"

"آپ جو پریشان ہیں۔ اسی لیے۔"

"ہاں ایسے مقام محبت میں آجاتے ہیں۔ جب دل ایک ہی لے پر دھڑکنے لگتے ہیں۔" وہ گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگے۔ یہ گہری بات کہیں اوپر لکھی ہوئی تھی شاید۔

"محبت۔۔۔ کون سی محبت؟" نوال سٹپٹائی؟ "کہیں دادا جان کو۔۔۔"

"تمہاری اور میری محبت نوال۔۔۔ مجھے یقین تھا' ایک تم ہی ہو جس سے دل کی بات کر سکتا ہوں۔"

"کون سی بات۔۔۔" "کاش اسے کوئی آواز دے لے' بھاگوں تو کیسے بھاگوں۔

"وہ کمینہ بم پھوڑ کے اب مزید کچھ پھوٹنے کو تیار نہیں۔ بتاؤ اب میں کس سے پوچھوں؟" نوال نے دوپٹا اپنے چہرے کے گرد کسا۔ اتنی باتوں میں لفظ کمینے نے دلی تسکین دی تھی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں دادا جان۔۔۔؟" وہ جذبات میں بہہ ہی گئی آخر۔۔۔ دل کی نرم جو تھی۔

"پتا کرو وہ لڑکی کون ہے۔ ایک بار بس ایک بار مجھے پتا لگ جائے۔" ان کی آنکھوں سے گویا خون ٹپکنے لگا۔

"تو یعنی آپ کو بھی نازک اندام پسند تھی؟" یہ حیران کن بات تھی اس کے لیے۔

"بات پسند کی نہیں' زبان کی ہے۔ صوفیہ بیگم نے زبان دی تھی اس کی نانی کو۔"

"زبان۔۔۔ کب؟" نوال بھونچکی رہ گئی۔ زبان دے دی تھی ابھی تو وہ اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اور لیلیٰ بیگم کی تو اپنی زبان خوب تھی مانگنے کی ضرورت کیوں؟

"محاورہ بولا ہے میں نے۔"

"اوف۔۔۔!" نوال نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سکون کا سانس لیا۔ "وہ لڑکی کون ہے؟" "میں کیسے پتا لگا سکتی ہوں۔ میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں مجھے تو گلی کے کونے کا بھی نہیں پتا۔۔۔ نوال نے پلکیں پٹپٹا کر معصومیت کی حد کردی۔

"تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" دادا جان نے سینہ تانا۔ "ہم اس گلی کا' شہر کا چپہ چپہ چھان ماریں گے۔" وہ خلاؤں میں دیکھ رہے تھے۔

"ہم؟" اس نے دہرایا۔

"ہاں تم۔۔۔" تیزی سے اسے دیکھا۔ "کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟"

"نہیں۔۔۔" اس کے منہ سے سچ نکلا ساتھ اشتیاق احمد کا رنگ اڑتا دیکھا۔ "میرا مطلب ہے کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔"

"ہاں مجھے تم سے ہی امید تھی۔" اشتیاق احمد نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"اب میں جاؤں؟" اس نے جان چھڑانی چاہی۔

"نہیں ناں' ابھی ہم چائے کی دو پیالیوں پر اپنا لائحہ عمل طے کریں گے؟"

"نہیں۔۔۔" نوال کا سر زور سے ہلا۔ "آپ چائے کی ایک پیالی پر سب طے کرلیں۔ مجھے بتا دیجیے گا بس۔"

"نہیں۔۔۔ اچھا۔۔۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ فوراً مان گئے۔ نوال اتنی آسانی سے جان چھوٹ جانے پر ابھی کلمہ شکر کہنے ہی والی تھی کہ ان کے اگلے جملے نے دانت کچکچائے' مٹھیاں بھینچے اور بال نوچ لینے کی

خواہش کو نجانے کیسے دبایا۔

"ویسے سوچنے کی بات ہے نا کہ وہ لڑکی ہوگی کون.... کون ہو سکتی ہے۔ اوہ؟" وہ پیر پٹختی بھاگ پڑی۔

"مجھ سے تو سب یوں پوچھتے ہیں جیسے میں اس کی امی ہوں۔ ہونہہ!" اشتیاق احمد مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے ٹہلنے لگے "آخرانہیں اتنا بڑا مشن درپیش تھا۔

☆ ☆ ☆

اخفش انعام کا واضح انکار اور وجہ سب کو پتا لگ گئی تھی۔ ابتدائی شور و غوغا ہائے وائے کے بعد اب جبکہ راوی نے چین لکھنے کے لیے قلم تھام لیا تھا اور ابھی چین کا پہلا صفحہ ہی لکھا تھا کہ صوفیہ بیگم کی آمد ہوئی تھی۔ صوفیہ بیگم تو انہیں دیکھ کر ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن گئی تھیں۔

"روز فون پر بات ہوتی تھی۔ مگر مجھے ذرا اندازہ نہ ہوا کہ صوفیہ اتنی بیمار ہے۔ آپ میں سے بھی کسی نے نہیں بتایا۔" سب کو کڑی نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ نے پوچھا ہی نہیں.... بلکہ آپ تو فون پر آنٹی کے علاوہ کسی اور سے بات ہی نہیں کرتیں۔" نوین اتنی صاف گو بھی نہیں مگر منہ سے سچ نکل گیا۔

"کیا آنکھوں کا بھی پرابلم ہو گیا ہے نظریں نہیں ملاتی۔" اگلا سوال پچھلے سے بھی کڑا۔

"کیسے ملائیں نظریں.... پوتے نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا۔" صدمے سے پر یہ آواز اشتیاق احمد کی تھی۔

"کیا.... کیا کہا؟" لیلیٰ بیگم نے کچھ گومگو سی کیفیت میں دیکھا۔

"پوتے نے کیا کیا۔"

"پوتا.... کون پوتا؟" اچھا میرا پوتا۔ ماشاء اللہ بڑا ہی سمجھ دار بچہ ہے۔ آئے دن کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ بھگتنا ہمیں پڑتا ہے۔" آخری جملہ زیر لب کہا۔ اخطب نے گھور کر دیکھا۔ نوین کو اعتراض ہوا۔

"اب ایسا بھی کچھ نہیں کر دیا اس نے.... کسی کو پسند ہی تو کیا ہے۔" گلاس اٹھانے کے بہانے ذرا سا جھک کر کہہ دیا۔

"یہی بات اونچی آواز سے کہہ دو نوین...!" اشتیاق احمد نے بلند آواز سے کہا۔ لیلیٰ بیگم نے انگشت شہادت کان میں زور زور سے ہلائی۔

"ابھی تک میرے کان بج رہے ہیں۔ جہاز سے اترنے کے بعد گھوں گھوں رہتی ہے دیر تک۔ آپ لوگ باتیں کر رہے ہیں، مجھے سنائی ہی نہیں دے رہا۔"

"بس اسے اللہ کا خصوصی کرم ہی کہہ سکتے ہیں۔" اخطب ولی ہو گیا۔

"نازک کا بہت دل ہو رہا تھا سب کو یاد کرتی تھی اتنا زیادہ کہ حد نہیں۔ یہاں گزرے وہ چند ہفتے تو جیسے زندگی کا حاصل ہو گئے۔ بہت بھولی اور سیدھی محبتوں سے گندھی بچی ہے میری.... نام لے لے کر یاد کرتی تھی۔ خاص طور پر صوفیہ سے تو اسے اتنی محبت ہو گئی کہ بس۔ کہتی تھی آن سے میرے جیسے خوشبو آتی ہے۔ میں نے کہا ماں اور ماسی میں کیا فرق.... ہاہاہا" لیلیٰ بیگم نے ہنس کر انداز نشست بدلا۔

نوین گھبرائی۔ بڑی مشکل سے بچے سلائے تھے۔ اور یہ ہنسی انجن کی گڑگڑاہٹ جیسی تھی۔

"نوین اور اخطب کو بھی یاد کرتی تھی اور آپ کا ذکر تو ہر وقت ہونٹوں پر رہتا تھا۔ اشتیاق بھائی.... کہتی تھی اتنی اچھی باتیں کرتے ہیں نانا جان....."

"اف!" اشتیاق بھائی کی آنکھیں آخری حد تک کھل گئیں۔ سرمہ بھی پھیل گیا۔

"باتیں.... کون سی باتیں؟ کب کی تھیں انہوں نے نازک سے باتیں.... اور وہ بھی ایسی جن کی یاد گھر تک کھینچ لائی۔ حیران نوین بھی تھی۔ سال بھر کے فون کے تعلق میں اگر کبھی غلطی سے فون اس نے اٹھا بھی لیا تھا۔ تو لیلیٰ آنٹی نے اور اس نازک نے سلام کے بعد سیدھا صوفیہ کا پوچھا تھا۔

اور یہی نہیں.... فیس بک پر نوین کی فرینڈ ریکویسٹ کو آج تک اوکے کا سگنل نہیں ملا اور ذکر یاد کرتے

کا۔۔۔ یہ تو سہیل و ژانج کے کھلے تضاد سے بھی بڑا کھلا ڈلا تضاد تھا۔ مگر کیوں۔۔۔؟

شروع کے دو پریڈز آف تھے۔ اس کا لمبی نیند لینے کا ارادہ تھا مگر بدقسمتی سے آنکھ وہی صبح چھ بجے پٹ سے کھل گئی۔ آنکھیں زور سے میچیں۔ اوندھی لیٹی۔ منہ پر تکیے رکھے۔ مگر سب بے سود پلک سے پلک جڑ کر نہ دی۔ اب یہ حال تھا نہ جاگی ہوئی تھی ناں سوئی ہوئی۔۔۔ اس نے بھاڑ سا منہ کھول کر جمائی لی۔ تب ہی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

"اتنی صبح صبح۔۔۔ خیریت۔۔۔" وہ سیدھی ہوئی، یہ صوفیہ بیگم تھیں۔

پریشان، ہراساں، ادھر ادھر دیکھتی جیسے چھپ رہی ہوں۔

"آپ صوفیہ دادی۔۔۔؟ خیریت ہے ناں؟" وہ جست لگا کر ان تک پہنچی۔

"وہ آگئی رات۔۔۔" ان کے لہجے سے بھی سراسیمگی ٹپکتی تھی۔

"آپ ایسا کریں، سارا الزام اس کے سر رکھ کے بری الذمہ ہو جائیں۔ کہ سب اس کا کیا دھرا ہے۔ آج کل کے لڑکے کب کسی کی سنتے ہیں۔" وہ اب اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔

"مگر کچھ قصوروار تو میں بھی ہوں ناں۔ لیلیٰ تو میرا گریبان ہی پکڑے گی ناں۔"

"اب میں کیا کروں نوال؟" صوفیہ دادی نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کچھ ایسی دل گیری سے پوچھا

کہ نوال اپنی فکر و پریشانی غم و غصہ بھول بھال کر ذہنی طور پر پوری طرح حاضر ہو کے ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جبکہ وہ آہی گئی ہیں تو انہیں خود ہی دو چار دن میں اندازہ ہو جائے گا کہ۔

"بات بتانے کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے پوچھے گی کہ جب میں نے سال پہلے طے کر لیا تھا کہ اپنے پوتے کے لیے اس کی نواسی لوں گی تو اب پیچھے کیوں ہٹی ہوں۔"

"آپ کہہ دیجیے گا لڑکا نہیں مانتا۔" اس نے سادہ حل پیش کیا۔

"کہنا تو آسان ہے پر اس کے رونے کون سنے گا۔"

"مخفش کیا کہتا ہے۔"

"اسے کیا کہنا ہے جو کہنا تھا کہہ تو چکا۔۔۔ صاف انکار۔" صوفیہ دادی رونے ہی نہ لگ جائیں۔

نوال کو پہلی بار صوفیہ دادی کی پوزیشن کا اندازہ ہوا۔ اس نے سر جھکا کر پہلی بار بہت سنجیدگی اور حساب کتاب سے سارے معاملے کو جانچا۔ صوفیہ بیگم پر امید پریقین نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"آپ ایک کام کریں۔" اس کے لبوں پر وہ مارا جیسی مسکان آٹھہری۔

"اسے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے کر مجبور کردیں۔"

"دودھ۔۔۔" صوفیہ بیگم کا کھلا چہرہ فیوز بلب بن گیا۔ "میں کیسے دے سکتی ہوں یہ واسطہ۔۔۔ میں اس کی دادی ہوں۔" انہوں نے دادی پر زور دیا۔

"تو اس ڈبے کا واسطہ دے دیں۔ جس کمپنی کا دودھ آپ استعمال کرتی تھیں۔" وہ بس پل بھر کو سٹپٹائی تھی۔

"اللہ کے لیے بچے تم تو سنجیدہ ہی نہیں ہو۔"

"جتنی سنجیدہ میں اب ہوں ناں اتنی تو زندگی میں کبھی نہیں ہوئی۔" نوال نے ڈیلے گھمائے۔ "دودھ نہ سہی اس محبت کا واسطہ دیں جو آپ نے اسے دی یا پھر اس نے آپ سے کی۔ بس یوں سمجھیں کام ہو گیا۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"مان جائے گا؟"

"آپ نے کیا فلمیں نہیں دیکھیں کبھی۔۔۔ وہ پرانی والی۔۔۔ دیکھیں۔۔۔" نوال نے اپنی کرسی ان کی وہیل چیئر

سے جوڑی اور جانچتی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا
"کہیں کوئی سن تو نہیں رہا۔"
"محبت کا واسطہ دیں۔ پرورش کے طعنے۔ راتوں کو جاگنے کا احسان۔۔۔ نہ مانے تو اگلا مرحلہ آئے گا۔ بیماری کا' آپ دھڑام سے سینے پر ہاتھ رکھ کر گر جائیے گا۔ میں ہارٹ اٹیک کا شور مچادوں گی۔"
"کیا۔۔۔؟"
"انجیو گرافی کے دوران مولوی صاحب کو بلوالیں گے۔ آپ کہہ دیجیے گا۔ یہی میری آخری خواہش ہے۔"
"کیا۔۔۔؟ وہ مان جائے گا۔"
"ناراضی اور بھوک ہڑتال کا آپشن بھی رکھا جاسکتا ہے۔"
نوال کا دماغ اور زبان صحیح سمت میں چل رہے تھے۔ صوفیہ دادی دم بخود تھیں۔ یہ سب تو ان کے اوپر منحصر تھا اور ان کی اداکارانہ صلاحیتیں صفر تھیں۔ یہ نوال کو نہیں معلوم تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ سامنا ہونے پر اخفش حیران ہوا تھا یا نازک اندام کی سانس سینے میں اٹک گئی تھی۔ ہاتھ دل پر دھرے وہ پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ پہلے تو وہ پہچانی ہی نہیں تا
وہ جمائیاں روکتی۔ انگڑائیاں سنبھالتی' سہج سہج برآمدے کی سیڑھیاں اترتی لان میں جاکر چہل قدمی فرمانا چاہتی تھی۔
اور وہ صبح اذانوں کا اٹھا آدھے شہر کی لمبائی چوڑائی ناپ کر پسینے میں تر بتر واپس آیا تھا۔ دونوں سیڑھیوں پر ہی یوں ساکت ہوئے جیسے انڈین سوپ میں سماں ٹھہر جاتا ہے۔ عمر گزر جاتی ہے' مگر بس وہ ایک پل۔۔۔ وہ ایک پل۔
ادھر نازک کے لیے تو پہچان کے مشکل مرحلے کے بعد بے یقینی اور صدمہ کا آغاز تھا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ وہ جو اس نے کبھی غلطی سے بھی نہیں گمان کیا تھا۔
جبکہ اخفش حیرت کے سمندر سے نکلنے کے بعد طیش کے صحرا میں بھٹکنے لگا۔ نہیں۔۔۔ دادو یہ نہیں کرسکتیں۔ کبھی نہیں۔۔۔ وہ ان سے ایسی امید نہیں کرسکتا تھا۔ وہ نازک کو وہیں ساکت چھوڑ کر دندناتا اندر پہنچا اور بدترین خدشہ مجسم سامنے ڈائننگ ٹیبل پر اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ہمراہ موجود تھا۔
"نہیں۔۔۔ لیلیٰ او لیلیٰ۔۔۔ کیسی وہ لیلیٰ؟" ایک بعد دوسرا گانا۔
"او اخفش۔۔۔ کتنی راہ دکھائی تم نے۔۔۔" لیلیٰ بیگم کے ہونٹوں سے کپ لگا تھا جب اس پر نظر پڑی تیزی سے گھونٹ نگلا کپ رکھا اور دونوں بانہیں وا کرتی کھڑی ہو گئیں۔
"رات کتنی دیر تک میں نے جاگ کر تمہارا انتظار کیا۔"
"جی۔۔۔!" وہ بازوؤں میں یوں تھا جیسے بڑی مرغی کے حصار میں چوزہ۔
"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا حال کرلیا تم نے' کھانا پینا چھوڑ دیا کیا؟" وہ اب اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ جمائے سخت تعجب سے اسے سرتاپا دیکھ رہی تھیں پھر سخت شکایتی نگاہیں صوفیہ بیگم کی جانب اٹھ گئیں۔
"تم نے ایک بار نہیں بتایا صوفیہ۔۔۔ اخفش بیمار ہو گیا ہے۔"
"بیمار۔۔۔!" صوفیہ بیگم نے منہ اٹھا کر نوین کو دیکھا۔ نوین نے اخفش کو۔۔۔ وہ سختی سے تردید کرنا چاہتی تھی' مگر اخفش نے طراری دکھائی۔
"جی بس وہ بخار تھا معمولی سا۔۔۔ بگڑ گیا۔"
"تو ڈاکٹر کو دکھاتے۔" وہ چہرے کو دیکھتی جارہی تھیں۔
"انہوں نے ناقابل علاج کہہ دیا ہے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" لیلیٰ بیگم نے سب کو دیکھا۔
"یہ دنیا ہے لیلیٰ آنٹی اور دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔"

اس نے کمنا بلے جھٹکا ہے۔

"مگر..."

"ایسے ہی مذاق کر رہا ہے۔" صوفیہ دادی نے شکوک و شبہات کی رسی دراز ہونے سے پہلے کھینچی۔ احفش نے منہ بنایا۔ اس بخار کو وہ اتنا طول دینا چاہتا تھا کہ لیلیٰ بیگم کانوں کو ہاتھ لگاتی بھاگ پڑتیں۔ ہمراہ نواسی "مگر یہ داد واف... !

"نہیں، مجھے تو مذاق نہیں لگ رہا۔ تم نے کبھی اسے غور سے دیکھا نہیں یہ کہاں سے لگ رہا ہے۔ وہ احفش، جو مجھے پسند تھا۔"

"اوہ! یعنی اب میں آپ کو پسند نہیں؟" احفش نے شدید خوش امیدی سے پوچھا۔

"نہیں نہیں پسند تو ہو مگر..." انہوں نے اس سے بھی تیزی سے امیدوں کا گلا گھونٹا مگر ساتھ ہی وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے کچھ مشکوک لگ رہی تھیں۔ احفش نے تولتی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

✲ ✲ ✲

"آپ کس کس بات پر حیرت کا اظہار کریں گی نانو جان...!" نازک کے لہجے کی تڑپ لیلیٰ بیگم کو بے چین کرنے لگی۔

"ہم تقریباً" ایک سال بعد ملے اور اس نے مجھے ہائے تک نہیں کہا۔ حال چال اور بات چیت تو خواب ہی سمجھیں۔"

"تو تم پہل کر لیتیں میری گڑیا...!"

"کیسے کر لیتی پہل... وہ تو مجھے دیکھ کر یوں ہو گیا جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔" نازک کی آواز بوجھل ہو گئی۔ اپنے لیے ایسا لقب استعمال کرنا دل گردے کا کام تھا۔ لیلیٰ بیگم خاموش ہو گئیں۔

"اور سب سے بڑھ کر آپ نے اس کی حالت دیکھی۔ وہ کہیں سے بھی سال پہلے کا احفش نہیں لگ رہا تھا۔" اصل صدمہ...

"ہاں وہ کسی بخار و خار کا ذکر کر رہا تھا۔"

"کوئی بخار و خار نہیں... اس نے ایک سال سے فٹنس کلب جوائن کر رکھا ہے۔ ڈائٹنگ اور ایکسر سائز... ہر وقت کیلوریز کاؤنٹ کرتا ہے۔ اور..."

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟" لیلیٰ بیگم نے بے ساختہ ٹوک دیا یہ تو بیماری کی خبر سے زیادہ خطرناک خبر تھی۔

"تو ین بھابھی نے..."

"مگر اسے اس سب کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یہی تو سوال ہے" آپ پوچھتیں نا اس سے۔" وہ رو نکھی ہو گئی۔ شکوہ کناں انداز سے ان کے گھٹنے پر سر رکھ کے لیٹ گئی۔ لیلیٰ بیگم نے اس کے ریشمی بال سہلانے شروع کر دیے۔ جبکہ دھیان کہیں اور تھا۔

"صرف احفش ہی کیوں..." وہ خود سے ہم کلام تھیں۔ "یہاں تو سب کچھ عجیب لگ رہا ہے جیسے کچھ چھپایا جا رہا ہو جیسے ہماری سرپرائز آمد نے حیران کم اور پریشان زیادہ کیا ہو اور سب کو چھوڑو... صوفیہ کا رویہ بالکل عجیب سا ہے۔ ناقابل فہم سا۔ آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات ہی نہیں کرتی۔ کھوئی کھوئی سی پتا نہیں..."

"یہی... بات..." لیلیٰ بیگم کا چلتا ہاتھ رک گیا۔ نازک جسے وہ سویا ہوا گمان کر رہی تھیں۔ اچھل کر بیٹھی تھی۔

"یہی بات میں نے بھی فیل کی ہے۔ صوفیہ نانو تو بالکل بدل گئی ہیں۔ پہلے تو مجھے اتنا پیار کرتی تھیں مگر اب تو مجھ سے ڈر رہی تھیں جیسے..."

"یعنی میں نے صحیح فیل کیا ہے۔" لیلیٰ بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"آپ نے اسے بریک فاسٹ کرتے دیکھا تھا۔" لیلیٰ بیگم کی سوالیہ نظریں اٹھیں۔

"دو براؤن بریڈ کے سلائس پھیکے دودھ کے ساتھ اور ایک فریش جوس کا گلاس اگر وہ اسی طرح سے کھائے گا تو بالکل اسمارٹ ہو جائے گا بلکہ پہلے سے

آدھا تو ہو ہی چکا ہے۔ کہیں ذیرو فگر کے چکر میں تو نہیں ارجن رام پال کی طرح۔ تو پھر میرا کیا ہو گا نانو جان! مجھے تو وہ پسند ہی اسی لیے آیا تھا کہ میرے جیسا دکھتا تھا۔ مجھے کبھی طعنہ نہیں مار سکتا تھا فٹی ہونے کا۔ میں جواب میں اسے آئینہ دکھا دیتی مگر... اگر وہ اسی طرح کم ہوتا رہا تو لوگ تو ہمیں شادی کے بعد الن نتھا کہیں گے۔" سخت فکر مندی سے حقیقت کے آئینے میں جھانکتی وہ چلا ہی تو پڑی اور لیلیٰ بیگم کے نقوش بگڑ گئے۔ یہ تو انہوں نے کبھی نہیں سوچا۔ کتنی باریک بین تھی نازک... اگلے ہی لمحے انہیں نواسی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"وزن کم کرنا مسئلہ ہوتا ہے۔ بڑھانا نہیں... ایک مہینے میرے ہاتھ کے تر نوالے کھائے گا تو واپس اصل حالت میں آجائے گا۔" وہ پر یقین تھیں، بے فکری سے کہا۔

"وہ کھالے گا؟ دیکھا نہیں ناشتے پر کتنے لوازمات تھے مگر اس نے وہی..."

"جانے دو ناشتے کے لوازمات... نوین کو کیا پتا، کیسے راتوں کو جاگ جاگ کر نہاری اور پائے دھیمی آنچ پر پکائے جاتے ہیں۔ میرے ہاتھ کے کھانوں کی خوشبو سے تو لوگ سوتے سے جاگ کر خوشبو کے سہارے گھر تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ اخفش کس کھیت کی مولی ہے۔"

ان کی خود ستائشی، گھمنڈ کی حد سے بھی گزر گئی۔ حقارت سے ہاتھ چلایا۔ نازک کی رنگت بحال ہونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا دادو...!" وہ خشم ناک تیور لیے ٹہلنے لگا۔ "آپ مجھے اس طرح پریشرائز نہیں کر سکتیں۔" اس نے ہاتھ پر مکا مارا۔

"کون سی زبان سے یقین دلاؤں کہ وہ کبھی میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسی ہیں اچانک..." صوفیہ دادی کا لہجہ سچائی کا ترجمان تھا۔ وہ ٹھہر کر چہرہ تکنے لگا۔

"ارے جانے بوجھتے کون اپنے سر مصیبت مول لیتا ہے۔ میں نے تو فون سننے بھی بند کر دیے تھے۔" وہی جواب دہی کے لیے روبرو پہنچ گئی۔ "میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا اب ہو گا کیا؟"

انہوں نے اسی سے مدد طلب کرنے کا سوچا۔ نوین کندھے اچکا کر مراقبے میں چلی جاتی تھی۔ اشتیاق احمد اجنبی ہو جاتے تھے۔ جیسے جانتے نہیں، پہچانتے نہیں۔

"صاف منع کر دیں۔" اس نے دو ٹوک انداز سے حل پیش کیا۔

"کیا کہوں گی۔"

"یہی کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کروں گا۔" اس کا چہرہ محض ذکر ہی سے سو واٹ کا بلب ہو گیا۔

"کیا بہت اچھی ہے؟" صوفیہ دادی کا دھیان پلٹ گیا۔

"ہاں بہت..." وہ تسلی سے کرسی پر تشریف فرما ہوا۔

"خوب صورت بھی ہے؟" یہ عین ممکنہ سوال تھا۔

"بہت زیادہ..." اس کی آنکھوں کے آگے مختلف "روپ" چکرانے لگے۔ ہنستی ہوئی، روتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، غصہ کرتی، کھاتی پیتی، چلتی پھرتی۔ ہر حال میں دل کی دیوار سے ایک اینٹ گرا دیتی تھی۔

"تو مجھ سے ملواتے کیوں نہیں...؟" آخری سوال اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"ملوا دوں گا... پہلے آپ اس مصیبت سے تو جان چھڑائیں۔"

"کون سی مصیبت...؟"

"یہی لیلیٰ نانو اور ان کی نازک سی نواسی..."

"تم سے رائے لے کر ہی نازک کو سوچا تھا۔"

"تو صرف سوچ تک محدود رہتیں نا... آپ آگے کیوں بڑھیں؟"

"آگے کہاں بڑھ رہی تھی... بس یونہی باتوں باتوں

میں بات بڑھ گئی۔"

"اوہ دادو۔۔۔ کون سا منگنی ہوئی بلکہ بات چیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ایک خیال تھا آپ دونوں کے بیچ بس۔۔۔" وہ صحیح کہہ رہا تھا۔

"یہ ہمارا خیال ہے کہ وہ ایک خیال تھا۔لیلیٰ نے اسے ارادہ ہی سمجھا۔"

"تو یہ تو پھر ان کی غلطی ہے نا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔صوفیہ دادی کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔خاموشی کا وقفہ بڑھ گیا۔

"کیا وہ نازک سے بھی زیادہ پیاری ہے؟" انہیں یک دم نازک کا بے تحاشا حسین چہرہ یاد آیا اور اس میں شک کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

حسین تو وہ بھی تھی، مگر اس حسن کا طول و عرض یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا اور جس حساب سے وہ کھاتی تھی اور جنبش بھی کرنا منع تھا۔اس رقبے نے نہ جانے اور کتنی جگہ گھیرنی تھی۔

"میں نے کبھی تقابلی جائزہ نہیں لیا دادو۔۔۔ اور میں نے یہ بھی کب کہا کہ نازک پیاری نہیں ہے یا اچھی نہیں ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہو گیا ہے کہ مجھے اس کے علاوہ اب اور کوئی اچھی نہیں لگتی۔"

صوفیہ دادی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔نوال کی دی ہوئی ساری ہدایتیں بھک سے اڑ گئیں کہ کن کن طریقوں سے وہ اسے دباؤ میں لا کر منوا سکتی ہیں۔پوتے کے چہرے پر اتنی رونق تھی اس کے نام کی کہ ان کے دل سے دعا نکلی، یہ جگمگاہٹ ہمیشہ قائم دائم رہے۔

"ٹھیک ہے، میں بات کرتی ہوں لیلیٰ سے، زبردستی کے رشتے بنا بھی دیے جائیں تو سروائیو نہیں کر سکتے۔"

ان کے جملے میں اعتراف شکست تھا، مگر لہجے میں اک نئی ہمت، عزم ارادہ۔۔۔ اخفش نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور جست بھر کے ان کے بیڈ پر پہنچا۔

"اوہ دادو! میری گریٹ دادو۔۔۔ اوم۔۔۔ ما۔۔۔ اس نے دائیں گال کا بوسہ لیا۔اس نے بائیں گال کا بوسہ۔۔۔ لینا۔۔۔ چاہا۔ دھاڑ۔۔۔ خواہش ادھوری رہ گئی۔وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ خشم ناک بلکہ ہیبت ناک تیور لیے پورے دروازے کو ایک ہاتھ سے دیوار کے ساتھ مار کے ان دونوں کو گھورتی وہ دو۔۔۔ نہیں چار آنکھیں۔ بلکہ آنکھیں نہیں۔۔۔ دو بم تھے۔ آتش گیر مادہ، شعلے اگلتی لیلیٰ بیگم۔۔۔ اور ان کے پیچھے نازک اندام۔۔۔

اخفش نے صوفیہ دادی کے سہم جانے کو واضح طور پر محسوس کیا۔وہ ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہو گیا۔

ان کو بتانا مشکل مرحلہ تھا۔اچھا ہوا وہ سب سن چکیں۔اب تو صرف وضاحت کرنی تھی۔معذرت کرنی تھی۔غلط فہمی کو راہ راست دکھانی تھی، مگر۔۔۔ مگر کیا یہ سب اتنا آسان تھا۔صوفیہ بیگم نے حلق تر کرتے ہوئے سوچا۔

لیلیٰ بیگم کی آنکھوں کا جلال۔۔۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر سے بھی بڑھ کر تھا اور نازک اندام کی آنکھوں کا ملال۔۔۔ وہ غم و شکوہ، بے یقینی، نہیں نہیں!! خوب صورت آنکھیں لبریز ہونے لگیں۔اخفش پہلی بار گھبرایا۔وہ جلال کو تو دلائل سے ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ان نین کٹوروں میں پانی کیسے ٹکتا، یہ تو سیلاب کی مانند لگ رہے تھے اور سیلاب کا کام بہالے جانا ہوتا ہے۔اللہ خیر۔

☼ ☼ ☼

سارا گھر صوفیہ دادی کے کمرے میں اکٹھا تھا۔لیلیٰ بیگم کے رونے کی آواز اتنی بلند تھی کہ پڑوس سے زینت تائی۔۔۔ نوال کا سہارا لیے دوڑی چلی آئیں۔

پہلی نظر نازک اندام پر پڑی۔اسے جیسے کوئی اسٹاپ کہہ گیا تھا۔کرسی کی ہتھیوں پر دونوں ہاتھ ٹکائے وہ سارے شور و غل سے انجان ناک کی سیدھ میں دیوار کو پلکیں جھپکائے بغیر تک رہی تھی۔ہاں بس گلابی گال پر ایک تار کے آنسو تھے جو ٹھوڑی پر آکر گریبان میں ٹپک جاتے تھے۔

اور سیدھی صاف بات یہ ہوئی کہ نازک کو دیکھنا دل گردے کا کام تھا اور خوامخواہ کا احساسِ جرم سب کے

دلوں کو مسوسنے لگا۔

یہاں تک کہ اخفش بھی پہلو بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ مجرم بن گیا تھا اور سب سے بڑھ کر نوال کی قہر برساتی نظروں کا سامنا کرنا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولی تھی، مگر نوال ضمیر خان کے لیے کب ضروری تھا کہ وہ زبان کو تکلیف دے۔ اس کی نظریں ہی جب یہ فرض ادا کر رہی تھیں۔

"بے وفا۔ خود غرض، جفا شعار، ایک لڑکی کو امیدیں دلا کر، خواب دکھا کر راہ بدل لینے والے دھوکے باز۔۔۔ تمہاری تو۔۔۔"

اخفش نگاہوں کا جواب نگاہوں ہی سے دینے کی کوشش کر لیتا۔ وقتاً "فوقتاً"۔

"نہیں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو نانی دادی کی آپس کی بات بلکہ بات بھی نہیں محض ایک تذکرہ تھا کہ اگر یوں کر لیا جائے تو۔۔۔ میں نے ہمت کبھی نہیں بڑھائی خدا کی قسم۔"

مگر نوال کے چہرے کے تاثرات نے بتایا اسے اس سب بکواس کو سننے کی قطعی خواہش مند نہیں۔

ایک مرد کے ہاتھوں مظلوم و معصوم عورت کا استحصال۔۔۔

سب تو لیلیٰ بیگم کے سیاپے کو سن رہے تھے۔

نوال آگے بڑھ کر نازک کی کرسی کی ہتھی پر ٹکی اور شانے سے بازو گزار کے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پتھر میں جنبش ہوئی۔

بھرے ہوئے نینھاں اٹھے اور اگلے ہی پل وہ نوال سے لپٹ کر جو رونا شروع ہوئی تو لگا بادل گرج رہے ہوں۔ لیلیٰ بیگم جو رو رو کر اور بہت سا بول بول کر تھک سی گئی تھیں۔ بری طرح چونکیں۔ نازک کو دیکھا اور پھر جو نانی نواسی نے تان سے تان ملائی تو اگر یہ ملہار ہوتا تو شہر کراچی کی حسرتیں مٹ جاتیں۔ وہ چھاجوں چھاج مینہ برستا کہ۔۔۔ بیاہی بیٹیاں چیخ چیخ کر گاتیں۔

"اماں میرے باوا کو گھر میں رو کے رکھیو ری کہ ساون آیا۔"

"پلیز لیلیٰ نانو!" اس نے محض انگلیوں کی اگلی پوروں سے چھوا ہی تھا۔

"وہ نوال۔۔۔! دیکھا تم نے انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا بلکہ ہمارے ساتھ۔۔۔"

نوال کا سانس کہیں راستے میں اٹک گیا۔ اسے اپنی ہڈیاں چٹخنے کا شک ہونے لگا۔ لیلیٰ بیگم نے غم غلط کرنے کے لیے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

نوال کو آہ کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ وہ اسے تقریباً" اپنی گود ہی میں بٹھا لینا چاہتی تھیں۔

"جی نانو جی۔۔۔ میں سب دیکھ رہی ہوں۔ بالکل یہ۔" نوال غیر محسوس انداز سے ذرا دور کھسک رہی تھی۔

"بتاؤ میں کس عدالت میں اپنا مقدمہ لے کر جاؤں۔۔۔؟ وعدہ کر کے پھرنا بھلا کوئی انسانیت ہے۔" نوال کا گھنگریالا چھتا دائیں بائیں ہلا۔

"میں نے تو ایک دنیا کو بتا ڈالا کہ میری نازک کا رشتہ میں نے اپنی کزن کے پوتے ہائے ہائے۔" شدت غم سے جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ چھتا اوپر نیچے ہلنے لگا۔

"زبان سے پھرنے والوں کو کیا کہتے ہیں؟"

"فریبی۔۔۔!" جواب نوال ہی کو دینا تھا۔

"خواب دکھا کر دامن جھٹک دینا شریفوں کا شیوہ ہے بھلا؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔۔۔"

"اب میری نازک کے آنسو کون پونچھے گا۔" لیلیٰ بیگم کی نگاہیں "جھڑی" پر تھیں۔

"میں نے کوشش تو کی تھی آنٹی جان۔" نوال نے یاد کروانے کی کوشش کی، مگر ان کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

"نہیں۔ تمہیں اس کی خوشیاں لوٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"میں حاضر ہوں۔" نوال نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"دل و جان سے۔۔۔ کیڑا ہوں اگرچہ ذرا سا۔۔۔"

اخفش بڑبڑایا۔ نوال کو گھورا۔ "شعر تو مکمل پڑھو۔" نوال دانت کچکچا کے رہ گئی۔

"ذرا سا مچھر ہاتھی کو پٹخنی دے سکتا ہے۔" وہ تکیہ

درست کرنے کے بجائے انخفش کی جانب جھکی تھی۔

"مجھے برا نہیں لگا کیونکہ اب میں ہاتھی نہیں رہا۔" بے حد گمبھیر صورت حال میں بھی نوال کو ہنسی آگئی۔ جسے اس نے بروقت روکا۔

"اچھے ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنا ماضی نہیں بھولتے۔یاد رکھتے ہیں۔"

"تو ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔جو وعدہ کرکے وقت مانگ کر پھر بھول جاتے ہیں۔ہاتھ نہیں آتے۔بات ہی نہیں کرنا چاہتے۔"

انخفش کی آواز ذرا بلند ہو گئی۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ؟" وہ کھا جانے والی نگاہوں سے انخفش کو دیکھنے لگیں۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بکواس کر رہا ہے۔" نوال نے دھاڑ لگائی۔

"میں چلتا ہوں دادو۔۔۔!" انخفش، صوفیہ بیگم سے مخاطب تھا۔

"آپ کی مشکل تو حل ہو گئی۔ اب لیلیٰ نانو کو بتانے کا مرحلہ طے ہو گیا۔ سب کچھ واضح ہو گیا اصل حقیقت سے تو وہ بھی واقف ہیں کہ محض ارادہ یا خواہش پر وہ اس طرح سے مجھے یا آپ کو بلیم نہیں کر سکیں۔ میرا نہیں خیال کہ میرے کسی عمل یا قول سے میری نازک کی طرف خصوصی دلچسپی ظاہر ہوئی ہو گی۔ہاں وہ مہمان تھی اور میں نے اچھا میزبان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔دادو کچھ ارادے ضرور باندھ رہی تھیں اور انہیں میری زندگی کے تمام فیصلے کرنے کا اختیار میں نے خود دے رکھا تھا۔مگر۔۔۔"

انخفش نے قصداً" رک کر سب کو دیکھا۔

"میں نے ہی انہیں منع کر دیا تھا کہ وہ نازک اندام کے حوالے سے بات کو بڑھائیں مت۔"

سب کی نگاہیں صوفیہ بیگم پر اٹھ گئیں۔انہوں نے مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

"ہاں۔۔۔ کہا تھا، مگر میں نے سنجیدگی سے نہیں لیا اس کی بات کو۔۔۔" لیکن۔۔۔ ساتھ ہی میں نے لیلیٰ کی حوصلہ افزائی بھی چھوڑ دی تھی۔"

صوفیہ دادی کی حقیقت بیانی پر جہاں سب نے سکھ کا سانس لیا۔ وہیں ٹھنڈی پڑتی لیلیٰ بیگم اور نازک دوبارہ سے بھڑک اٹھیں۔ مطلب نازک نے باآواز بلند رونا شروع کر دیا جب کہ لیلیٰ بیگم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی رانوں پر دونوں ہاتھ پے در پے برسانے شروع کر دیے۔

بات سنبھلنے کے بجائے بگڑنے لگی۔ لیلیٰ بیگم بتا رہی تھیں انہوں نے کتنے ہی سوالیوں کو (نازک کا ہاتھ مانگنے والے سوالی) صوفیہ اور انخفش کے بھروسے پر ٹھکرا دیا۔

ایک ڈاکٹر۔۔۔ دو انجینئرز، تین بزنس مین اور چار دوسرے بھی۔۔۔"

"دس رشتے۔۔۔" نوین نے تیزی سے انگوٹھے کو پوروں پر چلایا۔ اس ہیرا دیدی کے زمانے میں جب رشتوں کا کال پڑا تھا۔ ایسے میں نازک اندام خوش نصیب تھی مگر۔۔۔"

"میں نے سوچا غیروں پر بھروسا کرنے سے بہتر ہے اپنوں کا یقین کروں اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں۔۔۔"

(مجبوراً" سنتا انخفش چونکا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانے والی مثال بالکل پسند نہیں آئی، مگر احتجاج کا موقع کون دے رہا تھا)

"کمی کیا ہے میری نازک میں۔ گوری چٹی گلابی لڑکی۔۔۔

"پڑھی لکھی۔۔۔ سمجھ دار۔۔۔ (بھاں بھاں کر کے رو رہی تھی) اور۔۔۔"

اوصاف گنواتے گنواتے وہ یک دم خاموش ہو گئیں سب کے چہروں سے واضح تھا۔ ذرا جو متفق ہوں قطعی نہیں۔۔۔ یہ کس کا ذکر خیر تھا؟ سب کے چہرے سوالیہ تھے۔ لیلیٰ بیگم کا غصہ عود کر آیا۔ کسی کو بھی اس درد کا احساس نہیں تھا جس سے وہ گزر رہی تھیں۔ وہ غم جو ان کی حساس نواسی پر پڑا تھا۔ اس کا دل ٹوٹا تھا اور ادھر۔۔۔ بس ایک نوال تھی جو بہت دردمندی سے نازک کے شانے پر ہاتھ دھرے سخت شاکی نگاہوں سے انخفش انعام کو تکتی تھی۔

"تم اتنی آسانی سے خود کو بے قصور ثابت نہیں کرسکتے۔" انہوں نے براہ راست اخفش کو مخاطب کیا۔ "میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔" سب چونکے، یہ دھمکی تھی' ان کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ اخفش نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے۔

مگر صوفیہ دادی کی منت بھری نگاہوں نے اسے لب بھینچ لینے پر مجبور کردیا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں نانو جان۔۔۔ چھوڑنا چاہیے بھی نہیں۔" یہ نوال کی آواز تھی۔ اس نے صرف زبانی حمایت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ بلکہ دوسرا ہاتھ لیلیٰ بیگم کے شانے پر رکھ کے گویا اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔ سب کی پھٹی پھٹی نگاہوں سے بے نیاز اس نے وفاداریاں بدل لی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات کو شدید غیض اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بند کیے جانے والے بڑے بڑے بکسے صبح کھل گئے تھے۔ صوفیہ دادی نے سکھ کا سانس لیا۔ کتنی ناک کٹنے والی بات ہوتی کہ وہ نانی نواسی ان کے گھر سے روتے دھوتے نکلتیں اور ہوٹل میں قیام فرماتیں۔ منت ترلے' معافی تلافی' بہلانا بجھانا۔۔۔ اف کیسے کڑے امتحان سے گزری تھیں وہ۔

"میں خود تمہاری طرح انجان ہوں کہ کون ہے وہ لڑکی۔۔۔ کہاں ملی اسے اور بات اتنی آگے بڑھ گئی کہ اس نے نا صرف پسندیدگی کا اعلان کیا بلکہ شادی کا ارادہ بھی بتادیا۔"

"اللہ جانے کون ہے' کہاں رہتی ہے' آگا پیچھا کیا ہے اور اگر جو کوئی ایسی ویسی ہوئی تو۔۔۔" صوفیہ دادی نے خدشات میں گھر کر نوین کا ہاتھ پکڑلیا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو صوفیہ۔ ایسی ویسی ہی ہوگی۔ جب ہی تو اچھے لڑکے کو پھانس لیا۔ ارے آج کل کی لڑکیوں نے یہی شارٹ کٹ اپنا لیے ہیں۔ جہاں ذرا فائدہ دیکھا گر پڑیں۔" ان کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

نوین اختلاف کرنا چاہتی تھی' مگر صوفیہ بیگم کو دیکھ کر رہ گئی۔ وہ زور شور سے سر اثبات میں ہلا رہی تھیں۔

"تم فکر نہ کرو صوفیہ۔۔۔ میں ہوں نا۔"

"تم کیا کروگی؟"

"میں پتا لگاؤں گی کہ وہ کون ہے۔ جھوٹے کو گھر تک پہنچا کر نہ آئی تو نام بدل دینا۔" ان کا عزم جوان تھا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ لڑکی جھوٹی ہے۔" صوفیہ دادی حیران رہ گئیں۔

"اوفوہ۔۔۔!" لیلیٰ بیگم بھنائیں۔

"لیکن تم پتا کیسے لگاؤگی؟" ان کے پچھلے بے وقوفانہ سوال کی جگہ اب یہ سوال علم و حکمت سے بھرپور تھا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" انہوں نے گردن تانی۔ نجانے کیا کھچڑی پک رہی تھی۔

صوفیہ دادی نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے چھوڑ دیا۔" وہ بے فکر ہوگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ٹوں ٹوں۔۔۔

"مجھے لگتا ہے میں اتنا پریشر برداشت نہیں کرپاؤں گا۔" اس نے میسج پڑھا۔

"سمجھو" آج کی رات کالی ہوگئی۔" اس نے موبائل پر تیزی سے انگلیاں چلائیں۔

"یوگا کیا کرو' اس سے قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔"

ٹوں ٹوں۔۔۔

"اس سے کیا ہوگا؟" وہ پہلے ہی سے جواب لکھ کر بیٹھا تھا شاید۔

"دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا ہوگی۔"

"دنیا سے تو میں پہلے بھی کبھی نہیں ڈرا۔"

"رات کے چودہ بجے میرا سر کیوں کھا رہے ہو۔ خبردار جو مجھے میسج کیا۔"

"یقین کرو' دل ہلکا نہ کیا تو دل پھٹ جائے گا۔"

اسکرین پر پرنٹ جملے میں سے جذبات عیاں نہیں ہوتے 'مگروہ ٹھٹک سی گئی۔

اسے جملے کے اندر چھپا درد اور سچائی محسوس ہورہی تھی۔ یکدم گھبرا کر اس نے موبائل بیڈ پر ڈال دیا۔ مگر مسلسل ہوتی ٹوں ٹوں۔۔۔۔

اگر وہ فون بند بھی کردیتی تو۔۔۔ صبح Inbox بھرا ہوتا۔

اور اس سے بھی بڑھ کر وہ بازپرس کرنے پہنچ جاتا۔ موبائل پر تو وہ اسے گھمالیتی تھی۔ مگر دوبدو بات کرنا مشکل ہوجاتا تھا۔

"ٹوں ٹوں۔۔۔"

اسے موبائل پکڑنا پڑا۔

"اجازت ہو تو خوش فہمی پال لوں کہ میرا دل پھٹنے کے خدشے نے تمہیں غم سے ساکت کردیا ہے۔"

"منہ دھو رکھو۔"

"فرمائش ہے کہ حکم۔"

"درخواست ہے کہ مجھے تنگ نہ کرو ورنہ۔"

"ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا۔۔۔ کیا تم میری شکایت کروگی۔ کس سے؟ اپنے باپ بھائیوں سے 'اماں سے۔۔۔ یا تھانے میں؟ قسم سے یار یہی کردو۔ کچھ تو کرو۔"

اس نے شدید خوشی کے عالم میں گویا منت کی۔ وہ شکایت کردیتی تو سارے دلدر دور ہوجاتے۔ مگر افسوس تو یہی تھا کہ وہ کچھ کرتی نہیں تھی۔ یا پھر یہ کہ اسے معلوم تھا۔ لب کشائی پر اس نے ہی پھنس جانا ہے۔ اور پھر کوئی اس کی نہیں سنے گا۔

اور وہ واقعی یہی سوچ رہی تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔۔۔

"اگر اب مجھے میسج کیا ناں تو میں۔"

"تم ایسا کرو' میرے یہ سارے میسجز لے کر میرے گھر آجاؤ۔ میں تمہاری خاطر ذلیل ہونے کو تیار ہوں۔"

وہ بڑے مزے سے تکیوں کے ڈھیر پر اوندھا ہوگیا۔ وہ زچ ہونے لگی تھی۔ اس نے مسکرا کر سوچا۔ اور یہ سچ تھا۔ اس کا فون بجنے لگا۔ وہ کال کررہی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔ میں تم سے ڈرتی ہوں۔" اس نے ہیلو کہنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

"نہیں مجھ سے کیا تم تو کسی سے بھی نہیں ڈرتیں۔" اس کا لہجہ ہنسی سے بھرپور تھا۔

"پھر بھی۔۔۔" وہ غرائی۔

"ہاں پھر بھی۔۔۔" وہ مسکرایا۔ تب دانت پیسنے کی آواز لہروں سے بھی کانوں میں پہنچ گئی۔ اس نے فون دوسرے کان سے لگا کر پہلے والے میں انگلی گھمائی۔ اور تسلی سے لیٹ گیا۔ موضوع اخلاقی تھا۔ مگر "گفتگو۔ تو تھی ناں۔"

"میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ۔"

"اور میں بھی تمہیں بتا چکا ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اس نے اسی کے لہجے میں کہا۔

"تم پچھتاؤ گے۔"

"اگر قسمت میں پچھتاوے لکھے ہیں۔ تو میں کچھ کر کے پچھتانا پسند کروں گا۔" صاف ظاہر تھا' اسے مزہ آرہا تھا۔

"بعض دفعہ پچھتانے کے لیے زندگی نہیں بچتی۔"

"تو کیا تم میری جان لوگی۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں شاعر۔"

ہم نے پہلے تو ان کے آگے خنجر رکھ دیا
پھر قدموں میں دل رکھ دیا' سر رکھ دیا

"خفیہ انعام۔۔۔ تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو۔"

"آں آں۔۔۔ میں تو جان کا نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں کوئی تمہاری دھرتی ماں ہوں جو جان کا نذرانہ لوں گی۔ جاؤ اتنی فالتو کی چربی محاذ جنگ پر جاکر استعمال کرو۔"

"اونہوں یہ زیادتی ہے۔ میں ساری چربی جم جاکر اور بھوکا رہ کر پہلے ہی جلا چکا ہوں۔"

"میں نے تو نہیں کہا تھا۔" وہ بھڑکی۔

"نہیں' مجھے خود سے احساس ہوا کہ مجھے ایسا لگنا چاہیے۔ جس سے تمہیں متعارف کرانے میں شرمندگی نہ ہو۔"

"مجھے کون سی آفت پڑی ہے کہ تمہارا تعارف

کرواتی پھول گی۔" اس کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ پر اس نے برا نہ مانا۔۔۔ اسے اب اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔

"اب اس کا تو پھر تفصیلی جواب ہے۔ سناؤں۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ اور بس یہیں آ کر وہ بدک جاتی تھی۔ منہ در منہ جنگ میں وہ اسے پچھاڑ دیتی تھی۔ مگر جہاں اس کا لہجہ بدلتا۔ جملہ ذو معنی ہو جاتا۔ وہاں وہ بولنا بھول جاتی۔ اور شاید اسے اس چیز کا پتا لگ گیا تھا۔ جب ہی۔۔۔

"بولو بولتی کیوں نہیں۔۔۔ سناؤں؟"

"خبردار جو ایک لفظ بھی کہا۔" وہ دھاڑی۔ "؟اور اگر جو مجھے آئندہ فون کیا تو۔" وہ آگ بگولا ہو گئی۔ وہ ہنس دیا۔

"میں نے تو آج بھی نہیں کیا تھا۔۔۔" (ہائیں۔ وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی)

"میسج تو تم کر رہے تھے۔ شروعات تم نے کی۔"

"پہل مردوں ہی کو کرنی چاہیے یار!" وہ تکیہ بانہوں میں بھرے اوندھا ہو گیا۔ ادھر اسے پتنگے لگ گئے۔

"تت۔۔۔ تم مجھے یار کہہ رہے ہو۔ تمہاری اتنی جرات۔ تم۔۔۔"

"پھر اور کیا کروں نام لینے سے بھی منع کر رکھا ہے۔"

"فون بھی نہ کروں' میسج نہ کروں۔ راستے میں نظر پڑ جائے تب دوسری نگاہ نہ ڈالوں۔ تمہارے گھر نہ آؤں' تمہیں مخاطب نہ کروں۔ اتنی حدبندیاں مت لگاؤ۔ سانس لینے کی جگہ تو چھوڑ دو یار۔۔۔!" وہ پھر نافرمانی کر بیٹھا۔ "سنا تھا' اظہار محبت پریشانیوں کا حل ہوتا ہے۔ میرے ساتھ تو الٹ معاملہ ہو گیا۔

اچھا چلو کوئی ٹائم لمٹ دے دو۔ ہاں یا ناں کر دو۔۔۔ لیکن تمہیں ناں تو بالکل مت کرنا۔ وہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے تم میرے لیے۔"

وہ یکدم ٹھٹکا۔ فون چہرے کے سامنے کیا۔ نجانے کب سے وہ فون رکھ چکی تھی۔ "شٹ" اس نے فون کو دور پھینک دیا۔

☼ ☼ ☼

شانے پر ٹکایا بیگ پھسل کر کہنی میں آ کر لٹک گیا تھا۔ بغل میں فائلز دبی تھیں' ایک ہاتھ میں لائبریری سے ایشو کروائی گئی۔ بہت موٹی وزنی کتاب۔

اور دوسرے ہاتھ میں پیٹ پوجا کا سامان۔۔۔ اور اس پر ہونقوں سا کھلا منہ۔ صبح سے پریڈز لے کر دماغ چکرا گیا تھا۔

بکی سہیلی کو کمزوری کے عالم میں پہلے ہی غش پڑ چکا تھا۔ اسے آرڈر نوٹ کروا کر اوندھی پڑی تھی۔

مگر تب ہی اس طرح لڑکھڑائی جیسے کسی نے قدموں سے زمین کھینچ لی ہو۔ ہاتھوں میں تو سامان تھا۔ اس نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔ مگر یہ منظر سچ تھا۔ موٹی کتاب بغل سے سرک کر قدموں پر جا پڑی۔ ٹرے بھی گرنے کو تھی۔ مگر اس کے حواس جاتے رہے۔ سامنے۔۔۔

یقیناً" یہ اشتیاق احمد ہی تھے۔ اور ان کے ساتھ نازک اندام۔۔۔ مگر ان دونوں کا یونیورسٹی میں کیا کام۔ وہ بھی ایسے حلیوں میں۔۔۔ سر پر ہیٹ۔۔۔ اور آنکھوں پر سیاہ چشمے۔۔۔ ہیٹ کے چھجے کو چہرے پر یوں جھکا کر رکھا تھا جیسے شکل چھپانا مقصود ہو۔

دونوں کسی مزاحیہ زیرو زیرو سیون فلم کے کردار لگتے تھے۔

یہ چکر کیا تھا۔ اور اشتیاق احمد جو اسے کھلا پیا سب بتاتے تھے۔ آج اس سے بھی پردہ داری۔۔۔؟

"نہیں"۔۔۔ نوال کا سر۔۔۔ نفی میں ہلا وہ اپنی بھوک پیاس تھکان محو انتظار بکی سہیلی یہاں تک کہ لائبریری کی کتابوں تک کو بھول گئی۔ ہاتھ میں پکڑے ٹرے بھی کھڑکی کے باہر ذرا سی نکلی دیوار پر رکھ دی۔

"کون ہیں آپ لوگ۔۔۔ اور یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس کی آواز بارعب تھی۔

"وہ ہیلو نوال تم۔۔۔" اشتیاق احمد چونکے۔

"جی میں۔۔۔!" وہ کڑک انداز اختیار کرنا چاہ رہی تھی مگر اچنبھا اس قدر تھا کہ چہرے سے عیاں تھا۔

"آپ دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی اتنے عجیب حلیوں میں۔" اس نے ہاتھ کو اوپر سے نیچے کر کے حلیے پر نظر ثانی کی خواہش کی۔

حلیے پر اشتیاق احمد نے جھک کر خود کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے ہمارے حلیوں کو' اتنے تو اچھے لگ رہے ہیں۔ کیوں نازک....؟"

"جی جی.... بالکل...."

"لیکن آپ لوگ آئے کیوں ہیں۔ یوں ایسے اچانک؟" نوال کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"اوہ.... بس نازک کو یونیورسٹی دیکھنے کا شوق تھا۔" نازک نے سرہلایا۔

"تو مجھے کہہ دیتی میں لے آتی ساتھ۔"

"ہاں' نازک نوال کو کہہ دیتیں۔" نازک نے پھر سرہلایا۔

"نہیں' یہ کوئی اور چکر ہے۔ آپ لوگ منہ کھولتے ہیں یا نہیں...." نوال نے تیزی سے گردن گھمائی۔ پھر دھمکاتی نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

"تم جاؤ یہاں سے' مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" یہ انداز تو قطع تعلق جیسا تھا۔

"ہاں نوال' تم جاؤ' ہمیں کام کرنے دو۔" نازک نے نروٹھے پن اور اجنبیت سے منہ ہلایا۔

"ہائیں....!" نوال کے لیے جملے کے دونوں حصے چونکانے والے تھے۔

"پہلے اسے.... یعنی نوال ضمیر خان کو چلے جانے کا کہنا.... اور دوئم کام کون سا کام.... وہ بھی اس طرح چپکے چپکے.... نوال نے جو سوچا وہ پوچھ بھی لیا۔

"ہے کوئی کام.... تمہارے مطلب کا نہیں ہے۔ ہمارا پرائیویٹ کام ہے۔" نازک بولی۔

"پرائیویٹ کام...." نوال کے ڈیلے گھومے۔ پھر وہ خود بھی گھوم کر اشتیاق احمد کے روبرو ہو گئی۔ "آپ نے پارٹی کب بدلی۔ بولیے۔"

اور اس سوال میں جو مان تھا۔ یاد دہانی تھی۔ محبت تھی اور بے یقینی....

اشتیاق احمد گڑبڑائے۔ "نہیں پارٹی تو نہیں بدلی۔ مگر نازک سے وعدہ کیا تھا' کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا تو.... وعدہ خلافی تو نہیں کرنی چاہیے ناں۔" وہ بھولپن سے بتانے لگے۔

"میں "کسی" ہوں۔" نوال کا صدمہ بڑھتا جاتا تھا۔

"نہیں.... میرا مطلب ہے کہ...."

"اوہ نانا جان....!" اشتیاق احمد کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ نازک نے ان کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ بے چارے گرتے گرتے بچے۔ نوال کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا ہو گیا تھا۔ آخر.... جو دونوں سراسیمگی کے عالم میں دوسری طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔

"اخفش....! وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔" نازک کی دبی آواز پر نوال نے سامنے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے ادھر سے جانے والا اخفش واپس آ رہا تھا۔ ساتھ جو تین دوست تھے۔ معروف انداز اور عجلت نمایاں تھی۔ ایک کھلی فائل سے ایک لڑکا کچھ پوائنٹ نوٹ کر رہا تھا۔ نوال نے اسے جاتے دیکھا۔ پھر سلو موشن میں گردن گھما کر تسلی کرتے اشتیاق احمد اور نازک.... دونوں نے دل پر ہاتھ رکھ کے سکون کا سانس لیا تھا۔ نوال ہونق ہو گئی' یہ ہو کیا رہا تھا۔

"یہ پڑھنے آتا ہے یا گھومنے.... کبھی ادھر کبھی ادھر...." نازک متعجب تھی۔

"اس بات پر میں اسے بعد میں پوچھوں گا.... پہلے اس کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔" اشتیاق احمد نے عجلت سے کہا۔

"تو یعنی یہ اخفش کا پیچھا کیا جا رہا تھا۔" نوال پر انکشاف شدید صدمہ یا حیرت بن کر ٹوٹا۔

"نہیں...." نوال دونوں بازو دائیں بائیں پھیلائے اچھل کر ان دونوں کے سامنے آ گئی۔

"پہلے مجھے بتانا پڑے گا یہ ہو کیا رہا ہے۔ مجھ سے بڑا مددگار.... تو پوری 115 کی ٹیم کو ملا کر بھی نہیں بن سکتا...." وہ تولتی نگاہوں سے پوچھ نہیں رہی تھی۔ بتا رہی تھی۔ "کوئی شک....؟"

"تو سر....!" نازک کی ہاں سے پہلے اشتیاق احمد

نے سلیوٹ کر دیا۔ نوال بھی جان سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے تو پھر شروع ہو جائیں۔۔۔ مگر ٹھہریں ایک منٹ میں اپنا سامان لے آؤں۔"

وہ فاتحانہ انداز سے گھومی اور وہاں دیکھا جہاں بیگ تھا کتابیں تھیں اور بریانی کی ٹرے۔۔۔ ہیں۔۔۔ اگلے ہی پل اس کا ہاتھ اپنے منہ پر جم گیا کتابیں اور بیگ۔۔۔ اور یہ شور سا۔۔۔

کوئی پکار رہا تھا۔ "ارے کس کی منت پوری ہوئی ہے جو کوؤں کی دعوت رکھ دی۔" نوال کے ڈیلے ابل پڑے۔

"آپ کی وجہ سے۔" وہ غش کھانے کے انداز میں اشتیاق احمد اور نازک کی طرف آئی۔

"میں تمہارا خسارہ بھرنے کو تیار ہوں۔" وہ شرمندہ ہو گئے حالانکہ ان کا کیا قصور تھا۔

"میری ایک دوست بھی ہے۔" نوال کو یاد آیا۔

"مجھے خود بھوک لگنے لگی ہے۔" نقاہت زدہ آواز نازک کی تھی، صبح سے یہ وقت آگیا تھا اتنی بھاگ دوڑ۔۔۔ اور نتیجہ کچھ بھی نہیں۔

"چلو پھر کینٹین پر۔۔۔ پہلے پیٹ پوجا۔۔۔ پھر کام دوجا۔"

☼ ☼ ☼

"ہم نے سوچا، ہم اخفش کا پیچھا کرتے ہیں۔ ہونہ ہو، وہ لڑکی یونی ورسٹی ہی میں ہوگی جس کی وجہ سے۔۔۔" نازک باقی کا جملہ مکمل نہ کر سکی، وجہ انکار کا صدمہ نہیں تھی۔ حلق میں بوٹی پھنس گئی تھی۔ نوال نے پانی کا گلاس اس کے سامنے پٹخا۔

"یہ پلان تو میرے ساتھ مل کر بنایا گیا تھا شاید۔۔۔" وہ اشتیاق احمد کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں بنایا تو تھا مگر وہ کیا ہے ناں۔۔۔ جس کے دل پر بیتتی ہے۔ اس کی ایفرٹ (جدوجہد) زیادہ جینوئن ہوتی ہے۔"

"واہ۔۔۔!" نوال اش اش کر اٹھی۔ "اور اس خفیہ مشن کے لیے یہ گیٹ اپ اپنایا گیا۔" اس نے باری باری انگلی سے اشارہ کیا۔

"ہاں۔۔۔ کیسا ہے؟" اشتیاق احمد کی مارے اشتیاق کے باچھیں چر گئیں۔

"ایک دم فضول۔۔۔" نوال نے زور کا ہاتھ ٹیبل پر مارا۔ برتن جھنجھنا اٹھے۔

"اوں ہوں۔" اس کی دوست نے ہنکار بھری۔ وہ اتنی زیادہ بھوکی تھی کہ دونوں ہاتھوں میں چمچ پکڑ رکھے تھے۔ دوسری پلیٹ بھی ختم ہونے کو تھی۔

"جس نے نہیں متوجہ ہونا ہو وہ بھی مڑ مڑ کر دیکھے۔ بلکہ دیکھائے۔ ایسے ڈیل کرتے ہیں خفیہ مشن۔" وہ غصّے میں تھی۔ نازک کی نگاہیں نانا جان پر اٹھ گئیں۔ یہ سب ان ہی کا کیا دھرا تھا۔ کیپ اور منہ کو ڈھانپ لینے والے توے برابر گلاسز۔۔۔ کل شام کو ہی خرید کر لائے تھے۔

"دراصل۔۔۔" اشتیاق احمد نے ٹیبل پر کہنیاں ٹکائیں۔ اور کرسی کے اگلے پیروں پر جھک آئے۔ "اس طرح کے گیٹ اپ سے موڈ بنتا ہے۔ انسان کے اندر کا جاسوس بیدار ہو جاتا ہے۔ دماغ صحیح سمت میں کام کرنے لگتا ہے۔"

"نظر آرہا ہے۔۔۔ صحیح سمت۔" نوال نے طنز کیا۔

اشتیاق احمد نے سر ہلایا پھر نازک سے مخاطب ہوئے۔

"پلان چینج۔ کل ہم اسٹوڈنٹ کے روپ میں آکر اس کی کلاس کی لاسٹ والی سیٹ پر بیٹھ جائیں گے۔ کتابیں نوال سے مانگ لیں گے۔"

"تھری ایڈیٹس کی شوٹنگ نہیں چل رہی۔ کہیں بھی بیٹھ جائیں گے۔ یہ کراچی یونی ورسٹی ہے رینجرز کو بھنک پڑ گئی ناں۔ زندگی بھر نہیں بھی بیٹھنے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔" نوال نے صاف صاف بتانے ہی میں عافیت سمجھی۔

"تو پھر کیسے پتا چلے گا کون اس کے پیچھے پڑی ہے؟" نازک کی فکر مندی بڑھ گئی۔

نوال نے آنکھیں چندھی کیں اور گھورا۔

"یہ بتانا پسند فرمائیں گی کہ یہ کس نے طے کیا کہ کوئی اس کے پیچھے پڑی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ ہی

کسی کے پیچھے پڑا ہو۔" اس نے دانت پیس کر کہا تھا۔
"نہوں ہوں۔۔۔" پکی سہیلی کا منہ ۔ بھرا ہوا تھا۔ مگر تائید ضرور فرمائی۔
"وہ ایسے ہیں ہی نہیں۔۔۔" نازک کے یقین سے بھرپور شرمیلے جملے پر پکی سہیلی کی آنکھیں ابل پڑیں۔ نوال کو بھی حلق تر کرنا پڑا۔
"یہ محبت کے سارے درجے پاس کر چکی ہے۔ تب ہی تو یقین کی دولت سے مالا مال ہے۔"
سہیلی کا منہ بھرا ہوا تھا۔ صرف نوال ہی سمجھی اس نے کیا کہا ہے۔ کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا اور اشارہ کیا کہ صرف کھانے پر دھیان دے۔
نوال اس پر تبصرہ کرنا چاہتی تھی کہ اچانک جیسے زلزلہ آگیا۔ نازک اور اشتیاق احمد کا بس نہیں چلتا تھا۔ ٹیبل کے نیچے جا چھپیں۔ نوال کی نگاہیں بے ساختہ اٹھ گئیں۔ اوف۔۔۔ یہ کینٹین میں داخل ہوتا اخفش انعام تھا۔ ساتھ میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ کسی موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیتے ہوئے وہ دوسرے کونے میں براجمان ہوئے۔ ایک لڑکی مسلسل اخفش کے کان میں گھسی ہوئی تھی۔ شدید دکھی نگرمان سے بھرپور انداز تھا۔ اخفش ہمہ تن گوش تھا۔
اشتیاق احمد کی آنکھیں چمکیں۔۔۔ لڑکی تو پیاری تھی۔ اور اس پر اخفش کی بھرپور توجہ۔۔۔ وہ اسے پانی کا گلاس پیش کر رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اخفش نے رومال پیش کر دیا۔ نازک کے لیے یہ حد تھی۔
وہ پکڑے جانے کے خوف سے دبک کر بیٹھی تھی۔ مگر پھنسی آواز کا جوش۔۔۔ چیخ روکنے والی مثال تھی۔
"یہی۔۔۔ یہی ہے وہ کلموہی۔ جس نے۔۔۔ جس نے۔۔"
صدمے سے آواز گنگ ہو گئی۔ کوئی پل جاتا تھا جب وہ اٹھ کر دھاوا بول دیتی۔ رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی۔ اشتیاق احمد کی رنگت بھی تمتمانے لگی تھی۔ وہ تو اتار کر۔۔۔ غور سے لڑکی دیکھنے لگے۔ اف سرخ رنگت پر سیاہ گھور آنکھیں۔ نوال نے ہاتھ جوڑ کر چشمہ لگا لینے کی درخواست کی۔ یونی ورسٹی میں کئی کمزور دل لڑکیاں بھی پڑھنے آتی تھیں۔ ابھی بھاؤ بھاؤ چلاتیں اور پھر امی امی پکارتی ایک دوسرے کو کچلتی بھاگ نکلتیں۔
اس کالی (اچھی بھلی سلونی لڑکی تھی) میں ایسا ہے ہی کیا۔۔۔ چشمہ لگا ہوا ہے یعنی نظر کم ہے۔ مگر اس اخفش کی عقل بھی کم ہے۔ جو مجھ جیسی حسین منگیتر منگیتر۔۔۔ نوال اسے چپ کروانا چاہتی تھی اٹک گئی) کو چھوڑ کر اس۔۔۔ ہوا سے ہلکی لڑکی یہ تو میری ایک پھونک کی مار ہے۔"
غضب نے عقل خبط کر دی تھی۔ کچھ نہیں پتا تھا کیا کہہ رہی ہے۔ نوال نے ایک بار پھر روکنا چاہا۔ پکی سہیلی کا منہ ۔ بھرا تھا۔ اور وہ بھی نازک کو دیکھتی کبھی اس لڑکی کو۔۔۔ جو مسلسل اخفش انعام کے سر سے سر جوڑے بول رہی تھی۔
"اس سیاہ نمک کی کان میں ایسا کیا ہے، جو مجھ میں نہیں۔۔۔ ابھی چار لوگوں کو کھڑا کر کے ووٹنگ کرواؤں تو سب میرے حق میں ووٹ دیں گے۔ بلکہ میں ایسا کیوں نہ کروں نانو جان کو فون کر کے بلا لیتی ہوں وہی اس بے شرم لڑکی کا مزاج درست کریں گی۔ بلکہ اس کا نام یونی ورسٹی سے نکلوا دیتی ہوں یہ پڑھنے آتی ہے یا دوسروں کے منگیتر کو پھانسنے۔"
نازک اپنا بیگ ٹٹولنے لگی۔ غصے کی حالت میں موبائل مل ہی نہیں رہا تھا۔
"اوہ! مل گیا۔" وہ تیزی سے نمبر ملانا چاہتی تھی۔ تب ہی ایک ہاتھ بڑھا اور موبائل جھپٹ لیا گیا۔ یہ پکی سہیلی تھی۔ جو غضب ناک نگاہوں سے نازک کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ دوسرے ہاتھ سے کھانے کے برتن آگے اور کرسی پیچھے گھماتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ نوال کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اشتیاق احمد کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔ جبکہ نازک صرف حیران تھی۔ اور زیادہ دھیان اس کونے پر تھا جہاں اخفش سرگوشیوں میں پینگیں بڑھا رہا تھا۔

"اب اگر ایک بھی فالتو کا لفظ کہا ناں تو میں تمہارا..." پکی سہیلی کو نوال نظر آ گئی۔" اگر نوال کا خیال نہ ہوتا ناں تو میں تمہارا...

"رہنے دو یار... !اسے کیا پتا۔" نوال کا لہجہ عاجزانہ ہو گیا۔

نازک کو موبائل چھیننا پسند نہیں آیا تھا اور اس جارحانہ رویے کی سمجھ بھی نہیں آئی۔

"تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہی میں تو اس لڑکی کی بات کر رہی ہوں جس نے" خبردار۔" سہیلی کی انگلی اٹھی "جو ایک لفظ اور بولیں۔"

"کیوں تمہارا کیا پرابلم ہے؟" نوال جیسی نڈر کانپنے لگی تھی نازک کی بے خوفی کے کیا کہنے...

"میرا پرابلم یہ ہے بے بی ایلفنٹ... !کہ وہ بے شرم لڑکی میری بھابھی ہے۔"

"اوہ... !" اشتیاق احمد نے سر ٹیبل پر گرا دیا۔

"اور وہ جو الو کھڑکی سے باہر بیچ پر تنہا بیٹھا ہے۔ وہ میرا بھائی اور اس احمق کا پکا دوست ہے۔ اس کی شکایتیں لگا رہی ہے بے چاری۔ اور تم نے..." سہیلی نے تیزی سے نگاہیں گھمائیں کیا وہ کچھ تلاش کر رہی تھی جس سے نازک کا سر پھاڑ سکے۔

"نہیں... !" نوال چونکی "چھوڑو ناں یار! اسے کیا پتا، تم یہ بریانی کھاؤ بریانی۔" پر وہ بھڑک چکی تھی۔

نوال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنی پوری بھری پلیٹ بھی اس کی پلیٹ میں انڈیل دی۔ دو سموسے نازک کے سامنے سے اٹھا لیے۔ سہیلی کی نگاہیں نازک کی کوک کی طرف اٹھیں۔ نوال نے وہ بھی پیش کر دی، تب کہیں جا کر خطرہ ٹلا۔ نازک سمٹ کر خوف زدہ نظروں سے سہیلی کو دیکھ رہی تھی۔

ہوا سے ہلکی لڑکی... اور اتنی خوراک...

جبکہ اشتیاق احمد کچھ اور سوچ رہے تھے۔ نوال کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہیں ہماری مدد کرنی ہو گی نوال... !ورنہ ہم تو یونہی بے موت مارے جائیں گے۔" وہ پکی سہیلی کو دیکھ رہے تھے۔

نازک کی منت بھری نظریں بھی یہی کہہ رہی تھیں۔

نوال ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

تین روزہ مشترکہ کوششوں کی ناکامی کا سوگ منانے کے لیے تعزیتی اجلاس بارہ بجے کے بعد چھت کی درمیانی دیوار پر منعقد ہوا۔ دونوں گھروں کو الگ کرتی چھت کی چھوٹی سی دیوار کے ایک جانب نازک اندام گرین ٹی کے مگ میں تین چیچ چینی گھولتے ہوئے افسردہ بیٹھی تھی۔ اسے منتظر نگاہوں سے دیکھتے اشتیاق احمد (کہ چیچ فارغ ہو تو وہ بھی چینی گھول سکیں) اپنی نااہلی پر جیسے اپنی نظروں میں آپ گر گئے تھے۔ دیوار کے دوسری طرف کرسی ڈالے۔ کہنی دیوار سے ٹکائے نوال ان کے غم میں برابر کی شریک نظر آتی تھی۔

اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔ جب وہ دونوں اسے دیکھتے۔ "نوال! تم سے بھی نہ ہو سکا، تم جو ہر فن مولا تھیں۔"

"دراصل آپ کے طوطے نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔" اس نے پھیکی گرین ٹی کا گھونٹ صبر سے پیا۔ چیچ مل ہی نہ سکا۔ نازک چینی نہیں غم گھول رہی تھی۔ ایسی بدحالی تھی کپ خالی بھی ہو گیا وہ تب بھی دائرے بناتی رہی۔ اس سے زیادہ اب اس کے دکھ کو بتانے کے لیے کیا مثال دی جا سکتی تھی۔

"آخر پوتا کس کا ہے؟" اشتیاق احمد نے یہ کمپلیمنٹ فخر سے وصولا پھر فوراً "ہی احساس ہوا نہ تو یہ تعریف کی گئی تھی اور نہ ہی یہ سراہنے کا مقام تھا۔ یہ غم کی رات تھی۔ جسے صبح سے ضد تھی۔ وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔

"اب کیا ہو گا نوال...؟" نازک نے کس وقت سے یہ تکلیف دہ سوال دہرایا تھا۔ جیسے اسے جواب سے کوئی امید نہ ہو۔

نوال نے ایک نظر اسے دیکھا۔ دوسری نظر دوا

جان کو۔ اور بے ساختہ واہ ہے کوں چاہا۔ وہ آسمان کی سمت انگلی اٹھائے تارے گن رہے تھے۔ اس کی ملامت بھری نظروں پر شانے اچکا دیے۔

"اب تک صرف ایک سو تیئیس ہوئے۔ دراصل۔"

تاروں کا گوشمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے؟

"جاگ کر آپ نے کون سا تیر مار لیا نانا جان.....!"
نازک اتنی بھی بے خبر نہیں تھی۔

"مگر میرا ضمیر مطمئن ہے میں نے کوشش تو کی۔"
وہ پرسکون تھے۔

نوال کا سہلا۔ "ہاں کوشش تو کی تھی..... بلکہ بھرپور کوششیں کہنا زیادہ مناسب تھا۔" اس نے اپنی تصحیح کی۔ تب ہی اس کا ضمیر کروٹیں بدلنے لگا۔ بھرپور کوشش کے بجائے بھونڈی کوشش کہنا زیادہ مناسب لفظ ہے نوال ضمیر خان..... تین دن کی اس تگ و دو میں چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ساتھ لگنا پڑا تھا۔ لگتا تھا کسی کامیڈی سٹ کام کی شوٹنگ چل رہی ہے۔

یونی ورسٹی کی وہ کون سی لڑکی ہوگی۔ جس پر نازک نے شک نہ کیا ہو یا اس کا پیچھا نہ کیا ہو۔

محدب عدسہ سے اس کی 175 بائیک کے ٹول پرزوں کو بھی بار ہا جانچا گیا۔

"وہ لڑکی ہوگی چقندر نہیں کہ رنگ چھوڑ جائے گی۔ اور اب تو مشکوک بال ڈھونڈنا بھی بے وقوفی ہے۔ ساری قوم کے بال جھڑ رہے ہیں جگہ جگہ اڑتے پھرتے ہیں۔ کہیں بھی پڑ جائیں۔ اور یہ بتائیں آپ اپنے پوتے کو اتنا کریکٹر لیس سمجھتے ہیں کہ وہ شرٹ پر بالوں کی حد تک پہنچ جائے گا۔"

"افسوس کا مقام ہے۔" وہ سخت تاسف سے کہہ رہی تھی۔ اور وہ شرمندہ بھی ہو گئے۔ ہاں انہیں یہاں تک نہیں بڑھنا چاہیے تھا۔

"تم نے میری آنکھیں کھول دیں نوال....." انہوں نے چشمہ اتار کے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رگڑے۔

"نہیں..... " نازک نے سخت تاثرات سے تردید کی "جو اپنی زبان سے پھر سکتا ہے وہ پھر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"مخفش ایسا نہیں ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں نازک۔" نوال کے لہجے کی قطعیت۔ نازک کے لب بھینچ گئے۔ اشتیاق احمد نے چونک کر نوال کو دیکھا۔

ہاں وہ کہہ سکتی تھی، وہ جتنی باریک بین تھی۔ جتنی صاف گو تھی، جتنی دلیل سے ہر بات کرتی تھی اس نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔ وہ درست ہے۔ اور نوال ضمیر سے بڑھ کر اخفش کے کردار کی گواہی کسی کے پاس نہیں ہو سکتی تھی۔

پچھلے برس جب وہ دونوں سیلاب زدگان کی مدد کے لیے امدادی کیمپ میں تھے اور پھر جب نوال پانی میں بہہ گئی۔ اور جب وہ بے حس و حرکت نیم جان سی ٹیلے پر پڑی تھی کہ پلکیں جھپکنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔

تب اخفش جو اسے ساری رات ڈھونڈتا رہا۔ کبھی پانی کے اندر..... کبھی باہر۔ اس نے قسم کھالی تھی وہ نوال کو لیے بغیر نہیں جائے گا۔ اور پھر اس نے اسے ڈھونڈ بھی لیا۔ اتنے بڑے ٹیلے پر نوال اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر آرام دہ جگہ پر لٹایا بھی تھا۔ اس کا سر اٹھا کر اسے گھونٹ گھونٹ پانی پلاتا رہا۔ اس نے اس کے بالوں سے بھوسے کے تنکے بھی چنے تھے، وہ اس کی بے بسی پر اتنا دل گرفتہ تھا کہ رو پڑتا تھا۔

اس کے کردار میں کجی ہوتی تو یا اس کا دل سیاہ ہوتا تو کون تھا جو اس کو روک سکتا تھا۔ کچھ بھی کرنے سے، سوچنے سے۔

نوال نے اس کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے بھی میل نہیں دیکھا تھا۔

"تو پھر کیسے پتا لگے گا کہ وہ منحوس کون ہے۔" نازک صدیوں سے جیسے اسی ایک سوال کو لیے کھڑی تھی۔

"پیچھا بھی کر کے دیکھ لیا۔ کوئی نہیں ملا۔ موبائل

بھی چیک کیا۔ نانو نے تو اس کے سارے نمبرز پہ کال کر کے بھی دیکھ لیا۔"

(نوال کی آنکھیں پھیلیں۔ ہکا بکا اشتیاق احمد بھی تھے۔ واہ لیلیٰ بیگم تمہاری تیزیاں اشکیے بھئی اشکیے)

"آپ مان لیں نانا جان۔ یا تو آپ کا پوتا بہت ہوشیار ہے کہ ثبوت نہیں چھوڑتا یا پھر نانو جان درست کہتی ہیں کوئی لڑکی وڑکی نہیں ہے۔ ایسے ہی ہم سے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ روہانسی ہوگئی۔ نوال نے سر جھکا کر مسکراہٹ چھپائی۔ نانی' نواسی کو خود بھی معلوم تھا۔ وہ جان کا آزار بنی ہوئی ہیں۔

"کیا آپ نے بھی ناکامی کا اعلان کر دیا نانا جان....؟" نوال سے مایوس ہو کر اس نے اشتیاق احمد کا ہاتھ تھاما اور پھر بازو پر سر رکھ کے ہچکی بھری۔

"تم صحیح سے بیٹھو.... ہم بات کر تو رہے ہیں۔ بات چیت سے ہی مسئلے حل ہوتے ہیں۔"

"نہیں ہوتے...." نازک نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "بات چیت سے مسئلہ حل ہوتا تو آج کشمیر آزاد ہوتا۔"

"واہ!" نوال اش اش کر اٹھی۔

"تو پھر کیا کریں؟" اشتیاق احمد نے اپنا دماغ خالی ہو جانے کا اشارہ دیا۔

"اب بولنے کا نہیں عمل کرنے کا وقت ہے۔" نازک کو اپنی پڑی تھی۔

"عمل کون سا عمل.... بھئی' میں کوئی جادو ٹونا نہیں جانتا۔" سختی سے انکار کیا۔ پتا چلے قبر میں لیٹنا پڑے۔ نری شامت....

"عمل سے مراد...." نازک کو غصہ آنے لگا۔ "آپ دادا ہیں اس کے.... پکڑ لیں ہاتھ میں ڈنڈا.... اور جب تک نتیجہ حاصل نہ ہو' دس مار کے ایک گنیں۔"

"ایسے تو اسے چوٹ لگے گی۔"

"تب ہی تو منہ کھلے گا۔" نازک نے ترکی بہ ترکی کہا۔ اشتیاق احمد قائل ہو گئے۔

"یہ تم نے بالکل صحیح کہا۔

"صاف ہے کیسے لگا؟ تمہیں شرم نہیں آئی ایک لڑکی کو آس دلا کر' خواب دکھا کر مکرتے ہوئے۔"

"اچھا....!" اشتیاق احمد شدید اشتیاق سے کرسی پر آگے ہوئے۔ "خواب دکھائے تھے اس نے بھلا کون سے....؟"

"اُفوہ! محاورہ بولا ہے۔" نازک تنکی۔

"اُفف.... ایک تو تم محاورے بہت بولتی ہو۔" وہ نروٹھے پن سے گردن موڑ گئے۔

"اور یہ کہ وہ کیوں میرا دل توڑ رہا ہے میں اپنی کزنز اور دوستوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ میں نے تو خود سے اتنی باتیں گھڑ رکھی تھیں کہ وہ ایسا ہے ویسا ہے۔ اتنا لوونگ ہے' کیئرنگ ہے۔ میرے سنائے قصے اپنے منگیتروں کو سنا سنا کر' دو ایک کی تو منگنی ٹوٹنے کے دہانے پر آگئیں کہ تم نازک اندام کے منگیتر جیسے کیوں نہیں ہو اور اب....

"تم جھوٹ بولتی رہیں نازک؟" نوال بے یقین تھی۔

"محبت میں یہ سب چلتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم تو چپ رہو۔"

"اور اب.... ہاں کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے۔"

"بس خاموش.... اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ چکا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ کمرہ بند کر کے جب مار لگاؤں گا ناں.... اس کے باپ کا باپ ہوں' دیکھتا ہوں کیسے زبان بند رکھے گا۔"

"بالکل ٹھیک۔" نازک خوشی سے چلائی۔ "یہی علاج ہے اس کا...." نوال کے دیوتا کوچ کر گئے۔ دادا جان سے کیا بعید۔

☼ ☼ ☼

زینت بیگم۔ صوفیہ بیگم اور نوین سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ انداز سے فکرمندی اور بے بسی عیاں تھی۔ نوال دبے قدموں آئی اور اپنا سر بھی گھسا دیا۔ تینوں بری طرح چونکیں پھر اسے دیکھا تو سکھ کا سانس بھر کے

سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ دیا۔

"بڑی امپریس کرتی پچویشن ہے امی۔۔۔" نوین زینت بیگم سے مخاطب تھی۔ "رات ہی اخفش اخطب سے کہہ رہا تھا۔ اس کا تو گھر میں رہنا امتحان بن گیا ہے۔ آتے جاتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے تک لیلیٰ آنٹی ایسی جتاتی نگاہوں سے دیکھتی ہیں کہ قدم الٹے پڑجاتے ہیں۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے سو مرتبہ سوچتا ہوں بلکہ اب تو جھری سے تسلی کرتا ہوں کہ کہیں وہ باہر موجود تو نہیں۔ دو مرتبہ تو اپنے ہی کمرے کی کھڑکی پھاند کر نکلا کہ سامنا کیسے کروں۔"

"پتا نہیں 'لیلیٰ' بیگم کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ ورنہ ایسے صاف انکار کے بعد ان کو ایک پل بھی رکنا نہیں چاہیے تھا کجا کہ وہ ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئی ہیں۔"

"وہ تو جا رہی تھی میں نے ہی۔" صوفیہ دادی نے صفائی دینا چاہی۔

"ہاں ہاں، پتا ہے آپ ہی نے۔۔۔" زینت بیگم نے بے زاری سے ان کی بات کاٹی۔

"اتنی عجیب سی ناراض شکوہ کناں روٹھی روٹھی سی بیٹھی ہوئی ہیں۔ کہ میں خود ان کے قریب سے گزرنے سے کترا جاتی ہوں۔ چائے ناشتے کا بھی ڈرڈر کر پوچھتی ہوں۔ میرے ہاتھ کا بنا کھانا کھاتی ہیں۔ میں نے غلطی سے پوچھ لیا۔ گرم لاؤں تو ایسی سرد نگاہوں سے دیکھا کہ میرے تو اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوگئے۔"

نوین کی شکایتوں کی فہرست طویل تھی۔

"وہ اس امید میں تو نہیں کہ ایسے خفا ہو کر سب کو پریشرائز کریں گی۔ یا اخفش ہی مان جائے گا۔" نوال نے اپنی اتنے دنوں کی سوچ سب کے سامنے رکھی۔ صوفیہ بیگم تو بری طرح چونکیں۔ زینت بیگم کا سر نفی میں ہلنے لگا۔

"ایسے زبردستی کے رشتے نہیں بنائے جاسکتے۔ اچھے نتائج نہیں نکلتے۔ لیلیٰ بیگم بے وقوف ہرگز نہیں ہیں۔ ایک دنیا دیکھی ہے عمر گزاری ہے۔"

"تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں۔ میرا مطلب ہے اس بات کو تسلیم کرلیں کہ یہی رضائے الٰہی ہے۔"

نوین نے سیدھی بات کی۔

"کرنا تو یہی چاہیے۔" صوفیہ بیگم کا سر بھی اثبات میں ہلنے لگا۔ "مگر یہ بات اسے کون سمجھائے گا۔" اگلے ہی پل وہ پھر گھبرا گئیں۔

"صاف کہیں دادو۔ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔" نوال مسکرائی۔

"تم کوئی حل نکالو ناں بچے۔!" صوفیہ دادی نے اسی سے امید باندھی۔

"میں۔۔۔" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "نہیں پاپا۔۔۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں۔" صوفیہ بیگم کا چہرہ اتر گیا۔

"ابھی کہاں ہیں دونوں نانی، نواسی۔" زینت بیگم کو خیال آیا۔

"کہیں گئی ہیں، بہت تیار ہو کر۔۔۔ اخطب کو کال کر کے کہا۔ گاڑی بھیجو، انہیں ضرورت ہے۔ اخطب بولے بھی کہ انہیں خود ضرورت ہے تو فرمایا۔ کیب کرلیا اور اتنا غصیلا، بارعب انداز تھا کہ اخطب بولے نہیں میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔"

"واہ۔!" نوال نے داد دی۔ "عورت کو ایسا ہی بے خوف اور با اعتماد ہونا چاہیے۔" دوٹوک واضح۔

✲ ✲ ✲

تہائی دھوئی تیار شیار نازک کا موڈ درست نہیں تھا۔

"دیکھیں میری اسکن کتنی رف ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ دیکھیں ماتھے پر۔" وہ باربی اسٹائل کا دستے والا گلابی آئینہ پکڑے اپنے چہرے کو سخت بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"وہ واقعی۔۔۔ مگر کیسے؟" لیلیٰ بیگم کو بھی صدمہ پہنچا، تشویش سے نزدیک ہو کر دیکھا۔

"کیسے ہونی تھیں۔ وہی جو اتنے دن سے پیچھا کر رہی تھی۔ یونی ورسٹی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا، ایک جگہ نہ ٹکنے کی تو بددعا دی ہے جیسے اس اخفش کو کسی نے۔" وہ سخت بدمزہ ہوئی تھی۔

"تو تمہیں احتیاط کرنی تھی ناں چندا۔۔۔ سن بلاک لگاتیں اور کیپ لیتیں میں ذرا سی توجہ ہٹاؤں تو تم بالکل خود کو بھلا بیٹھتی ہو۔" انہوں نے آگے بڑھ کر ماتھے پر گرے بال سنوارے۔ "کیا بنے گا تمہارا؟" وہ فکر مند بھی تھیں۔

"یہی تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں۔" اس نے بے زاری سے آئینہ رکھ دیا۔

"کیا بنے گا میرا۔۔۔ وہ تو نہیں کرنے والا مجھ سے شادی۔"

"کیوں۔۔۔" لیلیٰ بیگم چلا اٹھیں۔ "کیوں نہیں کرے گا اس کا تو باپ بھی کرے گا۔"

"کیا۔۔۔ اس کا باپ۔۔۔ یومین انعام انکل۔۔۔ مائی گاڈ۔ نو نانو نو۔ آپ ایسا کہہ بھی کیسے سکتی ہیں' میرا مطلب ہے سوچ بھی۔۔۔"

"اوہو۔۔۔ بھئی مثال دے رہی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی میری فطرت ہی نہیں۔ میں نے پچھلے سال یہی طے کرلیا تھا کہ اس بقرعید پر تمہاری شادی کردوں گی تو کردوں گی بس۔"

لیلیٰ بیگم نے نواسی کے سر پر حیرت کا پہاڑ توڑتے ہوئے جج کے سے انداز میں ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

"بس ایک بار پتا لگ جائے وہ ہے کہاں کی مہارانی' جس نے تمہارے حق پر ڈاکا ڈالا۔" ان کی سوئی یہیں آکر اٹکتی تھی۔

"جانے دیں نانو جان۔۔۔! نازک کے لہجے میں زمانے بھر کی اکتاہٹ سمٹ آئی۔ "اس سے کیا حاصل اصل بات تو یہ ہے کہ مجھ سے نہیں کرنا چاہتا۔ ہمیں اس حقیقت کو قبول کرلینا چاہیے۔"

"ایسے کیسے کہہ دیا کہ قبول کرلینا چاہیے۔" لیلیٰ بیگم کو پتنگے لگے۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ وہ بہت لونگ ہے' کیئرنگ ہے' بھول گئیں' پچھلے برس جب تم اس کے ساتھ ریلیف کیمپ میں گئیں وہ کس قدر تمہارا خیال رکھتا تھا۔ تم نے خود بتایا تھا ناں۔ اتنے کاموں کے بیچ بھی اسے تمہاری فکر رہتی تھی۔ تمہارے کھانے پینے کی۔ آرام و صحت کی۔۔۔ ان سب باتوں سے کیا ظاہر ہوتا تھا کہ اسے تمہاری۔۔۔"

"نانو۔۔۔!" نازک نے ٹوک دیا۔ "آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں۔ وہ سب تھا۔۔۔ جبکہ اب سارا رونا ہے کا ہے وہ چاہتا تھا۔ وہ اب نہیں چاہتا ہے۔"

اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور لیلیٰ بیگم کے الفاظ گم ہوگئے۔ وہ اس کی صورت دیکھے گئیں۔

گلابی لباس میں اس کا گلابی چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ کچھ دھواں دھواں سا۔۔۔

"میں تمہارا برا تو نہیں چاہتی چندا۔۔۔ مجھے ایک کوشش تو کرلینے دو۔ دیکھو۔ وہ اکلوتا ہے۔ اس کا باپ اپنی دوسری بیوی بچوں کے ساتھ وہیں امریکہ میں سیٹل ہے۔ دادا۔۔۔ دادی آج مرے کل دوسرا دن اکیلا لڑکا ہے سمجھو نوین اور اخطب کی اپنی لائف ہے۔

تمہارے باپ کی دوسری شادی کے بعد میں تمہیں سوتیلی ماں کے سہارے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اور اب تو سنا ہے تمہارا کوئی سوتیلا بہن بھائی بھی آنے والا ہے۔ انتقش ہمارے ساتھ رہے گا۔ میرا سب کچھ بھی تو تمہارا ہے۔ وہ لالچی بھی نہیں ہے۔ اس کے خود کے نام اتنا کچھ ہے بوڑھی نانی اور دولت مند نواسی کے نام پر۔ بہت لوگ آئیں گے۔ مگر کیا گارنٹی ہے کہ وہ پرخلوص ہوں گے۔"

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔" نازک کی آواز دھیمی ہوگئی تھی۔

"خدا کہیں کھویا ہوا تھوڑی ہے جو ڈھونڈنا پڑے گا' وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔" لیلیٰ بیگم کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ آگئی۔ "مسئلہ تو ان انسانوں کو ڈھونڈنے میں ہوتا ہے۔ جو خدا کے احکامات اور بتائے ہوئے راستوں پر ایمان داری سے چلنے والے ہوں۔ مجھے وہ بہت پسند ہے نازک۔۔۔! ان کے گمبھیر لہجے کی بڑی گہری بات کے بعد انداز و آواز میں آجانے والی بے بسی نازک کا دل توڑنے لگی۔

"پسند تو چاند بھی سب کو ہوتا ہے مگر کبھی کسی کے ہاتھ آیا؟" لیلیٰ بیگم اسے کسی نادان بچی کی طرح ٹریٹ

کرتی تھیں۔ مگر وہ بچی تو تھیں نا۔ اتنی گہری سازش کی بات' لیلیٰ بیگم خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اور بس چلیں اب گھر چلتے ہیں۔ بہت دن رہ لیا ادھر۔" اس نے لیلیٰ بیگم کے گرد پھیلائے بازو سمیٹے۔

"تمہیں دکھ نہیں ہوا نازک۔ غصہ نہیں آیا کہ ان سب نے کیسے ہاتھ جھاڑے۔" لیلیٰ بیگم کا سوالیہ لہجہ آتشیں ہو گیا۔

"ہوا تھا۔ دکھ' حیرت' صدمہ... مگر نانو جان... چوٹ جتنی بھی زوردار ہو... کم ہو ہی جاتی ہے۔ نشان بھی نہیں رہتا" اس کا جملہ زیادہ مضبوط تھا یا لہجہ... تمیز مشکل تھی۔ تحیر میں مبتلا لیلیٰ بیگم کا رنگ بدلنے لگا پھر ایک سختی نقوش پر آکے ٹھہر گئی۔

"تم کچھ بھی کہو۔ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی تو میں ہوں نہیں' جب ایک بار کوئی ارادہ کرلوں تو پھر تو میں اپنے آپ کی بھی نہیں سنتی۔ شادی تو تمہاری میں کرکے ہی جاؤں گی۔ دیکھ لینا۔"

"جی...!" نازک گویا سر پیٹ لینے والی ہو گئی۔ نانو جان ضدی ہیں مگر یہ کیسی ضد... انفش انعام جیتا جاگتا انسان تھا۔ نانو کو یہ بات سمجھنی چاہیے تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے وہ سب باتیں نوال سے کہہ دیں کہ آپ کیوں انفش کو داماد بنانا چاہتی ہیں۔" نازک کی آواز بے یقینی سے پھٹ رہی تھی۔

"ہاں... تو اس میں کیا حرج تھا۔"

"یہ کہ اسے گھر داماد بنانا چاہتی ہیں۔"

"ہاں..."

"اور یہ کہ وہ اکیلا بھی ہے۔ آگا پیچھا کوئی نہیں۔"

وہ سب کچھ جو متعدد بار اس کے سامنے دہرایا تھا وہی انفش سے شادی کے فوائد... تفصیل سے تحریر کریں۔ نیز مثالوں سے ثابت کریں۔

مگر کیا وہی سب... بہت اندر کی' دل کی باتیں اب نوال کو بھی بتادی تھیں۔ اف خدا... عرق ندامت ہر بن مو سے پھوٹنے لگا۔

"ہر بات ہر ایک سے کہنے کی تو نہیں ہوتی نانو۔" وہ نڈھال سے لہجے میں بولی نوال کا سر جھک گیا۔

"نہیں..." لیلیٰ بیگم ہنوز اڑی ہوئی تھیں۔ "اسے بھی تو پتا چلے۔ اس انکار سے میں کس مشکل میں پڑ گئی ہوں۔"

"لیکن اس سب میں اس کا کیا قصور۔ یہ کیوں سنے؟" نازک نے خود کو چیخنے سے باز رکھا تھا۔ نوال کا سر بے ساختہ اٹھا انکار میں ہلا پھر ہاں میں...

"جب میں نے آپ کو واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں۔"

"نازک ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ نوال کو یہ سب کیوں سنا رہی ہیں لیلیٰ دادو۔" نازک کا جملہ کاٹنے والی یہ آواز انفش انعام کی تھی۔

نوال نے سختی سے مٹھیاں بند کیں... کبوتر ہونے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔

"ٹھیک کہا۔ سنانا تو تمہیں چاہیے تھا۔ مگر تم تو ہاتھ ہی نہیں آتے۔" لیلیٰ بیگم کا گلہ درست تھا۔

"پلیز نانو جان...!" نازک نے ان کا بازو پکڑا۔ گرفت میں تنبیہہ پوشیدہ تھی۔

"نانو کچھ نہیں کہہ رہی ہیں... تم جاؤ انفش..." نازک کا لہجہ صاف تھا۔

"مجھے بولنے دو نازک...!" انہوں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔ نوال کھڑی رہ گئی۔ اس نے وحشت زدہ ہوکر انفش کو دیکھا جو پرسکون نظر آتا تھا۔

"میں سچ مچ معافی کا خواستگار ہوں لیلیٰ دادو... لیکن یقین کیجیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر...

میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہو بھی جاؤں تو کیا ہم خوش رہ سکیں گے؟ اور خدا کی قسم اگر میں نے کوئی وعدہ کیا ہوتا تو میں اپنی جان سے گزر کر وعدہ پورا کرنے والا شخص ہوں۔ پوری زندگی گزار لیتا۔ مگر کبھی کسی پر ظاہر نہ ہوتا کہ یہ زبردستی کا بندھن ہے مگر خدا گواہ ہے یہ تو آپ اور دادو کا ایک مبہم خیال تھا۔ یہ بات نکلی ضرور تھی مگر آگے بڑھ نہ پائی تھی میں نے سب کچھ

ان پر ڈال دیا تھا۔ مگر پھر میں نے ہی انہیں منع کر دیا تھا کہ اس بات کو آگے کو مت بڑھائیے۔ میں کسی اور کو۔"

"اچھا... تو پھر کون وہ... ہے۔ تو سامنے لاؤ۔" لیلیٰ بیگم نے ہٹ دھرمی سے اکسایا۔ اخفش کی نگاہیں اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ الفاظ بھی گم ہو گئے تھے۔

اخفش کے پاس بہت ٹکڑا توڑ' دل توڑ جواب تھے۔ مگر اس نے ہونٹ کا کونا کاٹا اور پیچھے ہو گیا۔ ان کے جانے کے لیے راستہ چھوڑا۔ نازک انہیں لے کر جانا چاہتی تھی۔

نوال کو اپنی موجودگی بوجھ لگنے لگی۔

صورت حال یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اندازہ نہیں تھا۔ زبان بھی بوجھل ہو گئی تھی۔ کندھوں کی طرح۔

"چلیے نانو جان... سوری اخفش!" نازک انہیں دھکیلنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات نارمل تھے۔ ابھی تو بس نانو کو لے جانا مقصود تھا وہ جو بے وقوف سی چڑیا۔ جانو اور چندا تھی۔ یا یوں تھا کہ لیلیٰ بیگم نے اپنے پروں میں کچھ اس طرح سے سمیٹ رکھا تھا کہ واضح نہیں ہو پائی۔ کیا تھی اصل میں... کیسی تھی۔

لیلیٰ بیگم کو وہ دنیا سے بے بہرہ لگتی تھی۔ پر وہ تھی نہیں...

نوال میں ملنے کا یارا ابھی نہ تھا۔

چند دن پہلے کی جاسوس نازک... اور آج کی نازک... نوال حیران تھی وہ سچ تھا یا پھر یہ...

نوال کی نگاہ اٹھی۔ اخفش اسی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

پتا نہیں نانی نواسی کی آپس میں کیا بات چیت ہوئی تھی مگر یہ خوش آئند تبدیلی سب نے نوٹ کی کہ لیلیٰ بیگم کا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔

شروع کے چند دن تو وہ سب کو گھورتی پائی گئیں۔ ناشتے پر آنے سے منع کر دیا۔ لنچ پر پیزا آڈر کر دیا اور ڈنر ٹائم پر باہر چلی گئیں۔ کسی سے بات بھی نہیں کر رہی تھیں۔ مخاطب کرنے پر ایسی نگاہوں سے دیکھتیں کہ دل لرز جاتا۔

اب دونوں گھر میں بھی کم نظر آتیں۔ نجانے کہاں جایا کرتی تھیں۔ عام طور پر اکیلے جاتیں کبھی کبھار نازک بھی ساتھ ہوتی۔

"کہاں جاتی ہو۔" کے سوال پر انہوں نے بس اک نگاہ غلط انداز صوفیہ بیگم پر ڈالی تھی اور جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی کے مصداق... صوفیہ دادی پلکیں جھپک کر رہ گئیں۔ ہاں انہوں نے تو ان کا دل دکھایا تھا اور اب وہ کسی بھی سوال کا حق نہیں رکھتی تھیں۔ صوفیہ دادی اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح رہتیں۔

البتہ نازک کا موڈ خوش گوار تھا۔ وہ نوین کے بچوں کو اٹھائے لاڈ کرتی۔ اپنے پیارے ہاتھوں کے ناخنوں پر نیل آرٹ کے نمونے بناتی اور شاور رہتی۔ کانوں میں ہینڈز فری ٹھونس کر جھومتی ہوئی بھی پائی جاتی اس کے پاس نت نئے ڈیزائنوں کے بیش بہا لباس تھے۔ جنہیں روز بدلتی۔ فیشن کے معاملے میں وہ اس قبیل سے تعلق رکھتی تھی کہ ایک چیز ان ہے تو اسے اپنانا ہے۔ اچھی لگے نہ لگے۔

☼ ☼ ☼

فون وہ سنتی نہیں تھی اور بات اب اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ میسجز پر نمٹائی نہیں جا سکتی تھی۔ بالمشافہ ملاقات ضروری تھی مگر کہاں اور کیسے... وہ بھی ایسے کہ وہ اسے منا کر ہی چھوڑے غصے سے مان سے یا پھر منت سے... آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ سو وہ اس کی ٹوہ میں لگ گیا اور پھر وہ اس کے ہاتھ آ ہی گئی۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے مجھے جانا ہے۔" وہ اس کی راہ مسدود کیے کھڑا تھا۔

"آج ایسے نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں فیصلہ سنانا ہی پڑے گا۔" اس نے ٹانگ دیوار سے لگا دی پھر ہاتھ بھی... اب وہ بے خوفی سے اسے تک رہا تھا۔

"میں شور مچا دوں گی۔"

"بہت شوق سے۔۔۔ اچھا ہے جان چھوٹے گی سب نے کان کھا مارے ہیں۔ کون ہے؟ کہاں ہے؟ بلکہ ہے ہی نہیں۔۔۔ یہ تو تم نیکی کرو گی۔" وہ پورا ہوم ورک کیے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر۔" اس نے بھی لمحوں میں فیصلہ کرکے سر ہلایا۔ "میں انکار کرتی ہوں۔" اس نے اپنے تئیں اس پر پہاڑ توڑا۔

"وجہ بتادو۔۔۔"

"میں ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ بے مروت ہو گئی۔ رخ بدل لیا۔ درحقیقت یہ خود کو مضبوط اور بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش تھی۔

اسے خود پر غصہ آنے لگا وہ کمزور کیوں پڑ رہی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر جیسے اپنے اصل روپ میں آنے کی سعی کی مگر اس میں اب مشکل ہو رہی تھی۔ شاید وجہ اخفش انعام کی آنکھیں رہی ہوں جیسے وہ دیکھ رہا تھا۔

سینے پر ہاتھ لپیٹے اونچا لمبا چوڑا۔۔۔ وہ اس کے پیچھے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

"ایک سال کا انتظار۔۔۔ اور بدلے میں انکار۔ تم سے اس بے ایمانی کی امید نہیں تھی۔"

"یہ طے نہیں ہوا تھا کہ اگر میں انکار کروں گی تو تم یوں کرو گے۔" وہ اس کی جارحیت یاد دلانا چاہتی تھی۔ ایک لحاظ سے شرم دلانا۔

"اچھا۔۔۔ انکار کی وجہ بتادو۔ ورنہ میں ٹلنے والا نہیں۔" اس نے نرم لہجے میں دھمکایا۔

"میں برا آدمی ہوں؟" اس نے بے ساختہ نگاہیں اٹھائیں پھر جھکالیں۔ سچ آنکھوں سے چھلک جو جاتا نہیں نہیں۔ جو چیخ چیخ کر کہتیں۔

"تمہیں اچھا نہیں لگتا؟" سن کر پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ہر بات سے منکر ہونے پر تلی ہوئی تھیں۔

"کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" اس بار پلکوں پر اس کا اختیار نہ رہا۔ وہ بے ساختہ اٹھیں۔ انکار و ناراضی ہویدا تھی۔ وہ ایک قدم آگے آگیا۔

"میں پیچھے ہٹنے کو تیار ہوں حالانکہ یہ جان جوکھم کا کام ہوگا مگر پھر پتا ہے کیا باقی کی ساری زندگی اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں گزار دوں گا۔ تم نے منع کیوں کیا؟"

وہ لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

"پچاس سال بعد بھی ملو گی تو بھی مجھے ایسا ہی پاؤ گی۔ آں ہاں۔ جوگ نہیں لوں گا۔ کھوجی بن چکا ہوں گا۔ اسباب و وجوہات کو کھوجتا۔۔۔ خبطی بڈھا۔۔۔ بچے پتھر بھی مارا کریں گے اور ہو سکتا ہے ان میں تمہارے پوتے نواسے بھی شامل ہوں۔"

وہ بری طرح چونکی۔ وہ مذاق کر رہا تھا؟ اتنا سنجیدہ مذاق درد سے آنکھوں میں جھانک کر۔ جیسے اب خود پر ترس بھی نہ آتا ہو۔

"اللہ نہ کرے جو۔۔۔" وہ نرم دل تو تھی نا۔ اس بدحالی کے تصور ہی سے دل دکھ گیا۔

"قسم سے۔۔۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر در آنے والی تشکیک دیکھ کر اور وہ اسی مسکراہٹ سے تپ گئی۔ ہاتھ کے اشارے سے راستہ چھوڑ دینے کا کہا۔ منہ پھول گیا تھا۔

اس کی مسکراہٹ سمٹنے کے بجائے پھیل گئی۔ یوں مؤدب ہو کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دو قدم پیچھے سرک کر اسے کسی ملکہ کا سا اعزاز دیا ہاں جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔

اور وہ جو کسی جارحیت کی توقع کر رہی تھی۔ چونک اٹھی۔۔۔ اور وہ ہی کیوں اخفش انعام بھی بدک گیا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر اٹھیں اور پھر سامنے۔۔۔ یہ اشتیاق احمد تھے۔۔۔ سینے پر ہاتھ لپیٹے۔ دونوں کو باری باری دیکھتے وہ ایک قدم آگے آئے۔

"اخفش ٹھیک کہتا ہے۔ وجہ بتادو یا پھر مان جاؤ نوال ضمیر خان۔۔۔!" وہ مسکرا رہے تھے۔

"ہاہ۔۔۔!" اس کا دم حلق میں آکر اٹک گیا۔ سر پر پہاڑ ٹوٹا۔ بوکھلا کر اخفش کو دیکھا جو اچانک ہی مجبور و مظلوم و معصوم نظر آنے لگا تھا۔

"تم۔۔۔!" اس نے اپنے تازہ برابر ترشے ناخنوں کو

دیکھا۔ وہ اس پر کسی جنگلی بلی کی طرح جھپٹ جانا چاہتی تھی مگر۔۔۔

"تم نے تو وعدہ کیا تھا تم کسی کو بھی نہیں بتاؤ گے میری ہاں سے پہلے۔۔۔" وہ اپنے مخصوص ڈھنگ انداز سے اخفش کی سمت بڑھی۔

"ہاں تو میں نے نہیں بتایا۔۔۔ کب بتایا۔" وہ صاف انکاری تھا۔

"تو پھر دادا جان پر کیا وحی اترنے لگی؟" وہ پر یقین تھی۔

"مجھے کیا پتا۔۔۔ سامنے کھڑے ہیں ان ہی سے پوچھو۔" اس نے ہاتھ جھاڑے۔

حیران تو وہ بھی ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے سوچ لیا وہ گھنٹہ بھر سے "مسنا رہا" تھا۔ اشتیاق احمد نے دیکھ لیا ہوگا۔ سب کچھ سن کر سمجھ گئے ہوں گے، مگر اشتیاق احمد تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

"میرا پوتا اپنی زبان کا پکا ہے اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا مگر۔۔۔" وہ قصداً" رکے اور دونوں کو دیکھا۔ جس کی سانس تھمی ہوئی تھی۔ "میں نے کیا یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر گھنے سرمئی بالوں کو دو چٹکیوں میں پکڑ کے اوپر اٹھایا۔

"مجھے تو بہت پہلے ہی پتا چل گیا تھا تب سے جب تم لوگ واپس آئے تھے۔ بلکہ صاف کہوں تو جب تم دونوں ہیلی کاپٹر کی رسی سے لٹکے فضا میں جھول رہے تھے میں تو تب ہی سمجھ گیا تھا۔ میرا پوتا گیا۔"

بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ نوال کی آنکھیں اتنی پھیل گئیں جتنی پھیل سکتی تھیں۔

"آپ اسے بچانے کی کوشش مت کریں۔"

"میں تو تم دونوں کو بچانا چاہ رہا ہوں۔"

"دونوں کو۔۔۔" وہ یک زبان ہو کر بولے۔ "کس سے۔۔۔؟"

"اپنا نقصان مت کرو۔ تم دونوں مجھے بہت پیارے ہو۔"

"یہ زندگی بھر ہجر کاٹے اور تم۔۔۔" انہوں نے اپنا بازو نوال کے گرد پھیلایا۔

"پچھتاوے کی ریت جھاڑو، یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"میں کیوں پچھتاؤں گی۔"

"اب یہ تو تم اپنے آپ سے سوال کرنا۔۔۔ کہ اسے منع کر کے کیا خوش رہو گی؟" انہوں نے بالآخر اسے لاجواب کر دیا۔ واقعی اس کے الفاظ گم ہو گئے تھے۔

"اور تم اس کی وجوہات سنو اور تحفظات دور کرنے کی کوشش کرو۔" وہ بارعب آواز سے اخفش سے مخاطب ہوئے۔

"میں نے کوشش کی تھی۔" اس نے فوراً" کہا۔

"کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟"

"یہ سنتی ہی نہیں تھی۔"

"تمہیں بار بار سنانا چاہیے تھا۔"

"میں نے سنایا تھا۔"

"پھر۔۔۔"

اخفش نے خود کو بے قصور ثابت کر دیا تھا۔ وہ تو کوشش کرتا رہا تھا یعنی اب سارے قصور میرے کھاتے میں۔ نوال کو طیش آیا۔

"یہ۔۔۔ یہ مجھے میسجز کرتا تھا۔ ہر رونٹ۔۔۔ ہر وقت میرا ان بکس اوور رہتا تھا۔" ہڑبڑاہٹ میں شکایت بھی لگائی تو کیا۔

"اوف۔۔۔!" اشتیاق احمد چونکے پھر ڈیلے گول گول گھمائے "میسجز۔" کھینچ کر کہا نوال کا دھیان نہیں تھا۔ "شکایت نمبر دو کارڈز دے دے کر بھی ناک میں دم کر دیا۔ گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں۔"

"اوف۔۔۔" اشتیاق احمد کے ہونٹ گول ہو گئے۔ "کارڈز بھی۔۔۔ ی ی ی۔"

"ہاں۔" نوال نے سانس ٹوٹنے سے پہلے ہی تیسری شکایت بھی لگا لینی مناسب سمجھی۔

"کسی اور کو تو نہ بتانے کا وعدہ نبھایا مگر میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ جب موقع ملا کب جواب دو گی؟ میں ہنوز منتظر ہوں پھر کیا سوچا جب دیکھو میرے کانوں میں پھونکیں مارتا تھا۔ گھر سے نکلتے گھر میں گھستے۔۔۔ کینٹین کی لائن میں۔۔۔ لائبریری کی الماری کے پیچھے سے۔"

"پھونکیں...؟" اشتیاق احمد کی سوئی اٹک گئی تھی دونوں کو بے یقینی سے دیکھا۔ اخفش کی بتی پہلے ہی گل ہو چکی تھی۔

"خود وعدہ لے لیا کسی کو کچھ نہیں بتلائے گا" اور اب یہ کیا کر رہی تھی۔

"عشق میں فقیر ہوتے تو سنا تھا۔ تم کیا پیر ہو گئے۔ پھونکیں مارنی شروع کر دیں؟" ان کی سرے سے بھری آنکھیں تحیر کی زیادتی سے ہولناک دکھ رہی تھیں۔

"محاورہ بولا ہے میں نے۔" نوال رونے کو ہو گئی۔ اخفش سر پیٹ کر رہ گیا۔

"اوہ اچھا اچھا...!" توقع کے برخلاف وہ فوراً" مان گئے۔ مجھے ان پھونکوں پر کوئی اعتراض نہیں۔

"دادا جان...!" نوال نے احتجاج کیا۔

"ایک تو میری زبان بار بار پھسل جاتی ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ..." وہ بے بس تھے جیسے... دونوں بازو پھیلا کر دونوں کو دائیں بائیں سمیٹ لیا اور دھیرے دھیرے بولنے لگے۔ اخفش کے چہرے پر مسکان تھی جب کہ نوال... وہ اپنی ساری طراریاں بھولے... الجھن کا شکار لگتی تھی۔ دھیان کہیں اور ہی تھا۔

✲ ✲ ✲

صوفے پر ٹیبل پر شاپنگ بیگز کا ڈھیر تھا اور ان سے نکلتے پھسلتے ریشمی قیمتی بھاری بھرکم شوخ کپڑے۔

"دیکھو یہ پیچ اور پرپل... اور یہ میرون اور اورنج..."

وہ بہت بھاری عروسی لباس کسی مشاق سیلز مین کی طرح ہوا میں اچھال کر سب کے سامنے پھیلا دیے۔ پیچ فراک کے گھیرے سے زیادہ نوین اور صوفیہ بیگم کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ کپڑے کس کے تھے اور کیوں تھے' یہ تو کسی دولہن کے لباس تھے۔

"نازک کو یہ پیچ پسند تھا' مگر مجھے یہ میرون... پھر میں نے سوچا دونوں لے لیتی ہوں بس اب آپ لوگ یہ بتائیں منگنی پر کون سا پہناؤں۔"

انہوں نے احسان عظیم کرتے ہوئے حق انہیں تفویض کر دیا جو بھونچکی رہ گئی تھیں۔

"کس کی منگنی...؟" صوفیہ بیگم کی پھنسی آواز نکلی' مدد طلب نگاہیں نوین پر جمی تھیں جو خود مدد کی تلاش میں تھی۔

"نازک کی منگنی اور کس کی منگنی... شادی چھ ماہ بعد ٹھہر کر کروں گی ٹھیک ہے نا۔ بھئی آخر کو تیاریوں کے لیے وقت تو چاہیے ہی ہوتا ہے... ہے نا۔" انہیں آج ہر بات کے لیے تصدیق درکار تھی۔

"جی ہاں... جی نہیں۔" نوین جو حیرت کے باعث کھڑی تھی اب بیٹھ گئی (دھڑام سے گرنے سے بہتر تھا یہ فیصلہ...)

"ارے نازک...! وہ جیولری والا شاپر تو سامنے کرو۔" لیلیٰ بیگم نے پکارا۔

مگر نازک متوجہ نہیں ہوئی۔ سب سے بے نیاز کانوں میں ہینڈز فری ٹھونسے جھوم جو رہی تھی۔ لیلیٰ بیگم کو خود ہی ڈھیر میں ہاتھ مارنے پڑے۔

یہ اس فراک کے ساتھ... اور یہ اس میکسی کے ساتھ... پیچ فراک کے ساتھ روایتی مغلیہ طرز کے زیورات تھے اور میکسی کے ساتھ نازک نیکلس اور لمبے آویزے... دونوں کے چہرے پر ستائش پھیل گئی۔

"اب تم بتاؤ نا' منگنی کے روز کون سا پہنے۔" دونوں کے نقوش پھر سے تن گئے جیسے کسی نے پتلی پر پلاسٹر لگا کر ہینڈز اپ کہہ دیا ہو۔

"بتاؤ نا...؟" وہ ٹھنک کر پوچھ رہی تھیں اور یہ دونوں گنگ تھیں۔

اخفش کے صاف انکار کے بعد لیلیٰ بیگم کا جارحانہ رویہ... ناراضی اور صاف صاف کہہ دینا کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ پھر دھمکیاں۔ رشتہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ تب سب کے لیے یہ مشکل معرکہ بن گیا کہ انہیں کیسے سمجھایا جائے اور پھر انہوں نے ہی خاموشی

اختیار کی۔ نسب کو نظر انداز کرنے لگیں تو یہی سمجھا جانے لگا کہ انہوں نے حقیقت تسلیم کرلی ہے کہ ایسے زور زبردستی سے یہ رشتہ نہیں بنایا جاسکتا اور ابھی کلمہ شکر ادا کرنے کا ارادہ ہی کیا جارہا تھا کہ۔۔۔ یہ جوڑے' یہ زیورات' منگنی' شادی۔ اللہ کس مٹی کی بنی تھیں لیلیٰ بیگم۔۔۔

صوفیہ بیگم کا تو دماغ سن ہونے لگا۔ نوین بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے چور نگاہوں سے دیکھا۔ نازک اندام میوزک انجوائے کرتے کرتے بیٹھے سے لیٹ چکی تھی وہ تھکی ہوئی تھی اور لیلیٰ بیگم کی نسبت شاپنگ کے حوالے سے جوش و خروش اتنا نمایاں نہیں تھا جب کہ لیلیٰ بیگم۔۔۔ ان کے ہر انداز سے خوشی و بے فکری ٹپک رہی تھی۔ وہ ہر چیز کو بے انتہا جوش و محبت سے چھو کر دیکھتی تھیں اور دل بھرتا نہیں تھا جیسے دنیا میں اب اور کوئی غم نہیں تھا۔ کام نہیں تھا' کہو تو ساری رات بیٹھ کر پھول' پتیوں' نگوں پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔

"تم نے بتایا نہیں نوین۔۔۔! منگنی کے روز کون سا ڈریس زیادہ سوٹ کرے گا؟" لیلیٰ بیگم کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ اس نے بوکھلا کر صوفیہ بیگم کو دیکھا جو ہراساں نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ۔ یہ والا۔" نوین نے دیکھے بغیر ہاتھ رکھ دیا۔ لیلیٰ بیگم نے سرخوشی سے نعرہ لگایا۔ اور سب سے کٹ کر گانے کی دھن پر پیر ہلاتی چٹکیاں بجاتی نازک کا کندھا جھنجوڑ ڈالا۔ وہ یوں اچھلی کہ بس صوفے سے گرنے والی ہوگئی۔

"دیکھا۔۔۔ میں نہ کہتی تھی میکسی منگنی میں اچھی لگے گی۔ انگرکھا وغیرہ اور یہ جیولری "چوتھی" کے روز جچتی ہے۔"

"چوتھی۔۔۔ نہ پہلی نہ دوسری۔۔۔ لیلیٰ بیگم نے تو چوتھی کی رسم تک کا لباس طے کرلیا تھا ارے میرے مالک۔۔۔!" صوفیہ بیگم کا دل پسلیوں کی دیواروں سے ٹکر مارنے لگا۔ حالت نوین کی بھی کچھ ایسی تھی۔

"تو کس سے۔۔۔ میرا مطلب کب ہوگی یہ تقریب۔۔۔ یعنی منگنی۔۔۔" اس کے اندر تو ڈھیروں سوال تھے۔

اخفش انکار کرچکا تھا تو کس برتے پر آپ یہ سب۔۔۔

بھلا ایسے بھی کہیں ہوتا ہے' یہ تو باہمی رضامندی کے معاملات تھے۔ دلوں کے سودے آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔ کیا ہاتھ پیر باندھ کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میرون و اورنج میکسی والی کے ساتھ بٹھائیں گی۔۔۔یا۔۔۔یا۔۔۔ اف۔۔۔

"بھئی۔ منگنی کب کرنی ہے۔ یہ تو ابھی میں نے ڈی سائیڈ نہیں کیا۔۔۔ بھئی وہ تو ہم سب مل کر کریں گے۔ تم لوگوں کے مشورے کے بغیر تھوڑی کچھ کروں گی۔ یہ تو بس شاپنگ کا دل کر رہا تھا تو۔۔۔"

بہت محبت بھرے لہجے میں نوین کا گھٹنا چھوتے ہوئے وہ بتا رہی تھیں۔

"جی۔ جی۔۔۔!" نوین کو خود پر حیرت ہونے لگی۔ آخر وہ بے ہوش کیوں نہیں ہوتی۔

ادھر صوفیہ بیگم نے خود کو باور کروا دیا تھا کہ درحقیقت وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہوچکی ہیں۔ یہ تو بس آنکھیں کھلی ہیں اور اسے جاگنا نہیں کہتے اسے سکتہ ہوجانا کہتے ہیں۔

ادھر نوال کی بے تابی حد سے سوا تھی۔ وہ یہ جاننے پر مصر تھی کہ اگر کسی نے بتایا نہیں تو آخر انہیں پتا کیسے لگا' مگر اس سے پہلے یہ مصیبت ٹوٹی کہ سال بھر کے خاموش اشتیاق احمد نے نوین کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔۔۔ کچھ قیافے' کچھ حقیقت' کچھ افسانہ اور نوین۔۔۔

☼ ☼ ☼

"کہاں تو اتنی ناپسند تھی کہ تم کو اس کا نام سننا گوارا نہیں تھا اور کہاں یہ کہ اب اس کے علاوہ کسی اور کا نام سن نہیں سکتے۔ ہماری تو حیرت ہی نہیں جاتی۔" نوین نے اخفش کی خبر لی تھی۔

"میری بھی نہیں جاتی۔" نوین ہی کے انداز میں اس نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

"وہ محض دوست! اخفش...! کل تک تو وہ جانی دشمن تھی۔"

"سب کی حیرت درست ہے، مگر یہ بھی درست ہے کہ اب مجھے اس کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتی۔" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

"یہ لمحوں کے فیصلے تو نہیں ہوتے۔" نوین ٹٹول رہی تھی۔

"کس نے کہا، لمحے کا فیصلہ تھا وہ رات میری زندگی کی ساری راتوں سے لمبی رات تھی۔"

"کون سی رات...؟" نوین نے پہلو بدلا۔

"جب وہ شیر خوار بچی کو بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر پانی میں کود گئی اور ناکام تو کبھی ہوتی ہی نہیں۔ اسے لے بھی آئی، مگر پھر خود پھسل گئی اور اگلے پل وہ نظروں سے اوجھل تھی۔

سب مایوس ہو گئے تھے وہ ملتی نہیں تھی اور سب واپسی کو تیار تھے تب مجھے احساس ہوا کہ اس دلدلی زمین نے میرے پیر جکڑ لیے ہیں۔ اور پھر میں ساری رات اس کی تلاش میں بھٹکا۔ ہر بار تھکتا تھا۔ تب اس کی صورت ہمت دلاتی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں ڈوبتا تو وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاتی۔"

"تو کیا احسان اتارنا مقصود تھا؟" نوین سحر زدہ سی سن رہی تھی۔ بے ساختہ ٹوک دیا۔

"وہ مجھے دشمن لگتی تھی۔" اخفش نے سوال کو نظر انداز کر کے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اس رات مجھ پر ادراک ہوا۔ میں غلطی پر تھا اپنے اور اس کے رشتے کو دشمنی کا نام یونہی بے وقوفی میں دے دیا تھا۔ دراصل تو یہ اندر چھپا تعلق تھا۔ لگاؤ تھا۔ اور بہت سوچنے پر پتا لگا یہ محبت تھی۔ میں گرتا تھا، اٹھتا تھا، روتا تھا کہ اگر وہ نہ ملی تو...؟" سال گزر جانے کے بعد بھی اسے جھرجھری محسوس ہو رہی تھی۔ محض اس خیال سے کہ وہ کھو جاتی تو...

"اس کے مل جانے کی خوشی... ہاہ..." وہ جیسے اب اس لمحے کی سرشاری میں جی رہا تھا۔ "میں اب تک منا رہا ہوں، مگر وہ ہے کہ مانتی ہی نہیں۔"

اس کے لہجے میں بالآخر شکستگی در آئی۔ نوین کا تو مانو دل کٹ گیا۔

"میں صبر سے انتظار کرنے کو تیار تھا، مگر بیچ میں یہ جو لیلیٰ دادو اور نازک اندام کی انٹری ہو گئی۔"

"ہاں یہ تو واقعی گڑبڑ ہو گئی۔" نوین بھی پریشان ہوئی۔ "لیکن اب کرنا کیا ہے۔"

"بس آپ اس سے کہیں، جواب کیوں نہیں دیتی۔ ایک سال کی مدت کم نہیں ہوتی سوچنے کے لیے۔" اس نے ذرا اکھڑپن سے کہا۔ نوین کا سر تائیداً ہل رہا تھا۔ دفعتاً چونکی۔

"لیکن اگر اس نے جواب میں انکار کر دیا؟" اس کا لہجہ سہما ہوا تھا۔

"نہیں...!" اخفش بے چین ہوا۔ "اللہ نہ کرے۔"

تب ہی کچھ گھبرایا سا بے خود خان اندر داخل ہوا۔ پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھتا تھا۔

"کیا ہوا؟" دونوں کی توجہ مبذول ہوئی۔

"ادھر باہر دو لڑکے اور ایک لڑکی آیا ہے۔ بولتا ہے ایونٹ مینجمنٹ کرتا ہے۔" بے خود میٹرک کلاس میں چلا گیا تھا۔ پڑھائی میں اچھا تھا، مگر ایونٹ مینجمنٹ دونوں کے سر سے گزرا۔ اب انگلش اگر پشتو میں بولی جائے تو ایسا تو ہوگا ہی۔

"کیا کرتا ہے؟" دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سوالیہ نگاہیں الجھے ہوئے بے خود پر ٹک گئیں۔

"ایونٹ..." بے خود نے خود کو مشکل سے بچانے کے لیے آسان الفاظ ڈھونڈنے چاہے۔ "وہ لوگ ساری شادی بنانے کا کہہ رہے تھے کبھی سالگرہ بھی بناتے ہیں۔"

"اوہ..." دونوں کو سمجھ آ گیا۔ "پر وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"وہ بولتا ہے کہ اور منگنی ہونے والا ہے۔" بے خود خود حیران تھا۔

"منگ... نی..." اخفش اور نوین کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اگلے منٹ سر پر پیر رکھ کے باہر کو بھاگے۔

جینز اور کرتے میں ملبوس اسمارٹ سی سلونی لڑکی پورے لان کا یوں جائزہ لے رہی تھی جیسے خریدار ہو۔۔۔ یا بل چلوانا چاہتی ہو۔ نوین پر نگاہ پڑی تو پروفیشنل انداز سے مسکرائی اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "ہیلو!"

"آپ لیلیٰ بیگم۔۔۔ آپ ہی نے ہمیں ایجمنٹ کے لیے ہائر کیا ہے۔ آئی ایم شازیہ وسیم۔۔۔ یو نو"

نوین نے کیا جواب دینا تھا۔ جنبش سے بھی گئی۔ بڑھا ہاتھ تک نہ تھام سکی۔

ایسی ہی حالت اخفش انعام کی تھی۔ پیچھے آکر کھڑا بے خود صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا' اس ناقابل فہم و ناقابل یقین منظر کو ہر بندے نے اپنی اپنی جگہ ساکت ہو کر دیکھا تھا۔ لیلیٰ بیگم رات گئے تک شازیہ وسیم کے ساتھ لان کے طویل و عرض ناپتی رہیں۔ ان کی آوازیں بنارکاوٹ کے۔۔۔ کچن کی کھڑکی میں بت بنے اخفش اور نوین دل پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اپنی وہیل چیئر کو دھکیلتی صوفیہ بیگم۔۔۔ یونہی خوامخواہ کے مصروف بے خود خان۔۔۔

اور لیلیٰ بیگم کے شانہ بشانہ چلتے اشتیاق احمد کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ کلر تھیم میرون اور گولڈن تھی۔ پھول فقط اورنج کلر کے۔۔۔ مہمانوں کے لیے کلر تھیم اورنج تھی۔ چونکہ دلہن میرون میکسی میں ہوگی لہٰذا دولہا کے لیے پینٹ کوٹ۔۔۔ اور میرون و گولڈن ٹائی۔۔۔

"میں اورنج پھول نہیں لگا سکتا۔" اخفش چلا اٹھا۔

"یعنی باقی سب پر تم راضی ہو؟" نوین بھونچکی رہ گئی۔

"او نئیں یار!" اس نے بلا مبالغہ اپنے بال نوچے تھے۔

"میں اپنی جان دے دوں گا۔" اس نے دھمکایا۔

"تو پھر یہ کوشش تمہیں جلد از جلد کرنی ہوگی۔" اخطب پرسکون تھے نجانے کب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

"اور یہ دادا جان کو کیا ہوا ہے۔ انھیں ذرا اندازہ نہیں ہے شامیانے لگانے کے لیے یہ جو سر پے

گاڑنے کے لیے سوراخ بنائے جا رہے ہیں یہ دراصل گڑھے ہیں گڑھے جن میں میں دھیرے دھیرے ڈوب رہا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" نوین حیرت زدہ رہ گئی۔ "تو تم چپ چاپ کھڑے یہاں کیا کر رہے ہو انھیں بتاؤ ناں جاکر۔۔۔"

"ہاں' میرے بتانے سے تو جیسے وہ باز آجائیں گے۔" وہ جل کر بولا اور واک آؤٹ کر گیا۔

☆ ☆ ☆

نوین دم بخود سی بن رہی تھی۔ باہمت' مردمار' بے خوف' بااعتماد نوال ضمیر خان کا لہجہ و آواز دونوں چیزیں بہت بدہضم تھیں۔ وہ کہیں سے بھی وہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی جو نڈر ہو کر ہر بات کہہ ڈالتی تھی۔ جھجک' لحاظ نام کی کوئی چیز اس کی لغت کا حصہ تھی ہی نہیں۔

مگر شاید یہ موضوع ہی ایسا تھا۔ یا پھر یہ کہ دل کھول کر رکھنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔

"اس نے ساری رات مجھے ڈھونڈا تھا۔ اس نے سب سے کہا۔ وہ مجھے ڈھونڈے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ ورنہ پھر خود بھی کھو جائے گا ایسے کہ نہ کسی کو ملے گا نہ خود کو اور مجھے وہ برا تو کبھی نہیں لگا تھا!"

گم صم ہو کر بولتی کو اچانک صفائی دینا ضروری لگا۔ نوین کو دیکھنے لگی۔

"وہ اپنی جگہ درست تھا میں اپنی جگہ۔۔۔"

اس نے کہا۔ "محبت کا دریا ایک بار چڑھ جائے تو پھر کبھی نہیں اترتا۔"

"میں نے پوچھا۔ محبت۔۔۔ کس سے؟"

بولا۔ "تم سے۔"

میں نے اکڑ کر پوچھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

بولا۔

"اس نے بولا؟ کل شام کی۔" نوین نے اسے ٹوکا اور جملہ مکمل کر دیا۔

نوال سٹپٹائی۔ "یہ آپ سے اس نے کہا؟" وہ غصہ میں آئی۔ "اس نے وعدہ کیا تھا وہ مجھ سے پہلے کسی سے

کچھ نہیں کہہ سکا۔"

"وہ وعدے پر قائم ہے۔ منہ سے کچھ نہیں پھوٹتا۔" مگر بس یہ کہہ رہا تھا۔ اس ایک رات اور تلاش اور خدشات نے اسے باور کروایا تھا۔

یہ جو کچھ تھا فکر، بے چینی، غم وہ محبت کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

نوال چند لمحے تک نوین کے چہرے کو دیکھتی جیسے سچائی ٹٹولتی رہی۔ پھر سر جھکا لیا۔ اب جو وہ کہنے لگی تھی۔

"ہم ہیلی کاپٹر سے لٹک رہے تھے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار خوف آیا یوں ہوا میں لٹکنے سے۔۔۔ پر وہ بے خوف تھا۔

تب اس نے اسی طرح ہوا میں جھولنے کے اس پل بھر کے وقت کو ضائع نہ کیا' بولا تمہیں ڈفرنٹ کرنا اچھا لگتا ہے ناں۔ اگر میں دنیا کا سب سے انوکھا کام کروں۔۔۔ تمہیں پرپوز کروں۔

میں حق دق رہ گئی۔ خود ہوا میں جھول رہی تھی مگر ساری کائنات جیسے ساکت ہو گئی۔ اخفش انعام اور مجھے پرپوز۔۔۔ نہیں میں نے غلط سنا ہو گا۔ تیز چیختی چنگھاڑتی ہوا میں سوال کرنا مشکل تھا کہ کیا کہہ رہے ہو مگر سوال کی ضرورت کہاں تھی' اس کا چہرہ آئینہ بنا ہوا تھا۔

"تمہیں پرپوز کر رہا ہوں۔" اس نے حلق پھاڑ کے کہا تھا۔ اور مجھے کوئی شبہ نہ رہا۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور یہ بھی پتا لگ گیا کہ سچ کہہ رہا ہے۔ دل سے کہہ رہا ہے۔ ہوتی ہیں بعض حقیقتیں جو قلب پر وحی کی طرح نازل ہوتی ہیں اور پھر انہیں کبھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کچھ چیزیں اللہ آپ کے دل میں اتار دیتے ہیں۔ میرے ذہن سے سارے شبہات دور ہو گئے۔ وہ زبان سے جو کہہ رہا تھا۔ وہ سچ آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ چہرے پر ثبت ہو چکا تھا۔

"مگر۔" وہ قصداً" رکی اور پھیکا سا مسکرائی۔

"ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچ کر جب سانسیں بحال کر رہی تھی۔ اسے جواب کی بے چینی تھی۔ اس نے سوال دہرایا اور میں نے۔۔۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے تاکہ وہ سچ نہ جان لے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں اور میں انگلیوں کی جھری سے اس کے چہرے پر آجانے والے غم کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ بے بسی آمیز پچھتاوا۔۔۔"

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا نوال۔۔۔؟" نوین کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"میں نے سوچا۔۔۔ یہ کیفیت وقتی بھی تو ہو سکتی ہے۔ یہ لگاؤ' دلچسپی' فکر۔۔۔ ہم دو متضاد انسان ہیں۔ اس وقتی صورت حال کے تناظر میں یوں اچانک فیصلہ نہیں سنایا جا سکتا۔ کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔۔۔ میں کہوں۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو وقت لینے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص اسے۔۔۔ اور میں نے اس سے یہ سب کہہ بھی دیا تھا۔"

"کہہ دیا تھا۔" نوین نے دہرایا "کب کہہ دیا تھا؟" نوال کو چپ لگی۔

"وہ دوبارہ اپنا پرپوزل لے کر آیا تھا۔ تب۔۔۔"

"دوبارہ کب۔۔۔؟"

"جب تھوڑا وقت گزر گیا۔ اس نے اپنی کیفیات بالکل سچ سچ بیان کر کے مجھ سے جواب مانگا تھا۔" نوال کا لہجہ مجرمانہ ہو گیا۔

"اور تم نے انکار کر دیا تھا۔" نوین نے صدمے میں گھر کے شدید بے یقینی سے کہا۔

"نہیں؟" نوال کا سر جھک گیا۔ نوین نے سکھ کی سانس بھری۔

"پھر۔۔۔؟"

"میں نے اپنے خدشات دہرا دیے اور اسے جذباتیت کا شکار ہو کر جلد بازی سے منع کرتے ہوئے وقت مانگ لیا۔"

"کس چیز کا وقت۔۔۔؟" نوین کے پاس ڈھیروں سوالات تھے۔

"یہی کہ وہ اور میں اپنی اپنی جگہ اپنے حساب سے زندگی گزاریں گے ایک نارمل زندگی جس میں دونوں کے اوپر دونوں کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہو گا اور اگر

تب بھی اسے لگے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تب دوبارہ سوال دہرائے گا تو جواب دوں گی۔"

"تو کیا اس نے اپنا سوال نہیں دہرایا؟"

"میرا دل نہیں مانتا آپی۔ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔" اس نے بالآخر اپنی بے بسی آشکار کردی۔

"او نوال...!" نوین نے اسے خود سے لپٹایا۔ "محبت سب کچھ کروالیتی ہے۔"

"میں اور وہ دو مخالف انسان ہیں۔" وہ حقیقت پسندی سے کہہ رہی تھی۔ "ہم جب جب ملیں گے، اختلاف جنم لے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا اس ایک سال کے عرصے میں تمہیں اس سے کوئی شکایت ہوئی۔ وہ تمہاری خاطر خود کو اتنا تو بدل چکا ہے۔" نوین کے پاس بہت بڑی دلیل تھی۔

"امتحان میں ناکامی کے خوف سے تو نالائق بچہ بھی جھوٹا سچا پڑھ لیتا ہے آپی!"

"نوال!" نوین کو دکھ پہنچا۔ "مخفش دھوکے باز نہیں ہے۔"

"سوری۔" نوال کو احساس ہوگیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"آپ کو لگتا ہے ہم خوش رہیں گے۔ کامیاب رہیں گے۔" اس نے سوال کر ڈالا۔ نوین کو ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ نوال جو کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔ جسے اپنی عقل پر بھروسا تھا۔ جس کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں تھی وہ نوال آج...

نوین کی سوچوں کا سرا چھوٹ گیا۔ بے خود خان ہراساں سا اندر آرہا تھا۔

"وہ گھر چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔" وہ نوین کے سر پر پہنچ گیا۔

"کون...؟" نوین کھڑی ہوگئی۔

"مخفش بائی جان۔"

"تم سے کس نے کہا؟" نوین نے نوال کو دیکھا جو خود بھی حیران تھی۔

"اس نے خود۔ اور یہ بھی کہ کسی کو پتا نہ لگے۔ لیکن ام سے رہا نہیں گیا۔" وہ مجبور لہجے میں بولا تھا۔

☆ ☆ ☆

بات اتنی بڑی تو نہیں تھی۔ بس یہ ہوا کہ لیلیٰ بیگم مینیو ڈسکس کررہی تھیں صوفیہ بیگم اور اشتیاق احمد کبھی ان کو دیکھتے کبھی خود کو کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ارادہ تو یہ کرکے آئے تھے کہ صاف صاف بات کرلی جائے۔ مگر لیلیٰ بیگم کب دے رہی تھیں بولنے کا موقع... بات سے بات نکالتیں۔ ایک سے ایک قصہ...

شومئی قسمت مخفش ادھر آنکلا۔ الٹے قدموں پلٹنا چاہتا تھا مگر دیکھ لیا گیا لیلیٰ بیگم کو بہت ضروری کام یاد آگیا۔ انہوں نے کہا۔

"تم رسید لے لو اور منگنی کے روز پہننے والا دولہا کا سامان اٹھالاؤ۔ اور ہاں اگر تم شوز خریدنے کے لیے ساتھ چلو تو۔ دراصل مجھے آئیڈیا نہیں کہ آج کل کے لڑکے کیا پسند کرتے ہیں۔"

مخفش کی آنکھوں سے درشتی ٹپکنے لگی۔ وہ آج سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر سختی سے بات کرنے والا تھا۔

لیلیٰ بیگم کا فون بج اٹھا تھا۔

"ہاں ہیلو... ہوم... بالکل... بھئی ایڈریس کا کیا مسئلہ ہے۔ اپنی صوفیہ کے گھر ہی تو کررہی ہوں منگنی... تم نے کیا اس کا گھر نہیں دیکھا؟"

اشتیاق احمد چونکے۔ سنجیدگی سے بیگم کو دیکھا۔ جو پہلے ہی دم سادھے ہوئے تھیں۔

"ہاں ماشاء اللہ..." لیلیٰ بیگم جھومیں۔ "کیا لڑکا ہے، پڑھا لکھا اکلوتا... خوش شکل اور خاندان بھی بہت خوب... بھئی میری نازک کے تو بھاگ کھل گئے۔"

وہ تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ نگاہیں مخفش پر جمی تھیں۔ جو دوراہے پر تھا۔ کھڑا رہے یا بھاگ جائے' بے چارے کی قوت فیصلہ جواب دے گئی تھی۔

"سارا خاندان اکٹھا کر لیا لیلیٰ نے تو۔۔۔" صوفیہ دادی کی آواز سے خوف اور خدشات عیاں تھے۔

"میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔ بے خود۔۔۔ بے خود۔" وہ فیصلے پر پہنچ گیا۔

لیلیٰ بیگم کے کاموں کی طویل فہرست نے بے خود کو بھی نچا ڈالا تھا۔ اس وقت بھی ایک وزنی کارٹن اوپر پہنچا رہا تھا۔ اخفش نے اس کو پکڑ لیا۔

"ان فضول کے کاموں پر لعنت بھیجو۔" لیلیٰ بیگم پر قہر برساتی نگاہیں ڈال کر بے خود کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔

"میں گھر چھوڑ کے بھاگ رہا ہوں۔ میرا سامان پیک کرو۔" یہاں سے بے خود کو مدد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتنا سارا سامان وہ کیسے پیک کر سکتا ہے۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ لڑکی یا لڑکا جو بھی بھاگے' وہ سامان کی چنتا نہیں پالتے مگر کہاں جی۔۔۔ وہ اخفش انعام تھا۔

ہر کام سلیقے' طریقے سے کرنے والا۔۔۔ اور جب نکلے بڑے بڑے سوٹ کیس' تب بے خود موقع نکال کر بھاگا۔ نوین کو بلانے۔۔۔ غیر ارادی طور پر نوال بھی ساتھ ہو گئی۔ تینوں کامن سے ہو کر ہی اوپر پہنچے تھے۔ اشتیاق احمد بھی انہونی کے احساس سے ساتھ ہو لیے۔ صوفیہ دادی البتہ وہیں ٹکی رہیں' ان کی مثال اس ناخدا کی سی تھی جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی کشتی ڈوبتے دیکھتا ہے۔ لیلیٰ بیگم ایک کے بعد ایک بندے کو منگنی کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے رہی تھیں۔ ایک مسرت بھری نگاہ ان پر بھی ڈال لیتیں اکثر تائید بھی چاہتیں۔

"کیا ہو گا کل۔۔۔ جب سارا خاندان ان کے گھر میں جمع ہو جائے گا اور اخفش صاف انکاری۔۔۔ بلکہ وہ تو کہہ کر گیا ہے کہ وہ گھر سے چلا جائے گا۔" صوفیہ دادی کا حال برا تھا۔۔۔ جبکہ اوپر۔۔۔

☆ ☆ ☆

وہ بالکل اجنبی بن کر سامان پیک کروا رہا تھا۔ خود بھی لگا ہوا تھا۔ دو جہازی سائز کے کھلے سوٹ کیس ابلتے جاتے تھے۔

اشتیاق احمد صرف ایک ناظر تھے۔ نوین آگے پیچھے پھر رہی تھی۔ بے خود کی شامت آئی ہوئی تھی۔ صوفیہ بیگم کی مدد طلب نظروں سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ ایک نوال تھی جو بالکل دروازے سے لگ کر کھڑی تھی۔ چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

سلیقے سے سجا بنا کمرہ منٹوں میں مسافر خانہ ہو گیا۔ بے خود کو لگا' وہ چھت کا پنکھا اور بلب تک اتار کر لے جائے گا۔ جیسے صفایا پر تلا تھا۔ کچھ تو چھوڑ کر جاتا۔ جسے بعد میں سینے سے لگا کر اور رو کر اسے یاد کرنے کا سماں باندھا جا سکتا۔ مگر وہ بے دردی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔

اچھا تو تمہیں لگتا ہے' لیلیٰ آنٹی تم کو اتنی آسانی سے جانے دیں گی۔" نوین بول بول کر مانو اب تھک گئی تھی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" اجنبیت کی دیوار کو جھٹکا لگا۔

"مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"کامن میں دروازے کے پاس ہی تشریف فرما ہیں۔ کان پکڑ کے اپنے قدموں میں بٹھا لیں گی۔ سامان بھی ضبط ہو گا۔" نوین نے اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ اشتیاق احمد نوین کی پہنچ پر خوش ہوئے۔

ایک بے بسی آمیز اثبات صوفیہ بیگم کی طرف سے بھی تھا۔ بے خود تفکر سے اخفش کو دیکھنے لگا۔

"تو آپ سے کس نے کہا میں دروازہ استعمال کر رہا ہوں۔ میں اس کھڑکی سے کود کر جاؤں گا۔" وہ پورا پلان بنائے بیٹھا تھا۔

"کھڑکی۔۔۔" سب یک زبان ہو کر بولے۔ وہ ایک بار پھر ناقدانہ جائزہ لے رہا تھا' کہیں کچھ چھوٹ نہ جائے۔

"سب کچھ ڈال دیا ہے بائی جان۔۔۔" بے خود تو یوں الرٹ تھا جیسے اسے محاذ پر بھیج رہا ہو۔ "کھڑکی کے باہر سیڑھی لگاؤں؟"

"ہاں!" اخفش تیار تھا۔

"لیکن بھیرد' مجھے لگتا ہے۔ میں کچھ بھول رہا

ہوں۔" وہ کھوجتی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دیوار سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑی نوال نے پیروں کا وزن تبدیل کیا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ پھر نوال ہی نے نظریں چرائیں۔ اس کے نگاہیں چرانے سے چہرے پر شکوے کی سلوٹیں پڑیں اور پھر اس پر درشتی کا رنگ چڑھ گیا۔

وہ بہت تیزی بلکہ کسی حد تک ناراضی اور جارحیت سے باقی سامان سمیٹنے لگا۔ جس کو سب مذاق سمجھ رہے ہیں وہ تو...... سنجیدہ گمبھیر صورت حال بن گئی تھی۔

"اچھا تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔" صوفیہ دادی نے یک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ کو......"

"ہاں۔ میں دنیا کا سامنا نہیں کر سکتی کہ میرا پوتا منگنی سے ایک رات پہلے گھر سے بھاگ گیا۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"وہ دادو! کون سی منگنی...... کس نے طے کی ہے منگنی؟ آپ نے؟ دادا جان نے؟ میں نے؟ نہیں ناں...... تو پھر کس بات کا ڈر؟"

"دنیا کیا کہے گی؟"

"کچھ نہیں کہے گی۔ آپ بتایئے گا کہ کیسے لیلیٰ دادو جان زبردستی کر رہی ہیں۔ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ اتنی بار تو میں انکار کر چکا ہوں۔ ہمارا جواب تو پہلے دن سے سامنے ہے۔" وہ زچ ہو گیا۔

"تو چھوڑ دو ناں تم بھی ضد کو......" صوفیہ بیگم نے پینترا بدلا۔ "برائی کیا ہے نازک میں...... شادی تو کرنی ہے ناں اور ویسے بھی......"

"بات برائی کی نہیں میں نے آپ کو بتایا ناں میں کسی اور کو......"

"تو پوری بات بتاتے ناں۔ میں کبھی نہ کہتی اخفش! لیکن وہ لڑکی...... وہ جو بھی ہے وہ تو تمہیں پسند نہیں کرتی ناں تو پھر ضد کا حاصل۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔" وہ اچھل پڑا' بے ارادہ نوال کو دیکھا (تو کیا ایک سال بعد انتظار کروانے آس دلانے کے بعد اس نے بالآخر منع کر دیا تھا۔ نوال بھی سپٹائی نہیں اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔

نوین اور اشتیاق احمد کی آنکھوں سے بھی شکوہ آمیز بے یقینی جھلکنے لگی۔

"نہیں۔ میں نے تو......" نوال نے تیزی سے صفائی دینا چاہی پھر دھیان آنے پر زبان دانتوں تلے داب لی۔ صوفیہ بیگم ہنوز لڑکی سے ناواقف تھیں۔ تو پھر منع کی خبر کیسے پہنچی۔

"پسند کرتی ہوتی تو اب تک تم سامنے لے نہ آتے۔ تمہارے دادا ہی کہہ رہے تھے۔ لڑکی نے ہاں نہیں کی۔"

"اوہ......" سب نے سکھ کا سانس بھرا۔

"میری بات سنو اخفش...... مان جاؤ ناں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہو گی میرا بیٹا معمولی چیز پسند کر نہیں سکتا۔ مگر دیکھو ناں' بری تو نازک بھی نہیں۔ فطرتاً" بہت سیدھی بچی ہے۔ ابھی نانی کے ساتھ ہے تو ان کے کہے میں ہے...... کل کو تمہارے ساتھ رہے گی تو تمہاری مرضی کے سانچے میں خود کو ڈھال لے گی۔ ویسے بھی بیٹا! بڑی پرانی بات ہے۔ شادی ہمیشہ اس سے کرو جو آپ کو چاہتا ہو نہ کہ اس سے جسے تم چاہو کیونکہ یہ سراسر خواری ہوتی ہے۔ بالفرض وہ مان بھی جائے تو یہ رشتہ برابری کا نہیں ہو گا...... پجاری اور دیوتا جیسا پھر پلا تعلق...... دیوتا کبھی پجاری کو اٹھانے کے لیے نہیں جھکتا۔"

"ایسی بات نہیں ہے دادو...... وہ ایسی نہیں ہے۔" ناچاہتے ہوئے بھی نگاہ نوال کی طرف اٹھی۔ "بس یوں ہی غلط فہمیاں ہیں۔"

"تو کیا ساری زندگی صفائیاں دیتے ہوئے گزارو گے۔ جو تم پر اعتبار نہیں کر پا رہی' وہ کبھی پیار تک نہیں پہنچے گی۔"

انہوں نے بات کر دی یہ جانے بغیر...... کہ نوال ضمیر خان تڑپ گئی تھی۔ افسوس ناک بات یہ بھی ہوتی کہ نوین اور اشتیاق احمد کی نگاہوں میں بھی جتاتا تاثر آن ٹھہرا تھا۔ یعنی وہ بھی اسے مجرم سمجھتے تھے۔ وہ اعتبار تو

کرتی تھی۔ مگر خدشات......

"تو پھر نازک ہی کیوں؟" لیلیٰ بیگم پر غصہ بھی بہت تھا۔

"کیوں نازک کیوں نہیں....؟" صوفیہ بیگم نے اپنا سوال ڈال دیا۔

"ہے ناں نوال! میں نے کوئی غلط کہا۔" صوفیہ بیگم کو پہلی بار اس کی خاموشی محسوس ہوئی۔

"نہیں تو...." وہ بہ وقت بول سکی۔

"اسے اس لڑکی کو بھول جانا چاہیے ناں؟"

"او خدا....!" اتنی دیر کی گفتگو کا سب سے مشکل سوال.... اور سب اسے دیکھ رہے تھے نوین اور اشتیاق احمد بھی اجنبی ہو گئے۔ اخفش بھی سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور نوال اتنی مشکل صورت حال.... گمان سے پرے.... صوفیہ بیگم جو "ہاں" کی متمنی تھیں اور نوال ضمیر خان کو دل رکھنے کا ہنر آتا تھا۔ اک فقط سر کو اثبات میں ہلانا ہی تو تھا۔ اگر ہاں کہنا مشکل لگ رہا تھا تو....

نوین نے.... اشتیاق احمد نے۔ اخفش نے یہاں تک خود اس کے دل نے سمجھ کی کوشش کی تھی۔

اور اخفش انعام اس کی پہلو تہی کو نظر انداز کرتا تھا۔ سویں بار وہ اصرار پر انکار کر چکی تھی۔ مگر اسے لگا کہ یہ آخری موقع ہے۔ اب کی بار جو جواب آیا وہ واقعی جواب ہوگا۔ نوال نے صوفیہ بیگم کی متوقع نگاہوں کو دیکھا۔ انہیں حمایت درکار تھی۔ اور اخفش کو۔

سب نے دیکھا اس نے انکار میں سر ہلایا تھا۔ او وہ یعنی وہ نہیں سمجھتی کہ ایسی لڑکی کو منع کیا جائے۔ مگر اگلا ہی پل قیامت خیز تھا۔ نوال کی نگاہیں صوفیہ بیگم کی طرف پلٹی تھیں۔ اور یک جنبش زباں.... سب کی سماعتوں سے "ہاں" کا لفظ ٹکرایا تھا۔ جیسے لوہے کی دیوار پر لوہے کی ضرب۔

صوفیہ بیگم کا چہرہ کھل گیا۔ نوال اتنی عقل والی ذمہ دار بچی تھی اس نے بھی تائید کی یعنی وہ درست کہہ رہی ہیں۔

سر کی جنبش نے اخفش انعام کے دل کی کلیاں کھلا دی تھیں۔

زبان کی جنبش نے دل کی بستی میں آگ لگا دی۔ راکھ میں پھول کب کھلتے ہیں۔ اور اس نے کبھی بھی نازک کے عیب نہیں گنے تھے۔ اس نے کہ یوں اور ووں۔ اس نے تو بس یہ کہا تھا اسے کوئی اور لڑکی پسند تھی اس لیے....

تو ٹھیک ہے۔ جب پسند نے پسند کر دیا تو وہ کس برتے پر انکار کرتا۔

"ٹھیک ہے نوال ضمیر خان یوں تو یوں ہی سہی۔"

اس نے بے خود کو بریف کیس کھولنے کا حکم دیا اور دروازے کے پاس کھڑی نوال کے پاس سے نکلتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

نوین کا بس نہیں چلتا تھا۔ جو نوال کو پیٹ ڈالتی۔ ایسے کرتا ہے کوئی انکار.... سال بھر آس دلائی اور اب کمرہ بند کر کے پڑی تھی۔

اخطب نے اسے لیلیٰ بیگم کے ساتھ لگا دیا تھا۔ وہ جہاں جہاں جانا چاہیں اخفش ہی لے جائے گا۔ نوین کو احتجاج کا موقع بھی نہ ملا۔ اخطب نے اس پر بھی چند ذمہ داریاں ڈال دیں۔ خود وہ اپنے ابا اماں کی شاپنگ میں مصروف تھا۔

نوین بہت سے جملے تیار کر کے سر صاحب کے حضور پہنچی۔ وہاں شام غم ٹھہر گئی تھی صبح صبح ناشتے سے بھی پہلے.... نوین انہیں ایک آخری کوشش پر مجبور کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ دونوں یعنی صوفیہ بیگم.... اور اشتیاق احمد بیڈ کے دونوں کناروں پر رخ موڑے ایک ہی اینگل سے دراز تھے۔ گال کے نیچے ہاتھ ٹکائے دیواروں کو تکتے ٹھنڈی آہیں بھرتے۔

"آپ کو اخفش پر اس طرح زبردستی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" نوین نے سارا الزام ساس پر ڈال دیا۔

"تو کیا کرتی۔ ایک دنیا اکٹھی کر لی ہے لیلیٰ نے۔ تماشا بنوا لیتی یاد رکھو نوین.... ساری زندگی کی کل پونجی

بیچ کر بھی عزت مل رہی ہو تو ہچکچانا نہیں چاہیے۔ میں نے یہی کیا۔"

"اخفش کا دل راضی نہیں ہے۔ وہ خوش نہیں رہے گا بلکہ وہ ہی کیوں نازک بھی خالی ہاتھ رہے گی۔" نوین نے دردمندی سے کہا۔

"نہیں۔۔۔" صوفیہ بیگم نے پرعزم انداز سے کہا۔ "وہ خوش رہیں گے ان شاء اللہ۔ اور زبردستی تو تب ہوتی جب اخفش جس لڑکی کو پسند کرتا میں اسے مسترد کرکے نازک کو آگے لاتی۔ یہی بات میں نے اخفش کو سمجھائی اور الحمد اللہ اسے وقت رہتے عقل آگئی۔" صوفیہ بیگم نے نوین کو لاجواب کردیا تھا۔ اشتیاق احمد کے چہرے پر بھی قائل ہونے کے تاثرات تھے۔

"تو پھر اس طرح کمرہ بند کرکے سب سے بلکہ ایک دوسرے سے منہ پھیرے نظریں چرائے کیوں بیٹھے ہیں۔" وہ اور کچھ نہ کہہ سکی تو طعنہ مار دیا۔

صوفیہ بیگم مسکرادیں۔

"تھوڑا دل تو دکھتا ہی ہے۔ کیا برائی تھی میرے بچے میں جو اس لڑکی نے "یہاں" تک لاکر بے وفائی کردی۔"

نوین حیران رہ گئی اور اشتیاق احمد پر نگاہ پڑی تو بالکل گنگ ہوگئی۔ ان کا اثبات میں ہلتا سر اس بات کی نشان دہی کرتا تھا' وہ بھی لڑکی مطلب نوال ہی سے شاکی ہوگئے ہیں۔ صوفیہ بیگم تو ناواقف تھیں۔

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔"

نوین گم صم سی کمرے سے نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

اس کے سامنے کارڈز کا ڈھیر تھا۔ یعنی ڈھیر ساری محبت۔۔۔ جو الماری کے اندر بند تھی۔ اب بیڈ پر بکھری پڑی تھی۔ ہاں ضرور وہ اس کے اس فوری اظہار پر مشکوک ہوئی تھی۔ جذباتیت۔ وقتی کیفیت والی سوچ بھی درست تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لڑکیاں اتنی جلدی مانتی اچھی نہیں لگتیں۔ لیکن لڑکیوں کو اتنی دیر بھی نہیں کرنی چاہیے کہ فیصلے کا اختیار چھن جائے اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ بس صوفیہ بیگم کے سوال پر انکار ہی کرنا تھا۔ اس کا مبہم انکار۔۔۔ اخفش انعام کے لیے اقرار کا اشارہ ہوجاتا۔ سب ٹھیک ہوجاتا۔ اس نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں ہاتھ چلایا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ مگر بس یہ دل۔۔۔ کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا کیوں محسوس ہورہا تھا کہ نقصان ہوگیا اور وہ کوئی عام سی لڑکی تو نہیں ہے جو رونے لگے۔

اسے پتا بھی نہیں لگا خود کو نہ رونے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے رونا شروع بھی ہوگئی تھی۔ کھڑکی کے کھلے پٹ سے ہوا اندر چلی آئی۔ چند کارڈز زمین پر جاگرے دروازے کی دستک پر وہ چونکی۔

"تم کہاں ہو نوال۔۔۔ صبح سے آئیں نہیں۔ آئی نیڈ یور ہیلپ ایک چوٹی۔" یہ نازک کی آواز تھی۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا نوال ضمیر خان۔۔۔ جانے انجانے ہی میں ہی قسمت کے پھیرے اپنا نقصان کرچکی ہوں (کسی اور کا بھی) تو بھلے۔۔۔ لیکن اب ظاہر نہ کرنا کہ پچھتا رہی ہو۔ دروازے پر دستک اور نازک کی آواز مسلسل تھی۔

اس نے سرعت سے آنکھیں پونچھیں' پھر نظر پڑی تو جابجا کارڈز بکھرے پڑے تھے اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور دروازہ کھولنے سے پہلے دونوں ہاتھوں سے "محبت" سمیٹی اور لاکر میں مقفل کردی۔

☼ ☼ ☼

نوال اچھا سا تیار ہوکر آئی تھی۔ خصوصاً" آنکھوں کا میک اپ۔۔۔ مبادا کسی کو شک ہو' وہ روئی تھی۔ قہقہے بھی لگارہی تھی۔ اخفش سیڑھیاں اترتا آرہا تھا۔ اس کی نظر ٹھٹک گئی۔ نوال کو چبھن کا احساس ہوا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ اٹھیں اور جھکنا بھول گئیں۔ اگر دکھ مجسم ہوتا تو بس اخفش انعام کی شکل ہوتا (اگر دھوکا صورت میں ڈھالا جائے تو وہ تم نوال ضمیر خان۔۔۔ کہاں گیا تمہارا وہ ضمیر۔۔۔ جو تمہیں چین نہیں لینے دیتا تھا؟)

وہ نظریں پھیر گیا۔ بات ختم ہوگئی۔

نوین نے نوال کو کاریڈور میں ہلو کی آڑ میں کھڑے ہو کر آنکھیں پونچھتے دیکھا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ تیزی سے اس تک جانا چاہتی تھی۔ تب ہی اخفش پر نظر پڑی۔ وہ ایک دوسرے کونے میں کھڑا تھا۔ ضبط کا کڑا مرحلہ۔۔۔ ساتھ ہی اشتیاق احمد کی خفا آواز۔۔۔ نوین نے اپنی پوری زندگی میں ان کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ درمیان میں کرسی ڈال کر بیٹھے تھے۔

"اب کیا فائدہ نوال۔۔۔!" وہ سخت دکھی تھے۔ غصہ بھی اظہار کا طریقہ تھا۔ "میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتا تھا مگر افسوس۔۔۔ عقل مند لوگ بروقت فیصلے کرتے ہیں۔"

"کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ بس ڈھول تھا جو پھٹ گیا۔" وہ سخت خفا آواز اخفش کی تھی۔ وہ ناراضی اور لاتعلقی کے اظہار کے لیے دور کھڑا تھا مگر "حاضر" تھا۔

"میں نے بتایا تو ہے نا۔ اس وقت صوفیہ دادی کے انداز پر مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ بے بسی سے کہہ رہی تھی لہجہ سچائی کا مظہر تھا۔

"اور اس نے بھی تو ایک منٹ میں سارے فیصلے کرلیے۔" اس کے لہجے میں غصہ آگیا۔

"ایک منٹ۔۔۔!" اخفش جلبلایا۔ "ایک منٹ نہیں ایک سال۔۔۔ پورا ایک سال۔"

"تو کیا فائدہ ایک سال کا۔۔۔ جب تم نے منٹ بھر میں پانی پھیر دیا۔"

"مجھے کیا وحی آرہی تھی کہ تم مصلحت کا شکار ہو۔" اس نے لڑاکا انداز اختیار کیا۔

"وحی نہیں آتی، مگر محبت کے دعوے دار چہرہ پڑھنا جانتے ہیں۔"

نوال نے طعنہ مارا۔۔۔ نوین کو اس دلیل میں وزن لگا۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ان دونوں کو اس موضوع پر اس نازک ترین موقع پر آخر گفتگو کے لیے اشتیاق احمد نے اکٹھا کیسے کرلیا یا وہ خود ہی

بھرے گئے اور نوین کی طرح وہ بھی ادھر ہی نکلے۔
مسئلہ تو یہ تھا کہ اگر کوئی اور بھی ادھر آنکلتا تب کیا ہوتا۔

وہ تمام نزاکتوں کو محسوس کرتی ان تینوں کے سر پر پہنچی۔

"اس بحث اور شکوے شکایت سے اب کچھ حاصل نہیں۔"

"نہیں۔۔۔ میں اس معاملے کو نبٹا کر رہوں گا۔" اشتیاق احمد سنجیدہ تھے۔

"کیا کریں گے آپ؟" نوین کی آنکھیں پھیلیں۔

"میں سب کو صورت حال بتادوں گا۔"

"ہم ایسا نہیں کرسکتے انکل۔۔۔!" نوین نے زور دے کر کہا۔ "کیا یہ اتنا آسان ہے ان دونوں کے بیچ جو بھی معاملہ ہے۔ وہ ہم تین افراد کے بیچ ہے۔ جب کہ نازک کا معاملہ۔۔۔ تماشا لگ جائے گا۔" نوین نے جھرجھری لی۔

"کچھ دیر جاتی ہے یہاں ایک دنیا اکٹھی ہوجائے گی۔ کس کس کو جواب دیں گے آپ؟"

"میں دیکھ لوں گا سب کو۔۔۔ میرے بچوں کی خوشی سے زیادہ اہم نہیں ہے دنیا۔" اشتیاق احمد نے تیزی سے اٹھ کر دونوں کو دائیں بائیں لے لیا۔

"دنیا ہمارے لیے اہم نہیں ہوگی مگر لیلیٰ آنٹی اور نازک ان کا سوچا آپ نے؟" نوین نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ طیش میں آگئی تھی۔

"ہم نے نہیں اکٹھی کی دنیا۔۔۔" اشتیاق احمد کو بھی غصہ آگیا۔ "یہ کوئی طریقہ ہے۔ کبھی سنا تم نے ایسا۔۔۔ یا دیکھا کہیں۔۔۔ کیسے من مانیاں کرتی پھر رہی ہے وہ۔ اصولاً" تو اسے انکار کے بعد خاموشی سے چلے جانا چاہیے تھا۔ چلو غصہ کرتی، خفا ہوتی، چار باتیں سنادیتی کہ زیادتی ہوئی، مگر یہ کوئی باقاعدہ منگنی یا رشتہ طے نہیں تھا کہ وہ اس طرح جبر کرتی۔ یہ ساری دنیا اس نے اپنی مرضی سے اکٹھی کی ہے۔ ہوتا ہے کہیں ایسے، ہمارا گھر ہے اور ہم ہی اجنبی ہیں۔ سب انتظامات ہوگئے ہمیں تو صرف یہ بتادیا کہ جی آج شام منگنی ہورہی ہے جاکے پوچھے کہ لڑکا راضی نہیں، کوئی ایسا بھی کرتا ہے پریشرائز۔۔۔ بولو۔"

اشتیاق احمد کا لہجہ تیز اور آواز بلند ہوگئی تھی۔

"شروع سے ضدی اور ہٹ دھرم عورت ہے لیلیٰ۔ جو اس نے سوچ لیا جو اس نے طے کرلیا۔ صحیح یا غلط بس اسی پر پکی ہوگئی۔ اچھی خاصی سمجھ دار لڑکی ہے نازک۔ اسے خود سے کچھ سوچنے سمجھنے دیتی ہی نہیں۔ بس جو کہہ دیا وہ حرف آخر۔ بہت ہوگیا۔ میں خود بات کرتا ہوں اس سے۔" اشتیاق احمد ابھی اور بھی بہت کچھ بولنا چاہتے تھے مگر تب ہی نگاہ کھڑکی سے باہر لان پر چلی گئی۔ لیلیٰ بیگم بہت خوش دلی، جوش سے فون کان سے لگائے باتیں کررہی تھیں۔

ساتھ ہی ان کی توجہ کا مرکز وہ ورکرز تھے جو لان کو شام کی تقریب کے حساب سے تیار کررہے تھے۔ میرون، گولڈن اور اورنج رنگ کی بہاریں۔ مسرت ان کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔

ہر ایک چیز پر ان کی نظر تھی۔ ان کا بس چلتا تو وہ ایک ایک کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دیتیں۔

"میں بہت خوش ہوں۔ آج میری چھوٹی موئی کی روح پُرسکون ہوگی، میں بھی اب سکون سے مرسکوں گی۔ شام ہونے میں ابھی کچھ وقت ہے۔ میرا تو خوشی سے برا حال ہے۔ کب یہ وقت گزرے اور میں اپنی نازک کو عروسی لباس میں دیکھ سکوں۔"

ان کی آواز اندر تک آرہی تھی۔ لہجے سے پھوٹتی محبت خوشی، سکون وہ بات کرتے کرتے ایک آرائشی گلدان کو کسی اور جگہ سیٹ کرنے لگی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے۔ جو اس نے مجھے میرے ارادوں میں کامیاب ہونے کا موقع۔۔۔" ان کی آواز دور ہونے لگی تھی۔

اشتیاق احمد پر اتنے دل گیر اور جذباتی جملوں کا الٹا اثر ہوا انہیں شدید ترین غصہ آیا۔

"میں ابھی پوچھتا ہوں لیلیٰ سے کہ صرف اپنی ہی خوشیوں کا خیال ہے۔ وہ کس طرح کرسکتی ہے ایسے۔۔۔ میں۔۔۔" مارے غصے کے ان کی سرمہ بھری

آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ منہ سے جھاگ سا نکلنے لگا۔
پل تھا کہ وہ دائیں بائیں کھڑے احفش اور نوال کو خود سے دور کرتے کاریڈر سے گزر جاتے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں ان میں ایک پیام تھا۔
"نہیں۔۔۔" دونوں نے ایک ساتھ اشتیاق احمد کے بازو دبوچے۔ وہ بروقت گرنے سے بچتے ہوئے رکے اور تحیر بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا۔
"نہیں۔۔۔ آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" یہ احفش تھا۔
"مطلب۔۔۔؟" وہ سمجھ نہیں سکے۔
"مطلب یہ کہ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔" نوال وہی کہہ رہی تھی جو احفش نے کہا تھا۔
"یہ دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" نوین کی نگاہیں لیلیٰ بیگم پر تھیں جو اسٹیج کی ارینج منٹ پر حیر مطمئن تھیں اور شازیہ وسیم کو سمجھا رہی تھیں۔
"اب وقت گزر گیا ہے۔ ہم واقعی کچھ نہیں کر سکتے۔"
"ہم کرنا چاہیں گے بھی نہیں۔۔۔" نوال نے اپنے فطری دو ٹوک لہجے میں گویا فیصلہ سنا دیا۔
"تم لوگ کیا کہہ رہے ہو' میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" اشتیاق احمد جھنجلائے۔
"مطلب یہ کہ دادا جان۔۔۔!" احفش نے نازک کو دیکھا۔ وہ سہج سہج سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کام والی پروین کے ہاتھ میں بہت سے شاپرز تھے۔ بے خود بھی پیچھے تھا۔ نازک پار لر جا رہی تھی۔
"جانے انجانے میں سہی۔ صحیح یا غلط کی بحث سے ہٹ کر' میں ایک لڑکی کو یہاں تک لا کر پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔"
اشتیاق احمد کے سر پر بم پھوٹا۔ "تم نہیں لائے یہ سب تو لیلیٰ کی۔۔۔"
"میں نے کہا نا' وجہ جو بھی رہی ہو' مگر نام تو میرا آئے گا نا اور آپ ہی نے تو کہا تھا۔ نیک نامی کی راہ میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو گرا دینا چاہیے یہ تو پھر دل ہے۔ جانے دیں۔"

اشتیاق احمد بھونچکا رہ گئے۔ نوین ایک قدم بڑھا کر احفش کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی اور نوال۔۔۔ ایک قدم پیچھے کھسک گئی۔ یعنی معاملہ نمٹا دیا گیا۔ وہ چہرہ پڑھنا چاہتے تھے مگر۔۔۔
احساس کی ربر نے سب مٹا دیا' خالی ورق پر اب نازک کا نام لکھنے کے لیے جگہ ہی جگہ تھی۔ وہ چیخ کر اس جبر سے منع کرنا چاہتے تھے' مگر آواز نہ نکلی۔
اور آواز تو تب بھی غائب ہو گئی تھی بلکہ آواز کیا پورا جسم ہی حرکت سے انکاری ہو گیا جب لیلیٰ بیگم نے شام کے پروگرام کی تفصیلات آخری بار بتانا چاہی تھیں' سب یوں ساکت تھے جیسے چوک پر نصب مجسمے۔
پلکیں تک جھپکنا بھول گئے۔ زبان کیا بولتی۔ دراصل واقعہ یوں ہوا کہ۔۔۔

✲ ✲ ✲

سارے گھر والوں کو اکٹھا کر کے لیلیٰ بیگم نے ایک مختصر سا خطاب کیا تھا۔ سب کی بددلی عیاں تھی۔ نازک تک پارلر جانے سے پہلے ٹھہر گئی تھی۔ وہ ہر جملے پر نائیدا" سرہلاتی تھی۔
لیلیٰ بیگم اپنا غصہ۔۔۔ اپنی بے بسی' ہٹ دھرمی' مجبوری' احفش کو پسند کرنا سب کہہ چکیں۔ بڑی لمبی تمہید تھی۔ سب "مروتا" سنتے رہے۔ مروت مجبوری کا دوسرا نام۔
"آپ سب نے اتنے دن ہمیں یہاں برداشت کیا۔ میری اچھی بری سب باتیں سنیں اور ماتھے پر شکن نہ لائے۔ پر میں بھی کیا کرتی۔"
لیلیٰ بیگم وہ تمام باتیں دہرانے لگیں۔ ان کا بڑھاپا' نازک کے باپ کی دوسری شادی اور نازک سے لاپروائی۔ وہ واقعتاً" شرم سار' شکر گزار دکھائی دیتی تھیں۔ سب سامعین نے جب حقیقتیں سنیں تو وہ درست لگنے لگیں۔
"سب سے بڑھ کر اخطبہ۔ جس طرح اس نے میرا ساتھ دیا' میں سب سے ناراض رہی۔ آپ لوگوں

کے گھر ہی میں رہ کر آپ سب پر دھونس جمانا کی خفگی کا حق تو رکھتی تھی نا۔ رشتے داری تھی صوفیہ سے۔ ہم اچھے دوست بھی تھے... بلکہ تھے کیوں۔ اب بھی ہیں۔"

صوفیہ بیگم نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اب صورت حال یہ ہے کہ میں بس آخری چیز یہ چاہتی ہوں کہ منگنی کی یہ تقریب بحسن و خوبی انجام پا جائے اور آپ لوگ پورے دل سے اس میں شرکت کریں۔ اور میری نازک کو دعاؤں سے نوازیں۔ مجھے اخفش بہت پسند تھا بلکہ تھا کیوں اب بھی ہے۔ چنگیز خان 'اخفش' جیسا نہیں، مگر پھر بھی وہ بہت اچھا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس نے خود نازک کو اپنانے کی خواہش ظاہر کی۔ تو..."

نازک نے پلکیں جھکائی تھیں جب کہ سب گھر والے یک زبان ہو کر بولے۔

"چنگیز خان... کون چنگیز خان؟"

چنگیز خان نازک کا ہونے والا منگیتر... اور کون...؟"

"منگ... گے... تر..." سب نے اچھل کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ نشست چھوڑ دی۔ منگیتر کے لفظی ٹکڑے کر دیے۔ ان کے رد عمل پر وہ حیران ہوئیں تو صوفیہ بیگم نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔ لیلیٰ بیگم کے تیور بگڑ گئے تھے۔

"تم لوگوں نے کیا مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔ ٹھیک ہے میں غصہ تھی، بے یقین تھی، مگر کیا اتنا بھی نہ سمجھتی کہ اس طرح کے رشتے بن بھی جائیں تو چل نہیں پاتے۔"

مارے غصے کہ ان کا چہرہ بگڑنے لگا۔ سانس پھول گئی۔ نازک ہی نے اٹھ کر پانی پیش کیا۔

"یہ تو میری نازک ہی تھی جس نے میری آنکھیں کھول دیں۔" لیلیٰ بیگم نے نازک کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"آپ مجھے ڈی گریڈ کر رہی ہیں نانو جان... ایسے آدمی کے ساتھ کیسے شادی کر لوں جو کسی اور کے خیالوں میں کھویا رہتا ہو... اور پھر جب میری نازک ہی نے اخفش کے لیے منع کر دیا تو میں کیا پاگل تھی۔"

"تو یہ ہلاکو خان... میرا مطلب ہے چنگیز خان کہاں سے مل گیا۔" صوفیہ بیگم کا سوال سب کا ترجمان بن گیا۔

"تو..." لیلیٰ بیگم نے ہاتھ لہرایا۔ "کہاں سے ملنا تھا۔ سمجھو سارے خاندان میں بانس ڈال دیے میں نے 'وہ جو ہر روز صبح صبح نکل کر جاتی تھی تو تلاش ہی میں تو جاتی تھی۔ بھئی ہم تو جانتی ہو میں جو ارادہ کر لوں کہا تھا نا اس بقر عید کے چاند پر نازک کا کر دوں گی تو دیکھو کر دیا۔ اور چنگیز خان..." منہ میں شیرنی گھل گئی۔

"یاد نہیں... سکندر ماموں کے سالے کی سالی کی سمدھن کی بہن کی نند کی جو بیٹی... شجاعت چچا کی نواسی کے گھر بیاہی ہے اسی کا تو بیٹا ہے یہ... چنگیز خان..."

"وہی جس کے گھر میں شہتوت کا درخت تھا۔ وہ جس پر فالسے لگتے تھے۔" آخر یاد آگیا صوفیہ بیگم کا دماغ الٹ گیا تھا یقیناً"۔

"ہاں... ہاں...!" لیلیٰ بیگم خوشی سے نہال ہو گئیں جب کہ باقی سب بھونچکے رہ گئے تھے۔ سارا ماجرا بھول گئے۔ سوئی اٹک گئی تو کہاں۔

شہتوت کا ایک درخت۔ جس پر فالسے لگتے تھے۔

"فالسے... نہیں... فالسے کا درخت۔ جس پر جامن... نہیں نا شہتوت۔" اشتیاق احمد واقعی گھوم گئے۔

لیلیٰ بیگم صوفیہ بیگم کے نزدیک جا کر بیٹھ گئی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے جوش و خروش سے کہہ سن رہی تھیں۔

سلو موشن سے چلتے سین کو جیسے کسی نے فارورڈ کر دیا تھا۔ منظر میں جان پڑ گئی تھی۔ نوین کو اپنی تیاری پھیکی لگنے لگی۔ تب اخطب نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ قیمتی سوٹ لے کر آئے۔

اشتیاق احمد کو اپنی گلابی شیروانی کا رنگ پھیکا پھیکا سا لگنے لگا۔ اخطب کو جا لیا۔ "یہ آتشی گلابی کیوں

نہیں۔۔۔؟"

"کیا۔۔۔ ایک طرف بیگم۔۔۔ ایک طرف باپ۔۔۔"
ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ سب کو اپنی فکر پڑ گئی۔ بوجھ سرک گیا تھا اور ان سب سے پرے۔۔۔

☆ ☆ ☆

چنگیز خان سے نازک اندام کے بیچ انگوٹھیوں کے تبادلے کے بعد فوٹو سیشن کا طویل مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ چنگیز خان۔۔۔ دیکھنے میں سومو پہلوان تھا۔
مگر یہ بھی تھا کہ جچ رہا تھا۔ سب کچھ کتنا اچھا ہو گیا تھا۔
اشتیاق احمد نے اپنے دل کو اندر تک پرسکون محسوس کیا۔ تب ہی نوال اور اخفش پر نگاہ پڑ گئی۔ دونوں سارے مجمعے سے دور ذرا ہٹ کر کھڑے تھے اور بحث جاری تھی۔ نوال کا چہرہ بے یقین تھا۔ اخفش کا قطعیت سے بھرپور اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اشتیاق احمد کو لگا۔ اس کی سنہری آنکھیں لبریز ہو گئی ہیں۔
"آخر کیوں۔۔۔؟" نوال اتنی آسانی سے رونے والی چیز تو نہیں۔
اور غم زدہ بھی۔
وہ یک دم اشتیاق احمد بن گئے۔ اخفش کے دادا نہ رہے۔ نوال کے بچپن والے دوست۔ لڑکے پر غصہ آیا۔ تھی تو غلط حرکت مگر وہ خود کو باز نہ رکھ پائے دبے قدموں سر پر پہنچے۔ نوال کا بے یقین چہرہ۔
"تم سچ کہہ رہے ہو؟"
"ہاں۔"
"مجھے یقین نہیں آرہا۔"
"تو اب اس کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ اجنبی لگتا تھا۔
"بس میرے سارے کارڈز لوٹا دو۔" وہ روکھے پن سے نگاہ ملائے بغیریات کر رہا تھا۔
"ایک بار چیز دے دی جائے تو واپس تو نہیں مانگتے۔" اس نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں لیکن میں مانگ رہا ہوں۔" وہ ہنوز اڑا ہوا تھا۔
"کیا کرو گے کسی اور لڑکی کو دو گے؟"
"وہ میری مرضی۔۔۔"
"مرضی کی بات ہے تو۔۔۔ تو جاؤ میں نہیں دیتی۔ کر لو جو کرنا ہے۔" وہ یک دم بہادر ہو گئی۔
"کیا کروں گا افسوس کے سوا۔۔۔ تمہارے لیے وہ بوجھ تھے نا ہزار بار انہیں واپس کرنے کا کہتی تھیں۔ میں نے سوچا، تمہیں اس بوجھ سے آزاد کر دوں۔" وہ معصوم بن کر دیکھنے لگا۔
"تم نے لیے نہیں تو میں نے پھینک دیے پھاڑ کے۔۔۔" اس نے رخ بدل لیا۔
"اوہ ہو۔۔۔" اخفش کو دلی صدمہ پہنچا۔
نوال نے خود کو کوسا۔ اسے رونا آنے لگا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ وہ دل کا سچ نہ کہتی نہ اس طرح سے عیاں ہوتی نہ وہ یوں حظ اٹھاتا۔
بہت بہادر تھی، مگر دکھ، صدمہ، غصہ، آنسو بن کر گال پر لڑھک آئے۔ بہت ضبط کے باوجود سسکی نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اشتیاق احمد کو آگے آنا پڑا۔ وہ سخت غصے میں تھے۔

نوال کو بھی بس ایسے ہی کسی سہارے کی تلاش تھی۔ وہ تیزی سے ان کے شانے سے آلگی۔

"اسی لیے۔۔۔ اسی لیے میں ہاں نہیں کرتی تھی۔ مجھے پتا تھا یہ مجھے یونہی زچ کرے گا۔" وہ صدمے میں تھی۔ "اسے اتنا نہیں معلوم' دے کر چیز واپس نہیں لیتے۔"

"ہاں بالکل نہیں لیتے اور میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ انفش! بھلے سے تم میرے پوتے ہو' لیکن یاد رکھو۔ اس معاملے میں میں نوال کا ساتھ دوں گا۔" اشتیاق احمد نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہاں۔!" نوال نے تائید کی۔

"تم نے کیا نوال کو ہلکا سمجھ لیا ہے۔"

"بالکل نہیں۔۔۔" وہ مسکرانے لگا۔

"تو پھر لڑکی کو رلانے کا مطلب۔۔۔؟"

"قسم سے دادا جان۔۔۔ میں رلانے نہیں آیا تھا' مگر اس کے ہی بات بے بات آنسو ٹپک رہے ہیں۔"

"اس نے کارڈز واپس مانگے۔" نوال باقاعدہ رو پڑی' مگر انداز لڑاکا تھا۔ مر جائے گی یا مار دے گی۔ اشتیاق احمد نہ ہوتے تو جھپٹ پڑتی۔

"وہ تو اس لیے کہ سب کے سب خالی ہیں۔ نام پتے کے بغیر۔۔۔ میں نے سوچا اسے لکھ کر دوں گا۔" اس نے معصومیت کی حد کر دی۔

"ہائیں۔۔۔!" تو وہ مزے لے رہا تھا۔ نوال نے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر عود کر غصہ آیا۔

"کنجوس۔! تمہیں نئے کارڈز لینے چاہیے تھے۔"

"نئے۔" وہ سوچ میں گم ہوا۔ "تو ان سب کا کیا کرو گی؟"

"میں نہیں پھٹے پر رکھ کے بیچوں گی بدتمیز۔۔۔" نوال کا صبر ختم ہو گیا۔

وہ اسے اتنی دیر سے الو بنا رہا تھا اور وہ بن رہی تھی۔ اس بات نے طیش دلایا۔ آس پاس کچھ نہیں تھا جو اس پر برساتی۔ شامیانہ کا ڈنڈا کھینچ لیتی کیا۔ اس بے بسی نے غصہ عروج پر پہنچا دیا۔

کسی لڑاکا بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس جرأت پر چراغ پا ہو جاتا' مگر وقت نے اسے اتنا بدل دیا تھا کہ اس نے جان لیا تھا۔ عورت کا اتنا سا غصہ' اتنا سا حق' اتنی سی ناراضی۔۔۔ جھیل لینے سے مرد کا رتبہ کم نہیں ہو جاتا۔

اس کے نازک نرم ہاتھوں کے یہ مکے اس کے چوڑے چکلے سینے کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے اور یہی ہوا وہ جلد ہی ہانپ گئی اس کے ہاتھ دکھ گئے تھے۔ سرخ ہو گئے تھے۔

انفش نے کھوجتی نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ ڈم ڈم کی شاخ کھینچی۔ نوال حیرت سے دیکھنے لگی۔ کیا وہ اسے چھڑی سے پیٹے گا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔

"یہ لو۔ اس سے مار لو۔ ایسے تو تمہارے ہاتھ دکھ جائیں گے۔"

اس نے مسکرا کر چھڑی اس کی طرف بڑھائی جو ششدر رہ گئی تھی۔ اشتیاق احمد ہونٹوں پر شہادت کی انگلی ٹکائے خاموش کھڑے تھے' اپنی موجودگی چھپنے لگی۔

"بھئی میں چلتا ہوں۔" ان کا لہجہ خوش گوار تھا۔

دونوں کی استفہامیہ نظروں پر ہاتھ اٹھا دیے۔

"اپنے پوتے کو پٹتا نہیں دیکھ سکتا نا! اور تم نوال! آج اس چھڑی پر گزارا کر لو۔۔۔ مستقبل کے لیے میں تمہیں پائپ چڑھا کر ڈنڈا بنوا دوں گا۔ کیونکہ نوال ضمیر خان کو زندگی بھر کا ساتھی بنانے والے کو ان سب کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔"

"کوئی نہیں۔" نوال کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ گئی۔

ہاجرہ ریحان

پرنسپل کے آفس سے تیزی سے نکلتے ہوئے میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ جہاں میں اپنی سوچ میں گم تھی وہیں وہ بھی تو بنا دیکھے ہاتھوں میں کھلی کتاب پر نظریں جمائے گھسا چلا آرہا تھا۔

"اوہو۔ یہ آج کمان سے تیر نکل کر۔ کس کی کمین گاہ کی طرف محو سفر ہونے کو ہے؟" اس نے میرے ہلکے پھلکے جسم کو ہمیشہ کی طرح طنز کا نشانہ بناتے ہوئے چہک کر پوچھا۔

"اپنی ہی کمین گاہ کی طرف اور کہاں۔ اچھا سنو۔ میرے پاس وقت کم ہے، صرف یہی بتانا ہے کے دو دن کی چھٹی لے کر جارہی ہوں۔ لہٰذا برائے مہربانی میرے بچوں کو دو دنوں میں بگاڑ نہ دینا۔" میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کام کی بات کی اور اپنی راہ لینے کا سوچا۔ معلوم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے تو مجھے جانے نہیں دے گا اسی لیے اس کے جواب کی منتظر بھی رہی۔ گو میں یہ بھی جانتی تھی کہ پرنسپل نے اسے آفس یہی سب بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میری دو دن کی غیر حاضری میں اسے ہی میری کلاس کے ایکسٹرا پیریڈ زدیے جائیں گے، مگر ہم دونوں کی دوستی کی گہرائی اور بے تکلفی کا تقاضہ یہی تھا کہ جانے سے پہلے دو چار باتیں میں بھی اس سے کرلوں۔

اس کی گھنی پلکیں، بھنوؤں سے جاملیں۔ اور میں مسکرا دی۔ وہ جب بھی حیران ہوتا اس کا چہرہ سپاٹ رہتا، مگر آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور شاید بس اسی وقت، ورنہ زیادہ تر وہ خوابیدہ آنکھیں لیے۔ کاہلی میں پڑا رہتا۔ پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا۔ پہلے دن کی اس مختصری ملاقات پر بھی مجھے اس کی ادھ کھلی آنکھیں بہت حیران کر گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کئی دنوں کا جاگا ہوا ہے، میں نے احتیاطاً اس سے زیادہ بات نہیں کی کہ شاید تھکا ہوا ہو۔ اور بعد میں بے تکلفی ہوجانے کے بعد اس نے مجھ سے پہلے دن کی بے رخی کی شکایت کرڈالی تھی۔ وجہ بتانے پر وہ ہنس پڑا۔

وہ ایسا ہی تھا۔ بظاہر اکھڑ۔ تھوڑا بے لگام اور بہت زیادہ سست۔ پہلی نظر میں اس سے کسی بھی قسم کی عقل مندی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر دو چار دن اس کے ساتھ رہ کر ملنے والے کو اچھا خاصا اندازہ ہوجاتا کہ۔ "وہ میری ہستی میں اتا ہے، میری مستی میں شعور" کی مصداق اپنی دنیا میں مگن تو ہے، مگر وقت پڑنے پر چالاک و چست بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال میرے لیے پہلی ملاقات میں ہی اس کی خوابیدہ آنکھیں اس کا تعارف بن گئی تھیں۔

اور میں اس کو ایسے ہی یاد رکھتی تھی۔ میں نے کبھی کسی کو پورا نہیں دیکھا۔ کبھی مجھ سے پوچھا جائے کہ فلاں سے اتنے سالوں کی جان پہچان ہے، تم ان کے چہرے کے نقوش بیان کرو۔ تو شاید میں ہکلاتی رہ جاؤں۔ کچھ نہ بتا پاؤں۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ میں ملنے والے کا نام تک بھول جاتی ہوں۔ ہاں ملنے والے مجھے یاد تو رہتے ہیں۔ پورے نہیں، بلکہ ان کی کوئی ادا۔ مسکراتے ہوئے آنکھوں کی بڑھتی چمک۔ چلتے ہوئے کسی طرف جھکاؤ۔ یا پھر باتوں میں مخصوص انداز میں ٹھہرنا اور پھر بات کو مکمل کرنا۔ بس ایسا ہی کچھ یاد رہ جاتا ہے۔ میرے ذہن کے پردوں میں میرے دوست، احباب، رشتہ دار، اڑوسی پڑوسی

کی کچھ ایسی ہی ادھوری تصویریں نقش ہیں۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟"

اس نے کتاب بند کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا' مجھے اسی سوال کی توقع تھی' کیونکہ یہی سوال پرنسپل بھی پوچھ چکی تھیں۔ میں جو چھٹی ہونے پر بھی اکثر بھول کر اسکول آجاتی تھی تو اب بھلا دو دن کی چھٹی لے کر کیوں جا رہی ہوں؟

"ہاں ہاں بھئی۔۔۔ کوئی شک لگ رہا ہے کیا؟ بس شوہر صاحب تشریف لا رہے ہیں اس لیے۔۔۔" میں نے خود کو حتی الامکان مطمئن دکھانے کی کوشش کی۔

"ارے واہ۔۔۔ یہ معجزہ!! مبارک ہو بھئی۔۔۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے۔۔۔ خوشی سے جواب دیا۔

پہلا طنز تو میں معاف کر چکی تھی مگر اس بات پر میں چڑ گئی۔۔۔ دو چار لمحوں کی خاموشی ہی چاہیے تھی۔۔۔ میں خود کو سنبھال کر آگے بڑھ چکی تھی۔ شاید وہ بھی میرے مزاج کی اچانک تبدیلی کو سمجھ گیا تھا۔ لہٰذا جلدی سے پرنسپل کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

گھر واپسی پر راستے بھر میں یہی سوچتی رہی تھی کہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس سے آپ بے تکلف ہوں اور جن کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارتے ہوں۔ یہ بھی یقین ہو کہ وہ نہ صرف آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں' بلکہ حد درجہ آپ کی ذات سے مخلص ہیں۔ آپ ان سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کو راہ دکھا سکتے ہیں۔ پھر بھی زندگی میں ایسا مقام آتا ہے جب ان کے لیے بھی کچھ حدود قائم کرنی پڑتی ہیں۔ ہم چاہ کر بھی ان کو بتا نہیں سکتے۔ اپنے دل کو کھول نہیں سکتے۔ بس ان کو باتوں باتوں میں سمجھا دیتے ہیں کہ ہم سے اس وقت کوئی سوال نہ کریں۔ کوئی بازپرس کام نہیں آئے گی۔۔۔ اور میں اسے اس کی حد۔۔۔ اس کی لمٹ سمجھا کر آگے بڑھ گئی تھی اور اس نے بھی بڑی پھرتی اور چستی سے سمجھ لیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو چکا تھا۔

کہتے ہیں کہ جس سے محبت ہو اسے کھلا چھوڑ دو۔۔۔ گھاس وغیرہ چر کر اگر تم سے محبت ہوئی تو واپس آجائے گا۔ مگر اتنے دنوں کے انتظار میں جو گھاس وغیرہ ہمارے بغیر وہ چر چکا ہے اس کے لیے دل کو کس طرح بہلائیں؟

بے وفائی تو ایسی مہلک بیماری ہے جو بے وفا کو نہیں' بلکہ جس کے ساتھ بے وفائی کی جاتی ہے اس کو کھا جاتی ہے۔۔۔ اور مجھے بھی تو اندر ہی اندر چاٹ گئی یہ بے وفائی۔۔۔ اب جو وہ لوٹ کر آ رہا ہے تو کس بنیاد پر۔۔۔ کون سی وضاحت۔۔۔ کیا دلیل لے کر وہ میرا سامنا کرے گا۔ ہم اکیلے ہوں گے تو ایک دوسرے سے کس طرح پیش آئیں گے۔۔۔ اور یہ ملن جو سات سال بعد ہم دونوں میاں' بیوی میں ہو رہا ہے۔۔۔ کیسا بدرنگ' بے معنی اور بے مقصد لگ رہا ہے۔ اب لوٹنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ مجھے تو اس کے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔۔۔ کچھ ہمدرد مل گئے ہیں جنہوں نے کبھی میری مرضی سے اور کبھی نافرمانی کر کے مجھے ہنسنا۔۔۔ باہر نکلنا۔۔۔ مصروف رہنا۔۔۔ اپنا خیال رکھنا سکھا ہی دیا ہے۔ وہ میری زندگی کا ایک اہم کردار تو ہے' مگر غیر حاضر۔۔۔

جیسے کوئی بچہ بچپن سے ہی یتیم ہو جائے۔۔۔ بس باپ کا نام جانتا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ جوڑتا ہے۔۔۔ مگر اصل میں وہ باپ کو بہ حیثیت انسان پہچانتا ہی نہیں۔۔۔ اسی طرح کچھ عورتیں شادی کے دن سے ہی شوہر سے محروم ہو جاتی ہیں۔۔۔ مجھ جیسی شادی کے دن سے شوہر سے محروم ہو جانے والی عورت کے لیے بھی مہربانی کر کے "یتیم" جیسا ہی کوئی لفظ ایجاد کیا جائے۔۔۔ کیونکہ ایسا لفظ ایجاد ہو گا تو ہی ہم جیسی عورتوں پر لوگ رحم کی نظریں ڈالیں گے۔ ورنہ جن کے شوہر بیرون ملک کی کمائی بھیج رہے ہوں' ان پر دنیا رشک کرتی ہے۔

"مجھے کبھی بھی بڑے بڑے بنگلے۔۔۔ گاڑی۔۔۔ بینک بیلنس کا شوق نہیں رہا۔ انسان اپنی حد میں رہے' جو نصیب میں رزق لکھا ہے ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی خوشی مل بانٹ کر کھالے۔ ایک دوسرے کو وقت دے اور بس۔۔۔ زندگی میں اور کیا چاہیے؟"

ولیمہ کے بعد کی پہلی صبح میز پر ناشتا لگاتے ہوئے' میں نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا' مگر شوہر صاحب کا اونچا قہقہہ سن کر گھبرا کر ان کی والدہ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ خالہ جان اپنی جگہ جمی بیٹھی متانت سے

مسکرا رہی تھیں۔ مگر اسی وقت ان کی آنکھوں میں جیسے کچھ زردی سی دو چار لمحوں کے لیے اتری تھی۔۔۔ اور پھر وہ بھی بیٹے کا ساتھ دیتے ہوئے بتانے لگی تھیں کہ شوہر صاحب کو تو اس ملک میں اپنا مستقبل بالکل ہی تاریک لگتا ہے۔ وہ بچپن سے فیصلہ کرکے بیٹھے تھے کہ آسٹریلیا یا برطانیہ جائیں گے اور وہیں بس جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے لیے بھی ہدایات تھیں کہ میں بھی تیاری پکڑوں کہ ان کے برطانیہ لوٹ جانے کے کچھ ہی دنوں میں شوہر صاحب مجھے بھی بلالیں گے۔

میرا دل بجھ گیا۔۔۔ مگر انکار کی گنجائش ہی کہاں تھی۔۔۔ اگر مجھے باہر نہیں جانا تھا تو باہر کے لڑکے سے شادی ہی کیوں کی تھی۔۔۔ یہ المیہ بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ بیرون ملک میں کام کرنے والے لڑکے کا رشتہ اکثر اوقات قبول کرلیا جاتا ہے۔ کیونکہ ملک سے باہر کام (چاہے وہ کوئی بھی کام ہو) کرنا بھی ایک طرح کی ہائی فائی کوالی فکیشن ہے۔ جو رشتے میں چار چاند لگادیتی ہے۔

مگر میرے معاملے میں یہ بات نہیں تھی۔۔۔ میری والدہ نے اپنی بیماری اور بڑھاپے میں جلد از جلد فیصلہ کیا تھا اور مجھے نپٹا دیا گیا۔۔۔ کیونکہ ساس صاحبہ میری والدہ کی دوستوں میں شامل تھیں اور میں ان کو خالہ جان کہا کرتی تھی۔۔۔ شوہر صاحب نے شاید میٹرک کرکے ہی کسی نہ کسی طرح ملک سے باہر نکلنے کی راہ پیدا کرلی تھی اور ڈھائی دو سال میں اپنی ماں سے ملنے آجاتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سے خالہ جان کا ہمارے ہاں آنا جانا زیادہ ہوگیا تھا۔ پہلی بار امی کو ہارٹ اٹیک ہوا تو وہ خالہ جان سے گھنٹوں یہی پوچھتی رہتیں کہ میرا کیا ہوگا۔۔۔ خالہ جان ان کو دلاسا دیتی جاتیں اور اپنی کوشش کرکے چند ایک رشتوں کو بھی گھر لے آئی تھیں۔۔۔ مگر ہماری حیثیت تو سامنے تھی۔ دو کمروں کا کوارٹر جیسا مکان۔۔۔ جس کے ایک کونے پر دکان نکال کر کرایہ پر لگا کر امی جان نے اپنی تھوڑی سی آمدنی کا انتظام کرلیا تھا۔ میں نے گریجویٹ کے بعد اسکول میں پڑھانا شروع کردیا تھا اور ہم دونوں ماں، بیٹی کی خاموش زندگی بڑے بھلے انداز میں گزر رہی تھی۔

پہلے ہارٹ اٹیک کے بعد امی نے خالہ جان کے دلاسے پر خود پر کافی قابو پالیا تھا اور خالہ جان کے لائے گئے رشتوں پر دھیان دیتی تھیں۔ مگر دوسرے ہارٹ اٹیک نے ان کو مایوس کردیا اور آخر کار امی جان مجھے خالہ جان کو سونپ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ خالہ جان نے مجھے دلاسا دیا ہمارا گھر بیچ کر میرے نام سے پیسے جمع کرواکر وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہوچکی تھیں۔ اور میں خود بھی اب اس گھر میں اکیلے رہنے سے بہت افسردہ رہنے لگی تھی۔ خالہ جان نے امی جان کے بعد میرا خیال رکھا' زندگی کی طرف لائیں' مجھے خوشی دینے کے لیے اپنے بیٹے کو اس رشتے کے لیے واپس بلایا' ان کے احسانات میں چاہوں بھی تو کبھی نہیں اتار سکتی' پھر ان کے ساتھ دوستی' محبت اور جو انسیت تھی اس کو چھوڑ جانے کے خیال سے ہی دل بیٹھا جاتا تھا۔ خالہ جان کو اکیلے تنہا چھوڑ جانے کا خوف تو۔۔۔ تھوڑا تھوڑا خالہ جان پر غصہ بھی تھا کہ وہ بیٹے کے ساتھ جانے سے یکسر منع کرچکی تھیں اور کچھ اس طرح سختی سے کہہ چکی تھیں کہ ان کو منانے کے لیے کوئی دلیل ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کو اکیلے رہنا منظور تھا۔ اپنی زمین کو چھوڑنا گوارا نہیں تھا۔

میں زیادہ حیران اس بات پر تھی کہ چلو پہلے تو ہمارا ساتھ تھا' اب شوہر صاحب اپنی بوڑھی ماں کو اکیلے اللہ تعالیٰ کے سہارے چھوڑ کر کیسے جانے پر بضد ہیں' یہ تو اپنی ماں' اپنی زمین سے بے وفائی ہے' جس نے پال پوس کر بڑا کیا۔ جس نے برے وقت میں ساتھ دیا' جس نے جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھا' اسے چھوڑ کر چل دیا جائے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا' شوہر صاحب چند دنوں میں ہی واپس سدھار گئے۔ بے چینی تھی کہ سکون نہ لینے دیتی' میں ان کا فون سنتی گھبراتی' کانپتی جاتی۔

"میرے ... انہیں آج وہ یہ نہ کہہ دیں کہ کاغذات مکمل کرلیے ہیں۔ بھیج رہا ہوں' ویزے کے لیے اپلائی کردو۔"

مگر یہی بات ان سات سالوں میں شوہر صاحب نے کبھی نہیں کہی' کہا بھی تو کیا۔؟ خالہ جان تو شدید غصہ تھیں' شوہر صاحب کو عاق تک کرنے کی دھمکی دے چکی تھیں مگر وہ بھی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کو برطانیہ کی قومیت حاصل کرنے کے لیے ایک برطانوی خاتون سے شادی کرنی ہوگی اور تین سال بعد جب ان کو شہریت مل جائے گی تو وہ برطانیہ کے شہری بن جانے پر خاتون سے آزادی حاصل کرلیں گے۔ خالہ جان کا میرا ساتھ دینے کے باوجود مجھے اپنے حواس سن محسوس ہو رہے تھے۔ اگر کسی کو ہر وقت کھو دینے کا خوف غالب رہے اور پھر اچانک کوئی اور ہی آپ سے کھو جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس لمحے' اس ہمیشہ کے متوقع خوف زدہ لمحے میں کیا کیا جائے؟

مگر پھر چند ایک دنوں میں شوہر صاحب نے پوسٹ کے ذریعے اپنی برطانوی خاتون کے ساتھ کورٹ میں شادی کی تصویریں بھجوائیں تو جیسے مجھے سکتے سے کسی نے جگا دیا۔ میں نے چند لمحے تو تصاویر کو خاموشی سے دیکھا اور پھر قریب ہی بیٹھی دکھ سے کمزور ہوتی خالہ جان کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے سوا ہم دونوں کر بھی کیا سکتے تھے۔ چند دن کی ناراضی میں شوہر صاحب کے فون نہیں سنے' ان سے رابطہ نہ کیا' حال احوال نہ لیا اور پھر... جیسے مجھے عادت ہوگئی۔ میں اپنی تنہائی پر راضی ہوگئی اور مگن سی رہنے لگی' کچھ دنوں بعد ہی میں نے اسکول میں واپس نوکری کرلی۔

خالہ جان اور میں جیسے خود بہ خود ہی ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے۔ ہمیں لفظوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بات چیت کرتے بھی تو موضوع کیا اٹھاتے۔

سات سال! ان سات سالوں میں ہی جلن اور حسد سے بھرپور شروع کے... تین سال بھی شامل ہیں' جب اکثر رات گئے مجھے خیال آتا کہ اس وقت شوہر صاحب کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں' اکیلے ہوں گے۔ میں بستر پر لیٹے لیٹے جیسے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ جسم اکڑ جاتا' سانس بے قابو ہونے لگتی' کہتے ہیں کے آزمائے ہوئے کو آزمانا بے کار ہے۔ جو ایک بار مایوس کردے وہ ہر بار مایوسی ہی دیتا ہے۔ مگر شاید ایک ہارا ہوا انسان جب امید باندھنے پر آتا ہے تو ہزار بار مایوس کردینے والے پر بھی اعتبار کرلیتا ہے۔

میں کہیں دل میں تین سال گزرنے کا انتظار کررہی تھی۔ خود کو بہلا رہی تھی کہ تین سال بعد' وہ آئے گا تو اس سے جی بھر کر بدلہ لوں گی۔ باتیں سناؤں گی' خالہ جان کو بھی اکساؤں گی۔ تین سال گزرے اور پھر چوتھا سال بھی گزر گیا' میں اس قدر شرمندہ تھی کہ کس طرح اس کو فون کرکے پوچھوں کہ تم نے تو تین سال کہے تھے یہ تو چوتھا سال بھی گزر گیا ہے۔ خالہ جان مجھے پوچھنے پر اکساتے ہوئے' شرماتی تھیں ہم اس کی طرف سے ایسی کسی بات کے کرنے کے منتظر رہتے مگر وہ حسب معمول پیسے بھیجنے اور اپنی خیریت کا بتا کر فون بند کردیتا۔

اور پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میں کیا چاہتی ہوں۔ اس نے کچھ حاصل کرنے کے لیے مجھے نامراد کیا اور اب مجھے حاصل کرنے کے لیے کسی اور کو نامراد کردے۔ مجھے یہ منظور نہیں ہوا' میں نے پہلی بار خالہ جان سے اس پر منہ در منہ بات کی اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ اپنی زندگی سے خوش ہے اور اب اگر اسے اپنی دوسری بیوی پسند ہے۔ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو میں اس کو مجبور نہیں کروں گی۔ اس نے آپ کے ساتھ' میرے ساتھ نہیں تو کسی کے ساتھ تو وفا کی۔ بس اس بات کو بھول جانا چاہیے کے وہ واپس آئے گا۔ مجھے اپنے پاس بلائے گا' خالہ جان کی حالت ایسی نہیں رہی تھی کہ وہ سوال جواب کرتیں' بلکہ وہ تو بالکل ہی خاموش ہوگئی تھیں' ایسے جیسے انہوں نے ہر

بات پر ہامی بھر لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔ میں بھی وقت پورا کرنے لگی۔ ویسے بھی اب میں عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکی تھی جہاں پر لوگوں کو معاف کردینے کا جذبہ میری پوری شخصیت پر غالب آچکا تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں میں لوگوں کی کہی ان کہی کو سمجھ لینے کا شعور مجھے صبر دلا دیا کرتا تھا۔

گھر میں داخل ہوئی تو بڑے دنوں بعد باورچی خانے میں خالہ جان کو مصروف پایا۔ انہوں نے بہت محبت سے مجھے تیار ہونے کی ہدایات دیں۔ میں دل ہی دل میں ایک بار پھر دہل گئی۔ وہ کیا بتانے ۔۔۔ کیا کہنے اور کیا کرنے سات سال کے بعد اچانک آرہا ہے؟

اس نے پھر وہی کیا۔ جہاز میں بیٹھنے کو تھا تو فون کرکے ہمیں حیران کردیا' دوسرے دن آمد کا وقت بتا کر عجلت میں فون بند کرچکا تھا۔ اس نے مجھے سوچنے 'سمجھنے' سنبھلنے کا ایک بار پھر موقع نہیں دیا تھا' میں تیار ہو کر باہر آئی تو خالہ جان نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ رات کے کھانے پر انہوں نے جبران کو بھی دعوت دے دی ہے۔ میرے تصور میں خوابیدہ آنکھیں ڈول گئیں۔ چند لمحوں کے لیے سب اچھا سا لگا' کوئی پردیسی سالوں بعد لوٹ رہا ہو تو دل میں کتنی خوش فہمیاں سی چٹک جاتی ہیں' مگر پھر میں فوراً" ہی گھبرا گئی۔

"خالہ جان آج ہی کیوں۔ ذرا ان کو ایک دو دن گھر کے ماحول میں سیٹ ہونے دیتیں پھر بلا لیتیں جبران کو۔ ویسے بھی پتا نہیں وہ۔"

میں کہتے کہتے رک گئی۔ خالہ جان میری احتیاط پسندی کی ہمیشہ سے قائل تھیں اور کبھی کبھی مجھے ٹوک بھی دیا کرتی تھیں۔

"ارے بابا۔ ایک تو تم ڈرتی بہت ہو۔ اتنی خوف زدہ رہتی ہو کہ بس۔ کچھ نہیں ہوگا پھر جبران تو ہمارے ہی گھر کا فرد ہے اب۔ ان شاء اللہ سب اچھا رہے گا۔"

دوپہر ڈھائی بجے اس کا جہاز اتر چکا ہوگا' اس نے ہمیں ائیرپورٹ آنے سے منع کردیا تھا لہٰذا ڈھائی بجے کے بعد سے اس کے انتظار میں خالہ جان ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے' چلچلاتی دھوپ سے بے پروا لان میں ٹہلنے لگی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی پھر ایک بار اپنے اعصاب کو سن محسوس کررہی تھی۔ اس کی بات بے بات پر قہقہہ لگانے کی عادت برقرار تھی۔ کچھ لوگ سب کچھ کردینے' لوگوں کو آزما لینے کے بعد بھی ہنسنا بولنا' انجوائے کرنا' قہقہہ لگانا نہیں بھولتے' خالہ جان جب اس سے مل کرجی بھر کر رولیں تو مجھے بلایا گیا۔

ڈرائنگ روم میں ہر جگہ اس کے سوٹ کیس بکھرے ہوئے تھے جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کئی دنوں کے لیے آیا ہے۔ دل میں ایک اطمینان سا ہوا' ہم بے تکلف ہی کب تھے جو اب خود کو اجنبی محسوس کرکے عجیب لگتا' میں اس سے ذرا الگ ہو کر بیٹھی تھی اور وہ کئی بار خالہ جان سے نظر بچا کر مجھے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرچکا تھا۔

"کیا تم شادی کے وقت بھی اتنی ہی پتلی تھیں یا میری جدائی نے تمہیں اس قدر اسمارٹ کردیا ہے؟"
اس نے خالہ جان کے کمرے سے جاتے ہی مجھ پر بھرپور نظر ڈال کر لگاوٹ سے پوچھا۔ اور ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آنے کو تھا کہ میں گھبرا کر صوفے پر اس کے لیے جگہ بنا کر دوسری طرف کھسک گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

دوپہر تو گزر چکی تھی۔ اس نے کھانے سے انکار کرکے بس ایک کپ چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ لینے کی خواہش کی۔ جو میں نے فوراً" پوری کردی۔ اس کے بعد سوٹ کیس کھولے گئے' وہ کافی سارا سامان خالہ جان اور میرے لیے لایا تھا' ایک ایک چیز اس نے کہاں سے خریدی' کس طرح خریدی اور کن سوچوں میں گم ہو کر خریدی' ایک ایک بات بتاتا رہا' خالہ جان اور میں اس کو مبہوت سنتے چلے جارہے تھے۔ اور تھوڑی دیر بعد مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں نیلام گھر جیسا کوئی پروگرام اپنے سامنے لائیو دیکھ رہی ہوں بلکہ آج اس پروگرام کا حصہ بن گئی ہوں۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح شام کی۔ وہ فریش ہونے
کمرے میں چلا گیا اور خالہ جان کے کئی بار کہنے پر بھی
میں اس کے پیچھے کمرے میں نہ جا سکی۔ وہ تھوڑی دیر
کے بعد ہی نہا دھو کر کپڑے بدل کر پھر ڈرائنگ روم
میں آبیٹھا اور مجھے بغور دیکھنے لگا۔ جیسے میرے ارادے
بھانپ رہا ہو۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اتنے
میں جبران بھی آگیا' اس کے آنے سے ماحول میں خوش
گوار سی تبدیلی آگئی۔ مجھے ہنسی آگئی کہ جبران خوب
چمک دمک کے ساتھ آیا تھا۔ عید کے علاوہ میں نے
کبھی اس کو اس طرح طریقے کے لباس میں نہیں دیکھا
تھا' نہا دھو کر باقاعدہ اچھے سے بال بنا کر بہترین سا پرفیوم
خود پر انڈیل کر آیا تھا' لہٰذا شوہر صاحب کو پہلی ہی نظر
میں بھا گیا تھا یا پھر وہ بھی میری حد درجہ سرد مہری سے
بچنے کے لیے جبران کی پناہ تلاش کر رہے تھے۔ اور مجھے
دل ہی دل میں جبران پر رشک ہونے لگا۔ کچھ لوگوں کی
شمولیت زندگی میں بس اسی وقت ہوتی ہے جب کسی
کی تلاش ہوتی ہے۔ یہاں آپ سہارے کے متلاشی
ہوئے' دل کی بات کہنے کے لیے کسی سماعت کی تلاش
ہوئی' یا پھر بس دکھ میں خاموشی سے پاس بیٹھنے والے کو
نظروں نے ڈھونڈنا ہی شروع کیا کہ ایسے لوگ' اپنی
پوری آب و تاب کے ساتھ آموجود ہوئے۔

مجھے فخر ہونے لگا کہ جبران میرا دوست ہے اور کیسی
اپنائیت سے اس وقت شوہر صاحب کو وقت دے رہا
ہے۔ جبران نے مجھے کئی بار سہارا دیا تھا۔ بلکہ اب تو اکثر
مجھے یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ وہ کب سے۔ میرا موڈ بحال
کر چکا ہے اور میں خوش خوش اپنے معمول پر لوٹ چکی
ہوں' اسکول میں پہلے دو چار دنوں میں اس کی شخصیت
میں مجھے کوئی جاذبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر پھر
بچوں کے ایک پکنک ٹور پر ہم دونوں کو بچوں کو بس پر
سوار کرانے اور بہ حفاظت واپس لانے کی ذمہ داری
سونپی گئی تھی۔ میں اس وقت بالکل ہی نئی تھی لہٰذا تمام
ہی ذمہ داری جیسے جبران پر آگئی تھی اور پھر میں نے
دیکھا کہ بظاہر کاہلی سے سست قدموں سے چلنے والا
جبران وقت پڑنے پر کس چابک دستی سے بچوں کو
سنبھال لیتا' ساتھ میں ان کو خوش بھی رکھ رہا تھا اور
ہمیں محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ وہ سختی سے پیش آیا
ہے۔ بچے بھی اس سے بڑے مانوس تھے اس کے
اشارے پر چلتے چلے جاتے' پھر جب بچے پکنک پوائنٹ
پر پہنچ کر دوسری ٹیچرز کے حوالے ہو گئے تو ہم دونوں
ایک درخت کے نیچے چھاؤں میں جا بیٹھے۔

اس نے چند ایک جملوں میں اپنے بارے میں بتا دیا
اور مجھ سے میرے بارے میں اگلوا لیا۔ مگر اس وقت
تک بھی بے تکلفی اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ میں
شوہر صاحب کے بارے میں حقائق کھول کر بتا دیتی۔

ہوا یوں تھا کہ شاید وہ ہمارے ہی کسی دور دراز کے
رشتہ دار کی شادی تھی جس میں اچانک جبران سے
ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کو خالہ جان سے ملوایا اور ہم
ایک ہی میز پر کافی دیر تک براجمان رہے مگر پھر یوں ہوا
کہ اس پر شوہر صاحب کی ممانی جان کی نظر پڑ گئی۔ میں
نے کھانا لیتے اور میز پر واپس جاتے دیکھ لیا تھا کہ ممانی
جان' جبران کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ جبران کے چہرے کے
تاثرات سنجیدہ تھے اور اس کے کان ممانی جان کی باتوں
پر لگے ہوئے تھے۔ وہ بہت انہماک سے ان کو سن رہا تھا
اور میں جانتی تھی کہ ممانی جان اس وقت صرف مجھے
موضوع بنائے بیٹھی ہوئی ہیں' میں نے راستے سے ہی اپنا
رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

خالہ جان بھی اپنی کسی رشتہ دار کے ساتھ باتوں میں
مشغول تھیں۔ میں قدرے کونے کی ایک خالی میز دیکھ
کر تھکی ہوئی سی وہیں جا بیٹھی' بھوک مر چکی تھی اور
دل اداس' یعنی اب باتیں اسکول تک پہنچیں گی۔ چہ
مگوئیاں' رسوائیاں اور میری بزدلی' سب گڈمڈ ہو کر
میرے دماغ کو پلپلا رہا تھا' میں ایک ہاتھ سے سر کو
پکڑے بیٹھی تھی۔ لگ رہا تھا کہ بس میں ابھی رو پڑوں
گی اور دعا مانگ رہی تھی کہ کسی طرح خالہ جان
آجائیں تو میں جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کروں۔

"مانا کہ آپ دبلی رہنا چاہتی ہیں' مگر کھانا لے کر اس
سے اتنی بے اعتنائی تو کھانا دینے والے کو بھی پسند نہیں
آتی۔" وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے پلیٹ اپنی طرف

کھسکا تے ہوئے جھکا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' وہ پھر چہکا۔

"اں ہاں۔ آپ کی ممانی جان نے کافی دماغ خالی کر دیا ہے' اس لیے جب تک میں پیٹ پوجا نہ کرلوں' آپ پلیز اسی طرح اداس دیوی بنی میرے سامنے بیٹھی رہیں۔"

میں بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی... نہ کچھ سمجھ پا رہی تھی' نہ ہی اس سے بات کر رہی تھی۔

"ایک عورت چاہے تو دوسری کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مخلص ہو جائے تو دوسری کو کامیابی کی بلندی پر پہنچا سکتی ہے اور اگر یہی عورت دشمنی پر اتر آئے تو اپنے دشمن کے پاس خودکشی کر کے مر جانے کے سوا کوئی راہ ہی نہیں چھوڑتی۔"

جبران نے کھانا کھالینے کے بعد کہا تو میں چونک گئی... وہ میرے چونکنے پر مسکرانے لگا۔

"آپ ایک باہمت خاتون ہیں اور یقیناً" خودکشی جیسا بے وقوفانہ قدم آپ ہرگز نہیں اٹھائیں گی... اور فکر نہ کریں آپ کی ممانی جان نے آپ کے شوہر کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے وہ میری حد تک رہے گا۔ دیکھنے میں آپ ایک بہت ہی مکمل زندگی گزارنے والی شخصیت لگتی ہیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ کے بارے میں ایسا کچھ بھی سنوں گا... مگر شاید... مجھے معاف کیجیے گا مجھ سے بغیر چین بھی نہیں آنا تھا... اور سنائے بغیر ممانی جان کا پیٹ بھی ہلکا نہیں ہونا تھا۔" اس نے کچھ اس شرارت سے بات مکمل کی کہ میں بے اختیار مسکرا گئی۔

کیسی عجیب بات ہے کہ راز بہت قریب کر دیتے ہیں... خود بخود جیسے بہت گہرا سا تعلق بن جاتا ہے۔ اگر سامنے والا بے اختیاری میں کسی کمزور لمحے میں فاش ہوتے آپ کے راز سنبھال لے اور ان کی حفاظت بھی کرے تو جیسے دل خود بخود اس کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔ اس پر نظر پڑنے پر ایک طمانیت سی زندگی سی دوڑ جاتی ہے دل میں۔

اور پھر چند ایک دنوں میں ہی اسٹاف روم میں ہم دونوں اکثر ساتھ بیٹھنے لگے تھے۔ خالہ جان بھی شادی میں ممانی جان کو جبران کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھیں اور جب میں نے ان کو بتایا کہ جبران نے ہر بات اپنے تک رکھی ہوئی ہے اور اسکول میں کسی کو کچھ خبر نہیں لگنے دی ہے تو انہوں نے اسے گھر بلایا' عزت دی۔ اس کے بعد سے میں زندگی میں پہلی بار اپنے بارے میں بات کرنے لگی تھی۔ کسی سے سب کچھ کہہ دینا بھی کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے... جبران نے مجھے سن کر ہمت بڑھا کر ایک اچھے دوست ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔

اس کے گھر والے بھی ہمارے گھر آنے جانے لگے تھے اور مجھے خوشی تھی کہ جبران جیسا انسان میرے احباب میں شامل تھا۔

میں اپنی سوچوں سے پلٹ آئی تھی کہ خالہ جان نے بھی جبران کی تعریف شروع کر دی تھی کہ کس طرح دو چار بار خالہ جان کے بیمار ہونے اور اسپتال میں ایڈمٹ ہونے پر جبران جن کی طرح حاضر ہوتا رہا ہے... اور اکثر رات میں خالہ جان کے ساتھ میرے اکیلے اسپتال میں ہونے پر رات بھر ایمرجنسی کے باہر بیٹھا بھی رہا ہے۔ میں اٹھ کر کچن میں آکر کھانا لگانے کی تیاری کرنے لگی کہ شوہر صاحب بھی پانی لینے کے بہانے آپہنچے۔

"اچھا تو جبران صاحب آپ کے ساتھ رات بھر بھی رہے ہیں؟" شوہر صاحب نے دو چار گھونٹ پانی پی کر مجھ سے طنز سے بھرپور لہجے میں پوچھا تو میں گڑبڑا گئی۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں... وہ تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔" میں نے منمناتے ہوئے بات شروع کی ہی تھی کہ شوہر صاحب گلاس پٹختے ہوئے چیخے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا' وہ تو... ایسا نہیں ہے' یعنی تم مجھ پر ڈائریکٹ طنز کرنے لگیں کہ وہ تو ایسا نہیں ہے یعنی میں ایسا ہوں' کیوں... میں نے تمہارے لیے کیا کیا نہ کیا' اتنے سال قید کاٹی اور تم کہہ رہی ہو کہ میں ایسا ہوں؟"

میں نہ صرف دنگ رہ گئی بلکہ ڈر کر ایک طرف دبک

گئی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی سی کوشش کی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے آپ کا تو نام تک نہیں لیا میں تو جبران کے بارے میں بتا رہی ہوں۔"

شوہر صاحب دانت پیستے گویا ہوئے۔ "ہاں ہاں اور کیا تم تو بہت معصوم ہو ناں۔ کیوں تم نے کہا نہیں کہ وہ تو ایسا نہیں اس کا مطلب وہ تو نہیں مگر میں ایسا ہی ہوں۔ ہے یہ مطلب کہ نہیں؟ تمہیں مجھ سے شکایت ہی ہے تو اکیلے میں کرتیں' یہ میرے سر پر اپنے یار کو بٹھا کر کیا احسان جتا رہی ہو۔۔۔؟"

بس حد ہو چکی تھی میں مدد کے لیے پکارنے ہی والی تھی کہ خالہ جان۔۔۔ جانے کب خود ہی آ چکی تھیں اور اب شوہر صاحب کو سخت نظروں سے گھور رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں چھپ جاؤں' دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ہو جو مجھے اپنے پیچھے چھپا لے اور میں شوہر صاحب کی نفرت بھری نظروں سے بچ سکوں۔ شوہر صاحب نے خالہ جان سے کہا۔

"دیکھا آپ نے اپنی لاڈلی کو' مجھ پر کیسے الزام لگا رہی ہے۔ اپنے شوہر پر۔۔۔؟"

میں دیکھ رہی تھی کہ جب سے شوہر صاحب آئے تھے خالہ جان کچھ کاغذات کا بنڈل بنا کر مسلسل اپنے ہاتھوں میں رکھے ہوئے تھیں اور اب وہی کاغذات کھول کر وہ شوہر صاحب کو پکڑا چکی تھیں۔

"میں چاہ تو یہی رہی تھی کہ تم کو ایک اور موقعہ دے دوں۔ تم لوٹے ہو تو اپنی بیوی کو منانے میں کامیاب ہو جاؤ۔ مگر نہیں تم جیسے بدتمیز اور بددماغ انسان کو تمہارے بقول 'میری لاڈلی' جیسی لڑکیاں زیب نہیں دیتیں' تم ان کاغذات پر سائن کرو' اپنا سامان اٹھاؤ اور جبران نے تمہارے لیے جو ہوٹل میں کمرہ بک کروایا ہے' وہاں دفع ہو جاؤ' اس کے بعد تمہاری مرضی ہے کہ تم آج ہی واپس اپنے ملک چلے جاؤ' بہرحال دوبارہ یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

خالہ جان نے پھر اپنے ازلی دوٹوک انداز میں بات ہی ختم کر ڈالی تھی۔ شوہر صاحب کاغذات پڑھ کر بلبلا اٹھے۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟ میں نے اس وقت اسے نہیں چھوڑا تو اب کیوں چھوڑوں گا میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔"

خالہ جان نے غصے سے تقریباً "چیختے ہوئے جواب دیا۔ "ارے تو کیا اسے چھوڑنا' اس نے تجھے نہیں چھوڑا' مگر اب یہ خلع لے رہی ہے۔ بس۔۔۔ چلو' جلدی کرو۔ گواہوں میں جبران اور اس کے گھر والے شامل ہوں گے جو آتے ہی ہوں گے۔" جبران چپکے سے کچن میں داخل ہو کر تمام کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے قلم نکال کر شوہر صاحب کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ شوہر صاحب نے غصے سے دستخط کرنے شروع کر دیے۔ میں ایک لمحے کے لیے جیسے جاگی' میں نے اپنی ہی جگہ پر کھڑے کھڑے خالہ جان سے التجا کی۔

"خالہ جان! پلیز ان کو روکیں' پلیز خالہ جان۔" شوہر صاحب کے ہاتھ بدستور چل رہے تھے۔ وہ کھٹا کھٹ دستخط کرتے چلے جا رہے تھے۔ خالہ جان نے ایک لمحے کو ان کو دیکھا پھر جبران پر نظر ڈالی اور جواب دیا۔

"بے وقوف لڑکی! کیا ابھی تک تم نہیں سمجھیں' اس کا اصل مقصد تمہیں چھوڑنا ہی ہے۔ یہ آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر تم کو فارغ کر دے گا۔ بس ابھی تو تمہاری عمر گزرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس لیے تم جو بھی کہو میں تم کو اپنی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی۔"

اتنے میں جبران کے والد' والدہ اور چھوٹا بھائی بھی آ پہنچے اور چھوٹے سے باورچی خانے میں بھرے ہوئے لوگوں کے درمیان مجھے چھپنے کے لیے کوئی کونا' کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ خالہ جان نے میرا احساس کرکے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔ وہ رقت آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

"کوئی بات نہیں میری بچی' آج کے بعد تمہیں اس طرح چھپنے اور شرمندہ ہونے کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جبران اس اجنبی غیر ملکی کو ہوٹل پہنچا کر جلدی سے آ جانا بیٹا! ہم سب کھانے پر تمہارا انتظار کریں گے۔"

☼

نایاب جیلانی

بیعہ' عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا' عنایہ نزع کے الم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیعہ سے کہا کہ تمہاری خاموشی اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر بستا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیعہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے "فاتح" سے عشق تھا' بیعہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے گئی۔

دیا کا کمرہ خاص تہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیعہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیعہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں' ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں۔ ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔"

بیعہ نے کچھ نزدیکی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاتح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاتح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیعہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیعہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔ افسون مشہدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ

ناولٹ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تب ہی ایئرپورٹ پر افسون پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع افراہیم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔

مرید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور "دوست" کو بھی لے آنا۔ حدید کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیہہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بددماغ اور غصیل بھی ہے۔ اناویہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روبا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ اناویہ نے اس کو ناراضی سے منع کردیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روبا ہے۔

روبا جب اناویہ کے گھر گئی تو اس نے اناویہ کے تایا زاد افراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روبا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

دوسری قسط

یہ ظہران کے سب سے بڑے کاروباری مرکز "برج افسون" کا ایک منظر تھا۔ ظہران کی سب سے معروف ترین شاہراہ پر واقع یہ عمارت کئی طرح کے سیاحوں اور راہ گیروں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ یہ عمارت جو ساہوکاروں کے بازار میں "برج افسون" کے نام سے اپنی منفرد حیثیت رکھتی تھی۔ شیخ فوزان مشہدی کے وسیع و عریض کاروبار کا سنگ میل تھی۔ فوزان مشہدی کا شمار دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ دنیا کے کئی ممالک کے بڑے شہروں میں اس کی کمپنیوں کے صدر دفاتر تھے اور کئی معاشی لحاظ سے مضبوط ملکوں کے سمندروں میں اس کے بحری جہاز چلتے تھے۔

ظہران میں موجود فوزان مشہدی کی یہ کمپنی اس کی ذاتی حیثیت میں "پہلوٹھی کی اولاد" جتنی محبت توجہ اور چاہت کی حق دار معلوم ہوتی تھی۔ پہلوٹھی کی اولاد یعنی افسون مشہدی کی طرح ہی عزیز اور جان سے پیاری تھی۔

اس کمپنی میں سیکڑوں لوگ کام کررہے تھے۔ فوزان مشہدی اس کمپنی کے ایک ایک ایمپلائی سے بذات خود واقف تھا اور انہیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

ایون کے نسبتاً" غیر معروف اور سستے آئل پلانٹ پہ کام کرنے والا اس کا ایک ورکر جو پچھلے ایک سال چھ ماہ اور دو ہفتوں سے کام کررہا تھا۔ تین دن سے لاپتا تھا اور اس کی کوئی ایپلیکیشن ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کو موصول نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ اس طویل مدت میں اس نے بغیر بتائے چھٹی کی تھی۔

ظہران میں وہ پہلا ورکر تھا جو ایک تگڑی سفارش سے آیا تھا اور وہ پہلا غیر ملکی ورکر تھا جو اس کمپنی سے منسلک تھا۔ ورنہ یہاں سارے مقامی لوگ کام کرتے تھے۔

فوزان مشہدی اس وقت پاور سیٹ پہ موجود تھے۔ انہوں نے اپنا مقامی لباس یعنی جلباب زیب تن کررکھا تھا۔ سر پر رومال نہیں بندھا تھا۔ ان کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا جو کنپٹیوں سے کہیں کہیں سفید بھی نظر آتے تھے۔ فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ وہ ایک کسرتی جسم والے خوب صورت شخص تھے اور اپنی عمر سے بہت کم لگتے تھے۔ ان کے قریب ان کا پرسنل اسسٹنٹ لاشاری کھڑا تھا اور وہ انہیں اگلے ستره گھنٹوں کا شیڈول دے رہا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے لاشاری سے افسون کے بارے میں دریافت کیا۔

"مادام! آج دفتر نہیں آئیں۔" لاشاری نے ادب سے جواب دیا۔ اس کے جواب نے انہیں لیپ ٹاپ پہ کام کرتے کرتے چونکا دیا تھا۔

"لیکن وہ گھر میں بھی نہیں ہے۔" فوزان مشہدی متفکر نظر آئے۔ وہ کبھی بھی چھٹی نہیں کرتی تھی۔

"وہ اس وقت ایئرپورٹ پہ موجود ہیں۔ اپنی کسی

"امریکی پائلٹ سیلی سے ملاقات کے لیے گئی ہیں۔"

انہوں نے لیپ ٹاپ آف کر دیا۔ اور اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ اب وہ راؤنڈ کے لیے جا رہے تھے۔ ہر ڈپارٹمنٹ کا وزٹ ان کے معمول کا ایک حصہ تھا۔

لاشاری ان سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ وہ سب سے پہلے فنانس ڈپارٹمنٹ کی طرف گئے تھے۔ ان کے ورکرز انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے تھے۔

"اھلا" و "سھلا" "مرحبا۔" ایک گونج سی فنانس ڈپارٹمنٹ میں اٹھی تھی۔

اب وہ بلڈنگ کی طویل سرنگ نما ٹھنڈی راہداریوں میں سے گزر رہے تھے جب اچانک ایک خالی کیبن کے سامنے رک گئے۔ وہاں ایک چھوٹی ٹیبل رکھی تھی جس کے اوپر سسٹم موجود تھے، لیکن کرسی خالی۔

"یہاں پہ کون غیر حاضر ہے؟" انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے لاشاری کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور تھوک نگل کے بتایا۔

"وی آئل ٹینکرز کا انچارج۔" لاشاری کی آواز مدہم تھی۔ وہ خالی کیبن کو چند پل کے لیے دیکھتے رہے یہ اسی کم گو اور لاپروا ورکر کا کیبن تھا جو کبھی کام ٹھیک نہیں کرتا تھا اور پھر بھی وہ اسے اپنی کمپنی میں رکھنے پر مجبور تھے۔

"لاشاری! یہ لڑکا.....؟" فوزان مشہدی شاید اس لڑکے کا نام سوچنے لگ گئے تھے۔

"افراہیم۔" لاشاری نے ان کی مشکل آسان کی تھی۔

"ہاں۔ افراہیم۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکے تھے۔

"اپنے کوائف اور تعلیمی قابلیت کی وجہ سے کہیں بھی اس پلانٹ کا انچارج بننے اور اس کی دیکھ بھال کا اہل نہیں تھا اس کے باوجود ہم نے اسے جاب دی۔ اب یہ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ؟"

"جی سر! یہ ایک "نااہل" لڑکا ہے۔ اس کے باوجود جانے کس خوبی کی بنا پر اسے اپائنٹ کیا گیا؟" لاشاری اس سے زیادہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ فوزان مشہدی چپ رہ گئے۔ شاید انہیں افسون کی ضد کا خیال آ گیا تھا۔ اسے اپائنٹ کرنے کا کامل فیصلہ افسون کا تھا۔

"اینی وے، وہ کیوں نہیں آ رہا؟ مجھے اس کے متعلق رات سے پہلے پوری رپورٹ چاہیے۔" ان کے حکم پہ لاشاری نے سر جھکا دیا تھا۔

"اگر وہ پریشان ہے تو اس کی پریشانی کو دور کیا جائے۔ اگر بیمار ہے تو اسے مزید چھٹی دے کر اس کا علاج کرایا جائے۔" فوزان مشہدی نے اپنے مخصوص، دھیمے، مگر دو ٹوک لہجے میں ہدایات دی تھیں۔

لاشاری نے ان کے خوب صورت، بردبار چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس شخص پہ دولت ایسے ہی فریفتہ نہیں تھی۔ اس شخص کی نیک نیتی اور رحم دلی نے اسے "مالا مال" کر رکھا تھا۔

لاشاری کو اس پل ایک سنہرا قول یاد آیا۔ "قومیں وہی ترقی کرتی ہیں جن کے سربراہ صاف نیت اور رحم دل ہوں۔"

"اگر وہ نااہل لڑکا تین سالہ کانٹریکٹ کو بیچ میں ادھورا چھوڑ کر ملک سے فرار ہونے کی کوشش کرے اور اس وقت ظہران کے ہوائی اڈے پہ تیس منٹ بعد ٹیک آف کرنے والے جہاز کا منتظر ہو تو جناب

عالی! اس صورت حال میں ـــــــ کیا کرنا چاہیے ۔۔۔۔۔۔؟" لاشاری اپنے موبائل اسکرین پہ نئی آنے والی ای میل کو تیز تیز پڑھتا حواس باختہ ہو رہا تھا۔ وہ ماربل کے فرش پہ قدم جما جما کر چلتے ہوئے لحظہ بھر کے لیے رکے تھے۔

"تو اس صورتِ حال میں آپ ائیرپورٹ کے عملے کو الرٹ کرو۔ اس کا پاسپورٹ ضبط کرو۔ اس کے "خروج" کو کینسل کرو۔ ظہران کے جیل خانے کو مہمان نوازی کا موقع دو۔"

وہ حکم دے کر آگے بڑھ گئے تھے۔ لاشاری نے سر ہلایا اور فوراً" حکم کی تعمیل کردی گئی۔

"برج افسون۔" سے پچاس منٹ کی ڈرائیو پہ موجود ظہران کے ہوائی اڈے کے ریگستانی پس منظر رکھنے والی عمارت کی موروں سے مشابہ محرابوں کو دیکھتی افسون مشہدی دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھی۔ اسے اپنی ایرانی گلوکارہ ماں کا پسندیدہ ایک خوب صورت نغمہ یاد آرہا تھا۔

"مجھے خبر ملی ہے کہ آج میرا محبوب آئے گا۔ میرا سر اس رستے پہ قربان، جس راستے سے وہ سوار ہو کر آئے گا۔"

کچھ دیر بعد وہ اپنی سفید پر آسائش لیموزین میں بیٹھ کر "افسون حرم" کی طرف جارہی تھی جو اس کا عالیشان محل سرا تھا۔ اسے ایک لمبی نیند کا مزہ لوٹنا تھا کیوں کہ وہ ایک خوار ہونے والا دن، رات کی گود میں ڈال آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈین ہیگ کا عالیشان اسٹیشن دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پورٹرز کے ذریعے سامان سمیٹ کر پلیٹ فارم سے باہر نکلے تو دور نزدیک کہیں بھی مدید کا نشان تک نہیں تھا۔ اس صورت حال نے حریر کو حواس باختہ کیا تھا۔

"دنیا کا سب سے بد اخلاق انسان مدید قاضی ہے۔" یہ حریر تھا۔ غصے میں کھولتا ہوا۔ اس وقت حریر پر میلے میں کھوئے اس بچے کا گمان ہو رہا تھا جس کی ماں اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ بچوں کی طرح اس کا بازو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

پھر اس نے مدید کے نمبر پہ یکے بعد دیگرے بہت دفعہ کالز کیں۔ میسجز چھوڑے، مگر جواب ندارد۔۔۔ جانے مدید کہاں تھا؟

"کسی مشکل میں نہ پھنس گیا ہو۔" کچھ دیر صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے حریر کو تسلی دی تھی اور اپنے دائمی اعتماد کے ساتھ چند ایک ضروری جگہوں پہ کال کرنے لگا۔ وہ ایک کمرشل پائلٹ تھا اور پوری دنیا کے ہر شہر کا نقشہ اس کے بریف کیس میں رہتا تھا۔ اس نے ائیرپورٹ اتھارٹی کو کال کی تو ایک گاڑی آدھے گھنٹے کے بعد انہیں وی۔ وی۔ وی کے دفتر چھوڑ گئی تھی۔

"V V V" ایک سرکاری ادارہ ہے۔ جس کے دفاتر ہالینڈ کے ہر شہر، قصبے اور دیہات میں موجود ہیں۔ اس ادارے کا مقصد سیاحوں کو معلومات اور رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ اس خدمت کے عوض یہ سیاحوں سے کچھ وصول نہیں کرتے۔

وی۔ وی۔ وی کے دفتر میں ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کاؤنٹر پہ موجود تھی اور اس کے سامنے سیاحوں کا ہجوم تھا جو ایک قطار میں کھڑے تھے اور معلومات لینا چاہتے تھے۔

"ہماری باری پوری رات نہیں آئے گی۔ اتنا ہجوم ہے۔" حریر سخت کبیدہ خاطر لگ رہا تھا۔ اس نے حریر کو تسلی دی اور اپنا کارڈ آگے بھجوایا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لڑکی کاؤنٹر سے ہٹ کر ان کے قریب آگئی۔ پھر اس نے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ مختلف ہوٹلز کے بارے میں معلومات دیں۔ ساتھ ٹیلی فون نمبر بھی لکھ دیے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک آرام دہ ہوٹل میں پہنچ چکے تھے۔

حریر نے غسل کیا، کھانا کھایا اور اس کے بستر پر دراز ہو گیا۔

"مجھے تو اپنے آبائی شہر اور موجودہ شہر کے علاوہ اور کہیں نیند نہیں آتی۔ وہ بھی اکیلے میں۔ میں تو یہیں

سوں کا تمہارے ساتھ۔"

وہ بس خشمگیں نگاہوں سے حریر کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے اپنا تکیہ اٹھایا اور صوفے کی طرف چلا گیا۔
جیسے ہی اس نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی۔ حریر کی آواز سماعت پہ ہتھوڑے برسانے لگی۔
"وہ تمہارا دوست 'انتہائی کمینہ... یہ ہے اس کی مہمان نوازی۔" وہ اپنا غصہ اتارنے لگا۔
"وہ تمہارا بھی دوست ہے۔" وہ چبا چبا کر بولا تھا۔
"وہ تمہارا ہوتا سو تا ہمیں لینے نہیں آیا۔ لگتا ہے اس نے انوی ٹیشن دے کر ارادہ بدل لیا ہے۔" حریر جھنجلا کر رہ گیا تھا۔ لسے تشویش ہو رہی تھی۔ مدید ایسا غیر ذمہ دار تو ہرگز نہیں تھا وہ انہیں لینے کیوں نہیں پہنچ سکا۔ کوئی مسئلہ نہ درپیش ہو۔ پھر اچانک حریر کو ایک خیال آیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ پھر اس نے تکیہ دبوچا اور اسے زور سے دے مارا۔ جواباً "اس کا دل تو چاہا تھا کہ جوتا اتار کر اس کی دھنائی کر ڈالے۔
"سنو' پیارے! ایک بات تو بتاؤ۔ مدید تمہارا کتنا اچھا دوست ہے؟"
وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔
"بہت اچھا دوست ہے۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔" اس کے غیض بھرے لہجے اور الفاظ پہ حریر نے قطعاً" برا نہیں مانا تھا بلکہ پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگ گیا تھا۔
"ہاہا۔ تب ہی تو۔" حریر نے ہنسنے کے دوران بات ادھوری رہ گئی تھی۔
"مدید تمہارا کیسا دوست ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی اور آگیا اور تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔" وہ ہنسی روک کر بولا۔
"مطلب؟" اس نے ایک ابرو اچکا کر پوچھا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ ہی نہ سکا۔
"مطلب یہ کہ ہم لوگ مدید کی منگنی میں شرکت کرنے آئے ہیں۔"
"کیا...؟" وہ چیخ ہی پڑا تھا۔ مدید نے اس سے اتنا کچھ چھپالیا؟ بتایا ہی نہیں؟ کیا وہ اس کی خوشیوں پہ خوش نہ ہوتا؟ کیا وہ مدید کی خوشیوں سے جلنے والا تھا؟ اس کے اندر کوئی چیز بہت شدت کے ساتھ ٹوٹی تھی۔
حریر نے اچھا کیا تھا۔ بہت اچھا کیا تھا۔ اسے پہلے ہی بتا دیا۔ اب وہ یہاں رکنے والا نہیں تھا۔ اسے کل پہلی ٹرین سے واپس جانا تھا۔ اسے مدید کی منگنی میں شرکت نہیں کرنی تھی۔ اس کے دل کے اندر ایک "وہم" ایک خوف آسن مار کر بیٹھ گیا تھا۔ اگر اس نے مدید کی منگنی میں شرکت کی تو اس کے لیے اچھا نہ ہوگا۔ کیوں کہ مدید کی منگنی میں شرکت کا مطلب تھا اپنے اس خاندان کا سامنا کرنا' جن کے سامنے اس کی زندگی کا غمناک پہلو عیاں تھا۔

☼ ☼ ☼

طہران کی یہ صبح بہت چمکیلی تھی۔
اس نے دبیز مخملی پردوں کو ہٹا کر باہر بکھری خوب صورت صبح کا نظارہ کیا تھا۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی جاگنگ ٹریک پہ بھاگ رہے تھے۔ نکلتے قد اور کسرتی جسم' گلابی رخسار سرخ ہو رہے تھے۔ وہ ان دنوں چھٹیوں پہ طہران آئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں لندن اسکول آف بزنس میں زیر تعلیم تھے اور بہت کم طہران آتے تھے۔ زیادہ تر فوزان بابا اور آبگینے ہی ان سے مل آتے تھے۔ افسون حرم میں ان کا قیام بہت مختصر ہوتا تھا۔ بابا اور آبگینے زیادہ تر غیر ملکی دوروں پہ رہتے تھے۔ آبگینے کا دل اپنے بیٹوں میں لگتا تھا۔ وہ زیادہ تر حمیر اور عمیر کے ساتھ رہتی تھی۔
اور اپنوں کے لیے چاہت و قربانی کا جذبہ رکھنا کچھ لوگوں کے لیے زندہ رہنے سے بھی بڑھ کے ہوتا ہے۔ سو' انہیں ان کی ڈگر پر چلنے کے لیے روکنا نہیں چاہیے۔
اور اس خاندان کا "قافلہ سالار" یعنی سربراہ اس حقیقت کو گزر جانے والے برسوں میں جان گیا تھا۔
وہ صندل کی لکڑی کے قدمچوں پر قدم رکھتی نیچے آئی تو آبگینے نے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ سے اس کا

استقبال کیا۔ آبگینے کے صبیح چہرے پر نرمی تھی۔ بلاشبہ وہ ام القوین کے صحرائی علاقوں کا مکمل حسن رکھتی تھی اور بابا فوزان کے لیے ان کی ماں افسہ کی بے وفائی کے بعد ملنے والا عطیہ خداوندی۔

وہ گہرا سانس بھرتی ڈائننگ ٹیبل کی چکنی شفاف سطح پہ کہنیاں ٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ آبگینے نے اس کے سامنے ناریل اور انناس کا رس شیشے کے قیمتی صراحی نما فلجان میں رکھا تھا۔ اس نے نزاکت سے بلوری فنجان اٹھایا اور گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔ حمیر، عمیو اس کے دائیں بائیں بیٹھنے سے پہلے اس کے قریب پشت کی سمت کھڑے ہوئے تھے پھر انہوں نے پیچھے سے ہی اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کیے اور باری باری دونوں نے افسون کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا۔ محبت کے اس اظہار پہ افسون کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ جواباً اس نے بھی محبت بھرا جواب لوٹایا تھا۔ فوزان بابا نے کاروباری خبروں سے بھرے "عرب ٹائمز" سے نگاہ ہٹا کر اس بھرپور منظر کو حسرت سے دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے تھے۔

"میرا خاندان کاملیت کے دائمی احساس سے خالی ہے۔" وہ اس کی خالی نشست کو دیکھ کر گہری افسردگی کو اپنے دل میں اترتا محسوس کر رہے تھے۔ افسون ان کے احساسات کو سمجھ رہی تھی لیکن وہ اس "بے وفا" کا ذکر خیر چھیڑنے سے خود کو معذور سمجھتی تھی۔

"وہ اس قابل نہیں کہ اسے یاد کیا جائے۔" افسون نے قطعی طور پہ ناگواری سے جتایا تھا۔

"ایک چھوٹی سی ضد کے لیے اپنے خاندان سے خفا ہونا کوئی عقل مندی تو نہیں۔" اس نے حمیر کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے تلی ہوئی خمیری روٹی کا ایک ٹکڑا شہد میں ڈبو کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اس نے منہ کھول کر خمیری روٹی کے ذائقے کو محسوس کیا۔ بلاشبہ حمیر کی ماں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ تب ہی تو فوزان بابا کو آبگینے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا اور ٹھیک ہی نظر نہیں آتا تھا۔ آبگینے تھی ہی بہت اچھی۔ فوزان بابا کی زندگی کو آبگینے کے وجود نے مکمل کر دیا تھا۔

بلاشبہ آبگینے بہت اچھی قلب ساز تھی۔ اسے دلوں کو جوڑنے کا ہنر آتا تھا۔

"افسون! مجھے امید ہے، تم اسے بلاؤ گی تو ضرور آجائے گا۔ وہ تمہارے "بلاوے" کا منتظر ہے۔" آبگینے نے نرمی سے اس کے قلب کو نرم کرنا چاہا۔

"بھول ہے تمہاری آبگینے! وہ نہیں آئے گا۔ خواہ مخواہ کی ضد باندھ رکھی ہے اس نے۔" افسون نے بے زاری سے کہا تھا۔ فوزان بابا نے ایک نظر بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا پھر بات تبدیل کرتے ہوئے بولے۔

"آج کی مصروفیت کیا ہوگی؟"

"آج کی شام ہمارے نام ہوگی۔ کوئی مصروفیت نہیں۔ کوئی کام نہیں۔" حمیر، عمیو نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ جب سے آئے تھے، افسون انہیں وقت نہیں دے سکی تھی۔

"شام تمہارے نام اور سویرا میرے اپنے نام۔ ڈن ہوا شہزادو!" اس نے مسکراتے ہوئے اپنا پروگرام بتایا تھا۔

اب بھی وہ بیس بال کھیلنے جا رہے تھے۔ ظہران میں ان کی واحد مصروفیت اور پیچھے سے آبگینے کی لمبی لمبی ہدایات۔ وہ خارجی دروازے تک ان کے پیچھے گئی تھی۔

"سنتے ہو، دھیان سے، ڈرائیور گاڑی تیز نہیں چلائے گا اور حمیر تم ہار گئے تو بھائی کو نہیں مارو گے۔ کیوں کہ تم کھیل میں اچھے نہیں ہو۔ ہارنے کے بعد ہار کو تسلیم کرنا سیکھو۔ نہ کہ جیتنے والے پہ چڑھائی کرو۔" وہ ماں تھی اور متفکر تھی۔ اپنی بے دھیانی میں وہ اپنے بچوں کو زندگی کا خوب صورت سبق دے رہی تھی۔

افسون اس کی "فکر" پہ مسکرا دی تھی۔ اسے آبگینے اپنی خوبیوں کی بنا پہ بہت اچھی لگتی تھی۔

"اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ بس چلے تو بیس بال کورٹ میں بھی ساتھ چلی جائے۔" فوزان بابا آبگینے کی بے قراریوں پہ تبصرہ فرما رہے تھے۔

در پردہ انہیں بھی آبگینے کی فکر بہت پریشان کرتی تھی۔ وہ جس طرح اپنے بچوں کے پیچھے ہلکان ہوتی تھی' اسی طرح شوہر اور شوہر کی اولاد کے پیچھے بھی۔ جن میں افسون اور اس کا بھائی شامل تھا۔ وہ ناراض ناراض لڑکا جسے آبگینے کا وجود اتنا پسند نہیں تھا اور اس نے آبگینے کے خلاف دل میں بہت سا عناد پال رکھا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کبھی کم اور کبھی بڑھتا رہا۔

"وہ کبھی یاد نہیں آتا' اس لیے کہ وہ مجھے کبھی بھولتا نہیں۔" فوزان بابا کی آواز اسے بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ ان کی نگاہیں آدھی دیوار کو گھیرے اس پورٹریٹ پہ تھیں جس میں وہ پوری جان کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت بھری تھی۔ جیسے وہ اپنے باپ اور بہن کو ستا کر خوش ہو رہا ہو۔ جیسے وہ بچپن میں شرارت کر کے انہیں ستاتا اور خوش ہوتا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا وہ ضد کا اتنا پکا ہوگا۔" وہ افسردگی سے کہہ رہے تھے۔ اولاد کی دوری ماں باپ کے لیے باعث آزار ہوتی ہے' لیکن اولاد اس جذبے کو نہیں سمجھ سکتی۔ یہاں تک کہ اولاد کو وقت خود ماں باپ کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ پھر انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے غلط تھے؟ اور کس جگہ کھڑے تھے۔

"اور میں اس کی بے کار ضد میں اس کے ساتھ کبھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔" افسون نے ٹھوس لہجے میں انہیں باور کروا دیا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر مطبخ کی طرف جا رہی تھی۔ وسیع و عریض چمکتا ہوا کشادگی کا احساس لیے باورچی خانہ۔ اس نے آبگینے کو ایک ٹفن تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ پھر اپنا قناویز کا گاؤن اور معجر لینے کے لیے خادمہ کو اوپر بھیجا۔

"تم نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ اگر تم اسے بلاؤ گی تو ضرور لوٹ آئے گا۔" انہوں نے موبائل کو چارجنگ سے ہٹاتی افسون کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ کچھ تھا جو انہیں غیر معمولی اور عجیب لگ رہا تھا۔

"اور میں ایسا نہیں کروں گی۔" افسون نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ خادمہ کے ہاتھ سے قناویز کا گاؤن لیتی مصروف انداز میں بولی تھی۔ پھر اس نے گاؤن پہنا اور ہال کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سر پہ معجر لپیٹنے لگی۔ اس نے بڑی نفاست سے نہایت مہارت اور عمدگی کے ساتھ نقاب کیا تھا۔ پھر اس نے ہال کی آدھی دیوار پہ پھیلے اپنے بھائی کے پورٹریٹ کی طرف دیکھ کر بہ آواز بلند کہا تھا۔

"میں افسون مشہدی ہوں۔ تمہارے لیے اپنے اصول توڑ نہیں سکتی' میں ان لوگوں کے پیچھے بھاگتی ہوں' ان لوگوں کو روکتی اور واپس بلاتی ہوں۔ جنہیں میں نے نکالا نہیں ہوتا۔ تمہیں میں کیسے خود بلا لوں؟ جب کہ اس گھر سے میں نے تمہیں نکالا تھا' میں تمہیں واپس نہیں بلاؤں گی۔ جب بھی آنا پڑے تمہیں خود ہی آنا ہوگا۔" اس نے اپنا کلچ نکالا۔ اندر فوزان مشہدی کا کارڈ رکھا۔ خادمہ ٹفن اٹھا کر پہلے ہی اس کا اشارہ پا کر باہر جا چکی تھی۔

باہر سرخ پتھروں کی روش بچھی تھی جس کے دائیں بائیں بوٹے قد کے پام ترتیب سے لگے تھے۔ پام کے پتے کیلے تھے۔ مالی نے ان کو تازہ تازہ غسل دیا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے شان سے کھڑے "افسون حرم" کو دیکھا اور ڈرائیور کو کچھ ہدایات دی تھیں۔ اس کے "حرم" کی پیشانی پہ سنہرے حروف میں اس کا اپنا نام لکھا تھا۔ ظہران کی تیز دھوپ میں سونے کی طرح چمکتا ہوا۔

وہ سر جھکائے سرخ پتھروں سے بچھی روش پہ اپنے ہی دھیان میں چل رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں محبت آسن جما کر بیٹھی تھی۔ وہ اس کے ملک میں آیا تھا۔ وہ اس کے دل میں آیا تھا۔ ملک میں آنے والوں پہ تو "خروج" بھی لگ جاتا ہے' لیکن دل میں آنے والوں پہ کبھی بھی "خروج" نہیں لگتا۔

ظہران پہ پھیلی دھوپ میں اس کا دل پگھل رہا تھا۔ اس احساس کی زیادتی سے کہ اس کے دل کا "قیدی" ظہران کے "قید خانے" میں پڑا تھا۔ رافع افراہیم بغیر خروج لگے اس کے ملک سے بھاگ جانے والا بھگوڑا

تھا اور رافع افراہیم کا ٹھکانہ ظہران کا قید خانہ نہیں بلکہ افسون مشہدی کا جیل خانہ تھا۔ اور اس سورج جیسے تپتے، پربتوں جیسے مغرور اور بادلوں جیسے بے نیاز افراہیم کو ظہران کی اس حوالات سے نکال کر اپنے حریم دل کی حوالات تک لانے میں افسون مشہدی کو صحرائے عرب جتنی مسافت کا سفر طے کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

افسون حرم کے دریچوں اور محرابوں سے پرے ظہران کا سورج آگ برسا رہا تھا۔

خادماؤں نے پردوں کی ڈوریوں کے سرے کھول دیے تھے اور پورے ہال میں ٹھنڈی مشینیں آن تھیں۔ اندر کا ماحول باہر کی نسبت پرسکون، ٹھنڈا اور فرحت بخش محسوس ہوتا تھا، لیکن ایسا نہیں تھا۔ فوزان مشہدی کے لیے تو بالکل بھی نہیں اور جب ان کی جان عزیز زوجہ محترمہ ان کے سامنے بھاپ اڑاتی کافی کا مگ رکھ کر گئی تو انہیں بن پیے ہی کافی کی کڑواہٹ اور تلخی اپنے حلق میں اترتی محسوس ہونے لگی تھی۔ مگ سے نکلتا دھواں ان کی آنکھوں کے سامنے عجیب عجیب مرغولے اور بدہیئت شکلیں بنا رہا تھا۔

ان کی سوچوں اور تکلیف دہ تاثرات سے قطع نظر آبگینے کے اپنے ہی خاندانی مسائل تھے۔ جن پہ بات کرنا آج ہی ضروری تھا کیوں کہ کاروباری مراکز و دفاتر میں چھٹی کا یہ دن اس کا عزیز ترین دن تھا جب اسے اپنے شوہر نامدار کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ بقول حمیر عمیر کے "آبگینے کو آج ہی پورے ہفتے کی چغلیاں کرنے کا موقع ملتا ہے۔"

"بھابھی نے انگریزوں میں رشتہ داری کر کے جیسے بڑا کمال کر لیا ہے۔ بہو کے نام اپنا حرم سرا کریں گی۔ لڑکی والوں کی یہی ایک ڈیمانڈ تھی جیسے وہ کہیں کی "لاٹ صاحبہ" ہو۔" پتا نہیں آبگینے کو غصہ کس بات پہ تھا۔ بھابھی کی برٹش بہو پہ، یا بہو کے نام لکھوانے والے مکان پہ؟

"تو کیا ہوا؟ تمہارے بھائی کے اتنے مکان ہیں۔ ان میں سے ایک بہو کو مل جائے گا تو کیا ہو جائے گا؟"

"وہ مکان فرانس کے ساحل پہ ہے مطلب اپارٹمنٹ۔ اتنا عالیشان کیا ضرورت تھی بھلا؟ جانے ٹکتی بھی ہے یا نہیں۔" آبگینے جز بز ہو کر رہ گئی تھی۔

"تمہارے بھتیجے سے اس کی لو میرج ہے۔ ٹکے گی کیوں نہیں۔"

"انگریز ہے، جانے قابل بھروسہ ہو یا نہیں۔ میرے بھائی کی بھی عقل، بیوی نے اپنے پاس گروی رکھ لی تھی۔ بیٹے کو امریکا پڑھنے بھیجا تھا تو یہاں باندھ کر بھیجتے۔" آبگینے نے کلس کر کہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ جہاں جھنجلاہٹ تھی اور صاف غصہ بھی لکھا نظر آ رہا تھا۔

"بیٹے تو تمہارے بھی انگریزوں کے ملک پڑھنے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا گمان کرتی ہو؟ کل کو وہ بھی کسی نو مسلم کو اٹھا کر لے آئیں گے۔" انہوں نے آبگینے کو ڈرانا چاہا تھا۔ وہ سچ مچ خائف سی ہو گئی تھی۔

"تو بہتر ہے الوف کی شادی میں اپنے بیٹوں کے لیے بھتیجیاں دیکھ لو۔" انہوں نے اپنے تئیں مشورہ فراہم کیا تھا جسے سن کر آبگینے کو ڈنک لگا۔

"ہرگز نہیں۔" اس کے انداز میں بہت شدت تھی۔ وہ حیران رہ گئے تھے۔ یہ بات اتنی بری تو نہیں تھی۔ ان کے خاندان میں زیادہ تر کزنز میرج ہوتی تھی۔ آبگینے خود ان کے چچا کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

"کیوں؟" انہوں نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا تھا۔

"بھائی کو میری بیٹی نظر آئی؟ وہ فرنگن اٹھا کر لا رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری بیٹی کا خیال کیا؟" آبگینے کا اپنے بھائی پہ سارا غصہ اور اس غصے کی وجہ سامنے آ گئی تھی۔ ان کے دل پہ بہت اثر ہوا۔ وہ ان کی بیٹی کے لیے اس قدر گہرائی میں جا کر سوچتی تھی؟ فوزان مشہدی کے دل میں آبگینے کی قدر و منزلت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ خفا خفا سی آبگینے کے قریب آ گئے تھے۔ پھر اس کا ملائی سا

ہاتھ تھام کر نرمی سے بولے۔

"تمہارے والدین نے ہم پر کوئی سختی نہیں کی تھی۔ ہم آدھی زندگی یورپ میں گزار کر آئے۔ ہم سب بھائیوں نے اپنی پسند سے شادیاں کیں۔ کوئی لبنانی لے آیا۔ کوئی ایرانی۔ کسی کی کامیاب ہوئی اور کسی کی شادی ناکام ہو گئی۔ اب ہمارا بھی فرض ہے اپنے بچوں کو اپنے فیصلے کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں اور ان کی خوشی کو سامنے رکھیں۔ تمہارے جذبات میرے لیے بہت قیمتی ہیں، لیکن اپنے بھتیجے کا جذبہ بھی سامنے رکھو۔ اس نے ایک انگریز لڑکی کو مسلمان کرکے اپنے خاندان کا حصہ بنانا چاہا ہے۔"

وہ چاہتی تھی افسون کے معاملے پہ بھی غور کیا جائے جب کہ افسون؟ انہوں نے گہرا سانس بھرا اور اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ اور آبگینے کو اٹھتے اٹھتے بہت ہی ضروری بات یاد آگئی تھی۔

"آپ کو پچھلا "طعام" (دعوت) یاد ہے۔ جب پورا خاندان یہاں اکٹھا ہوا تھا؟ وہ پاکستانی لڑکا جو ملازمت کے لیے یہاں آیا تھا جس نے اتنا ملوک گیت بنایا۔ یاد ہے آپ کو؟ تب انہوں نے کتنی باتیں بنائی تھیں۔ ایک غیر لڑکے کو افسون حرم میں کیوں بلایا گیا؟ اسے مہمان خانے تک ہی محدود رکھنا چاہیے تھا اور اس کی خوب صورت آواز پہ پھر ساروں کو سکتہ ہو گیا تھا۔ بھابھی نے آج فون کیا تھا مجھے۔ الوف کے دعوت ولیمہ (طعام) میں اس لڑکے کو بھی بلوایا جائے۔ وہ اپنے غیر ملکی مہمانوں کو انٹرٹین کرنا چاہتی ہیں۔ اس کی خوب صورت آواز اور گیتوں کی وجہ سے۔"

آبگینے کی لمبی تقریر پہ وہ بے ساختہ اس کی طرف دیکھتے چلے گئے تھے۔ انہیں بھی اچانک سالگرہ والی شام اور اجنبی سادہ لڑکا یاد آگیا تھا۔ جسے افسون نے دعوت نامہ بھجوایا تھا اور وہ شاید مشہدی خاندان کی سات پشتوں پر احسان کرتا ان کے "حرم" میں آیا تھا۔ وہ نااہل سا لڑکا جو ایک ذمہ دار پوسٹ کے لیے قطعاً ناموزوں تھا۔ انہیں کیسے بھول سکتا تھا۔

"وہ لڑکا اپنے پاسپورٹ پہ کمپنی کی طرف سے "خروج" کی اسٹیمپ لگوائے بغیر بھاگ رہا تھا۔ یعنی صریحاً" جرم۔ میں نے اسے ایئرپورٹ سے پکڑوایا ہے۔" وہ آبگینے کو بتا رہے تھے۔ ایسی باتیں وہ گھر میں ڈسکس نہیں کرتے تھے، مگر بات اس لڑکے کی تھی۔ جو افسون کا منظور نظر تھا اور یہ بات ان کا "روشن خیال" ذہن قبول کرنے سے انکاری تھا۔

"اور وہ لڑکا اب کہاں ہے؟" آبگینے کی رنگت اڑ گئی۔ اس نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ اپنی "فکر" کا اظہار کیا تھا۔

"حوالات میں۔" انہوں نے بیوی کی "فکر" کو اچھی طرح سے محسوس کیا تھا۔ وہ ایسے ہی اس قدر متفکر نہیں ہوئی تھی۔ یقینی طور پر افسون نے اسے کچھ نہ کچھ اس لڑکے کے متعلق بتا رکھا تھا۔

"افسون کو خبر ہے کہ کیا؟ میرا مطلب ہے اس غیر ملکی کو افسون نے ہی ترس کھا کر ملازمت دلائی تھی۔ وہ بے چارہ جو ظہران کی کچی بستی میں غبار آلود زندگی گزار رہا تھا۔"

وہ ان کے اندر تک اترتی، کھوجتی نظروں سے خائف ہو گئی تھی۔

"اطلاعاً" عرض ہے آپ کی منہ چڑھی لاڈلی افسون نے ہی اس کو "مفرور" پاکر مخبری کی تھی۔" فوزان مشہدی کے انکشاف نے آبگینے کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

"اور ان ہی کی خواہش پہ مجرم کو موقع پہ پکڑ کر حوالات میں ڈالا گیا ہے۔ اب تم مجھے صاف صاف معاملہ بتا دو آبگینے! بات کہاں تک پہنچی ہوئی ہے؟ رجعت کا کوئی رستہ ہے یا نہیں؟ کیوں کہ مجھے معاملہ بہت آگے تک جاتا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ حوالات میں اس سے ملاقات کرنے چلی گئی ہے اور اس سے پہلے وکیل ہائیر کیا گیا۔ یعنی کہ۔۔۔" ان کی سوچتی ہوئی نگاہوں میں غصے کے ساتھ ساتھ ان دیکھی پریشانی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے رہا تھا۔

آبگینے کوئی عادی مجرم نہیں تھی۔ نہ کامیاب اداکارہ۔ نہ کوئی ملمع ساز۔ وہ ان سے خائف ہوتی کچھ بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔ اس نے افسون کا اعتبار توڑ دیا

تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے شوہر کا اعتبار نہیں توڑ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆
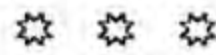
"مجھے یہ نہیں پتا تھا۔ تو دوست نہیں آستین میں پلنے والا سانپ ہے۔" ڈین ہیگ کے اس درمیانے ہوٹل کے دیدہ زیب بیڈ روم میں حریر کی درگت بن رہی تھی۔ مدید اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا گلا دبانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"میرے باپ! مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ زبان پھسل گئی تھی۔ میرے منہ سے جانے کیسے نکل گیا تھا۔" حریر ہاتھ جوڑنے پہ آچکا تھا۔

"جانے وہ کہاں ہو گا؟ واپس نہ چلا جائے۔" مدید کا مارے صدمے کے برا حال تھا۔ اسے ڈھیلا پڑتا دیکھ کر حریر نے اسے دھکا دیا اور خود کو اس موٹے آلو کے نیچے سے بمشکل نکالا۔

"یہاں بیٹھ کر میرا کچومر نکالنا۔ کوئی سدباب نہ کرنا۔" حریر نے کچھ دیر بعد اس کی عقل کو کوستے ہوئے جتلایا تھا۔

"تو کیا کروں اب؟ کہاں ڈھونڈوں اسے؟ کیا ضرورت تھی اسے کچھ بتانے کی؟ ایک میرا سرپرائز تباہ کیا اور دوسرا اسے واپس... جانے سے بھی نہ روکا۔" مدید زہر خند چیخا تھا۔

"جیسے وہ مجھے بتا کر تو گیا ہے نا۔ کیسے روکتا؟ ادھر میری آنکھ لگی اور ادھر وہ غائب۔" اب حریر کو کیا خبر تھی۔ وہ اتنا شدید رد عمل دکھائے گا؟ یہ اتنا غصہ کرنے والی بات تو نہ تھی۔ مدید اسے سرپرائز ہی تو دینا چاہتا تھا۔ کیا دوست اتنا سا مذاق بھی نہیں کر سکتے؟

وہ اندر کی بات تو جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بات جس کی مدید کو خبر تھی۔ وہ حقیقت' وہ ہولناک سچائی جس سے مدید واقفیت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کے تاریک پہلو اور دہشت ناک کہانی۔

"اس مراقبے سے بہتر ہے۔ ہم اسے تلاش کریں۔ یقینی طور پر وہ ہیگ اسٹیشن کے آس پاس ہو گا۔" حریر کی تجویز اسے وسوسوں سے کھینچ لائی تھی۔

مدید کا "موٹا دماغ" بھی تیز تیز چلنے لگا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر ہیگ اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ یہ ہوٹل اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسٹیشن اس وقت سنسان تھا۔ کسی بھی ریل کے آنے یا جانے کے آثار نہیں تھے۔ ہیگ اسٹیشن کا چپہ چپہ کھوجتے اور کونہ کونہ چھان مارتے ہوئے وہ دونوں مایوسی کی انتہا پہ پہنچ چکے تھے۔

"وہ بائی ایئر نہ چلا گیا ہو۔ اس کو فلائٹ ملنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہمیں امید نہیں ہارنی چاہیے۔ وہ انتظار گاہ میں نہیں۔ اسٹیشن کے اندر نہیں' لیکن قرب و جوار میں ضرور ہو گا۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں اسٹیشن کا بیرونی ایریا دیکھ رہے تھے' کچھ دکانیں' مال' چھوٹے چھوٹے دفاتر اور وہیں وی۔ وی۔ وی کے دفتر کے پاس اس کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ مدید سے صبر نہ ہو سکا تھا۔ وہ دیوانہ وار وی۔ وی۔ وی کے دفتر کی طرف لپک رہا تھا۔ اس حال میں کہ اس کے لبوں پر صرف ایک ہی تکرار تھی۔

"فاتح! تم میری منگنی میں شرکت کیے بغیر نہیں جا سکتے۔ اگر ایسا ہوا تو میں آنے والی ٹرین کے نیچے آکر جان دے دوں گا۔"

مدید کی "پکار" اور حریر کی "دھاڑ" نے وی۔ وی۔ وی کے دفتر سے نکلتے فاتح کو لمحہ بھر کے لیے منجمد کر دیا تھا۔ وہ دونوں بھاگتے' لپکتے فاتح کے وجود سے والہانہ انداز میں لپٹ گئے تھے۔ وی۔ وی۔ وی کے دفتر سے باہر نکلتی وہ خوش اخلاق سی لڑکی بڑی حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دوسرے سے بھینچ بھینچ کر ملتے اور پھر ایک دوسرے کو دھمو کے جڑتے یہ تینوں جوان تیسری دنیا کا کوئی عجوبہ لگ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

ہالینڈ' جزیروں پر مشتمل ایک خوب صورت ملک ہے۔ یہ مختصر ملک انتہائی مہذب اور ترقی یافتہ ہے۔

یہاں پانی کی افراط ہے۔ ہر جگہ نہریں اور جھیلیں موجود ہیں۔ شہروں کے درمیان میں بھی نہریں بہتی ہیں۔ ہیگ آبادی کی قلت اور یہاں کی گھریلو سادہ طرز زندگی کے باعث یورپ کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ انہیں ہیگ پہنچے ابھی گھنٹہ بھر گزرا تھا جب کوئی تین سو چوالیس مرتبہ مدید نے سر دھنتے ہوئے ہیگ کی تعریف کی تھی۔ جیسے وہ زندگی بھر اسی گاؤں میں رہائش پذیر رہا ہو۔

"یہاں کے لوگ بڑے خلیق اور بڑے ہی ملنسار ہیں۔ انیہ کی گرینڈ ما کو چھوڑ کے باقی امن ہی امن۔" مدید نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ فاتح قطعی بیزار بیٹھا تھا جب کہ حریر خاصی دلچسپی سے اس کی داستان امیر حمزہ سن رہا تھا۔

"میرے سسر تو مجھ پر جان دیتے ہیں۔ یہ رنگ دیکھ رہے ہو۔ میرے سسر نے بڑی دور سے منگوائی ہے۔" اس نے کسی نازک اندام دوشیزہ کی طرح اپنا مردانہ ہاتھ لہرا کر دکھایا تو حریر کو غش آنے لگے۔ شاید اسے ضرورت سے زیادہ مل گیا تھا۔ فاتح کو مدید کی گزشتہ زندگی کا خیال آیا تو یہ جوش و خروش غیر معمولی نہ لگا۔ وہ چھپر پھاڑ کر ملنے والی نعمتوں پہ اترانے کا حق محفوظ رکھتا تھا۔

"یہ رنگ منگنی سے پیشتر ہی تمہاری انگلی میں پہنچ گئی؟" ایسے وکیلوں کی طرح پوائنٹ حریر کے علاوہ کون پکڑ سکتا تھا؟ مدید گڑبڑا گیا تھا۔

"آں، ہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ یہ تو ٹرائی کرنے کے لیے میرے سسسسز کمال خالو نے مجھے دی ہے۔" مدید نے فوری طور پر سنبھلتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

"اور تمہاری نیت خراب ہوگئی اور تم نے انہیں واپس ہی نہ کی؟ یا پھر تمہیں یہ وہم لاحق ہو گیا ہو گا کہ کیا پتا کمال خالو کا ارادہ بدل جائے اور وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے سے مکر جائیں۔ تب انیہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی نشانی نہ ہوتی۔" حریر نے اس کی نیت کو بھانپ کر ایسی چوٹ کی کہ مدید بلبلا بھی نہ سکا تھا۔

"آپ نے اس سڑے ہوئے منہ سے بدشگونی کی باتیں ہی نکالنا۔ وہ کیوں مکریں گے۔ اتنے لوگوں کے بیچ میں مجھے انگوٹھی پہنا۔۔۔" مدید روانی سے بولتے بولتے اچانک زبان کو دانتوں تلے داب گیا تھا۔ یہ اس کے منہ سے کیا نکلنے جا رہا تھا؟ اس نے فوراً گفتگو کا رخ موڑا۔

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، چلو پہلے ڈنر کرتے ہیں۔ اور میں تمہیں گھر والوں سے بھی ملواتا ہوں۔" وہ انہیں فریش ہونے کے لیے اکیلا چھوڑ کر خود گیسٹ روم سے نکل گیا تھا۔ اور صد شکر کہ فاتح کو الگ کمرہ عنایت کیا گیا تھا۔ حریر اس وقت فاتح کے ساتھ نہیں تھا۔

فاتح گہرے سانس لیتا فریش ہونے کے لیے واش روم میں چلا گیا تھا۔ جب وہ نہا کر آیا تب تک حریر بھی پہنچ چکا تھا۔ وہ فنکشن سے چند دن پہلے ہی لوٹ جائے گا۔ پاکستان سے مہمان آنے تک وہ یہاں سے جا چکا ہو گا۔ اس کی کسی سے ملاقات نہیں ہوگی۔

مدید اس کے ابو کے کزن کا بیٹا تھا۔ ان کے تایا زاد بھائی کا پہلا اور آخری بچہ۔ وہ فاتح کا بچپن سے سنگی تھا۔ اکلوتا دوست، پہلا اور آخری ہمراز۔ جان لٹانے والا رفیق۔ یوں مدید کی امی رشتے میں فاتح کی تائی لگتی تھیں۔ مدید کے ابو کا بہت سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ وہ انہیں اپنے بچپن میں ہی کھو چکا تھا۔ اس کی پرورش ننھیال میں ہوئی تھی۔ اور مدیحہ تائی کو اپنی سسرال سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ وہ جتنا مدید کو ددھیال سے دور رکھنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ وہ اتنا ہی ان کے قریب تھا۔ ہیگ میں مدید کی خالہ بہت روایتی سے پاکستانی گھرانے میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کے سسرالی بہت سالوں سے ہیگ گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ یہاں کمال خالو کی کچھ زمینیں بھی تھیں۔ اور ان کا پرانا سا مگر بہت پیارا گھر ٹیولپ کے کھیت کی بالائی جانب ایک ڈھلوانی سطح پہ تھا۔ اور مدید کو یہاں آئے ہوئے سات آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔

وہ مدید کے مجبور کرنے پہ آ تو چکا تھا مگر اس کا بے چین دل مطمئن نہیں تھا۔ اس کے برعکس حریر بہت

خوش تھا۔ اور ایک راؤنڈ سب کی نظر سے بچ بچا کر پورے گھر کا لگا آیا تھا۔ اور اب فاتح کے کانوں میں گھسا تعریف کر رہا تھا۔ "مدید کا لائف میں یہ ہائی جمپ کمال خالو جیسا ہی باکمال ہے۔" اس کے انداز میں ستائش تھی اور فاتح کو بعد میں پتا چلا تھا۔ وہ انیہ سے بھی مل کر آیا تھا۔ اور اس کی بھی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

مدید نے بڑی محروم زندگی گزاری تھی۔ چھوٹی چھوٹی نعمتوں، چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور خوشیوں کے لیے ترستے ہوئے۔ مدید نے بہت برا وقت دیکھا تھا۔ بھوک، غربت، افلاس اور بے سرو سامانی میں۔ کسی اور کے ٹکڑوں پہ پلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر اب اس کی زندگی میں سکون آرہا تھا تو فاتح کے لیے یہ خوشی کا مقام تھا۔

ڈرائنگ ہال میں فاتح کی سب سے ملاقات ہوئی تھی۔ کمال خالو، کنیز خالہ اور کنیز خالہ کی ساس، انیہ کی گرینڈ ما۔ ان میں انیہ نہیں تھی۔

"تیری انیہ سے صبح ملاقات ہوگی۔ ابھی وہ کسی کام سے نکل گئی ہے۔" مدید نے اس کے کان میں گھس کر انیہ کی غیر موجودگی کا بتایا تھا۔ فاتح نے سرہلا دیا۔ وہ کون سا انیہ سے ملنے کا اشتیاق رکھتا تھا۔

انہوں نے روایتی سا کھانا پر تکلف ماحول میں کھایا اور گیسٹ روم کی طرف چلے گئے تھے۔

اور ان کے جاتے ہی ماحول گرم ہو گیا تھا۔ انیہ کی گرینڈ ما مدید پہ چڑھ دوڑی تھیں۔

"جس طرح کے نکمے تم خود ہو، ویسے ہی اپنے دوست بلا لیے ہیں۔ مفت خورے۔" انہوں نے مدید کے وہ لتے لیے کہ خدا کی پناہ۔ اس کی خالہ تھر تھر کانپتی رہی تھیں۔ کمال خالو بے نیاز تھے جب کہ مدید ڈھیٹ بنا کھانا کھاتا جا رہا تھا۔ جیسے یہ ساری "عزت افزائی" اس کے معمول کا حصہ تھی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، پاکستانی خبطی بڑھیا جو مرضی کہتی۔

"میں کہتی ہوں، ان دونوں کو ایک ہفتے سے زیادہ برداشت نہیں کروں گی۔" دادی جان نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ "میں نے انہیں نکال باہر کروں گی۔" اس کی بے نیازی انہیں تاؤ دلا رہی تھی۔

"آپ اپنے دعوے پر قائم نہیں رہ سکیں گی۔ یہ میرا دعوا ہے۔" مدید برابر مسکراتا رہا تھا۔ اور انہیں کھولاتا رہا۔

تب ہی انیہ بھی واپس آگئی تھی۔ ہال میں ماحول گرم دیکھ کر اس نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

"پلیز گرینڈ ما! مہمانوں کے ساتھ ایسا مت کریں۔ وہ ہمیشہ کے لیے نہیں آئے۔" انیہ کو دیکھ وہ کچھ جز بز ہو گئی تھیں۔

"تم اس کی حمایت مت کرو۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"یہ حمایت نہیں۔۔۔ آپ کو مہمانوں کا احساس کرنا چاہیے۔ وہ ہماری خوشیوں میں شمولیت کے لیے آئے ہیں۔ اپنا وقت اور پیسہ برباد کر کے۔" انیہ نے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مدید حیران سا اسے دیکھتا گیا۔ انیہ اور کسی کے لیے گرینڈ ما کو خفا کرے۔ جبکہ دو دن پہلے مدید کے ساتھ اسی بات پہ اس کی تکرار ہوئی تھی۔

"تم اپنے کن دوستوں کو دعوت دے رہے ہو؟ وہ بھی ایک مہینہ پہلے۔ ڈیڈ اور گرینڈ ما کی کنجوسی اور بد مزاجی کا تمہیں خوب علم ہے۔" انیہ برہم تھی۔ مدید تب بھی چپ ہی رہا تھا۔ پھر اس کی اتری صورت دیکھ کر اسے شاید ترس آگیا۔

"ایک ہفتہ ٹھہرا کر انہیں چلتا کر دینا۔ یہ پاکستان نہیں ہے مسٹر مدید!" انیہ کا لہجہ گہرا طنزیہ تھا۔ پھر مہمانوں سے ملنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اور اب یہ تبدیلی گرینڈ ما کو چپ کرا دیا تھا۔ اور اب موسم کی پروا کیے بغیر لان میں موجود تھی۔ انتہائی چپ اور گم صم سی۔ اور چاہتی تھی کہ مدید اسے اکیلا چھوڑ دے۔ اسے انیہ کے اچانک بدلنے والے رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ریگستانی علاقوں میں رات بہت ٹھنڈی ہوتی ہے۔ نم نم سی گیلی گیلی سی۔

اس وقت شام کا سماں تھا۔ فضا میں نمی تھی اور گلابوں کی خوشبو گھلی محسوس ہوتی تھی۔

افسون حرم کی پیشانی پہ اس کے نام کا سنہرا کلس اب بھی چمکتا تھا۔

اس نے بالکونی میں کھڑے کھڑے ظہران پہ بکھری شام کی دلفریبی کو محسوس کیا تھا۔

لان میں حمیر اور عمیو ٹینس کھیل رہے تھے۔ حمیر جب بھی ہارتا' اونچی آواز میں بولتا اور لڑنا شروع کر دیتا تھا۔ دونوں ریکٹ سے ایک دوسرے پہ حملے کرتے تھے۔ حمیر سیر تھا تو عمیو سوا سیر۔ ہارنا تو دونوں کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ اس حال میں آبگینے کی جان بنی ہوتی تھی۔ وہ باورچی خانے کا سارا پھیلاوا چھوڑ کر لفگیر اٹھائے ان دونوں میں سیز فائر کروانے آجاتی۔

"جانوروں کی طرح لڑ رہے ہو۔ یوں لگتا ہے کسی چڑیا گھر سے آئے ہو۔" آبگینے غصے میں چیخ رہی تھی۔

حمیر نے فوراً "جملہ پکڑا کیا تھا۔

"یہ ساؤتھ افریقہ کے جنگلوں سے آیا ہے۔ اسے وہیں چھوڑ آؤ آبگینے!" اس نے ریکٹ اٹھا کر میز پہ رکھا اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں پسینے سے تر بتر تھے۔ اب ہاتھوں سے نہیں باتوں سے لڑنے کے موڈ میں تھے۔ وہ دونوں ہی افسون کی دیکھا دیکھی آبگینے کو نام سے ہی بلاتے تھے۔

آبگینے سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ان دونوں کی لڑائیاں ختم کرواتے کرواتے عاجز آچکی تھی۔

"میں تم لوگوں کا کیا علاج کروں؟" اس نے تاؤ کھا کر کہا۔ حمیر نے آواز لگا کر جوس منگوایا۔ پھر آبگینے کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں تو آپ کیا فرما رہی تھیں ہمارا علاج؟ ایک علاج ہے میرے پاس اگر آپ غور کرنا چاہیں تو؟؟"

وہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بتاؤ تا کہ میری گلو خلاصی ہو۔" آبگینے تو بھری بیٹھی تھی۔

"ہماری شادیاں کروا دیں۔" اس نے ہاتھ جھاڑے اور بالکونی میں کھڑی افسون کو اشارہ کیا تھا۔

"نیچے آجاؤ' اپنے بھائیوں کے سروں پہ سہرا سجانے کا شوق ہے تو۔" حمیر کی آواز اس کے کانوں میں صاف پڑ رہی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بالکونی سے نیچے اتر آئی تھی۔

"دیکھو' شرم ہی نہیں۔ بڑے۔ بہن بھائی بیٹھے ہیں اور چھوٹوں کو گھر بسانے کی پڑ گئی۔ کان کھول کر سن لو۔ تم دونوں کی شادی ان دونوں سے پہلے نہیں ہو سکتی۔" آبگینے کی دھمکی پہ حمیر بدک اٹھا تھا۔

"یہ تو زیادتی ہے۔ اگر یہ دونوں شادی ہی نہ کریں تو ہم بغیر شادی کے رہیں گے۔"

"اور ہمارے بچے دنیا میں آنے کے لیے تڑپتے رہیں گے۔" یہ عمیو تھا۔ جس نے اپنی عقل کے مطابق ہی بات کی تھی۔

"کیوں نہیں شادی کریں گے۔ بدتمیز' افسون کی تو سمجھو ہوئی کے ہوئی۔" آبگینے کے انداز پہ ان کی باتوں کو سن کر ہنس ہنس کے بے حال ہوتی افسون لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی تھی کیونکہ آبگینے کا لب و لہجہ ہی کچھ ایسا تھا۔

"بہن کے بعد پھر ہمارا نمبر لگے لگا۔" حمیر نے خوش ہو کر کہا۔

آبگینے نے اس کے کندھے پہ دھپ لگائی تھی۔

"اس کے بعد بھائی کی باری ہے۔" عمیو نے بھی ٹکڑا لگایا تھا۔

"بھائی کی فکر چھوڑ دو۔ وہ یورپ سے اپنے لیے انتظام کر کے ہی آئے گا۔" حمیر مطمئن تھا۔ آبگینے چونک گئی تھی۔ پھر خفگی سے بولی۔

"کبھی نہیں۔ وہ اپنے خاندان میں ہی شادی کرے گا۔" آبگینے کا یقین حیران کن تھا۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ بھائی جب بھی آیا' دو تین بچوں کو ہمراہ لائے گا۔" حمیر نے چیلنج بھرے لہجے میں کہا تھا۔

معاً "پتھریلی روش پہ کوئی چلتا چلتا دھڑام سے گر

گیا۔ شاید آنے والے کا پاؤں کسی گملے سے ٹکرایا تھا یا
اس کا سارا دھیان گفتگو کی طرف تھا۔ تب ہی وہ لڑکھڑا
کر زمین بوس ہو چکی تھی۔ ان سب کے لبوں سے بے
ساختہ "او" نکلا تھا۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے
ہوئے افسون نے آگے بڑھ کر اسے تھاما۔

"رطابہ! دھیان سے۔" آبگینے اور افسون تشویش
سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کہیں زیادہ تو نہیں لگی؟" افسون نے اسے سہارا
دے کر بٹھایا تھا۔ وہ جھینپی جھینپی سی مسکرا دی۔

"نہیں تو۔" اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ ایسی بھی کیا
بے خودی؟ وہ سخت شرمندہ تھی۔

"دھیان اپنے پاس ہو تو تب نا۔ دھیان تو ہمارے
بھائی کے پیچھے لگا رکھا ہے۔" حمیر نے چوٹ کی۔ اوپر
سے افسون کی گہری نگاہ اور آبگینے کی شرارتی ہنسی۔
رطابہ آج بری پھنس گئی تھی۔

"مجھے ماموں کے گھر آنا ہی نہیں چاہیے۔" اس
نے ہاتھ اٹھا کر کہا تھا۔

"جب سے ماموں کا بیٹا وطن بدر ہے۔ آپ تب
سے یہاں رونق افروز ہوتی ہی نہیں۔" حمیر کے پاس
پوری معلومات تھیں۔ عمیر نے اس کی تائید میں
سر ہلایا اور آبگینے نے بھی رطابہ کو غور کر دیکھا تھا۔

"مصروف ہوتی ہوں۔ اور تم لوگوں نے جیسے
ہمارے گھر ڈیرہ لگا رکھا ہے۔ اتنا آتے ہو کہ ہاتھ جوڑ کر
کہنا پڑتا ہے کہ کسی اور کو اب مہمان نوازی کا موقع
دو۔" رطابہ نے بھی فوراً "بدلہ لیا تھا۔ حمیر نے فوراً"
بات سنبھالی۔

"آج ہم نے پروگرام بنایا تھا۔ اور آج تم خود دھمک
گئیں۔" وہ کون سالا جواب ہوتا تھا۔

"میں تو افسون سے ملنے آئی ہوں۔ ایسے ہی اڑتی
اڑتی کچھ "شرانگیز" خبریں سننے کو ملی تھیں۔ سوچا کہ
خود جا کر تصدیق کر آؤں۔" رطابہ اب کے افسون کے
کان کے پاس جھکی تو قریب بیٹھی آبگینے بھی دھک سے رہ گئی
تھی۔ یعنی کہ۔۔۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپ
رہے تھے۔ یہ کسی طور بھی ٹھیک نہیں تھا۔ آبگینے کو
اکثر حیران کر دیتا تھا۔ وہ جیسے ابتدا میں ہی "انتہا" کو
سوچ بیٹھی تھی۔

حمیر اور عمیر کسی بات پہ بحث کرتے اٹھ کر وقتی
طور پر اندر گئے تو افسون نے بھی بڑی رازداری کے
ساتھ اپنی اکلوتی سہیلی کو جواب دیا تھا۔ اس کی آنکھوں
میں ستارے چمکتے تھے۔

"جو سنا ہے ٹھیک ہی سنا ہے۔" وہ اتنے آرام سے
تسلیم کر رہی تھی کہ رطابہ کا دل اچھل کر حلق میں
آگیا۔

"وہ کون ہے۔ جس نے تمہیں اس قدر نڈر کر دیا۔"
رطابہ کے چہرے پہ حیرت کی گرد اڑ رہی تھی۔ اس کا
دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

"آہ وہ ایک مزدور تھا۔ جس نے مجھے پاگل کر دیا۔"
افسون کی آنکھوں میں وہ دن کسی چراغ کی مانند روشن
ہوا تھا۔ اسے وہ دوپہر بہت شدت سے یاد آئی تھی۔
جب اس نے پہلی مرتبہ رافع ابراہیم کو ظہران کی گلیوں
میں دیکھا تھا۔

وہ "افسون برج" کی عالیشان عمارت کے فٹ پاتھ
پر چل رہی تھی اس حال میں کہ اس کا قناویزی گاؤن
ایک نفیس سی چنٹ کے ساتھ پیروں سے کچھ اوپر تھا۔
اس نے بڑی نزاکت سے گاؤن کے ایک کونے کو اوپر
اٹھایا ہوا تھا۔ اس انداز میں کہ نفیس ہیل کے اوپر لگے
ننھے منے نگینوں سے منعکس ہوتی خوب صورت
روشنی دھوپ میں لشکارے مارتی تھی۔ اس کے
پورے وجود میں ایک لاپرواہ سی بے نیازی اسے
سینکڑوں میں ممتاز کرتی تھی۔

کچھ دیر پہلے افسون برج کے میٹنگ ہال میں اس کو
اچانک کچھ بے زاری سی ہوئی تھی اور وہ میٹنگ
ادھوری چھوڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ وہ کوئی کیریئر ویمن
نہیں تھی بس۔ کبھی کبھار شوقیہ اپنے باپ کے آفس
چلی جاتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے کچھ ذمہ داری
بھی اٹھا لی۔ یہاں تک کہ فوزان بابا اس کے کیے گئے
فیصلوں پر بھروسا کرنے لگے تھے۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی
ذہین لڑکی تھی۔ کچھ دیر پہلے ایک رسمی میٹنگ کو ادھورا

چھوڑ کے ظہران کی سڑکوں اور تپتی راہوں پر چلنے لگا کیا محسوس کیا۔ مقصد تھا؟ یہ بات اسے برج سے نکلتے ہوئے سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد سمجھ میں آئی تھی۔

چلتے ہوئے معا" اسے ایک طرف پستہ کھجور کا درخت دکھائی دیا تھا۔ یہ ایسی کھجور کی جھاڑی تھی۔ جس کا عمدہ پھل پک کے تیار ہو چکا تھا۔ اور وہاں پہ ایک نورانی چہرے والا بزرگ بیٹھا تھا۔ جس کے گرد بہت سی عورتوں اور نوجوان لڑکوں کا جھرمٹ تھا۔ جب وہ کھجور کے قریب پہنچ گئی تو وہاں خاموشی سے بیٹھا اپنے حساب کتاب میں گم بزرگ چونک گیا تھا۔ پھر احتراما" اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ اپنے شاہانہ لباس و پوشاک اور ذات کی بے نیازی کے ساتھ ظہران کے شاہی طبقے کی کوئی عزت مآب خاتون لگتی تھی۔

افسون بہت حیرت سے بزرگ کو دیکھتی رہی۔ اس کی وہاں موجودگی کے دوران ایک جوان آیا جس نے بزرگ سے کوئی بات کی پھر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ ایک تھکا تھکا سا شکستہ دل جوان لگتا تھا۔ وہ اپنے لباس سے مزدور طبقے کا نمائندہ تھا۔ ایک ایسا غیر ملکی جو اس کے وطن میں مزدوری کرنے آیا ہوا ہو۔

افسون سائے کی اوٹ میں کھڑی تھی اور وہ جوان' بزرگ کے سامنے ظہران کے سورج تلے ساکت اور بے جان جسم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ افسون کو لمحہ بھر کے لیے یوں لگا' جیسے وہ سانس بھی نہ لے رہا ہو۔ اس کا ہاتھ بزرگ کے سامنے بھیک لینے کے انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک اجنبی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جس سے افسون ناواقف تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے یوں لگا۔ وہ جوان کوئی بھکاری ہے جو اس بزرگ سے بھیک کا طلب گار تھا۔

"معا" افسون کی نگاہ نے ایک اور بدلتا منظر دیکھا۔ اس نے اس بھکاری جوان کو روتے دیکھا۔ وہ بے آواز رو رہا تھا۔ اور بے تحاشا رو رہا تھا۔ اس کی شہد بھری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے زمین پہ گر رہے تھے۔ افسون نے پستہ کھجور کی جھاڑی تلے کھڑے کھڑے ہی اپنے دل کی بنجر سرزمین پہ سبزہ اگتے

"نہیں مریض ہوں۔ مجھے مسیحا چاہیے۔ بیمار ہوں' طبیب چاہیے۔" اس کی آواز میں صحرائے اعظم کے ریتیلے علاقوں جیسے پیاس تھی۔ وہ بزرگ اسے بے بسی سے دیکھتا رہا۔ وہ تو شخص علم قیافہ کا ماہر تھا۔ ہاتھ پاؤں کی لکیریں کھوجتا اور اپنے حسابی دماغ سے اندازے لگاتا۔ یہ لڑکا اور اس کا سوال' اس کی طلب اور خواہش اس بزرگ کی عقل اور بساط سے بڑھ کے تھی۔ وہ ہر دفعہ اسے مایوس لوٹا دیتا تھا۔ اس بزرگ کے پاس در در بھٹکتے اس جوان کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

"اندر آگ ہے بابا' بہت پیاس ہے بابا۔" وہ اپنا سر بزرگ کے گھٹنوں پہ پٹخنے لگا تھا۔ وہ انتہائی جذباتی اور جنونی تھا۔ افسون جھاڑی کے تنے سے ٹیک لگا کر دیکھتی رہی۔

"فراہیم! تو چلا جا۔ اپنے وطن لوٹ جا۔ تیرے مرض کا علاج تیرے وطن میں ہے۔" بزرگ کا ہمیشہ والا ایک ہی جواب۔ نہ تسلی' نہ تشفی۔ کیونکہ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہو چکا تھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتا۔۔۔ تیرے پاس میرے مرض کا علاج نہیں۔" وہ چیخ پڑا تھا۔

"ہاں نہیں ہے۔ بالکل نہیں ہے' تو میرے پاس نہ آیا کر۔" بابا نے اسے بے بسی کے مارے جھڑک دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو میرا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ میرا مرض لاعلاج ہے۔" وہ مایوس نظر آ رہا تھا۔ وہ بزرگ سے دور اب اکیلا کھڑا تھا۔ سورج کی طرف منہ کیے۔ شاید وہ خود کو اذیت دے رہا تھا۔ پھر افسون کی آنکھوں میں ایک دم ہراس بھر گیا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اتار دیے تھے۔ اب وہ تپتی زمین پہ ننگے پیر چل رہا تھا۔

"بابا! اس کو روکو۔" وہ چلا اٹھی تھی۔ "اس کے پیروں میں آبلے پڑ جائیں گے۔ بابا! اس کو درد ہو گا۔"

"نہیں ہو گا۔" بابا بے نیاز تھا۔

"بابا! اسے روکو' اس کے جوتے' اس کے پیر' اس کو

درو۔" وہ چیخنے لگی۔ بابا اپنے خیالوں میں گم۔

"وہ عادی ہے۔ وقفہ نماز یا وقفہ خوراک میں یہاں آجاتا ہے۔ روزانہ ایک ہی بات کرتا ہے۔ پھر جوتے اتار کر ننگے پیر بھاگ جاتا ہے۔ برج ہریرہ میں مزدوری کرتا ہے۔ اس کا کفیل سخت ذرا سی دیر میں سراپا آگ بن کر بھسم کردیتا ہے۔ اور اس کو بھسم ہونے کی گالی سننے کی عادت ہے۔"

بابا مطمئن تھا۔ اور اپنے کام میں مصروف بھی۔ افسون رونے لگی' بابا کا حساب غلط ہوگیا۔ کام رک گیا۔ وہ حیرانی سے ظہران کی اس شہزادی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی اور ابھرتی تھی۔

"تم نے اسے مایوس کیا۔ بابا! تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ گرم زمین پہ اکڑوں بیٹھ گئی۔ بابا کے حواس جواب دینے لگے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ یہ اس معمولی مزدور کے لیے پریشان ہو رہی تھی؟

بابا حواس باختہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ "میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔" بابا نے جیسے اپنی جان چھڑائی تھی۔

"علاج تب تجویز کیا جاتا ہے جب مرض تشخیص ہو۔ تم مرض سے واقفیت نہیں رکھتے تو علاج کیا کروگے۔"

ہاتھ کی لکیروں کا حساب جاننے والا یہ ماہر شان سے جاتی اس عرب شہزادی کو دیکھ رہا تھا' جس نے اپنا دل ظہران کی اس تپتی دوپہر میں برج ہریرہ کے اس مزدور کی شہد بھری آنکھوں پہ نہیں' اس کے یونانی دیوتاؤں سے تراشے سحرانگیز نقوش پہ نہیں' اس کی عالی شان شخصیت پہ نہیں' اس کی آن بان پہ نہیں' بلکہ اس کے آبلوں سے پھوٹے زخم زخم تلوؤں پہ نثار کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اس شعبدہ گر لمحے کی گرفت میں اگلے کئی دن تک قید افسون حیران تھی۔

اس نے اپنے دل کو بار ہا ٹٹولا۔ کیا وہ محض لمحاتی تاثر تھا؟ وقتی طور پر اپنے اثر میں لینے والا۔ کیا اس غریب مزدور پہ اس کا دل ترس کھا رہا تھا؟

اس کا ایقان کہتا تھا۔ یہ کوئی لمحاتی کیفیت ہرگز نہیں۔ یہ جذبہ خالص تھا۔ شفاف تھا' اچھوتا تھا اور دیرپا بھی۔

اگلی صبح افسون کے لیے بہت نئی تھی۔ جس میں ہر رنگ الگ اور نکھرا نکھرا تھا۔ حالانکہ ظہران وہی تھا۔ اس کا موسم بھی وہی تھا۔ فضا بھی وہی تھی۔ تبدیلی افسون کے اپنے اندر آئی تھی۔

اس نے شب خوابی کا لباس تبدیل کیا اور صندلی الماری کے اوپر سے ایک ڈبا اتار کر کچھ دیر کے لیے سوچا اور مسہری کے نیچے رکھے جوتے نکال کر ڈبے میں احتیاط سے رکھے۔ پھر اس نے فرسٹ ایڈ باکس کھولا اور ایک مرہم نکال کر ڈبے کے اندر محفوظ کردیا۔ ڈبے کی پیکنگ کے بعد اب وہ رائٹنگ ٹیبل پہ بیٹھی تھی اور پیڈ کے اوپر کچھ لکھنا چاہ رہی تھی۔ کیا۔ لمحہ بھر کے لیے رک کر اس نے سوچا تھا۔ اسے کیا لکھنا تھا؟ اور کس زبان میں لکھنا تھا؟ اس کی معلومات کے مطابق وہ عجیب عادتوں والا لڑکا پاکستانی تھا۔ برج ہریرہ کی تعمیراتی بلڈنگ میں کنکریٹ ڈھونے والا مزدور تھا اور اپنے کام میں بے دھیانی کی وجہ سے اپنے کفیل کی آنکھوں میں چبھنے والا سب سے بڑا کانٹا تھا۔

اس نے عربی کا انتخاب کیا تھا' لیکن ساتھ انگلش ترجمہ بھی لکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنی تحریر سے "چونکا" دینا چاہتی تھی۔ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو' تو بہتر ہے منفرد ہو جاؤ۔ انفرادیت قدرتی طور پہ چونکاتی ہے۔ سو اس نے افراہیم کے قریب جانے کا منفرد طریقہ سوچا تھا۔

"وقت ہر تصور کو بدل دیتا ہے۔ وقت ایک کورا صفحہ ہے۔ جس کے کونے استعمال کی شدت سے مڑ جاتے ہیں۔ اور اسے شکستہ کردیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ وقت کا صفحہ الٹ دیں اور نئے صفحے پر زندگی کے تجربات رقم کریں۔ اے گھر بھولے ہوئے پرندے! تمہاری زندگی ایک شکستہ صفحے پہ ٹھہر چکی

ہے۔ تمہارے اندر زندگی جی ہوئی ہے۔ جسے طہران کی دھوپ بھی پگھلا نہیں سکتی۔"

وہ لکھنا شروع ہوئی تو تحریر میں روانی آتی گئی۔ لکھائی اب بھی شکستہ تھی۔ لیکن تحریر پڑھی جاسکتی تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور کاغذ پہ مزید لکھنا شروع کردیا۔

"زخم جتنا بھی چھوٹا ہو اس کی مسیحائی کی جاتی ہے۔ تم اپنے "زخموں" کی مسیحائی کیوں نہیں کرتے؟"

لکھتے لکھتے افسون رک گئی تھی۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے پیڈ سے صفحہ اکھاڑ کر تہ کیا اور اسی ڈبے کے اندر رکھ دیا۔ اب وہ ڈرائیور کو سمجھا رہی تھی۔ یہ ڈبا برج کے کس مزدور کو دینا تھا۔

"وہ اپنی آن بان سے پہچانا جائے گا۔ سنہرا رنگ اور سنہری شہد بھری آنکھیں۔ وہ بے دھیان ہوگا۔ اپنے گیان میں گم صم اور جسے برج ہریرہ کا ٹھیکیدار سب سے زیادہ ڈانٹے گا اور گالیوں سے نوازے گا۔ اور تم، اس کے تلووں کو ضرور دیکھ کر آنا۔ اس کے پیروں کا زخم مزید کتنا گہرا ہوچکا ہے؟"

پوری ہدایات اور جامع تفصیلات کے بعد خطائی کو اجازت ملی تو وہ ڈبے سمیت حکم کی تعمیل کرنے فوراً" پلٹ گیا کہ باہر کھڑی آبگینے ششدر سی خطائی کو باہر جاتا دیکھ رہی تھی۔ معاً" اس نے دروازہ دھکیلا اور اندر آگئی۔

آبگینے نے آگے بڑھ کر اپنی جوتی کی نوکیلی نوک سے افسون کے پاؤں پہ ٹھوکا دیا تو وہ بے دھیانی میں چیخ پڑی۔

"اف۔ دھیان سے۔۔۔ یہاں آبلہ ہے۔" وہ پیر پکڑ کر تکلیف سے دہری ہوگئی تھی اور آبگینے ششدر۔

افسون کے پیروں پہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی آبلہ نظر نہیں آتا تھا۔

آبگینے کے لیے یہ صورت حال بڑی تعجب انگیز تھی۔ افسون کو بھی آبگینے کی نگاہوں کا احساس ہوا تو سنبھل گئی تھی۔

"آبلے کہاں ہیں؟" وہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتی، اس وقت ٹھنک گئی تھی۔ جب افسون نے راکنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

"افراہیم کے پیروں میں۔۔۔" آبگینے کو یوں لگا تھا جیسے عرب کے ریگستانوں میں زلزلہ آگیا ہو۔

☆ ☆ ☆

اور سامنے پھیلا دور تلک آنکھوں کو خیرہ کرتا یہ "برج ہریرہ" تھا۔

یہ ایک ایسی عمارت کا منظر تھا جو زیر تعمیر تھی۔ یہاں پہ ویسی ہی افراتفری، شور، بے ترتیبی اور ہنگامہ پھیلا تھا جیسا نو تعمیر اور زیر تعمیر عمارتوں کو مکمل کرنے کے لیے پھیلا ہوتا ہے۔

وہ ہاتھ میں ڈبا لیے کئی مزدوروں سے ٹکرایا۔ کئی مزدوروں سے سر کھپایا اور کئی مزدوروں کو افراہیم کا حلیہ سمجھایا۔ لیکن سوائے ناکامی کے اب تک ہاتھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ یہاں پہ سینکڑوں مزدور تھے۔ ان میں افراہیم کو تلاش کرنا کس قدر مشکل تھا۔ ان مزدوروں میں زیادہ تعداد پاکستانیوں کی تھی۔ کچھ انڈونیشین بھی تھے۔ اور خطائی زبان و بیان کے معاملے میں کورا۔۔۔ ہانپ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد ایک غیر معمولی کراہ پہ چونک اٹھا تھا۔ زیر تعمیر برج کے داہنی جانب لگے خیموں میں سے ایک خیمے کے اندر کوئی درد کی انتہا پہ پہنچ کر کراہ رہا تھا۔ خطائی سے برداشت نہ ہوا اور وہ خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکنے لگا۔ ایک مزدور لڑکا ہاتھ میں گلاس پکڑے کسی کو پانی پلا رہا تھا۔

وہ سامنے ہی لیٹا تھا۔ خیمے کے داخلی دروازے کی طرف اس کے پیر تھے۔ خطائی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ ان آنکھوں کے پھٹنے کی وجہ وہ پیر تھے جن کے زخموں سے خون اور پیپ رس رہا تھا۔

آبلوں سے بھرے پیروں کے تلوے۔ چھالے جگہ

جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ زخم گہرے تھے اور ان میں سے خون نکل رہا تھا۔ خطائی کو لگا وہ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد ٹھیک جگہ پہ اب پہنچا ہے۔

اس نے خیمے کے اندر آنے کی اجازت لی تھی۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ جس بیمار شخص کے خیمے میں وہ بے دھڑک گھس آیا ہے۔ وہ افراہیم کا ہی خیمہ ہے۔ خطائی کی تپسیا بالآخر کام آگئی تھی۔ وہ فخر سے سینہ پھلا کر واپس چلا گیا۔ مادام کی نظروں میں اس کا ایک پوائنٹ تو بڑھ ہی گیا تھا۔ وہ مادام افسون مشہدی کا اتنا نکما ڈرائیور نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"بھائی لوگو! دیکھو تو اس میں کیا ہے؟ کوئی دھماکہ خیز بارود نہ ہو۔" کاشی اسے درد کا کوئی سیرپ پلا کر فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ افراہیم نے اپنی تکلیف کی شدت سے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"بارود ہے تو اس کو پھٹنے دو۔ اور اطمینان رکھو، ہم ایسے خوش قسمت نہیں۔ جو اتنی آسانی سے مر جائیں اور دنیا کے اس قفس سے آزاد ہو جائیں۔" اس کی آواز میں کانچ ٹوٹ رہے تھے۔ کاشی اس کے درد کو جانتا تھا۔ اس لیے بس دکھ کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا وہ ساتھ ساتھ سل بٹے پہ کچھ کوٹ رہا تھا۔

وہ اپنی ماں سے پوچھا ہوا ٹوٹکا آزما کر افراہیم کے زخم کے لیے سفوف بنا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد سفوف تیار ہو گیا۔ اس نے سفوف میں عرق گلاب ڈالا اور افراہیم کے پیروں پہ لیپ کرنے لگا۔

"بھائی لوگو! تم نا۔۔۔ روزانہ جوتی بھول آتے ہو۔ کوئی اتنا بھی مدہوش نہیں ہوتا کہ تپتی زمین بھی جس کے ہوش ٹھکانے نہ لائے۔ آخر یہ تو ہونا تھا۔ ننگے پیر مزدوری کرنے کا انجام۔۔۔ زخم بگڑ رہا ہے بھائی لوگو۔۔۔"

کاشی تیز تیز بولتا لیپ کے ساتھ زخم کی صفائی کرتا چیخ اٹھا تھا۔

"مر نہیں جاؤں گا۔" وہ نقاہت بھری آواز میں بولا تھا۔ اس کا جسم بہت گرم تھا۔ جیسے تیز بخار ہو۔

"بھائی لوگو! یہ جو ٹھیکے دار ہے نا۔ یہ زیادہ دیر ہمیں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ مزدوری ہاتھ سے گئی تو اور کام ملنا بہت مشکل ہے۔ طہران میں تو ویسے بھی مزدوروں پہ مندی کے دن ہیں۔" وہ اس کے زخموں کو سفوف اور عرق سے صاف کرتا آزردگی سے بولا تھا۔

افراہیم نے بمشکل اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔

"مجھے تیری فکر ہے کاشی! تیرا کنبہ ریال کے انتظار میں ہو گا۔ میری تو خیر ہے۔ نہ گھر نہ بار۔"

"بس تم ٹھیک ہو جاؤ افراہیم بھائی! ہم کوئی اور کام ڈھونڈ لیں گے۔" کاشی نے محبت سے کہا۔ اس کی محبت بھی افراہیم کو وحشت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ بھلا ان محبتوں کے قابل تھا کیا؟ اس کے چہرے پہ بکھرتی وحشت کو دیکھ کر کاشی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

معاً اس کی نگاہ اس ڈبے پہ جم گئی۔ کاشی کی آنکھوں میں چمک بھر گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈبا اٹھا لیا۔ اب وہ افراہیم کی اجازت پا کر اسے کھول رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ دیکھ لے۔۔۔ اس میں خزانوں کی چابیاں تھوڑی ہوں گی۔" افراہیم پہ نقاہت چھا رہی تھی۔

"کیا پتا کوئی ایسی چابی ہو۔ جس سے قسمت کا تالا کھل جائے۔" کاشی کی خوش گمانی عروج پہ تھی۔ پھر اس نے ڈبا کھول لیا اور اندر سے نکلنے والے افراہیم کے جوتے دیکھ کر خوشی کے مارے چیخ پڑا تھا۔

افراہیم بھی کچھ حیران ہو گیا تھا۔ کیا چور کو ان پہ ترس آ گیا تھا؟ یا چور کو اس کے زخمی پیروں کی تکلیف کے بارے میں الہام ہوا تھا؟

کاشی نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ ایک رقعہ بھی تھا اور دوائی کی ایک شیشی بھی۔

"بھائی لوگو!" کاشی نے اس کا کندھا ہلا کر متوجہ کیا۔

"یہ تیرے لیے چور نے لو لیٹر بھی بھیجا ہے۔"

افراہیم بھی حیران حیران سا رقعہ دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہ ایک حیران کن

تحریر تھی۔
شکستہ سا انداز تحریر تھا۔ افراہیم الجھن کے عالم میں پڑھتا گیا۔ کاشی بھی تجسس کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جانے رقعے میں کیا لکھا تھا؟ اس کے اندر ڈھیروں بے چینی تھی۔
تمہیدی جملوں کے بعد آگے کچھ عجیب سا فلسفہ لکھا تھا۔ جسے پڑھ کر افراہیم کا دماغ سُن ہونے لگا۔
"وقت ہر تصور کو بدل دیتا ہے۔ وقت ایک کورا صفحہ ہے۔ جس کے کونے استعمال کی شدت سے مڑ جاتے ہیں اور اسے شکستہ کر دیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ وقت کا صفحہ الٹ دیں اور نئے صفحے پر زندگی کے تجربات رقم کریں۔" یہ کون تھا جو اس کے اندر اترنے کی کوشش کر رہا تھا؟ اور یہ کس نے لکھا تھا؟ آخر کس نے....؟
"اے گھر بھولے ہوئے پرندے! تمہاری زندگی ایک شکستہ صفحے پر ٹھہر چکی ہے۔ تمہارے اندر زندگی جمی ہوئی ہے۔ ظہران کی دھوپ بھی جسے پگھلا نہیں سکتی۔" لفظ تھے یا چابک؟ افراہیم درد کی شدت سے بلبلا بھی نہ سکا۔
"زخم جتنا بھی چھوٹا ہو' اس کی مسیحائی کی جاتی ہے۔" افراہیم کا سانس سینے کی قید میں تنگ پڑنے لگا۔ اس کی آنکھیں پستہ مجبور کی جھاڑی کی اوٹ میں کھڑی اس مہ رخ کا عکس دیکھ رہی تھیں۔ وہ لڑکی جو جھاڑی کے پاس بے نیاز کھڑی تھی۔ نہیں' وہ بے نیاز نہیں تھی۔ اس کا سارا دھیان افراہیم کی طرف تھا۔ اس لڑکی کی قوت مشاہدہ اور ذہن پڑھنے کی غیر معمولی قوت نے افراہیم کو دنگ کر دیا تھا۔ اس نے اس کے اندر کا راز پالیا تھا۔
"افراہیم ایک گناہ گار انسان ہے۔ افراہیم ایک جہنمی انسان ہے۔ افراہیم ایک راندہ ہوا انسان ہے۔ اپنے خاندان کا بھی اور اپنے خدا کا بھی۔" رقعہ اس کے ہاتھ میں بھینچ گیا تھا اور اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ اس پہ غشی طاری تھی۔ کاشی اس کی حالت پہ گھبرا اٹھا تھا۔ افراہیم بے ہوش ہو رہا تھا۔ اس کا سانس رک رک کر چل رہا تھا۔ کاشی اونچی آواز میں چیختا نکلا تھا۔ کچھ دیر میں ایمبولینس آگئی اور افراہیم کو اس میں ڈال کر ہسپتال لے گئے تھے۔
اور کاشی بے ہوش پڑے افراہیم کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ "کیا کوئی لو لیٹر پڑھ کے بھی بے ہوش ہو جاتا ہے؟"

✡ ✡ ✡

ہر سُو گہرا سناٹا اور گھور شام لو اسی۔ حالانکہ باہر معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بس اس کے اندر کا موسم ویران تھا۔
"اور اسے سرا قصور خطائی کا لگتا تھا۔ جو اس کا پیغام اور سامان کسی غلط جگہ پہنچا آیا تھا اور ادھر خطائی اپنی صفائیاں دے دے کر عاجز آچکا تھا۔
"خداوند پاک کی قسم! وہ افراہیم ہی تھا۔ شہد جیسی آنکھیں اور بال اور اس کے پیروں پہ گہرے زخم۔ میں کسی غلط جگہ سامان نہیں پہنچا کر آیا۔" افسون کا غصہ اور بے کلی کسی طور کم نہ ہوتی تھی اور اسی جھنجلاہٹ میں اس کی رطابہ سے بھی جھڑپ ہوئی اور زندگی میں شاید پہلی مرتبہ آبگینے سے بھی۔
"میں پہلے سے پریشان ہوں آبگینے! اوپر سے تم میرے لیے پروپوزل اٹھا لائی ہو۔" افسون نے جھنجلا کر کہا تھا۔ اس نئے آنے والا پروپوزل اور آبگینے کے دباؤ نے اسے سچ مچ پریشان کر رکھا تھا۔
"تو پھر تم بھی آر یا پار کا فیصلہ کیوں نہیں کرتیں؟ اگر افراہیم سے دل لگی کوئی لغزش ہے تو اسے بھلا دو۔ اگر محبت ہے تو قبول کرو۔" آبگینے نے اتنی آسانی کے ساتھ افسون کا اپنا آپ اس پہ عیاں کر دیا تھا۔ وہ لحہ بھر کے لیے ساکت رہ گئی تھی اور پھر خود بخود فیصلہ ہو گیا۔
وہ اپنے دل پہ اترنے والی اس پہلی واردات کی ساری داستان آبگینے کو سنا کر کچھ پرسکون ہو چکی تھی اور آبگینے اتنی پریشان ہوئی کہ اسے تسلی بھی نہ دے سکی۔
"بابا مان جائیں گے آبگینے؟" وہ رو دینے کو تھی۔

آبگینے کو اسے دلاسا دینا ہی پڑا تھا۔ "وہ مان جائیں گے اگر افراہیم انہیں پسند آگیا تو۔۔۔" اس نے افسون کے کپکپاتے ہاتھ کو نرمی سے دبایا۔

"بابا حسب و نسب اور قومیت دیکھیں گے؟ پھر کیا ہو گا آبگینے!"

"تمہاری ماں ایک مغنیہ تھی۔ ایرانی تھی۔ ایک الگ قوم، ایک الگ نسل، تمہارے دادا نے یہ فرق نہیں دیکھا تھا۔ اپنے بیٹے کی خوشی دیکھی تھی۔ فوزان کو بھی اپنی اولاد کی خوشی دیکھنی ہوگی۔ یہ ایک تاریخ ہے اور تاریخ اپنے آپ کو ضرور دہراتی ہے۔" آبگینے کا لہجہ ملائم تھا۔ اس دلاسا ہوا۔

اور اب افسون کو کیا کرنا تھا؟ افراہیم تک پہنچنا تھا۔

پھر جب وہ خطائی کے ہمراہ برج ہر روپہ پہنچی تو اس کا غصہ سوا نیزے پہ تھا۔ افراہیم کو ٹھیلے دار نے بھگایا تھا۔ چھٹیاں کثرت سے کرنے کی وجہ سے اسے کام سے فارغ کر دیا گیا تھا۔

اس کا سارا غصہ خطائی پہ اترا تھا۔ "یہ سب تمہاری نحوست ہے۔ جو بھی کام کرتے ہو غلط ہی کرتے ہو۔" وہ ایسے خالی ہاتھ تھی جیسے سب کچھ لٹا بیٹھی ہو۔ خطائی کا اس عزت افزائی پہ منہ پھول گیا تھا۔ پھر خطائی نے ادھر ادھر سے پتا کیا تھا تو کسی نے بتایا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے اور افسون نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسپتال چلنے کے لیے کہا تھا۔ "دل کے سلسلے بہت عجیب ہیں اور دل تک جاتے رستے بہت دشوار۔۔۔ یہ مرحلے آسان نہ تھے۔"

یہ دارالشفا کا ایک منظر تھا۔ سہ پہر ہو رہی تھی۔ ریتلے علاقوں سے مشک فام ہواؤں کا سندیسہ آرہا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ کھڑکیوں پہ گہرے پردے اور ماحول پر مہیب خاموشی کا راج تھا۔ وہ اسے دور سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بلکہ اسے نہیں۔ اس کے پیروں کو۔۔۔ اس کے زخموں پہ کھرنڈ آرہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے پیروں کی سمت آگئی۔ پھر اس نے اپنے مخملی ہاتھ سے افراہیم کے پیر کو چھوا تھا۔

اس کا لمس برف تھا یا آگ تھا؟ شعلہ تھا؟ یا شبنم تھا؟

اس کا مصاحب اپنی نیند کو شکست دیتا ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ وہ چونک گئی۔ پھر مسکراتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے تمہارے پیروں کی فکر تھی۔ صد شکر کہ زخم کا علاج ہو گیا۔" اس نے پیر چھونے کی وجہ بتائی تھی یا وضاحت کی۔ رافع افراہیم کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔

اس کے چہرے سے نقاب ہٹا ہوا تھا۔ وہاں روشنی تھی اور نہ ختم ہونے والی خوشی۔۔۔

رافع افراہیم تھک گیا اور تکیے پر گر گیا۔ وہ اس خوب صورت بلا کو اپنا تعاقب کرتے دیکھ کر بھی اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

"میرا مرض لاعلاج ہے۔ دنیا کے کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس اس کا علاج نہیں۔" وہ شاید خود سے مخاطب تھا۔ کیونکہ اس کی بڑبڑاہٹ بہت دھیمی تھی۔

"یہ ممکن نہیں۔۔۔ ہر بیماری کا علاج ہے۔ بیماری جسم کی ہو یا روح کی۔۔۔" افسون کے اگلے الفاظ نے اسے دو سو واٹ کا کرنٹ لگایا تھا۔ وہ اپنے دکھتے جسم کی تکلیف بھلائے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاں۔۔۔ افراہیم کی آنکھوں میں ہراس تھا۔ وہ ایک دم ان کالی آنکھوں سے ڈر گیا تھا۔ ان آنکھوں میں کھوج تھی اور چہروں سے دل کے راز جان لینے کی طاقت بھی۔۔۔

"تمہیں کیا لگتا ہے افراہیم! تم مجھ سے کچھ چھپا لو گے؟" اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔

"زندگی ایسی بے قیمت تو نہیں۔ جسے یوں ضائع کر دیا جائے۔" اس کی آواز ہر روز آتی تھی۔ بلاناغہ آتی تھی۔

وہ برا مانتا، غصہ کرتا، چپ رہتا، نہ بولتا، منہ پھیر لیتا، پھر بھی وہ آنے سے، فلسفہ سنانے سے، گھاؤ بھرنے سے باز نہیں آتی تھی۔

اسے بولتے رہنا تھا، وہ سنتا یا نہ سنتا، جواب دیتا یا نہ

دیتا۔ اس کی طرف دیکھتا نہ وکھنے۔ یوں کاشی سے لے کر افسون کے ڈرائیور تک ڈھیرے ڈھیرے سب ہی جاننے لگے تھے۔ کیا؟

"وہ اس کا اول ترین مقصد حیات ہے۔"

پھر ایک دن وہ اس عارضی ٹھکانے سے بھی رخصت ہو گیا تھا۔ رخصتی سے ایک دن پہلے افسون نے اسے اپنا کارڈ دیا اور پیار سے سمجھایا۔

"تمہیں کہیں بھی دوسری جگہ کام کرنے سے پہلے میرے پاس آنا چاہیے۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح یہ حکم نامہ خاموشی سے سنا تھا۔ گناہ گاروں کے سر جھکے ہی رہتے ہیں۔ اس جھکے سر کو فرماں برداری سے تعبیر نہ کیا جائے۔

وہ ایک اچھے علاج کے بعد افسون سے رخصت ہو کر چلا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر طہران کے بازاروں میں کھو جانے کے لیے۔

یہ طہران کی ایک گمنام سی بستی تھی۔

اور یہاں یہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ کاشی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس کے ہزار انکار کے باوجود بھی۔ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ جبکہ افراہیم چاہتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے خوار نہ ہو۔ کاشی کا کنبہ بڑا تھا۔ اور پیچھے مصیبت میں تھے بھی۔ وہ کچھ کمائے گا تو پیچھے بھیجے گا۔

اول تو مزدوری ملتی نہیں تھی۔ اگر مل جاتی تو رقم اتنی کم کہ گزارہ کرنا مشکل تھا۔ وہ ایک بوسیدہ کمرے میں تین اور لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور پورا دن جانوروں کی طرح اینٹیں ڈھوتے۔ یہ ہوائی مزدوری تھی۔ کبھی ملتی، کبھی نہ ملتی۔

پھر یوں ہوا کہ آزمائش کا یہ دورانیہ بڑھ گیا تھا۔ جس کمرے کو وہ باقی تین لوگوں سے شیئر کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کاشی کا جھگڑا ہو گیا اور انہیں اس ٹھکانے سے بھی نکلنا پڑا۔ اب خالی آسمان تھا اور بے سرو سامانی کا عالم۔ کئی کئی دن فاقوں کی حالت میں گزر جاتے تھے۔ نہ کام مل رہا تھا، نہ ٹھکانا۔ کبھی کسی فٹ پاتھ پہ سونا پڑتا۔ کبھی کسی چھپر تلے رات گزرتی۔

یہ تھا۔ پردیس۔ مزدوروں کا پردیس۔ ذلت، بھوک، تکلیف اور بے سرو سامانی۔ اس پردیس کے لیے لوگ اتنے کشٹ اٹھاتے ہیں اور آنکھوں میں خواب بھر کے آتے ہیں۔ کاشی کے حالات زیادہ ماٹھے تھے۔ پاکستان سے فون آتے۔ رقم کا تقاضا۔ اخراجات، بل، قرضے۔ پھر ایک دن کاشی نے اچانک یاد آنے پر اس کا بازو دبوچ لیا اور بڑی ہی امید کے ساتھ اس کی منت کی تھی۔

"تیرے پاس باجی کا کارڈ ہے نا افراہیم بھائی۔ باجی کو کال کرنا۔ وہ ہمیں اپنے پاس کام دے۔" اسے اتنے مہینوں بعد بھولی بسری "باجی" اچانک یاد آ گئی تھی۔

لیکن کاشی کی لاکھ منتوں کے بعد بھی افراہیم نہیں مانا۔ اسے کاشی کی "باجی" سے کوئی مدد نہیں لینی تھی۔ وہ زندگی میں دوبارہ کبھی بھی افسون کا سامنا کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ وہ افسون جو زبردستی اس کی زندگی میں گھسنا چاہتی تھی۔ مگر کیوں؟ اور اس کیوں کے بعد افراہیم کے پاس سوچنے کے لیے بھی کچھ نہیں بچتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک ایک دن پاکستان سے کاشی کے لیے کال آ گئی تھی۔ اس کی ماں کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ بھائیوں کے پاس علاج کے لیے پیسہ نہیں تھا اور ماں سرکاری اسپتال میں ناکافی سہولیات کی وجہ سے سسک سسک کر مر رہی تھی۔ اس رات کاشی پبلک فون بوتھ سے ٹکریں مار مار کر روتا رہا۔ پہلی مرتبہ افراہیم کے لیے کاشی کو دلاسا دینا بھی محال ہو گیا تھا۔

وہ بڑی کرب ناک رات تھی۔ وہ دونوں جاگتے رہے۔ کاشی رات بھر روتا رہا تھا اور افراہیم سوچتا رہا۔ فیصلہ مشکل تھا۔ بہت مشکل تھا لیکن ہو گیا۔

اسے کاشی کی خاطر زہر کا گھونٹ بھرنا ہی تھا۔ بالآخر ان چھوڑی ہوئی راہوں پہ چلنا ہی تھا۔ افراہیم نے مروڑ تروڑ کر پھینکے اس چھٹنے کارڈ کو کاشی کے بکسے سے نکال کر فون نمبر ذہن میں دہرایا اور اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کرنے چل دیا۔ پھر اگلے چار دن زندگی کے عجیب ترین دن تھے۔ اس ایک فون کال نے افراہیم کی تو نہیں البتہ کاشی کی زندگی بدل ڈالی تھی۔

انہیں ایک غیر ور کی انٹرویو کے بعد کام پہ رکھ لیا گیا تھا۔ انہیں آئل ٹینکرز کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ افراہیم آئل ٹینکرز کا انچارج تھا۔ تیل کے کتنے ٹینکرز روزانہ کارخانے سے بھر کے مختلف شہروں اور ملکوں کی طرف جاتے تھے؟ دن میں سیکڑوں اور ان کا حساب بڑا مشکل حساب تھا جو افراہیم کو اکثر بھول جاتا تھا۔ وہ گنتی میں غلطی کر دیتا اور شام کو "برج افسون" کے کیبن میں رکھی فائلوں پہ غلط اعداد و شمار لکھتا۔

نتیجتاً لاشاری کا غصہ، جھنجلاہٹ اور بڑبڑاہٹ...... لاشاری فائلیں اٹھا کر افسون کے سامنے لے جاتا اور غصے میں کہتا۔

"یہ نکما ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے پہ نہیں۔ آئل کی جگہ مسائل لکھتا ہے۔ اعداد کی جگہ عذاب لکھتا ہے۔ گنتی کا ہیر پھیر اربوں کا نقصان ہے۔ ایک دن میں تین سو ٹینکر ایک کارخانے سے نکلتے ہیں۔ وہ تین سو کی جگہ تیر لکھتا ہے۔ گنتی میں اس غلطی پر فراڈ کا کیس بن سکتا ہے۔"

وہ تحمل سے سنتی رہتی۔ جب لاشاری بول بول کر تھک جاتا تھا۔ تب وہ راکنگ چیئر پہ جھولتی بڑی سنجیدگی اور بُردباری سے کہتی۔

"آپ کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے اور عمر بھی...... میں آپ کی بات کو غلط تو نہیں کہہ سکتی۔ ٹھیک ہے، وہ غلطی کرتا ہے۔ فراڈ کا کیس اعداد کی غلطی سے بن جاتا ہے اگر فراڈ ثابت ہو سکے۔ جب وہ ریال سے بینک بھرنے لگے یا منی لانڈرنگ کرنے لگے۔ جبکہ وہ آپ کی کمپنی سے صرف تنخواہ لیتا ہے۔ اکثر تنخواہ لینا بھی بھول جاتا ہے۔ اگر وہ تنخواہ بھول سکتا ہے تو کچھ بھی بھول سکتا ہے۔ آپ اس کی غلطی کو نظر انداز کیا کریں۔" کی رنگ گھماتی افسون کی عقل پہ لاشاری کا دل چاہتا ماتم ہی کرے۔ وہ باپ کی محنت اور اس کے سرمائے کو ڈبو دینے کو تیار بیٹھی تھی۔

لاشاری اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے سارے ورکرز کو ہی اندازہ ہونے لگا تھا۔ افسون مشہدی کی خصوصی نظرِ عنایت اس نالائق ترین لڑکے پہ ہے۔

اور کاشی کہتا تھا۔ "قسمت اچھی ہو تو سب کچھ ہی اچھا ہوتا ہے۔"

افسون نے اس کی پشت پہ ہاتھ رکھا تو کاشی کی قسمت کا تالا آپوں آپ کھل گیا۔ اولاً وہ کمپنی کا ڈرائیور بنا۔ پھر اس کی مہارت دیکھ کر اسے آئل ٹینکرز کی ڈرائیونگ سونپ دی گئی۔ کمپنی نے اس کا لائسنس بنوا دیا تھا۔ جو پردیس میں بننا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کاشی کی قسمت کا ستارہ چمک گیا تھا۔ وہ محنتی تھا۔ دل لگا کر کام کرتا۔

اور افراہیم اس دن کے انتظار میں تھا جب کاشی کے قدم اس دھرتی پہ اچھی طرح سے جم جاتے۔ وہ کاشی کی وجہ سے ہی افسون کی کمپنی میں ملازمت پہ تیار ہوا تھا۔ افسون کی "نظرِ کرم" اول روز کی طرح ہی تھی۔ دفتر آتی تو اپنے کمرے تک محدود رہتی۔ باہر آزادانہ ملنا، نہ اس کا خاندانی وقار اس کی اجازت دیتا تھا، نہ قانون۔

اسے اپنی خاندانی اور اخلاقی قدروں کا بھی احساس تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اسے اپنے جذبوں، محبت اور دل کا بھی احساس تھا۔ پھر ایک دن وہ ہو گیا جو افراہیم کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ جس شعلے سے وہ بچنا چاہ رہا تھا۔ وہ آگ اس کے دامن سے لپٹ گئی تھی۔ وہ جزیرہ ہوائی کے ابلق ساحلوں پہ لشکارے مارتا ایک ایسا ہیرا تھی جو کانچ سے بنا تھا اور بدقسمتی سے افراہیم کے ہاتھ آ لگا تھا جسے اس نے اپنے گمان میں توڑ دیا۔ اسے چاہیے تھا اپنے سارے درد اس کے حوالے کر دیتا۔ خود کو ہر بوجھ سے آزاد کر دیتا۔ پر وہ اتنا حوصلہ کہاں سے لاتا؟ اپنا آپ عیاں کیسے کر آتا؟ وہ اتنا بہادر ہوتا تو کیا طہران کی گلیوں میں دھکے کھاتا؟

☼ ☼ ☼

سنہرا کارڈ تپائی پہ رکھا تھا۔

وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں موجود تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ ہاں اس کی دردناک آواز، فسوں خیز تنہائی

میں اس کی ساتھی تھی۔

وقت کا سیل رواں
جس کے اس پار کہیں رکھی ہے
گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب
اور اس پار فقط خواب ہی خواب
تیری یادوں کے کنول
تیری جدائی کے گلاب

اس کی آنکھوں میں لالی اتر آئی۔ ان آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ لہو کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ "کیا تم کو پتا ہے عنایہ! خواب آتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔" وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اور باہر پھیلی تپش کو دیکھ رہا تھا۔ اسے "برج ہریرہ" میں اپنی مزدوری کے دن یاد آنے لگے۔

جب وہ بجری' اینٹیں' پتھر اور سیمنٹ کی بوریاں اٹھاتا تھا۔

اس دن سیمنٹ کا ٹرک آیا تھا۔ اور اسے خالی کرنا تھا۔ سیمنٹ اتار کے گودام میں محفوظ کرنا تھا۔ وہ سب مزدوروں کی طرح اپنے کام میں گم تھا۔ وہ سیمنٹ کی بوریاں ٹرک سے اتار رہا تھا۔ اور اس کے کان سنتے تھے۔

پھر کاشی سے کسی ادھیڑ عمر مزدور نے کہا۔

"اپنے بھائی سے کہو۔ کوئی گیت سناوے۔ یہ آگ یہ گرمی' برسات میں بدل جائے۔"

ادھیڑ عمر "چاچا" شوقین مزاج تھا۔ کام کے دوران ریڈیو لگا لیتا۔ دھنیں' سنتا' موسیقی پر سر دھنتا۔ اور اس کے ہاتھ میوزک کی لے پہ بہت تیز چلتے تھے۔ وہ میوزک کے ساتھ چلتا تھا۔ بلکہ دوڑتا تھا۔ وہ "چاچا میوزک" تھا۔ کسی نے چاچے کو بتایا تھا۔

"کاشی کا بھائی کوئی بڑا موسیقار ہے۔ ایسی آواز کہ گیت کے ساتھ دھن نہ بھی لگے تو سواد آجائے۔ روح پھڑک اٹھے۔ مجمع پہ سکوت چھا جائے۔" یہ ہوائی نہیں تھی۔ سچائی تھی۔ کاشی کے "بھائی لوگ" کی آواز لوگوں پہ سکتہ طاری کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔

"ڈر ہے وہ مودائی؟ کبھی نہیں مانے گا۔ بولتا تو ہے نہیں کسی سے۔ بات کریں تو پتھر اٹھا کر پیچھے ہی نہ پڑ جائے۔" کسی نے ڈر کے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ بوریاں ٹرک سے اتارتا افراہیم چونکا' ٹھٹکا اور پھر کام سے لگ گیا۔ لیکن ان کی آوازیں۔۔۔۔؟ کلن پھاڑتی تھیں۔

"کاشی سے کہو نا۔ اس کی بات نہیں ٹالتا۔" کسی اور نے مشورہ دیا تھا۔ چاچا کاشی کو گھسیٹ لایا۔ اور کاشی افراہیم کے پیچھے لگ گیا۔

"میری عزت کا سوال ہے۔ سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ بھائی لوگ میری بھی بات نہیں مانتا۔" کاشی کی منتیں۔

وہ بوریاں اٹھاتا رہا۔۔۔۔ اور تانیں سوچتا رہا۔ کوئی گیت' کوئی نغمہ جو کاشی کو بے عزتی سے بچا سکے۔ اسے جھکے برآمدوں والا ایک گھر یاد آیا۔ جس کے پچھواڑے میں مستقبل کے ایک عظیم موسیقار کا اثاثہ دفن تھا۔ ایسا موسیقار جو اپنے فن میں عروج کمال سے پہلے ہی طبعی موت مر گیا۔ یا اسے مار دیا گیا۔ اس کے شوق' لگن' جنون کو ختم کر دیا گیا۔

اس کا وائلن' اس کا چھوٹا سا ہارپسی کارڈ' اس کے تخلیق کیے ہوئے نغمہ ہائے سوز (Scores) اور اس کی تصویریں۔ وہاں موسیقی کے شائقین کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اور نانی غصے میں زیر لب بڑبڑاتی تھیں۔

"استغفراللہ' ساری دنیا کے نکمے اکٹھے ہو گئے۔"

اور نانا گھر ہوتے تو لاٹھی اٹھا کر کہرام برپا کر دیتے۔

"میراثی' گویئے' ڈوم۔ میرے گھر میں حرام کام نہیں ہوں گے۔ نکل جاؤ یہاں سے۔" ہر وقت ایک ہی آواز۔ "نکل جاؤ۔ نکل جاؤ۔ نکل جاؤ۔"

وہ بوریاں اٹھاتا رہا اور آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

"نکل جا کمینے' نکل جا۔ تیری کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔ میرے گھر میں' میرے شہر میں' میرے دیس میں' میرے دل میں۔" اس کے منہ پہ جوتے لگ رہے تھے۔ اور وہ کراہ بھی نہیں سکا۔ چیخ بھی نہیں سکا۔ رو

بھی نہیں سکا۔

"بھائی لوگ! گانا سنانا۔" کاشی کا اصرار' تکرار' خواہش۔۔۔؟ وہ اس کے بوسیدہ تھیلے سے آخری قیمتی اثاثہ بھی اٹھا لایا تھا۔ کام میں "کھانے کا وقفہ" ہو گیا۔ مزدور تھک ہار کر چھپر تلے اکٹھے ہوئے۔ کوئی روٹی کھول رہا تھا۔ کوئی گنگال میں سے پانی نکال رہا تھا۔ اور کوئی اینٹ کو تکیہ بنائے گھر کو یاد کر رہا تھا۔ کسی نے تان لگا رکھی تھی۔ کوئی ماہیا گا رہا تھا۔ کسی کو "ڈھولن" یاد آرہا تھا۔

وہ بوریاں ڈھوتے ڈھوتے تھک گیا۔ اس کی کمر پہ زخم آگئے تھے۔ جو پسینے سے چپکی قمیص تلے رستے خون کی وجہ سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

وہ چھپر تلے آیا تو "چاچا میوزک" پھڑک اٹھا۔ ایک دفعہ پھر اصرار تھا۔ بحث' ضد' اس نے کاشی کے ہاتھ سے بانسری پکڑلی۔ جب وائلن نہ ہو تو بانسری سے کام چلانا' محفل کو بام عروج پہ لے جانا۔ افراہیم کا کمال تھا۔

میں تو ایک کاغذی پھول تھا سر شام خوشبو سے بھر گیا
میں کہاں کہاں مجھ کو خبر نہیں مجھے کون چھو کے گزر گیا
میں اداس چاند کا باغ ہوں' میں گئے دنوں کا سراغ ہوں
میری شاخ شاخ جھلس گئی' مرا پھول پھول بکھر گیا

اس کی انگلیوں پہ زخم آگئے۔ وہ یہ نہیں گا سکتا۔ وہ کچھ بھی نہیں گا سکتا۔ اس کے گلے کا سر سراب بن چکا تھا۔ گیت سوچتے ہوئے اسے کوئی اور بھی شدت سے یاد آیا تھا۔ نیلی آنکھوں والی گلابی گڑیا۔ اور اس کی ضد۔ "گانا سناؤ۔ گاتے ہو یا لگاؤں دو ہاتھ۔" نیلی آنکھیں غصے سے بھری تھیں۔

افراہیم کے اندر کوئی اترنے لگا۔

"تمہاری بات کبھی ٹالی ہے عنایہ! تم کہو' اور میں نہ سناؤں؟" افراہیم نے کاشی کے ہاتھ سے بانسری پکڑلی تھی۔ اور کاشی منہ کھول کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ بھائی نے کیا کہا؟ عنایہ؟ کیا بھائی کا دماغ چل گیا؟ میں کاشی سے عنایہ ہو گیا؟" وہ ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ ساکت اور دنگ کیونکہ اس کے ساتھ چھپر تلے سارا مجمع بھی ساکت تھا۔

بانسری کی لے پہ ایک دھن بکھر رہی تھی۔ یوں کہ روٹی کھانے والا مزدور منہ میں روٹی لے جانا بھول گیا۔ گنگال سے پانی ڈالنے والا پانی ڈالنا بھول گیا۔ ماہیے والے کو ماہیا بھول گیا۔ ایک سکوت تھا جو قرب و جوار پہ طاری تھا۔ ایک خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو آواز آجاتی۔

وہ سیمنٹ کی ایک بوری پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اور مجمع پہ سحر پھونک رہا تھا۔

اس کے پاس بیٹھے' کھڑے' لیٹے نچلے طبقے کے مزدور تھے۔ پردیسی' دکھی اور گھروں سے دور۔

"ساقی پلا' اتنی پلا کہ گھر کو چلوں میں اڑتے ہوئے۔"

عرب کے ریگستانوں میں طوفان آگیا تھا۔ چھپر تلے جیسے بھونچال آگیا تھا۔ تھکے' ماندے' بکھرے ٹوٹے مزدور اونچی آواز میں شور کرنے لگے' ناچنے لگے' جھومنے لگے۔ چیخنے لگے۔ بولوں کے ساتھ تانیں لگانے لگے۔

پردیسیا' او' دلریا! صورت دکھا۔

بانسری درد تھی' بانسری کرب تھی۔ بانسری یاد ماضی تھی' جس کے پیچھے عنایہ تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں تھیں۔

وہ آنکھیں نہیں تھیں۔ وہ دو گڑھے تھے۔ جس میں افراہیم گرا تھا اور آج تک اٹھ نہ سکا تھا۔

وہ دو آنکھیں نہیں تھیں۔ دو کنویں تھے۔ جن میں افراہیم ڈوبا تھا۔ اور آج تک ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس کے کنارے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ قرمزی گاؤن' سرخ ریشمی معجو والی۔ جس کے ہاتھ میں روشن شمع تھی۔

کیا وہ لڑکی اسے روشنی دکھا کر اندھیروں سے نکالنے آئی تھی۔ یا اندھے کنویں سے نکال کر جلانے آئی تھی؟ اور اس وقت وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ سنہرا کارڈ اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ وہ گھبرا کر پھر سے باہر دیکھنے لگتا۔

اور کاشی بیانگ دہل کہتا تھا۔

"بھائی لوگ! تم کب سمجھو گے؟ خوش قسمتی بار بار

دروازے پہ نہیں آئی۔ "بس کو مت مونو۔ باجی کا دل مت توڑو۔" کارڈ کے ساتھ آج بھی ایک رقعہ آیا تھا۔ جس کی تحریر کاشی نے پڑھی تھی۔

"ہم جانتے ہیں۔ ہمارے ورکرز میں سے کچھ لوگوں کو خداداد صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں۔ آپ کو اپنے "دیوان خاص" میں بلائیں۔ آپ کی نغمہ سرائی سے اپنے والد کو اور ان کے مہمانان گرامی کو چونکائیں۔ بعد عشا "افسون حرم" میں آپ کی آمد ہمارے لیے ایک اعزاز ہوگی۔"

نیچے خوب صورت لکھائی میں "افسون مشہدی" لکھا تھا۔ اور افراہیم کا دل بند ہونے لگا۔ اس نے لب بھینچ لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ آج ایک ہفتے بعد بھی اس کی ہمت، طاقت اور حوصلہ اسے افسون حرم تک جانے پر مجبور کرنہ سکا تھا۔

کاشی سر پٹخ پٹخ کر تھک گیا۔ افسون پیغام بھیج بھیج کر عاجز آگئی تھی۔ خطائی دھوپ میں کھڑا رہ کر جھلس گیا تھا۔ لیکن افراہیم کی "ناں" ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ یہاں تک کہ اسے عرب کی کاروباری دنیا کے سب سے بڑے، عالی مرتبہ جاہ و حشم کے مالک فوزان مشہدی کا پیغام مل گیا تھا۔ اور اس پیغام پہ وہ ہراساں ہوگیا تھا۔ اب وہ انکار کرتا تو کس منہ سے کرتا۔

وہ زہر کے گھونٹ بھر کے "افسون حرم" جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اور کاشی مارے خوشی کے بھنگڑا ڈال رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک نجی محفل تھی۔

تاحد نگاہ پھیلے ہوئے فرشی سبز قالین پہ دیدہ زیب نشستیں تھیں۔ دیوان خاص کی قیمتی چھت پہ روشنیاں منعکس کرتے عالی شان فانوس روشن تھے۔ کونوں میں موم بتی کی شکل کے اسٹینڈ تھے۔

دیوان خاص میں رنگ و بو کا ایک سیلاب تھا۔ فوزان مشہدی کا پورا قبیلہ مدعو تھا۔ پورا خاندان۔ جو دو سو گھروں پر مشتمل تھا۔

آج ان کے لاڈلی شریک حیات کا جنم دن منایا جارہا تھا۔ انگریزوں کی ایک رسم۔ جو انگریزوں کے درمیان رہ رہ کران کی زندگیوں کا بھی لازمی جزو بن چکی تھی۔

فوزان مشہدی انتظامات پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر دیوان خاص سے باہر نکلے تو آبگینے سے گفتگو کرتی افسون قدرے پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ نہیں آرہا۔" اس نے بھرائی آواز میں آبگینے سے کہا تھا۔ اپنے آویزوں کو کانوں میں پہنتی آبگینے نے لاپروائی سے پوچھا۔

"کون؟"

"میرا سرپرائز۔" افسون کی آنکھوں کی سیاہی میں چمکیلے آنسو اندھیرے میں گم ہوتے اور نظر آتے جگنوؤں کی مانند چمک رہے تھے۔ فوزان مشہدی لمحہ بھر کے لیے چلتے چلتے تھم گئے تھے۔

افسون کس کی بات کررہی تھی؟ کون تھا ایسا خاص؟ جس کے نہ آنے پہ ان کی لاڈلی "نور نظر" کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کا رکنا، ٹھہرنا اور تھمنا ایک فطری عمل تھا۔

پھر ان دونوں کی آواز ایک بھنبھناہٹ میں بدل گئی تھی۔ وہ جھنجلا گئے تھے۔ افسون پریشان تھی؟ روتی تھی؟ غم زدہ تھی؟ کس کے لیے؟ ان سینکڑوں لوگوں میں کون ایسا خاص تھا۔ جو ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ ان کی اطلاع کے مطابق سب مہمان آچکے تھے۔ تو پھر آخر کون؟

وہ چلتے چلتے رک سے گئے تھے۔ پھر ان کی عقابی نگاہوں نے خطائی کا پیچھا کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں خطائی ان کے سامنے تھا۔ گھبرایا ہوا۔ پریشان۔ خطانہ کرتے ہوئے بھی وہ خطائی تھا۔

"کسی کو آنا تھا یہاں؟" ان کا کڑک لہجہ اور دبنگ انداز۔ خطائی جھوٹ بولنے کی خطا نہ کرسکا تھا۔ اس کا سراثبات میں ہل گیا۔

"جی۔"

"کون ہے وہ؟" سوچتا ہوا بردبار لہجہ۔ سنجیدہ آنکھیں، دھیمی آواز۔ وہ کھوجتی نگاہوں سے خطائی کو

دیکھ رہے تھے۔ وہ افسون کا ڈرائیور تھا۔ اور جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

"ایک موسیقار ہے۔ دھن بناتا اور گیت سناتا ہے۔" خطائی نے سر جھکا کر بتا دیا۔

"نام؟" ایک اور سوال۔

"افراہیم۔" انہوں نے اچھنبے سے خطائی کی طرف دیکھا تھا۔

"کام؟" وہ چونک گئے تھے۔ ٹھٹک گئے تھے۔ رک گئے تھے۔

"انچارج ہے آئل ٹینکر کا۔" خطائی نے اپنا سانس روک لیا تھا۔

"اس کی اتنی ہمت کہ میری بیٹی کو انکار کرے۔ اسے جاکر کہو۔ فوزان مشہدی بلاتے ہیں۔ نہ آئے تو میری بات کروانا۔"

اور خطائی جب واپس جارہا تھا۔ تو اس کے قدم اٹھتے کہیں تھے اور پڑتے کہیں تھے۔ وہ مالکن کے مصاحب کو لینے جارہا تھا۔ وہ مالکن کی آنکھوں میں خوشی بھرنے جارہا تھا۔

اور پھر ریگ رواں پہ چلتے وقت نے بھی حیرت سے دیکھا۔ وہ آگیا تھا اور اسے آنا ہی تھا۔ ستارے کب اپنے مدار سے ہٹ سکتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔

دیوان خاص کے مہمان اب کھلے آسمان تلے موجود تھے۔ ظہران کا چاند پورے طمطراق سے جلوہ افروز تھا۔ اس کے لیے ایک خوب صورت چبوترہ بنوایا گیا تھا۔ اور وہاں ایک ایسی چیز بھی تھی جس نے اسے لمحہ بھر کے لیے ساکت کردیا۔ "وائلن" جو اسے جھکے بر آمدوں کے اس گھر میں لے گیا تھا۔ وہ پچھواڑے والا خاموش کمرہ۔ جس کے اندر اس کا اثاثہ پڑا تھا۔ اور عنایہ گھٹنے موڑ کر وہاں بیٹھتی تھی۔ اور ٹھوڑی پہ کہنی ٹکا کر موسیقی سنتی تھی۔ وہ جب بھی وائلن بجاتا تھا۔ عنایہ کے لیے بجاتا تھا۔ اور آج اس قسم کو توڑ رہا تھا۔ آج وہ افسون کے لیے وائلن بجا رہا تھا۔ اس کی آواز نے لمحہ بھر میں ہی پورے لان میں سکوت طاری کردیا تھا۔

اور ایسے ہی افسون بھی سکتے کے عالم میں تھی۔

اسے یقین ہی نہ آتا تھا۔ اور وہ اپنی "فسوں خیز" آواز سے محفل کو لوٹ رہا تھا۔

"یہ ایک کھلی چاندنی رات ہے۔ اور میں دریائے ٹیمز کی لہروں پہ بہتے ہوئے ایک شاہی بجرے میں موسیقی سنا کر اپنے بادشاہ کا دل موہ لینا چاہتا ہوں۔

بے تھون ایسا موسیقار ہے۔ جو پوری توجہ اور انہماک چاہتا ہے۔ آیئے اور میرے ساتھ موسیقی کی مخمور دنیا میں کھو جایئے۔ میں آپ کو بے تھون کی موسیقی پہ تیرتا ایک نغمہ سناتا ہوں۔" افراہیم کی گونج دار آواز نے غیر ملکی، دیسی بدیسی مہمانان گرامی کو ایک سحر میں مبتلا کردیا تھا۔ اس کی آواز جادو جگاتی تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔

ان سے بہت دور اونچے چبوترے پر وائلن کے ساتھ ایک جنگ کی کیفیت میں افراہیم اپنے آپ میں نہیں تھا۔

"یہ گنہگار ہے۔ کمینہ ہے۔ اپنے نیک ماں باپ کے نام پر دھبہ ہے۔" کوئی اس کے منہ پہ جوتا مار رہا تھا۔ کوئی اسے بالوں سے کھینچ کر باہر نکال رہا تھا۔

"گندگی کی پوٹ۔ بدنیت، نکل جا۔ دور نکل جا۔ بہت دور چلا جا۔" وہ اسے ٹھڈے مار رہے تھے۔ کف اڑا رہے تھے اور وہ ان کے قدموں میں گڑ گڑا کر منتیں کرتا تھا۔

"نانا! ایک موقع۔ معافی کا ایک موقع۔ اللہ بھی توبہ کا ایک در دکھلا رکھتا تھا۔ مجھے ایک موقع۔" ٹھڈا اس کے منہ پر پڑا تھا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اور لہو کی پھوار نکلی تھی۔

"کوئی معافی نہیں۔ کوئی حرف نہیں۔ کوئی لفظ نہیں۔" وہ چلائے تھے۔

"نانا! میں... نانا! عنایہ..." افراہیم ان کے پیروں میں گر گیا۔

"مرگیا تو... مرگئی عنایہ۔" انہوں نے نفرت سے کہا اور اسے دھتکار کر چلے گئے۔ وہ چیخنے لگا تھا۔ جیسے اب چیخ رہا تھا۔ حواس سے بے گانہ ہو کر۔ بن پیے مدہوش ہو کر۔

"اور میں گناہ کے سفر میں اکیلا ہوں۔" گیت کے بول اس کی روح کو زخمی کر رہے تھے۔ وہ ننگے پیر ریت پر بھاگ رہا تھا۔ گرم ریت' آبلہ پائی کا سفر۔ آگ اگلتا سورج۔ عرب کا صحرا۔ اور اندھا دھند بھاگتا ہوا ایک گناہ گار۔

"میں گناہ کے سفر میں اکیلا نہیں ہوں۔ ہاں' نہیں ہوں۔ عنایہ میرے ساتھ تھی۔ وہ برابر کی گناہ گار تھی۔" وہ اونچی آواز میں چیختا رہا اور آسمان روتا رہا۔ رات بھر روتا رہا۔

وائلن کے تاروں پہ تھرکتی انگلیاں ایک دم ساکت ہو گئی تھیں۔ گیت ختم ہو گیا تھا۔ موسیقی کی آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ لیکن **مجمعے** کا شور۔

"ونس مور' ونس مور۔" غیر ملکی مہمانوں کی فرمائش نے اسے چبوترے اور وائلن کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

محفل اپنے عروج پر تھی جب طعام کا وقفہ آ گیا تھا۔ افسون کی بے چین نگاہوں نے اسے ہجوم چیر کر ایک خاموش کونے کی طرف بڑھتا دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ اور ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پیے گا۔

اور اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں آئے گی۔ افراہیم کی اس طرف پشت تھی۔ جہاں وہ کھڑی تھی۔ سرخ محرابی ستون کے پاس۔ اور اب اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس حال میں کہ افراہیم کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

وہ ایک دلکش مقامی ملبوس میں تھی۔ اس کا گاؤن پیروں سے۔ بہت نیچے تک زمین پر سجدہ ریز تھا۔ جب وہ چلتی تو ریشمی فرل دور تک گھسٹتی جاتی تھی۔

"کون سا غم جان کو لگا رکھا ہے افراہیم! کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟" وہ ملامت سے پوچھ رہی تھی۔ افراہیم نے سر نہ اٹھایا۔ اس کے سوالوں پہ اب وہ ہیجانی غصہ نہیں نکلتا تھا۔

"تمہیں کیوں بتاؤں؟" افراہیم نے دھیمی مگر زہریلی آواز میں کہا تھا۔ افسون لحہ بھر کے لیے چپ رہ گئی تھی۔

"کیا تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے۔" اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ افراہیم تھا۔ انتہائی کٹھور۔ افسون نے یہ وار بھی دل پہ سہ لیا تھا۔ پھر اس نے بات بدل دی تھی۔

"میرے بلانے پہ آجانے کا شکریہ۔" اس کی آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"تمہارے باپ کے بلانے پہ آیا ہوں۔ تو۔ شکریہ بھی تمہارے باپ کا قبول کروں گا۔"

"میرا باپ بلائے یا میں۔ بات تو ایک ہی ہے۔ لیکن کوئی سمجھے تو تب نا۔" وہ مسکراتی رہی۔

"تم چاہتی ہو یہاں سے چلا جاؤں؟۔" افراہیم نے آنکھوں میں غیض بھر کے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" اس نے ایک جذب سے کہا تھا۔ افراہیم ٹھٹک گیا۔ یہ بھی عجیب لڑکی تھی۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔

جب وہ لان کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تب بھی افسون کی آواز اس کے پیچھے آرہی تھی۔

"تم مجھے کچھ بھی نہ بتاؤ افراہیم! میں پھر بھی سب جانتی ہوں۔" افسون کی آواز نے اس کے قدم روکنا چاہے تھے مگر وہ نہیں رکا تھا۔

"تم نے کہا تھا۔ افراہیم! تمہارے مرض کا کسی کے پاس علاج نہیں۔ دراصل تمہارے مرض کی کسی کے پاس تشخیص نہیں۔ تم جاننا چاہو گے افراہیم! تمہیں کون سا مرض لاحق ہے۔ تو سنتے جاؤ اے گھر بھولے ہوئے پرندے! تمہیں "مرض عشق" نہیں۔ "مرض ندامت" لاحق ہے۔" وہ زینے کے پہلے قدمچے پر کھڑی تھی۔ اور افراہیم آخری قدمچے کے کنارے پہ۔ اس حال میں کہ افسون حرم کی ایک ایک اینٹ اس کے سر پر گرا رہی تھی۔ اور وہ دھیرے دھیرے اس ملبے تلے دبتا جا رہا تھا۔ یہ افسون نے اس کے ساتھ کیا کر دیا تھا۔ اسے "یاد ماضی" کے کس تاریک گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔

٭ ٭ ٭

اور یہ ظہران کا جیل خانہ تھا۔ ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ۔ جس کی چھت اونچی نہیں تھی۔ اور جہاں وہ "قید" بھگت رہا تھا۔

افراہیم نے سر دیوار سے لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتا تھکن سے چور تھا۔ اور نہایت تکلیف میں تھا۔

افراہیم کو یاد آیا۔ وہ کس سے بھاگ رہا تھا۔ کس سے بھاگ کر ظہران چھوڑ رہا تھا۔

"افسون سے 'اس کی محبت سے 'اس کے عشق سے۔" وہ اس کی محبت سے بھاگتا تھا۔ اور وہ سلطنت دل کی بھاری ذمہ داری اٹھانے سے بھاگتا تھا۔

افراہیم کو یاد آیا۔ وہ دن جب اس نے ظہران چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

کاشی کے دوبئی میں قدم جم گئے تھے۔ اب وہ اپنا ذاتی ٹینکر چلاتا تھا۔ افسون کی محبت اب رشتے کی کوئی زنجیر چاہتی تھی۔ اور افراہیم کے پاس رشتوں کے نام پر افسون کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جس شب افسون نے اپنا پروپزل لانے کے لیے افراہیم کو مجبور کیا تھا۔ اس سے اگلے دن ہی افراہیم نے اپنے ویزے پہ جعلی "خروج" لگوایا اور ہمیشہ کے لیے ظہران چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

افسون کو اس کے ملک چھوڑ کر بھاگنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ اور وہ نہ صرف ہوائی اڈے پر پہنچ گئی تھی بلکہ اس نے افراہیم کے خلاف کیس بنوا کر حوالات میں بند کروا دیا تھا۔ اب وہ بھاگ کے کہاں جاتا۔

وہ ہار گیا تھا۔ افسون کی محبت کے سامنے ہار گیا تھا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور سر محبت کے قدموں میں جھکا دیا تھا۔ وہ عشق کی دیوی کے چرنوں میں بیٹھ گیا تھا۔ اور محبت کے وجدانی گیتوں پر سر دھن لیا تھا۔ وہ محبت کے سامنے جھک گیا تھا۔ وہ تکبر سے محبت کو ٹھڈا مار کے جانے سے ڈر گیا تھا۔ وہ اپنے انجام سے ڈر گیا تھا۔

اس نے محبت کے نام پہ ایک مرتبہ پھر جوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا؟

جانے ہار ملتی یا جیت؟

جانے ذلت ملتی یا عزت؟

جانے محبت ملتی یا نفرت؟

وہ محبت کے قدموں میں کشکول رکھنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ افسون کی چاہت کے سامنے جھک جانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

٭ ٭ ٭

"محبت پربتوں کے دامن سے پھوٹنے والے جھرنے کی طرح اپنی سمت اور اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔" کسی نے کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا۔ محبت نے اپنی راہیں نکال لی تھیں۔ یہ چور راستے نہیں تھے۔ یہ صاف منزل اور صاف رستہ تھا۔ پھر الجھاؤ کہاں پہ آیا؟ رکاوٹیں کہاں سے آئیں؟

وہ رطابہ کے سامنے بیٹھی اپنی بحیرہ اسود کے کالے پانیوں جیسی آنکھوں کو رگڑتی گہرے غم میں مبتلا تھی۔ اور شاید وقت عصر اس پر لمبا ہو جاتا جب اچانک ہی آبگینے نے اسے مژدۂ جاں فزا سنا ڈالا تھا۔ افراہیم نے قید خانے سے اس کے لیے پیغام بھیجا تھا۔

"افسون جاں! تیرے دل کا قید خانہ 'ظہران کے اس قید خانے سے اچھا ہے۔"

یہ مثبت لفظوں کا کوئی جملہ نہیں تھا۔ اس میں افسون کے لیے زندگی گزارنے کا اسم لکھا گیا تھا۔ افسون کو زندگی آگے بڑھانے کا سہارا مل گیا تھا۔

وہ اسے ملتا یا نہ ملتا۔ اس کے نصیب کا حصہ بنتا یا نہ بنتا؟ کیا اتنا کافی نہیں تھا کہ اس نے افسون کی محبت کو قبول کرلیا تھا۔ اور آگے تو نصیبوں کے کھیل تھے۔ اور کھیل میں تو ہار جیت، ہوتی ہی ہے۔

ان دنوں ظہران پہ رقص کا موسم تھا۔

یوں لگتا تھا۔ بوٹے قد کے پام سے لے کر لان کا ایک ایک بوٹا اس کے ساتھ مسرور ہے۔ اور چاہت کا دعائیہ کلمہ پڑھتا ہے۔

زندگی سے اور کیا چاہیے تھا؟ فقط ایک محبت!" ایک چاہت سے لبریز نگاہ

اس نے افسون کے لیے ملنے کا پیغام بھیجا تھا۔ اور افراہیم نے اسے یوں ہی نہیں بلایا تھا۔ وہ اسے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ یا کچھ کہنا چاہتا تھا۔

قریباً" ڈیڑھ ماہ پہلے فوزان بابا نے کمپنی کی طرف سے کیے گئے کیس کو واپس لے لیا تھا۔ اسے قید سے رہائی مل گئی تھی۔ اور افراہیم کو ملازمت پہ بھی بحال کر دیا گیا تھا۔ اب وہ کام کرتا تھا۔ بہت دل سے تو نہیں، بہرحال پہلے سے کچھ بہتر کارکردگی دکھا رہا تھا۔

آبگینے چاہتی تھی وہ رطابہ کو ساتھ لے جائے۔ لیکن افسون نے انکار کر دیا تھا۔

اس کے مختصر فلیٹ میں جانے سے پہلے افسون نے خطائی کو روک کر ایک فلاور شاپ سے سفید گلابوں کا بوکے ۔۔۔ لیا تھا۔ پھر افراہیم کے فلیٹ کی بلڈنگ تک پہنچ کر خطائی سے کہا۔

"تم میرا نیچے انتظار کرو۔" خود وہ اپنا سوتی پیروں کو چھوتا گاؤن سمیٹتی فلیٹ کی طرف مڑ گئی تھی۔

افراہیم کی رہائش پہلے کی نسبت بہت بہتر تھی اور خود وہ اپنی قابل رشک صحت کے ساتھ ساتھ پہناوے میں بھی پہلے سے بہت بہتر معلوم ہوتا تھا۔ صاف ستھرا لباس، شفاف چہرہ، مسکراتی پیشانی اور پُرسوز آنکھوں میں جما ہوا مدھ۔ وہ اسے آج بھی اول روز کی طرح دل سے قریب لگا تھا۔

"خوش آمدید" اس نے بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا۔ افسون کا دل فنا ہونے لگا۔ اس مسکراہٹ کو پانے کی خاطر اس نے اتنا لمبا انتظار کیا تھا۔

"مجھے یقین تھا تم آؤ گی۔" اس نے تازگی بھری آواز میں کہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"میں تمہیں آج کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" افراہیم نے نرمی سے کہا اور کونے میں رکھی کسی چیز کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ جو بھی چیز تھی۔ کسی کپڑے سے ڈھکی تھی۔

افراہیم نے چمکتی آنکھوں سے افسون کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔

"اسے ہٹاؤ۔" وہ پُرتجسس سی کپڑا اٹھا کر بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"یہ۔۔۔؟" غلاف کے نیچے وائلن رکھا تھا۔ نیا نکور چمکتا ہوا۔

"میں نے کاشی سے منگوایا ہے۔ مجھے اندازہ تھا۔ تم میوزک، موسیقی اور نغموں کو پسند کرتی ہو۔" وہ خوشی کے احساس میں ڈوب کر کہہ رہا تھا۔ افسون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ اور اس کی مسکراہٹوں کے دائمی ہونے کی دعا کر رہی تھی۔

"میری ماں ایک گلوکارہ ہے۔ یہ شوق موروثی سمجھ لو۔ میں گا نہیں سکتی۔ مگر گیتوں کو پسند ضرور کرتی ہوں۔" وہ وائلن کے تاروں کو چھیڑتی بتا رہی تھی۔

"لیکن میرے ہاں گیتوں کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے عنایہ کے لیے وائلن خریدا تھا۔ بہت سے پیسے جمع کر کے۔ تاکہ اسے دھنیں سناؤں۔۔۔ لیکن پھر۔۔۔" وہ روانی میں بولتے بولتے رک گیا تھا۔ شاید اسے کچھ یاد آیا تھا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر جانے کس سے التجا کی۔

"آج۔۔۔ نہیں، یادیں، باتیں، ماضی۔۔۔ بس آج نہیں۔۔۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں۔۔۔ صرف چند ساعتیں خوشی کے احساس تلے گزار لوں۔" اس کی بڑبڑاہٹ پہ افسون چونک گئی تھی۔ پھر اس نے افراہیم پہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ یوں کھڑی رہی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

"تم مجھے کچھ سنا رہے ہو۔۔۔؟" وہ افراہیم کو ایک الماری کی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ وہ کوئی چیز نکالنے گیا تھا۔ پھر جلدی واپس آگیا۔

"یہ کیا ہے؟" افسون نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"وہ بوجھ جو سینے پہ دھرا ہے۔۔۔ جسے اٹھا اٹھا کر تھک چکا ہوں۔ جسے سنبھال سنبھال کر ظہران کے بازاروں میں خوار ہو چکا ہوں۔ اس بوجھ میں کسی اور کو حصہ دار کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرا آدھا بوجھ اٹھاؤ گی؟"

اس نے سر جھکا کر بھرائی آواز میں کہا تھا۔ افسون کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ تو آج وہ کامیاب ہو گئی تھی اور اس کا اعتماد جیت گئی تھی۔

افسون نے اس کا دیا گیا تحفہ نہایت عقیدت سے اپنے ہاتھ میں لیا۔

"میں تمہارا آدھا بوجھ نہیں۔۔۔ پورا بوجھ اٹھالوں گی۔" افراہیم اسے دیکھتا چلا گیا۔

"یہ دعوا بہت بڑا ہے۔"

"میرا وعدہ بھی بہت بڑا ہے۔۔۔ کہا ہے تو نبھاؤں گی۔ عہد کی پکی ہوں۔ تمہارے دکھ سنوں گی تو اپنے بھی سناؤں گی۔۔۔" وہ روانی سے بولتی ہوئی وائلن سے چھیڑ خانی کرنے لگی۔ افراہیم ٹھٹک گیا تھا۔

"تمہیں بھی کوئی دکھ ہے؟"

"کیا محبت کا؟" اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"جیسی محبت تم سے کی ہے۔ ایسی تو کسی اور سے کرنے کے قابل نہیں ہوں۔۔۔ اور جہاں تک دکھ کی بات ہے۔ تو دکھ کا تعلق صرف محبت سے نہیں ہوتا اور محبت بھی صرف ایک شخص تک محدود نہیں ہوتی۔ میرا ایک سرپھرا سا بھائی ہے۔ اس کی بے جا ضد نے مجبور کیا کہ اسے گھر سے نکال دوں۔ وہ بھی ایسا خبطی کہ نکل گیا۔ اور ایسا گیا کہ مڑ کر نہیں آیا۔"

اس کی آنکھوں میں بھائی کی یاد نے آنسو بھر دیے تھے۔ افراہیم اس کے دکھ پہ افسردہ ہو گیا تھا۔

پھر دونوں کے بیچ خاموشی کا طویل وقفہ آ گیا۔ وائلن پہ بے ڈھنگی دھنیں گونجنے لگیں۔ معاً" افسون نے مڑ کر افراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک دیوار سے لگا افسون کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پہ فوراً" نگاہیں جھکا گیا۔ وہ نظر چراتا نہیں تھا۔ نگاہ جھکا لیتا تھا۔

"عشق۔۔۔؟" افسون نے باہر بکھری روشنی کو اپنے اندر اترتا محسوس کیا "کوئی دھن ایسی ہے، جو عشق کی وضاحت کر سکے؟"

"ہے تو۔۔۔ کیا سناؤں؟ کیا تم اسے سمجھ لوگی؟" افراہیم دو قدم آگے کو ہوا تھا۔

"عشق کیا ہے تو سمجھوں گی نہیں کیا؟" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ افراہیم اس کی طرف دیکھتا ہوا وائلن کے قریب آیا۔ وہ اوپر اسٹول پہ بیٹھا تو وہ عنایہ کی طرح زمین پہ بیٹھ گئی تھی۔ افراہیم کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"تم یوں زمین پر نہ بیٹھو، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

افراہیم کا چہرہ آن کی آن میں رنگ بدل گیا تھا۔ افسون اس کی کیفیات سمجھ رہی تھی۔ تب ہی ملائمت سے بولی۔

"پچھلا بھولو گے تو آگے چلو گے افراہیم! نئی چیزوں میں گزشتہ تلاش نہیں کرو۔" اس کے انداز میں ایک ملائم سی تنبیہہ تھی۔ افراہیم بے بس ہو گیا۔ اور اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

افسون نے اسے وائلن کی طرف متوجہ کیا۔

"تم مجھے کوئی گیت اور دھن سنانے والے تھے۔"

وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا اور اس نے کربناک یادوں کے غار سے نکلتے ہوئے ایک کلاسیکل دھن بکھیری تھی۔ وہ تو ابھی تک وہیں تھا۔ تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا۔ تاریکی میں روشنی کو ڈھونڈتا ہوا۔ اس نے دھنوں سے پہلے عادتاً" ایک تمہیدی نوٹ پڑھا تھا۔

"یہ دھن اور کلام میرے بھائی کا پسندیدہ کلام ہے۔ وہ مجھ سے سنتا تھا اور کھو جاتا تھا۔" اس نے کہنا شروع کیا تھا اور ریاضی میں بھٹکنے لگا تھا۔

"مجھے خبر نہیں تھی۔ وہ کہاں کھو جاتا ہے۔" اس کی آنکھیں میں سرخی گھلنے لگی۔

"وہ وہاں کھوتا تھا۔ جہاں میں بھی اپنا آپ کھوتا تھا۔"

افسون دم بخود تھی۔ اور ساکت سی سن رہی تھی۔ وہ سر جھکائے دھن چھیڑ رہا تھا۔ وہ ایک نغمہ ہائے عشق کا درد چھیڑ رہا تھا۔

"محمد میاں صاحب فرماتے ہیں۔" اس نے آنکھیں بند کر کے دھیمے سروں سے کلام کی اٹھان لی تھی۔

پل صراط ایہہ عشق دا پینڈا
بیٹھا ہووے جے شاہ عنائیت اگے

بلھا لا کے یار سنگھار نچے
پتھر پگھل کے کیوں نہ موم ہوون
جدوں یار دے سامنے یار نچے
اس کے حلق میں گولا اٹکنے لگا۔ افسون دیکھ سکتی تھی۔ اس کے گلے کا کنٹھ ابھرتا اور معدوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے کرب کو اندر دھکیلنے میں ناکام دکھائی دیتا تھا۔
ہووے تال تے تال تے ناچ ہوندا
او نار کہاندا جیہڑا بے تال نچے
شاہی اگ اگے بلھا نچیا سی
اگے بلھے دے کئی ہزار نچے
وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔ لیکن اس کے آنسو؟ ہاں ان بھرے کٹوروں میں آنسو نہیں تھے۔ وہاں جمے ہوئے لہو کے چھینٹے ضرور تھے۔
پل صراط ایہہ عشق دا پینڈا
سو جانے جیہڑا تردا
اس بہشتی ویلری ہندا
تے نرگ وچھوڑا کھردا
افراہیم نے وائلن پہ اپنی انگلیاں پٹخیں۔ وہ ایک ہیجانی غم میں دلوں کو چیر دینے والی آواز میں گا رہا تھا۔
عین عشق جھناں نوں لگ جاندا
تے او سک جاندے نے وانگ کانیاں دے
کج سک جاندے کج مک جاندے
نال خلقت دے طعنیاں دے
"وہ نیلی آنکھوں والی گڑیا تھی۔ مجھے بتایا گیا' وہ میری ہے۔ لیکن وہ مجھ سے پہلے میرے بھائی کی تھی۔ وہ میری ہرگز نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کی طلب کی۔" وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ اپنے ماتھے کو وائلن پہ رگڑنے لگا۔ وہ خود اذیتی کی انتہا پہ تھا۔
"اور وہ کامیاب ہو گیا۔ جبکہ میں بدنام ہو گیا۔" اس کا سانس اکھڑ گیا۔ لیکن وہ پھر بھی دھن بجا رہا تھا۔ اور بجا بجا کے گا رہا تھا۔ وہ خود کو آزاد دے رہا تھا۔
کے عشق دا ناں بدنام کیتا
کج سڑ گئے نی وانگ پروانیاں دے
وارث شاہ عشق دے بججھے نہیں چھٹ دے
چھٹ جاندے نی قیدی جیل خانیاں دے
اور اس کا سر وائلن پہ ڈھلک گیا اس کے نیلے لب کپکپا رہے تھے۔ لفظ اس کے لبوں پہ تھرتھرا رہے تھے۔
"میرے نفس کی سرکشی نے یہ ناکامی قبول نہ کی۔ اور میں نے اپنے لیے اپنے ہاتھ سے دوزخ خریدی اور آج تک اسی دوزخ میں جل رہا ہوں۔ میں وہ بدبخت انسان ہوں۔ جس نے دنیا میں ہی دوزخ کا مزہ چکھ لیا۔"
اس کی سانس بند ہونے لگی تھی۔ اس کے سینے کا فطری اتار چڑھاؤ معدوم ہو رہا تھا۔ افراہیم مر رہا تھا۔ افراہیم ختم ہو رہا تھا۔
افسون لرز اٹھی' کانپ اٹھی' گھبرا اٹھی.... افسون دیوانہ وار باہر کی طرف لپکی۔
وہ افراہیم کی سانسوں کو ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ افراہیم کے جسم کو بے جان ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ظہران کا آسمان رو رہا تھا۔
سرخ آندھی ریگ رواں کو اڑاتی پھر رہی تھی۔ آسمان سرمئی سے گہرے اسودی رنگ میں بدل گیا تھا۔
فوزان مشہدی نے اپنی کنواری بیٹی کو کسی "بیوہ" کے روپ میں دیکھا اور ان کے چہرے پہ دھول اڑنے لگی تھی۔
افسون ان کے سامنے نڈھال کھڑی تھی۔
"آپ نے بلایا تھا بابا!" وہ خونی آنکھوں کو جھکاتی' نظر چراتی اپنے پیروں پہ نہیں کھڑی تھی۔ وہ تو زمین کے اندر دھنس چکی تھی۔
"تم ٹھیک ہو افسون!" فوزان مشہدی بھول گئے تھے کہ انہوں نے افسون کو کیوں بلایا ہے۔
"میں ٹھیک ہوں بابا! آپ بتایئے۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔ اور گہرے گہرے سانس کھینچنے لگی۔ فوزان مشہدی نے گہرا سانس بھرا اور اپنے

جلباب کی آستین سے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھنے لگے تھے۔ پھر انہوں نے اک نگاہ افسون کے چہرے پر ڈالی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے وہ جس مقصد کے لیے افسون کو بلا چکے ہیں کیا اسے پورا کرلیں؟ وہ افسون کو سب کچھ بتا دیں؟ کیا یہ مناسب فیصلہ اور مقرر کیا ہوا وقت تھا؟

انہوں نے افسون کا کانپتا ہاتھ پکڑ کر کچھ پل سوچنے کا وقفہ لیا اور بولے۔

"میں نے سوچا اور بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ بہت دل کو سمجھایا اور بہت دلائل اکٹھے کیے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ عربوں کی نہ سہی اپنی خاندانی تاریخ کو بدل دوں۔" وہ اس کا ہاتھ نرمی سے تھپتھپاتے، نرمی سے دباتے کہہ رہے تھے۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا۔ جو بہت کٹھن تھا۔ لیکن میری بیٹی کی خوشی اس سے منسوب تھی۔ میں نے وہ فیصلہ کرلیا تھا۔ جو بہت بڑا تھا۔ میرے حوصلوں سے بھی بڑا۔۔۔ لیکن میری بیٹی کی خوشی سے بڑا نہیں تھا۔"

انہوں نے اپنی آنکھوں کے کونوں سے نکلتی نمی کو افسون کے دونوں ہاتھوں کی پوروں سے صاف کیا تھا۔

"میں نے اس لڑکے کا پتا کروایا۔ وہ کس ملک، کس خطے اور کس قومیت سے تعلق رکھنے والے ملک کا شہری ہے۔ مجھے اس کے بارے میں پتا چلا وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کیوں آیا ہے۔"

وہ ایک بہت ہی معزز علمی گھرانے کا فرد ہے۔ اس کا باپ بہت بڑا سرکاری افسر تھا۔ اس کا حسب بہت اعلیٰ تھا اس کا نسب بہت بلند تھا۔ لیکن وہ خود کیا تھا؟ نہ معزز نہ مہذب؟"

انہوں نے ایک طویل سانس لبوں کی قید سے آزاد کیا۔ اور روانی سے کہتے رہے۔

"ضروری نہیں کہ نیک ماں باپ کی اولاد بھی نیک ہو۔ یہ ضروری تو نہیں؟ شادی کے لیے اگر کسی بھی عورت میں تین چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں تو مرد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ شرافت، نجابت، کردار۔۔۔ بس اتنا سمجھ لو کہ وہ لڑکا ابراہیم ان تینوں خوبیوں سے مبرا ہے۔ وہ ساری دنیا کی مال و دولت سے بے نیاز ہوتا، کنگال ہوتا، مفلس ترین انسان ہوتا میں تب بھی اسے دولت کے ترازو میں کبھی نہ تولتا۔ افسون! وہ لڑکا میری عزت مآب بیٹی کے قابل نہیں ہے۔ وہ اپنے خاندان کا دھتکارا ہوا ہے۔ وہ ایسے گناہ میں ملوث تھا جس سے منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔ وہ اپنے حقیقی بھائی کی بیوی پہ بری نیت رکھتا تھا۔ وہ ایک بدکردار شخص تھا۔"

انہوں نے لب بھینچ کر گفتگو کا اختتام کردیا تھا۔ افسون نے شدت کرب سے آنکھیں موندتے ہوئے بس اتنا ہی کہا تھا۔

"اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے، میں مانتی ہوں۔ وہ اس گناہ کے پیچھے اب تک خوار ہو رہا ہے میں جانتی ہوں۔ لیکن بابا! خدا نے تو انسان کے لیے بے شمار روزن اور دریچے رکھے ہیں۔ ان میں ایک دریچہ توبہ کا بھی ہے۔ لیکن ہم انسان کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ خیر ان سب باتوں سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا بابا! وہ گناہ گار دھتکارا ہوا انسان اپنے تمام تر گناہوں سمیت مرچکا ہے۔" افسون نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر نکل گئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

فرزانہ کھول

چھپا ہے کچھ

میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ وہ اس کا چہرہ وارفتگی سے تک رہا تھا۔

"مگر میں تم سے محبت نہیں کرتی۔" مہوش حیات نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکار کر دیا۔

"ہونہہ" غرور تو دیکھو' انکار کر رہی ہے۔ مگر رہی ہے محبت سے۔۔۔ وہ بھی ہمایوں سعید کے اظہار۔۔۔" عدن نے ریموٹ کافی غصے سے اٹھایا۔ پھر ایک جھٹکے سے ٹی وی بند کر دیا۔

"ہائے۔ ہائے۔۔۔ یہی اظہار محبت مجھ سے کبھی کر کے تو دیکھے قسم سے اپنا دل نکال کر اس کے بائیں پہلو پہ ٹانک نہ دوں تو میرا نام بدل دینا۔" چت لیٹتے ہوئے اس نے بیڈ پہ دونوں بازو دائیں بائیں پھیلائے۔۔۔ اور ایک ایسی ٹھنڈی آہ بھری کہ کمرے میں چھائے ساون کے حبس اور گھٹن پہ بھی کپکپی طاری ہو گئی۔

"ہمایوں سعید نہ ہوا۔ حمزہ عباسی ہو گیا جس پہ تم پتا نہیں پچھلے کتنے سالوں سے لٹو ہو۔۔۔ اس نے اپنی

مکمل ناول

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

چھوٹی سی ناک کو سکیڑ کر مزید چھوٹا کیا اور اکتاہٹ بھری نظر عدن پہ ڈالی۔ ساتھ ہی کتاب کو زور سے بند کیا۔

"اگر میں حمزہ عباسی پہ لٹو ہو گئی تو میری بہن کا حق مارا جائے گا اور پھر امرت اور نمرت کی رقابت پہ لامحدود اقساط کا ڈرامہ شروع ہو جائے گا.... لہٰذا..."

"ارے لڑکیوں! باہر آنے کا کوئی ارادہ نہیں..... عدو..... ذرا مجھے سکنجبین تو بنا دینا۔" باہر سے آتی اپنے نام کی پکار پہ عدن نے اٹھنے میں لمحے کی تاخیر نہیں کی اور جلدی سے پاؤں میں چپل اڑس کر دروازے کی جانب لپکی۔

"سوری خالہ! میں ذرا ڈراما دیکھ رہی تھی۔" وہ ان کی چارپائی کے پاس سے گزرتی کچن کی طرف بڑھی۔

"کتنی دفعہ کہا ہے، ہمن کے پڑھنے کا ٹائم ہوتا ہے۔ اس وقت یہ خرافات مت دیکھا کر۔" مدحت کہنیوں کے بل ذرا اوپر ہوئیں۔

"گھر میں کمروں کا کال نہیں..... مدحو خالہ..... اصل میں اس کی بھی نیت ڈراما دیکھنے کی ہوتی ہے..... چپکے سے کتاب اٹھا کر بہانوں سے ٹی وی والے کمرے میں آ ٹپکتی ہے۔" وہ کچن سے باہر آ کر لیموں کے پودوں کی طرف جانے لگی۔

"اس گھر میں انسانوں کا کال ہے۔" مدحت بڑبڑائیں اور سوئی جاگی آنکھوں سے جامن کی چھدری شاخوں پہ بیٹھی اونگھتی فاختہ کو دیکھا۔

"میرے لیے بھی بنانا۔" امن نے برآمدے میں آ کر ہانک لگائی..... عدن نے جھٹ سے دو تین لیموں اور توڑے، صحن گدلا گدلا سا ہو رہا تھا۔ جابجا خشک پتے۔

"پتا نہیں ہوا کہاں چھپ جاتی ہے۔" امن نے بالکل ساکن شاخوں کو دیکھ کر خود کلامی کی.....

وہ سیڑھیاں اترتی جامن کے درخت کو مسلسل تاکتی جا رہی تھی، جو پکے جامنوں سے بھرا ہوا تھا..... پھر ایک لٹکتی شاخ کو مضبوطی سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"ٹھک، ٹھک..... پکے فرش پہ جامنوں کا ڈھیر لگ گیا۔

"اس دفعہ پھل اچھا آیا ہے۔ کسی رشتہ دار کی طرف تحفتاً بھیج دیتے ہیں۔" عدن نے چھوٹی ٹیبل خالہ کی چارپائی کے ساتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں کے رشتہ دار..... کون سے رشتہ دار ایک اکلوتا..... بھائی جو کراچی کو سمندر کا دوسرا کنارہ سمجھتا ہے۔ باقی لے دے کر تمہاری پھوپھو، بچتی ہے۔ جسے میری شکل دیکھ کر اختلاج قلب ہونے لگتا ہے۔ سالوں ہو گئے کبھی یہاں کا رخ نہ کیا۔ کبھی مرے ہوئے اکلوتے بھائی کی بچیاں بھی یاد نہیں آئیں۔" ان کی خشک آواز شکوؤں سے مزید چیخ رہی تھی.....

"توبہ ہے مدحو خالہ آپ بھی بات بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔" عدن نے ٹیبل پہ سکنجبین سے بھرا جگ رکھا۔

"رشتے دار نا سہی۔ محلے میں ہی حاجی صاحب..... یا حافظہ ساجدہ کی طرف بھیج دیں گے۔" اس نے کانچ کا گلاس خوش ذائقہ مشروب سے بھر کے خالہ کو پکڑایا۔

انہوں نے کچھ بھی کہے بنا، خاموش نظروں سے اپنی سرو قد خوشنما سی بھانجی کو دیکھا..... تین اکیلی بے سہارا عورتیں، جہاں کوئی اپنا بھی آیا نہ گیا۔ واحد آمدنی پندرہ ہزار، دکانوں سے ملنے والا ماہانہ کرایہ۔ ایسے میں کون تعلقات استوار رکھتا ہے۔ حاجی صاحب کے دو قابل لائق فائق کماؤ بیٹے اودھر سے جانے والے جامن اور لیموؤں کو کہیں کسی خواہش کی پیش رفت نہ سمجھیں اور ان کی وجہ سے جو گلی محلے کے حضرات اس گھر کی طرف بے باک نظروں سے نہیں دیکھتے۔ ان کی نظروں میں جو احترام ختم ہو گیا تو..... انہوں نے بے ساختہ جھرجھری لی۔

"کیا ہوا پسند نہیں آئی۔" عدن نے انہیں جھرجھری لیتے دیکھ کر پوچھا۔ مگر انہوں نے اپنے دھیان میں سنا ہی نہیں تھا، حافظہ ساجدہ نے کیسے دو بیٹے کھاتے پیتے گھرانوں میں بیاہ لیے۔ ویسے تو ہمن کا

راگ الاپتے' اس کی زبان کیسی ہری رہتی ہے۔ اب تیسرے بیٹے کی منگنی بھی اس خاندان میں کی ہے جہاں سے بہو تین ٹرک جہیز کے لائے گی۔۔۔۔ شاخوں نے ہلکے سے ہلکورے لیے' چھپی ہوا نے پتوں کو چھوا' حبس اور گھٹن نے سر نیہوڑا کر فرار کی راہ اختیار کی۔

اونگھتی فاختہ کوئل کی کو کو سے ہڑبڑا کے جاگی۔

"یا ہو۔۔۔" اس کے پرجوش نعرے پہ مدحت کے دھیان میں دراڑیں پڑیں۔ صحن میں پھیلی ہلکی گرد۔۔۔ اور خشک پتے ہوا کے سنگ شیر و شکر ہو رہے تھے' عدن بھاگ کر کچن سے بڑی ٹوکری لے آئی۔۔۔ جس میں دونوں بہنیں ہنستے۔۔۔ کھلکھلاتے جامن بھرتی جا رہی تھیں۔۔۔ مدحت کا موڈ بھی خوش گوار ہو گیا۔۔۔ ابھی ان کی عمریں ہی کیا ہیں۔۔۔ اللہ مالک ہے۔

"امو۔۔۔ عدو۔۔۔ ذرا پچھلے صحن کا بھی چکر لگا آؤ۔۔۔ انار بھی اچھے خاصے ٹوٹ کے گرے ہوں گے اور پتہ نہیں ٹماٹروں کا کیا حال ہے۔" پتا نہیں ان دونوں نے سنا بھی کہ نہیں۔۔۔ ایک دم چلنے والی ٹھنڈی۔۔۔ سبک ہوا۔۔۔ پہلی محبت کی طرح "نہیں" اردگرد سے بے نیاز انوکھی کہانیاں سنا رہی تھی۔ جو بہت پرانی ہیں مگر ہر انسان کو اپنی باری پہ نئی لگتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کون سی کے ٹو جیسی بات تمہارے گوش گزار کی ہے' جو گھنٹہ بھر سے منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہو۔" مسعود صاحب نے چشمہ درست کرتے ہوئے ذرا کے ذرا آصفہ بیگم کو دیکھا۔

"کے۔ ٹو ہی سامنے لاکھڑا کرتے۔۔۔ یا پھر میرے سر پہ ہی دے مارتے۔۔۔ جو ذرا سا بھی چوں چرا کرتی مگر۔" انہوں نے پل بھر کو گہرا سانس بھرا۔۔۔ پھر شوہر پہ قاتلانہ نگاہ ڈال کر گویا ہوئیں۔

"مگر ایسی میرے زخموں پہ نمک چھڑکنے والی بیدرد بات' منہ بھر کے نہیں کرنی تھی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ آصفہ بیگم! کبھی سیدھی بات کو ٹیڑھا کر کے سمجھنے والی عادت نہ گئی۔ اور خدانخواستہ کون سے زخموں پہ نمک پاشی ہوئی ہے۔ کیسے نادیدہ زخم' جو ہمیں تو پچھلے اٹھائیس برسوں سے نظر نہ آئے۔۔۔ جہاں کبھی بھولے بھٹکے سے بات حسان۔۔۔ یا اس کی بچیوں کی ہو۔۔۔ خود ہی کند چھری سے خود کو ذبح کر کے زخموں کا واویلا شروع کر دیتی ہو۔" مسعود صاحب نے تاسف سے اپنی بیگم کو دیکھا۔ ضبط اور غصے کے مارے جن کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"میں حسان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی میری جان سے پیاری سہیلی کے ارمانوں کا خون کیا تھا اس نے۔۔۔" دو دفعہ دل توڑا اس نے۔ ان کی نا صرف آواز بلکہ وجود بھی ارتعاش کی زد میں تھا۔ پھر بھی ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شوہر پہ کس طرح چڑھائی کریں۔

"ایسی کون سی اہلفی تمہاری سہیلی نے ایجاد کی تھی کہ پہلی دفعہ دل ٹوٹا پھر۔۔۔ جوڑ لیا۔" مسعود کے لہجے میں ہلکی سی شگفتگی در آئی۔۔۔ آج بتا ہی دو۔ مسکراہٹ زیر لب ہی دبالی۔

"اب گڑے مردے مت اکھاڑو اذان کے ابا۔۔۔ بھائی نے بھی تو خونی رشتوں پہ سالی کو ترجیح دی تھی۔۔۔ وہ دن بھول گئے۔۔۔ کیسے منہ بھر کے تمہارے سامنے

کہا تھا۔۔۔ یار شتہ سو بار ختم کر لو۔۔۔ میں مدحت کو غم زدہ نہیں چھوڑ سکتا۔" میرا اور اس کا رشتہ اسی دن ختم ہو گیا تھا۔" دکھ سے پھٹی اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"تم سے کیا رشتہ ختم کیا۔۔۔ مجھ سے سب سے ہی ختم کر گیا۔۔۔ مدحت سے بچیوں سے۔۔۔ کیسی بددعا لگی تھی اسے کسی کا بھی ہو کے نہ رہ سکا۔۔۔ پھر رونا کیسا۔"

مسعود صاحب آبدیدہ ہو گئے۔۔۔ عینک اتار کر آنکھوں میں اتری نمی صاف کی۔۔۔ آنسو لڑیوں کی صورت آصفہ کی آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے۔ مسعود کے دل کو کچھ ہوا۔

"اصل میں وہ تمہاری سہیلی کو بیوہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ احسان ماتوان کا۔" انہوں نے ماحول کی افسردگی دور کرنے کے لیے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑا۔۔۔

"وہ تمہارے دل کی کلی، دو دفعہ دل جوڑ کے کیسے شاداں و فرحاں زندگی گزار رہی ہے۔ نہ وہ تمہارے بھائی کی محبت میں جوگن ہوئی۔۔۔ اور نہ ہی محبت میں اس کے نام پہ زندگی گزارنے کا خود سے عہد باندھا۔"

اب وہ کھل کے مسکرا رہے تھے۔ صحراؤں کی خاک چھانتی و بجلی سے لے کر کسی بیلے کو آباد کرتی۔۔۔ پھر مانتے کہ وہ محبت کی ماری تھی۔۔۔ مگر ان محترمہ نے کیا خوب شوہر کا گھر آباد کیا کہ ماشاء اللہ سے سات بچے محبوب کے ہجر میں پیدا کر لیے۔۔۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کے کناروں سے پھوٹی پڑی جا رہی تھی۔

"آپ سے تو خدا ہی جیتے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔" وہ اٹھتے اٹھتے کچھ یاد آنے پہ دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"یہ اپنی بے تکی خواہش اذان کے سامنے مت رکھنا۔۔۔ سمجھو نہ تم نے کچھ کہا۔۔۔ نہ میں نے کچھ سنا۔" مسعود نے انہیں بغور دیکھا۔

"رشتوں کی پہیلیاں اب ہمارے زمانوں کی طرح گنجلک نہیں رہیں۔۔۔ آج کل کے بچے تو پورا پزل حل کر لیتے ہیں۔" انہوں نے اپنے خیالات کی کھچڑی میں جو تڑکہ لگایا تھا اس کی خوشبو کم از کم آصفہ نہیں سونگھ سکتی تھی۔ عافیت اثبات میں سر ہلانے میں ہی تھی سو انہوں نے بھی زور و شور سے ہلا دیا۔

اور ہاں وہ چلتے چلتے رکیں۔۔۔ "وہ صحراؤں کی خاک مجنوں نے چھانی تھی اور بیلا رانجھے نے آباد کیا تھا میری سہیلی کی جنس تو مت بدلیں۔" وہ کڑھتی۔۔۔ بڑبڑاتی پیر پٹختی بیڈ روم سے باہر چلی گئیں۔ مسعود کا دماغ ایک نئی کہانی کے تانے بانے بننے میں لگا ہوا تھا جس میں ان کے پسندیدہ کرداروں نے ان کی مرضی کے رنگ بھرنے تھے یا پھر کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔" اس نے اٹک اٹک کر پڑھا۔ اس کی انگلش اب اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اس کا ذاتی خیال تھا۔ اب میں نہ صرف اسپیلنگز اچھی کر لیتی ہوں بلکہ حروف پہچاننے لگی ہوں۔۔۔

آمو۔۔۔ ذرا پڑھ کر بتانا یہ کس نے میرا خیال پوچھا ہے؟ اس کا لہجہ یہ بات کرتے ہوئے تجسس جیسی روشنی سے چمکا تھا" امن نے سر اٹھا کر ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔۔۔ کچھ ڈھونڈتی ہوئی۔۔۔ کچھ کھوجتی ہوئی۔۔۔ وہ لانبی لانبی ہری مرچیں کاٹ کر مدحت کے سامنے پڑی بڑی سینی (ٹرے) میں رکھتی جا رہی تھی اور خالہ کے ہاتھ ان میں تیزی سے مسالا بھرتے جا رہے تھے۔

"اچھا دیکھ ناں۔" عدن نے اپنی کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب کی۔۔۔ اور موبائل اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ میسج پڑھتے ہی امن کے لب مسکرائے۔۔۔ مسکراہٹ ہنسی میں بدلی۔۔۔ ہنسی قہقہوں کے رنگوں میں گوڈے گٹوں سمیت بھیگی۔ مدحت نے ہاتھ روک کر اسے گھورا۔ عدن اس کے یوں لوٹ پوٹ ہونے پہ غصے سے لال پیلی ہونے لگی۔

"کہیں حاجی صاحب نے تو خیال نہیں پوچھ لیا۔ جو باؤلوں کی طرح ہنستی جا رہی ہے۔" مدحت نے عدن کا غصہ دیکھ کر امن کو گھور کے دیکھا۔

"خالہ! خیال بھلا کس نے پوچھنا تھا۔ کمپنی کا میسج ہے کہ کیا کہتے ہیں ستارے۔ اور محترمہ کی انگلش اب آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے واہ جی واہ۔" امن نے صاف اس کا مذاق اڑایا تھا۔ مارے

خفت سے عدن کا چہرہ سرخ ہوا۔ وہ ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی پچھلے صحن میں چلی گئی۔

"لو! اچھی خاصی بیٹھی تھی۔ خواہ مخواہ ہم نے اس کی پڑھائی پہ چوٹ کر کے اسے ہرٹ کیا ہے۔" مدحت کے چہرے پہ فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔

"خالہ! میں روزانہ اسے انگلش پڑھانے کی کوشش کرتی ہوں مگر یہ دھیان ہی نہیں دیتی' اس کی توجہ تو بس ٹی وی کی طرف لگی رہتی ہے۔۔۔ اور پھر یہ کس خوش فہمی میں گھری۔۔۔ اس کے میسجز کے انتظار میں رہتی ہے؟ اوپر سے آپ نے بھی ماموں کی سرسری سی خواہش کو کس قدر اس کے پلو سے باندھ رکھا ہے۔ بس ایک دفعہ کے ذکر کے بعد کبھی انہوں نے بات کی۔ پچھلے چار سالوں سے جبران نے بھی اپنی شکل نہیں دکھائی۔۔۔ سال بعد ماموں بس دکانوں کے کرائے کی وصولی کر کے دے جاتے ہیں اور آپ دونوں بس' بھانجی پتا نہیں امید کے کن بنجر پودوں کو پانی دینے پر جتی ہوئی ہیں۔۔۔" ابھی امن شاید اور بھی کچھ کہتی' مدحت آنکھیں پھاڑے اپنی اٹھارہ سالہ بھانجی کو فق چہرے کے ساتھ دیکھ رہی تھیں' جس نے کس قدر سفاکی سے حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا تھا۔ اک ذرا سی امید اور رتی بھر خواب کا شائبہ تک ان کے دامن سے نوچ ڈالا تھا۔

"کبھی' کبھی جان بوجھ کر بھی ہم اپنے گمان کو تقویت دیتے رہتے ہیں' خیال کو آسروں کو جھنڈ میں بھٹکا دیتے ہیں۔"

"تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں جبران سے کوئی امیدیں باندھ کے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔" امن اچانک ہی سامنے آکر پھٹ پڑی تھی۔

"مجھے کسی گنجے سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ بھلے ماموں بارات لے کر آجائیں۔۔۔ نکاح خواں کو بھگا دوں گی۔۔۔ وہ تو بس میں ہمیشہ خالہ کا سوچ کر خاموش رہی ہوں کہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ نہ ہو۔" وہ امن کے سر پر کھڑی دل کی ساری بھڑاس نکال چکی تھی۔

"ہیں۔۔۔ ہیں۔۔۔ لڑکی۔۔۔ عقل کے ناخن لو تم کسی انڈر ٹریٹمنٹ لڑکی نہیں ہو۔۔۔ نہ کسی ناول کی ہیروئن ہو کہ رشتوں کی قطار تمہارے آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑی ہو۔ تم بس عدن حنان ہو۔ اپنی اوقات میں رہو۔" مدحت کو خوب تپ چڑھی۔ وہ اپنا کام ختم کر چکی تھیں سو تھال امن کے حوالے کیا۔

"بس ٹھگنا اور گنجا نہ ہو۔" وہ پھر اپنی سابقہ نشست پر پھیل کے بیٹھی۔ وہ ایسی ہی تھی اس کا غصہ منٹوں میں غائب ہو جاتا۔

"اب کہو گی ناک لمبی نہ ہو۔۔۔ رنگ بھی کالا نہیں ہونا چاہیے۔" امن نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو میں ضرور کہوں گی۔" اس نے گلاس پکڑ کر ایک ہی سانس میں خالی کیا۔

"باوقار۔۔۔ بردبار۔۔۔ سچا' حکم صادر کر کے فیصلے اپنے حق میں کروانے والا۔" وہ آنکھیں میچ کے گویا اپنے خیالات بیان کر رہی تھی۔

"پھر تو اسی گھر کے جا من ساری زندگی کھاتی رہنا۔" مدحت نے گہرا سانس بھر کے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔" پھر خود ہی زیر لب بڑبڑائیں۔

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ اب ذرا مجھے واش بیسن تک لے چل' مسالا اب ہاتھوں میں جلن کر رہا ہے۔" مدحت نے اس کے سادہ سے نقوش کو پتا نہیں کس سوچ کے تحت دھیان سے دیکھا۔۔۔ وہ اپنے الجھے سے بے ترتیب بالوں کو کیچو میں جکڑ کے فوراً" کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی خالہ کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ آج سالن پکانے کی باری امن کی تھی لہٰذا اس نے اب دو گھنٹے مدحت کو ڈائجسٹ پڑھ کے سنانا تھا۔ نمکین سی دوپہر کی خاموشی میں اترتے سائے' دم سادھے پرندوں کی سرگوشیاں سن رہے تھے اور دھیرے' دھیرے سفر ناتے ہوئے درختوں کی چھاؤں سے کٹنے کو بے چین وقت کی سوئیوں کے ساتھ سرکتے ہوئے اپنی تپش چھاؤں کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"حنان میرا بہت اچھا دوست بھی تھا۔۔۔ میں اب

تک سمجھتا رہا کہ وہاں سب ٹھیک ہو گا سو کچھ مطمئن تھا۔ میرا خیال تھا کہ بہن اور بھانجیوں کی ذمہ داری کا جو بار منیجر نے اپنے سر لیا تھا وہ بخوبی نبھا رہا ہو گا۔۔۔ وہ تو اتفاقاً "ایک ماہ پہلے کسی کام سے مجھے بدین جانا پڑا۔۔۔ تو وہاں ایک دیرینہ بھلے وقتوں کے دوست سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے دانستہ منیر کا ذکر چھیڑا۔"

"تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ تو سال میں ایک آدھ بار کراچی کا چکر لگاتا ہے' جہاں تک مجھے یاد ہے حنان نے بدین میں کچھ زمین بھی خریدی تھی' جواب یقیناً "منیر کے قبضے میں ہو گی اور جس کی بھنک بھی اس نے مدحت یا بچیوں کو نہیں پڑنے دی ہو گی۔۔۔ میرا دل کہتا ہے وہاں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ اذان بیٹا اگر تمہاری ماں اور میراج کے لیے بلاوا نہ بھی آتا تو بھی میں نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ تمہیں وہاں ضرور بھیجوں گا۔" مسعود صاحب نے بیٹے کے متفکر چہرے پہ نظریں ٹکائیں۔ "تمہاری ماں ایک بے جا ضد کی انا میں کئی سالوں سے مقید ہے اور صد افسوس کہ اس سے رہائی چاہتی ہی نہیں۔ حالانکہ حنان کا فیصلہ سو فیصد درست تھا سگی خالہ جتنی محبت ان بن ماں کی بچیوں کو دیتی' دنیا کی کوئی عورت نہیں دے سکتی تھی۔" وہ چند لمحے خاموش رہے' اذان نے اپنے باپ کو آج سے پہلے اس قدر افسردہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ شگفتہ مزاج کے' محفل میں رنگ جمانے والی طبیعت رکھتے تھے۔

"تمہارے ماموں نے غصے میں قطع تعلق کی بات کہہ دی اور تمہاری ماں نے اس کی بات پہ مہر لگا کر اجنبیت کی حد کر دی۔۔۔ مدحت بیچاری ایک سیدھی سادی اور نیک دل عورت ہے۔۔۔ مگر آصفہ بیگم کی نظر میں اس جیسی۔" انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"خیر چھوڑو۔" وہ کچھ توقف سے بولے۔

"اب تم ان تمام معاملات کو کیسے ہینڈل کرو گے' یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" وہ کچھ ہنس کر بولے۔۔۔ اور بیٹے کے خوبرو چہرے کو بغور دیکھ کر اس کی اندرونی کیفیت کو جانچا۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے ابو! میں امی کو بھی بعد میں بخوبی سنبھال سکتا ہوں مگر وہ لوگ اس طرح اچانک ٹپک پڑنے والے رشتہ دار کو۔ آئی مین کسی غیر شخص کو ڈیڑھ دو ماہ اپنے گھر کس طرح ٹھہرائیں گے۔" وہ کچھ الجھ کر کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"تم ان کے لیے غیر شخص ہرگز نہیں' البتہ وہ اور تم بھی چند روز تک اجنبیت ضرور محسوس کرو گے' اور پھر تم کہہ دینا کہ کراچی میں میرا اور کوئی رشتہ دار نہیں تھا تو والدین کے آنے تک میں کہاں رہتا۔۔۔ بس کہہ دینا مجھے مسعود صاحب نے بھیجا ہے۔" وہ کچھ جھنجلا کر قطعی لہجے میں بولے تو اذان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

آج آصفہ بیگم ٹیلر سے اپنے سلے ہوئے کپڑے لینے گئی ہوئی تھیں سو مسعود صاحب کو بیٹے سے کھل کر معاملات طے کرنے کا موقع مل گیا۔

"اور سنو اگر تمہیں کسی شک و شبہ کی بنیاد پر بدین جانا پڑ جائے تو جانے میں تامل سے کام مت لینا' باقی میرا بیٹا بہت بردبار اور سمجھ دار ہے' ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیوں بھئی ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔" وہ اس کے کندھے پہ تھپکی دے کر ہنسے۔

"دیکھ لیں ابو۔۔۔ کافی مشکل پچویشن میں آپ نے پھنسا دیا ہے۔" وہ بھی سر کھجا کر مسکرایا۔

"اور فرض کریں ان خواتین نے مجھے گھر کے اندر گھسنے ہی نہ دیا۔۔۔ اور دروازہ ٹھک سے بند کر کے کہا ہم آصفہ بیگم کے بیٹے کو گھر میں نہیں ٹھہرا سکتے تو۔۔۔" شرارت سے زیادہ اس کے لہجے اور آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا' مدحت ایک سلجھی ہوئی وضع دار عورت ہے اور اس نے بچیوں کی تربیت بھی اسی انداز میں کی ہو گی۔۔۔ بیٹا! وہ تو رشتوں کو ترسے ہوئے لوگ ہیں۔" مسعود کا لہجہ دھیما ہوا۔

"سو رشتوں کی قدر ان سے زیادہ کس کو ہو گی۔" دھیما لہجہ ملال میں گھر کر سرگوشی نما ہوا۔

"اور گاڑی کا کیا کروں گا۔" اذان کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کر بولا۔

"میری چھوٹی گاڑی لے جانا۔۔۔ میں نہیں چاہتا وہ

تمہاری گاڑی یا تمہارا عہدہ سن کر کسی احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ پتا نہیں وہ کس حال میں زندگی گزار رہی ہوں گی۔ بس ان میں گھل مل کے رہنا' بالکل گھر کے ایک فرد کی طرح' اور۔" وہ کچھ کہتے' کہتے خاموش ہو گئے۔ اذان نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یار' اب یوں تو نہ دیکھو' کیا ساری باتیں میں ہی تمہیں سمجھاؤں۔" وہ خفیف سا ہنسے۔

"میں سمجھا نہیں۔" اذان نے کچھ الجھ کر پوچھا۔

"میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بس تم پیکنگ کرو۔ پرسوں ہماری فلائٹ کے بعد ان شاء اللہ رات کا کھانا اپنے ماموں کے گھر کھانا۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ مگر وہ ابھی تک ایک کشمکش کا شکار تھا۔

اپنے ماں سے زندگی میں پہلی دفعہ اتنی بڑی بات چھپائی تھی اور زندگی میں پہلی بار بالکل انجان لوگوں میں اتنے دن گزارنے تھے' اپنی حیثیت چھپا کر رہنا تھا۔ وہ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر اب اے سی کے عہدے پر فائز تھا۔

"تو چلیں۔۔۔ اے سی صاحب' رخت سفر باندھیں' ایک نیا اور انوکھا معرکہ حل کرنا ہوگا۔" وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔۔۔ اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔

ابو بھی ناں۔۔۔ کم از کم ان لوگوں کو ایک فون ہی کر دیتے' مگر چلو خیر' اب وہ لوگ مجھے سزا کی طرح جھیلیں یا جزا کی مانند' دیکھا جائے گا وہ ہر فکر سے آزاد ہو کے جانا چاہتا تھا۔ اسے ان دیکھے رشتہ داروں کی زندگی سے ان الجھنوں کو ختم کرنا تھا بقول مسعود صاحب کے وہ جن میں گھرے ہوئے تھے وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں سفید بدلیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں تھیں۔

"خالہ کالے بادل تو مینہ برساتے ہیں۔۔۔ یہ سفید بدلیاں آسمان پہ کیوں دکھتی ہیں۔" امن نے ان خالہ بھانجی کی مصروفیات میں خلل ڈالا عدن نے ڈائجسٹ بند کر کے بے زار نظروں سے اسے تاڑا۔

"مجھے تو اچھی لگتی ہیں۔۔۔ روئی کے گالوں جیسی بدلیاں' سفید پھول' سفید دعا' اور سفید محبت۔" امن نے قہقہہ لگا کر جملہ مکمل کیا۔

"سفید محبت' پہلی مرتبہ سنا ہے۔" مدحت کو اس کا قہقہہ اور یہ دو حرفی بات جانے کیوں اچھی لگی۔

"جن کا خون سفید ہو جاتا ہے' پھر وہ محبت بھی سفید ہی ہو جاتی ہے۔" امن کے ان دو لفظوں کی عدن نے خوب تشریح کی۔۔۔ مدحت کچھ لمحوں تک کچھ بول ہی نہیں سکیں جو دو تین رشتے تھے انہوں نے کیسے دل کھول کے ان بچیوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔۔۔ سورج کی ڈوبتی کرنیں چھن' چھن برآمدے کے اس سرے میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آج مدحت کی آنکھوں کی نمی کچھ زیادہ چمکیلی تھی ان کا دل جیسے پھٹا جا رہا تھا۔

ہماری کہانی کیا خوب موڑ لے رہی تھی سارا مزہ کرکرا کر دیا۔" عدن کو خالہ کی آنکھوں کی نمی کسی بپھرے سیلاب کی مانند دکھ رہی تھی۔ عدن پچھتائی کہ اس نے ایسی بات کیوں کی۔ خالہ یوں ہی خود کو قصوروار سمجھنے لگتیں۔

"آپ دونوں خالہ بھانجی کا انداز ہمیشہ مجھ سے جان چھڑانے والا کیوں ہوتا ہے۔" امن پیر پٹختی پچھلے صحن کی طرف جانے لگی۔

"اسے خوف' دلچسپی نہیں اور ہماری کہانیوں کا سارا سسپنس اسی طرح توجہ ہٹا کر خراب کرتی ہے۔" عدن نے سر جھٹک کر دوبارہ رسالہ کھولا اور ساکت بیٹھی خالہ پہ اک نظر ڈال کر پڑھنا شروع کیا۔ "گھنی باڑھ کے پیچھے اس سے کوئی سات فرلانگ کے فاصلے پر ایک سایہ دبے پاؤں جیسے پانی پہ تیرتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔" امن جو پچھلے صحن کو جانے والا برآمدہ آدھا عبور کر چکی تھی بہن کی آواز سن کر رکی۔

"لمبا سفید چغہ' جھکا ہوا سر۔۔۔ اور چہرے کے اطراف پھیلے کندھے سے نیچے جاتے بال برآمدے

میں رکی ہوئی امن الٹے قدموں ان کی طرف بھاگی۔

"اف عدو چپ کر جاؤ۔" امن خالہ کے پلو سے جڑ کر اس سے لپٹ ہی گئی۔ "یہ ضرور آیوشمتی ہوگی۔" خالہ کا چہرہ بھی خوف سے پیلا ہوا۔

"یہ آمنہ ریاض کی آیوشمتی پتا نہیں کیا ہے۔ رات کو آس پاس محسوس ہوتی ہے۔ عدن! آئندہ مجھے بس کیف اور خوش نصیب والا حصہ سنایا کرنا۔" مدحت نے انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کیا۔

"ارے خالہ کچھ نہیں ہوتا۔" عدن ایسی باتوں پہ یقین نہیں رکھتی تھی سو بہادری سے بولی۔

"اتنا بڑا گھر ہم تین اکیلی عورتیں۔ گھر میں ہولناک سناٹے' بند گلی کے اینڈ پہ ہمارا گھر۔ لوگوں کا آنا جانا بھی مفقود' نہ کوئی ٹریفک کا گزر۔" عدن نے ان دونوں کو ڈرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' خالہ سمٹیں' امن' خالہ کی بغل میں منہ گھسانے لگی۔

"اوہو' تمہاری کہنی میری پسلی میں چبھ رہی ہے۔" مدحت نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

"گلی میں آیوشمتی آتی ہے پھر دروازہ بجتا ہے۔" عدن نے رسالہ کھولا' اور اپنی طرف سے جملہ گھڑ کے سنایا۔

"ارے کہہ رہی ہوں بند کرو' مجھے نہیں سننا۔" ایک زوردار دستک۔

پوچھا "کون۔" جواب آیا۔

"آیو۔۔۔" خالہ بھانجی نے مضبوطی سے ایک دوسرے کو پکڑا۔

"ٹھک' ٹھک۔۔۔ دستک واقعی زوردار تھی۔ دونوں کی خاصی بلند چیخ نکلی۔

"توبہ ہے۔ عدن نے رسالے کو پائنتی رکھا۔ امن نے فوراً" اٹھا کر کرسی پہ پھینکا۔

جیسے وہ روح باہر آجائے گی۔ عدن کا قہقہہ کچھ زیادہ ہی بلند تھا۔ دروازے کے دوسری طرف موجود اذان کے لیے صورت حال کافی خطرناک تھی۔ پہلے چیخنے کی آوازیں پھر کسی لڑکی کا بے باک سا قہقہہ اس نے گھر کی طرف دوبارہ دیکھا۔ پرانی طرز کا خاصا بڑا گھر جس کی سفیدی اتر کر برہنہ اینٹوں کو کسمپرسی میں مبتلا کر رہی تھی' پوچھنے کی زحمت کیے بنا دروازہ کھول دیا گیا۔

دروازے کھولنے والی نے شدید حیرت سے گھر کر اپنے سامنے کھڑے اجنبی مرد کو آنکھیں پٹپٹا کر دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک بھاری اٹیچی کیس بھی تھا۔ اٹیچی کیس سے ہوتی اس کی حیران نظریں گلی میں کھڑی سفید مہران پہ ٹکیں۔۔۔۔ بند گلی کا آخری گھر' شاید کوئی راستہ بھول کر آگیا ہے۔

"یہ حنان صاحب کا گھر ہے؟" سامنے کھڑے اونچے' لمبے' گھنے دار بالوں والے سوبر سے بندے نے نام پوچھ کر اس کے گمان کو ہوا میں اڑایا کہ آنے والا راستہ نہیں بھولا بلکہ صحیح جگہ پہ آیا ہے" لڑکی نے از سر نو' سر سے لے کر پیر تک اس کا جائزہ لیا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے۔" عدن نے تھوک نگل کر پوچھا۔

اب سامنے کھڑی بندی کا معائنہ کرنے کی باری اذان کی تھی' سادہ سا چہرہ جس کے انتہائی مناسب نقوش' بالوں کی چھوٹی بڑی الجھی لٹیں کانوں کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ چہرے پہ نرمی کے ساتھ الجھن اور حیرت دوچند تھی۔

"جی میں اذان مسعود ہوں' اور مجھے مدحت آنٹی سے ملنا ہے۔"

"ارے۔۔۔ عدو کیا آیوشمتی کو دیکھ کر پتھر کی تو نہیں ہوگئی ہو۔" مدحو خالہ کی کڑک آواز گونجی' انہیں لڑکیوں کا دروازے میں کھڑا ہونا سخت ناپسند تھا۔

"خالہ! کوئی اذان مسعود صاحب ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" عدن نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر وہیں سے ہانک لگائی۔۔۔۔ اگر ان کی بھانجی آیوشمتی کا نام لیتی تو انہیں حیرت کا اتنا شدید جھٹکا نہ لگتا' نام سن کر وہ اندر تک سنسنا اٹھی تھیں۔ کئی ثانیے تو کچھ بولنے کے قابل نہیں رہیں۔ پھر حواسوں میں آکر جلدی سے اور بے قراری سے بولیں۔

"اسے اندر لے آؤ۔" لہجے میں تیزی اور بے چینی نمایاں تھی کہ ذرا سی تاخیر ہوئی تو مبادا آنے والا لوٹ ہی

نہ جائے۔

"جی اندر تشریف لے آئیں۔" محتاط سے لہجے میں کہا۔ اذان نے اٹیچی کیس اٹھایا۔

"ابھی خالہ نے صرف آپ کو اندر آنے کے لیے کہا ہے' سامان کی بابت تو میں نے بتایا ہی نہیں۔" عدن نے قدرے رک کر کہا۔ اذان کا سامان کی طرف بڑھا ہاتھ پیچھے ہٹا۔

"خالہ! ان صاحب کا سامان بھی ساتھ ہے۔" غٹرغوں۔ کبوتروں کا غول برآمدے کے روشن دانوں سے اڑا' عدن کی ہانک بھی ہی اس قدر اونچی۔ بھانجی کی اس بات پہ خالہ کے وجود میں روح پھڑپھڑائی ضرور مگر کبوتروں کی طرح اپنا ٹھکانہ نہیں چھوڑا۔

"اسے کہو سامان بھی ساتھ لے آئے۔" خالہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آتوشمتی کی طرح تیر کر اس مہمان کے استقبال کے لیے جا پہنچیں' امن اس تمام کارروائی میں پتھر کا بت لگ رہی تھی۔ اذان نے خالہ کی آواز سن کر اجازت طلب نظروں سے اس لڑکی کو دیکھا اور اٹیچی اٹھا کر دہلیز پار کی۔

"ایک منٹ رکیں۔" عدن نے ہاتھ کا اشارہ کیا پھر پلٹ کر صدا لگائی۔

"خالہ گاڑی بھی ہے۔" اذان کو اب سامنے برآمدہ نظر آرہا تھا۔

"اے ہے عدن کیا ہے۔ اگر ٹرین بھی ساتھ ہے تو بھی اسے اندر آنے دو۔" خالہ کے انداز میں عجلت نمایاں تھی۔ اذان نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا اور لمبے' لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی طرف بڑھا۔ برآمدے کی چار سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس چارپائی کے قریب پہنچا جس پہ یقیناً" مدحت آنٹی تقریباً" لیٹنے کے انداز میں بیٹھی تھیں۔ اذان نے مؤدب انداز سے انہیں سلام کرنے کے ساتھ اپنا سر ان کے آگے جھکایا۔ مدحت نے اپنائیت سے سلام کا جواب دے کر شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا' عدن بھی چھوٹے' چھوٹے' قدم اٹھاتی پہلی سیڑھی تک پہنچ چکی تھی۔

"امن' عدن بھائی کو سلام کرو۔" بت بنی امن کے وجود میں ذرا سی جنبش ہوئی' فوراً" ماتھے تک ہاتھ لے جا کر عین امراؤ جان والے انداز میں سلام کیا' البتہ عدن اس نچلی سیڑھی کے پاس پڑے بھاری اٹیچی کی طرف متوجہ تھی۔

"یہ تمہاری پھوپھو آصفہ کا بیٹا ہے۔" امن نے سٹپٹا کر اور عدن نے جھٹکا کھا کر اسے دیکھا۔ خالہ اس اجنبی کا تعارف کروا کر اب اس سے باتوں میں مشغول تھیں۔ عدن نے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے امن کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔" امن نے اندر آتے ہی منہ پھاڑ کے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہش! آہستہ بولو۔" عدن نے دھیمی آواز میں گھر کا۔

"جاؤ تازہ لیموں توڑ کے لاؤ۔ میں تب تک جگ میں چینی گھولتی ہوں۔" اس کے ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ دس منٹ بعد اذان مزیدار مشروب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"خالہ! عدو پوچھ رہی ہے' رات کے کھانے میں کیا بناؤں؟" امن نے مہمان کے عقب میں کھڑے ہو کر استفسار کیا۔

"بہن سے کہہ' ذرا ساجدہ کو فون لگائے۔ اس کا بڑا پوتا آئے تو سامان منگوالینا۔" عدن سمجھ گئی تھی کہ ساجدہ کے بڑے پوتے سے کیا سامان منگوانا ہے۔ سال کے سال ماموں کی آمد پر بھی ساجدہ کے بڑے پوتے سے گوشت اور کھیر' مکس بریانی' مسالا منگوایا جاتا تھا۔ اذان نے دیکھا آدھے گھنٹے بعد نو دس سالہ بچہ کچھ شاپرز تھامے گھر میں آیا تھا۔

"خالہ! عدو پوچھ رہی ہے۔ گوشت سالن میں زیادہ ڈالوں یا بریانی میں۔" ایک مرتبہ پھر اس کے عقب سے سابقہ آواز آئی۔

"اصل میں گھر میں سوائے ان کے ماموں کے کوئی مہمان نہیں آتا۔ اس لیے لڑکیاں ذرا اتاؤلی ہوئی جارہی ہیں۔" خالہ نے بھانجی کو گھور کے دیکھا۔

"بریانی میں گوشت زیادہ ڈال دیجیے گا۔" خالہ کے بجائے جواب مہمان کی طرف سے آیا تھا۔ امن سر پٹ کچن کی طرف بھاگی۔

"مہمان کے منہ میں تو زبان بھی ہے۔" باآواز بلند تبصرہ کیا۔ اذان کے لب سیٹی کی طرح گول ہوئے۔ خالہ نے شرمندگی سے نگاہ نیچی کی۔

"پتا نہیں کھیر میں مزید چینی ڈالنی ہے کہ نہیں۔" یہ آواز عدو نامی لڑکی کی تھی۔

"خالہ! عدو نے پوچھا ہے کہ۔" خالہ کی ابلتی لال آنکھیں باہر چھلکنے کو تیار۔

"مجھے شوگر تو نہیں پر زیادہ میٹھا مجھے پسند نہیں لہٰذا۔۔۔" مسکراتے لہجے میں کہی گئی بات کچن میں سن لی گئی۔ برآمدے کے کونے میں دس فرلانگ کے فاصلے پہ تو کچن تھا۔

"دراصل میں ان کے ماموں زیادہ میٹھا کھاتے ہیں تو۔۔۔" گھوریاں ڈال ڈال کے خالہ بے چاری کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔

"امو! عدو سے کہو دوسرے کونے کے ساتھ والا بڑا کمرہ کھول دے اور تو جاکر فٹافٹ بیڈ شیٹ بھی بدل دے اور جھاڑ پونچھ کی ضرورت ہے تو وہ بھی کردے۔" خالہ نے مناسب لہجے میں متانت سے بات ختم کی۔

"پہلے کھانا تو بنالوں۔۔۔ خالہ کے محترم مہمان کو ایک فون کرکے آنا چاہیے تھا۔" خالہ نے یہ خوبی سن لیا تو مہمان بہرہ تو نہیں تھا۔ مدحت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ منہ پہ چادر لپیٹ کے بس پڑجائیں۔

"عدو بیٹا! امن کو چابیاں ہی بتادے تاکہ وہ کمرہ ٹھیک کردے۔ بچہ تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ کھانا پکنے تک چند گھڑیاں آرام کرلے گا۔" مدحت نے دل ہی دل میں لاکھ پلٹے کھاکر کہا۔

"تو کیا مہمان کا بچہ گاڑی میں سو رہا ہے۔" دونوں بہنوں کے مشترکہ خیالات۔۔۔ خالہ کا آنکھیں چرانا اور اذان سے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ امن کو شاید چابی مل گئی تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اذان کو اپنی معیت میں اس کمرے تک لے آئی۔ پرانا مگر خوب صورت فرنیچر سے آراستہ وہ ایک کشادہ بیڈ روم تھا جس کی دیوار گیر کھڑکی پچھلی جانب بھی کھلتی تھی۔ باتھ روم بھی اٹیچڈ تھا۔

"میں نے تولیہ بھی واش روم میں رکھ دیا ہے۔" امن دروازے کی طرف بڑھی۔

"شکریہ۔" اذان نے دوستانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ وہ سامان لینے کی غرض سے باہر آرہا تھا جب اس نے برآمدے میں عدن کی آواز سنی۔

"اتنے سالوں بعد پھوپھو کو ہماری یاد کیسے آگئی؟" شکوہ کناں آواز میں تلخی نمایاں تھی۔ اذان کے قدم وہیں تھم گئے۔

☼ ☼ ☼

"پانیوں پہ چھینٹے اڑاتی ہوئی لڑکی" "شڑاپ" کی زوردار آواز۔۔۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے۔ پھر دماغ میں بجلی سی کوندی کہ وہ رات سے یہاں مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔

"دیکھی ہے ہم نے آتی ہوئی لہروں پہ جاتی ہوئی لڑکی۔۔۔ شڑاپ۔۔۔ شڑاپ۔۔۔" وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

"یا خدا! یہ صبح صبح کون سی فلم چل رہی ہے۔" جالی دار دروازے کی وجہ سے مچھر تو نہیں تھے مگر بجلی جانے کی صورت میں کمرہ حبس زدہ ہوجاتا تھا سو وہ تمام رات سوتا جاگتا رہا۔ اب کہیں دو تین گھنٹے قبل ہی سکون کی نیند آئی تھی کہ یہ آواز وہ پُرتجسس سا ہو کر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

"چھپّی چھپا چھپّی۔۔۔ چھپا کے چھپّی۔" اس نے ہاتھ میں پانی کا موٹا سا پائپ پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی سی گڑیا تھی۔ کھڑکی کے ساتھ پکی جگہ پہ زمین پہ کچھ خانے بنا کر وہ اکیلی کوئی گیم ان خانوں میں اچھل اچھل کر کھیل رہی تھی۔ موٹے پائپ سے پانی کی تیز دھار برآمد ہو رہی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس نے کل دروازہ کھولا تھا۔ جس کے چہرے پہ ایک متانت اور سنجیدگی تھی۔ اذان کے لیے یہ منظر دلچسپی کے ساتھ حیران کن بھی تھا۔ وہ ساتھ ہی گڑیا کو بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نہلانے لگی مگر اس کا اصل مقصد عقبی صحن کی صفائی تھی۔

"پانیوں پہ چھینٹیں اڑاتی ہوئی لڑکی۔"

زیادہ دیر کھڑکی کے پاس رکنا اسے مناسب نہیں لگا۔ وہ پردہ برابر کرکے اپنے سامان کی طرف آیا۔ آج ہفتہ تھا سو تمام دن گھر پہ گزرنا تھا۔ اس نے شلوار قمیص کا انتخاب کیا۔ آج یہاں پہلا دن ہے۔ وقت پر ہی سب کے ساتھ ناشتا کرنا چاہیے۔ وہ واش روم میں گھس گیا۔ دوسری جانب سے بھی آوازیں آنی بند ہو چلی تھیں۔ غالباً" وہ لڑکی فراموش کیے بیٹھی تھی کہ گھر میں کوئی مہمان بھی ہے۔ جس کے کمرے کی کھڑکی پچھلے صحن میں کھلتی ہے ان ہی سوچوں میں غلطاں وہ برآمدے میں آیا جو دھوپ میں ڈوبا سورج سے پناہ مانگ رہا تھا۔ مدحت آنٹی کی چارپائی نیم کے درخت کے نیچے بچھی تھی۔ جامن کے درخت نے بھی گٹھ جوڑ کرکے وہاں خوب چھاؤں پھیلا رکھی تھی۔ چارپائی کے ساتھ دو کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ آنٹی کو صبح بخیر کہہ کر وہ ایک کرسی پہ نشست سنبھال چکا تھا۔

"اور سناؤ رات کیسی گزری۔ نیند ٹھیک سے آئی۔" مدحت نے نرم آواز میں مسکرا کر پوچھا تو اذان نے بھی مسکرا کر ہی۔

"جی۔" کہا ہی تھا کہ عدن ٹرے اٹھائے ان کی طرف آئی۔ اذان نے بلا ارادہ ہی بغور اسے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے کا منظر اس کی آنکھوں میں تازہ ہوا۔ وہی سنجیدگی اور وقار اس کی شخصیت سے جھلک رہا تھا کہیں سے بھی وہ پانیوں پہ چھینٹیں اڑانے والی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ اذان نگاہ جھکانے پہ مجبور ہوا۔ ناشتا واقعی مزیدار تھا۔

"آپ چینی کتنی لیتے ہیں۔" اس نے چائے کا کپ سامنے رکھ کر پوچھا۔

"شکریہ۔۔۔ میں خود بنالوں گا۔" وہ ہلکی آواز میں سہولت سے بولا۔ وہ یہاں ان سے خدمتیں کروانے نہیں آیا تھا۔

"امن نظر نہیں آرہی؟" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"امن کالج گئی ہوئی ہے۔" آج پرندوں کی آوازیں ذرا کم تھیں۔ شاید وہ بھی مدحت کی طرح حیران تھے۔ اس نے یوں ہی درختوں کی طرف نگاہ کی۔

"اور عدن' کالج نہیں جاتی؟" کچھ دیر کے وقفے کے بعد اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" مدحت کا یک لفظی جواب اسے کسی گہرے کنوئیں سے آتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر اپنے سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھا جن کا چہرہ ہزار ملالوں کی زد میں گھرا تھا جیسے اذان کے ذہن میں ہزاروں سوال سر اٹھا رہے تھے۔ جب خاموشی ان دونوں کے درمیان طوالت پکڑنے لگی تو پژمردہ لہجے میں جواب ایک مکمل وضاحت کی صورت میں دیا گیا۔

"عدن ساتویں کلاس میں تھی جب میرا اور حنان کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ وہ تو دوسری سانس بھی نہیں لے پایا تھا اور میں حماں نصیب بچ گئی مگر ریڑھ کی ہڈی میں ایسی چوٹ لگی کہ بس ضروریات زندگی کے تحت ہی چل پھر لیتی ہوں۔ سچ پوچھو تو عدن کا بچپن اور جوانی میری بدنصیبی کی نذر ہوگئی۔" ضبط کے کڑے پہرے توڑ کر آنسو رخساروں تک آنے میں کامیاب ہوئے۔ اذان بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا کہ تسلی کے لیے کون سے لفظوں کا چناؤ کرے۔

"حنان جو اپنوں کو ناراض کرکے مجھے بچیوں کے لیے محبت کا سائبان سمجھ کر اس گھر میں لایا تھا۔ وہ سب تو خواب ٹھہرا' الٹا میں ایک معذور کی صورت ان پر ایک بوجھ کی طرح مسلط ہوگئی۔" اذان کے لیے زندگی کی یہ بے رنگ حقیقتیں بالکل نئی تھیں۔ پھر بھی وہ اپنی نشست سے بے چین سا ہو کر اٹھا ان کی پائنتی پہ لگ کر دل گرفتگی سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"ماموں کا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ آپ اب بھی ان کے لیے ایک مضبوط سائبان ہیں۔ لڑکیاں آپ کے زیر سایہ محفوظ ہیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی تو اس کے تمام رشتے دار عدن اور امن کے لیے نامحرم ہوتے۔ زندگی ان کے لیے مشکل ہوتی۔" وہ ان

کے ہاتھ اچھا کر بولا۔ تو وہ ایک دم مسکرا دیں۔ فی الحال وہ اپنی ماں کا ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"میں اب آگیا ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مدحت نے ممنون نظر اس پہ ڈالی۔ تب ہی بیرونی گیٹ کا چھوٹا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا جو اذان نے ہی کھولا۔ ساجدہ کا پوتا اذان کے ہمراہ اندر آیا۔

"خالہ جی! عدن باجی نے فون کرکے بلایا ہے۔" بچے نے بات مدحت سے کی اور للچاتی نظروں سے موٹے جامن تاڑے۔ اذان بچے کی آمد کا مقصد جان گیا۔

"مہمان صرف ایک دن کا ہوتا ہے۔ اب کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں لہٰذا آئندہ اگر آپ کی باجی اس وجہ سے بلائیں تو مت آنا۔"

"مہمان تین دنوں تک خدمت کروانے کا حق رکھتا ہے لہٰذا۔" عدن نے اچانک سر پہ آکر اس کی بات کاٹی۔

"گڈو بھاگ کر قیمہ اور ہری مرچیں لے آؤ' بے فکر ہو کر جاؤ میں نے تمہارے لیے ٹوکری بھر جامن رکھے ہیں۔ دھیان سے قیمہ بنوانا چھیچھڑے مت ڈلوانا۔ جہاں سے جلیبی کی دکان نظر آئے دوسرے رخ کھڑے ہونا۔ یاد رکھنا ذرا سا چھیچھڑا بھی ہوا تو جامن نہیں دوں گی۔"

"واہ بھئی' کام کروانے کے لیے خوب لالچ دیا جارہا تھا۔" اذان نے لبوں پہ ہاتھ جما کر مسکراہٹ چھپائی۔

چوں' چوں' گھو گھو گھوں۔۔۔ چڑیا اور فاختہ شاید کسی بات پہ خوش ہوئی تھیں تب ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹنے لگیں۔ پرندوں کی چپ ٹوٹی میٹھی بولیوں اور بے فکری چہکار سے لگ رہا تھا کہ چھاؤں میں بیٹھنے والا مہمان انہیں اب اجنبی نہیں لگ رہا۔ گیٹ پھر بجا عدن جو قریب ہی کھڑی تھی۔ قدم بڑھا کر دروازہ کھولا۔

"باجی! اماں پوچھ رہی ہے آپ کے دروازے کے سامنے جو گاڑی کھڑی ہے' وہ آپ کا مہمان ہے۔" اذان نے کسی بچے کی آواز سنی۔

"صبح سے یہ کوئی بارہویں گھر سے بچہ یہی تصدیق کرنے آیا ہے۔" مدحت کا لہجہ کھلکھلاتا سا تھا۔

"ہاں یہ خوش نصیبی ہمارے حصے میں ہی آئی ہے چلو تم شکل گم کرو۔ گاڑی نہ ہوئی ہوائی جہاز ہو گیا۔" عدن کی بڑبڑاہٹ عروج پہ تھی۔ مدحت نے فوراً اذان کی طرف دیکھا جس کی مسکراتی آنکھیں کسی بھی رویے کا بُرا نہ ماننے کی گواہی دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سہ پہر کا ہاتھ تھام کر سورج کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو اذان کی گاڑی بھی حرکت میں آئی۔ واپسی پہ اس کے ساتھ دو مستری بھی تھے۔ آج اتوار تھا اور وہ یہ دونوں کام آج ہی نپٹانا چاہتا تھا۔ بڑے گیٹ کا اندرونی کنڈا جو پچھلے کئی سالوں سے بند رہنے کی وجہ سے زنگ آلودہ اور پھنسا ہوا تھا۔ ایک مستری وہاں نیا کنڈا لگانے کی جدوجہد میں مصروف تھا تاکہ گاڑی اندر کھڑی کی جاسکے اور دوسرا اپنے ایک کاریگر کے ساتھ مشاق ہاتھوں سے یو پی ایس فٹ کرنے میں مصروف تھا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔" مدحت یہ ایک جملہ کوئی دسویں بار کہہ رہی تھیں۔

"ضرورت تھی تب ہی تو لگوا رہا ہوں۔ آپ مجھے اپنا بھی سمجھتی ہیں اور پھر غیروں جیسی باتیں بھی کرتی ہیں۔" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں انہیں مطمئن کر چکا تھا۔ اس تبدیلی پہ امن خوش تھی البتہ عدن کے سپاٹ چہرے سے کچھ بھی اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اگلے ایک ہفتے تک وہ اس گھر کے تینوں افراد کی عادات و اطوار' ان کے مزاج اور روٹین سے کافی شناسا ہو چکا تھا۔

امن ایک پُراعتماد لڑکی تھی۔ اس کے کالج آنے جانے کے لیے ایک رکشہ لگا ہوا تھا۔ عدن کی دنیا بس گھر کے اندر تک تھی۔ وہ سبزی بھی گیٹ کے اندر کھڑی ہو کر خریدتی۔ وہ ایک سادہ لوح گھریلو اور خدمت گزار قسم کی لڑکی تھی' جس کی روزمرہ زندگی مدحت کے اردگرد گھومتی رہتی جو معمول کے مطابق پچھلے صحن میں پانیوں پہ چھینٹیں اڑاتی تھی۔ وہ عدم

تحفظ کا شکار تھی وہ صبح آفس جاتا تو واپسی شام کو ہی ہوتی۔ کیونکہ یہاں سے آفس کافی دور تھا۔ آج اسے اس گھر میں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ امن سے اس کی بے تکلفی اور دوستی ہو چکی تھی۔ عدن کی طبیعت بس اپنی خالہ کے ساتھ ہی ہنسوڑ تھی یا پھر اپنی گڑیا سے رازونیاز کرتی جسے وہ درختوں کی شاخوں میں چھپا کر رکھتی۔ اذان اس کی نفسیات سمجھ چکا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں تین عمریں گزار رہی تھی۔ وہ گیارہ سال کی عدن جب اس سے بستہ اور اس کی گڑیا چھوٹی تھی، تنہائی پاتے ہی وہ اس عمر میں پہنچ کر اپنے شوق کی تکمیل کرتی تھی۔ خود سے اپنے بچپن سے ملتی۔ آتی ہوئی لہروں پہ اس جاتی ہوئی لڑکی کو دیکھتی جو اس کی ذات سے نکل چکی تھی جب وہ کچن میں ہوتی تو ایک سنجیدہ، باوقار ذمہ دار عورت کا روپ دھار لیتی گھر جس کے کندھوں پہ چلتا تھا۔ وہ گھر پر خرچ ہونے والی ایک ایک پائی کا حساب لکھتی تھی اور جب وہ اپنی خالہ کو محبت بھری کہانیاں پڑھ کر سنا رہی ہوتی تو بیس سال کی عمر میں لڑکیاں خوابوں کے جتنے محل تعمیر کرتی ہیں، وہ ان میں چلتی پھرتی سفر کرتی نظر آتی تھی۔ باہر کی دنیا اس کے لیے اجنبی تھی، خوف کی علامت تھی۔

آج بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ منچلی سی ہوا تینوں کے آنچلوں کو چھو چھو کے رنگین ہوئی جا رہی تھی۔ سب کا ٹھکانہ آج کشادہ برآمدے میں تھا۔ امن اپنی انگلش کی کتاب کھولے اذان سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ ریڑھی والے نے سبزی کی صدا لگائی۔

"عدو... آلو بینگن کے پکوڑے بنا دو۔" امن نے فرمائش کی۔ حسب عادت وہ سر ہلا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ تب ہی سعودیہ سے کال آ گئی۔ سگنل پرابلم کی وجہ سے اذان کا رخ بھی گیٹ کی طرف تھا۔

"تمہارے چچی چچا کیسے ہیں؟" ماں کے سوال پر وہ کچھ گڑبڑایا ضرور پھر سنبھل کر انہیں جواب دیا۔ اگر امی کو پتا چل جائے کہ میں اس وقت ان کی بڑی بھتیجی کے عین پیچھے، چند قدم کے فاصلے پہ کھڑا ہوں، اسے عجیب سی شرمندگی نے گھیرا۔ حرم شریف میں کھڑی ماں سے وہ کیسے جھوٹ بول رہا تھا۔ تاسف کے مارے اس نے کال ڈراپ کر دی۔ "بینگن ایک کلو کہا تھا چچا۔" وہ ہنس کر بولی۔ اتنا تو وہ جان چکا تھا کہ وہ اسی مخصوص چچا سے سبزی وغیرہ خریدتی ہے۔

"کیوں جناب! وہ مہمان ہم سے زیادہ عزیز ہے۔ جس کی خدمتیں کی جا رہی ہیں۔" یہ لوفرانہ آواز سن کر وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اذان اس کے پیچھے ہے۔ وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ مڑی۔ یہ آواز سبزی والے بابا کی ہرگز نہیں تھی۔

"آج پھر تم دروازے تک آ گئے ہو۔ میں حاجی صاحب سے شکایت لگاؤں گا۔" سبزی والے نے اسے دبے لفظوں میں جھڑکا۔

"چچا! ہم بھی سبزی خریدنے آئے ہیں ناراض کیوں ہوتے ہو۔" وہ جیسے دروازے سے جڑ کے کھڑا تھا اور بابا کے ہاتھ سے سبزی کا شاپر جھپٹ کر خوف سے پیلی پڑتی عدن کی طرف بڑھایا۔ سارا معاملہ اذان کی سمجھ میں آ گیا۔ ایک ہاتھ سے عدن کو راستے سے ہٹا کر وہ تیر کی تیزی سے باہر گیا۔ وہ نوجوان جو شکل سے ہی آوارہ دکھائی دے رہا تھا اسے دیکھ کر ٹھٹکا ضرور۔ مگر اپنی جگہ جما رہا۔ اذان عین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ لڑکا اس کے اونچے قد اور بارعب شخصیت کے سامنے تنکے جیسا لگ رہا تھا۔

"آئندہ اگر اس گھر کے سامنے نظر آئے تو واپس اپنی ٹانگوں پر چل کر نہیں جا سکو گے۔" اس کا مضبوط لہجہ اور سرد الفاظ سن کر لڑکے کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ اذان لب بھینچے اپنے غصے کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔

"آئندہ سبزی ہمیشہ اپنے گھر کے سامنے خریدنا اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔" دل تو کر رہا تھا کہ الٹے ہاتھ کے دو چار جھانپڑ رسید کرے۔

"ورنہ...؟" وہ لڑکا شاید اب کچھ سنبھل چکا تھا۔

"ورنہ تمہیں کل ہی پتا چل جائے گا۔" اتنا کہہ کر اذان اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ ایسے لوفروں سے نپٹنا اچھی طرح جانتا تھا۔ آنٹی اور امن کے

ہراساں چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ عدن انہیں سب بتا چکی ہے۔

"تو عدن کا باہر کی دنیا سے کٹ کر رہنے کی وجہ کیا یہی لڑکا ہے؟" اس نے باری باری ان دونوں خالہ بھانجی کو دیکھ کر دبے ہم لہجے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پہ غصہ ابھی تک نمایاں تھا۔

"کیا کریں بیٹا! اکیلی عورتوں کو ایسے لوگ تر نوالہ سمجھتے ہیں وہ تو تمہارے ماموں کی وجہ سے محلے میں ہماری بہت عزت کی جاتی ہے ڈھائی سال ہو گئے بچی کو گھر سے نکلے۔" کچھ لمحوں کے لیے اذان سانس لینا بھول گیا۔ سانس لینا واقعی اسے دشوار لگا۔

"کہتا تھا زبردستی اٹھوا کر نکاح کر لوں گا۔ ساری گلی جانتی ہے۔ بس یہ ذرا حاجی صاحب سے جھجکتا ہے۔ بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔" ایک انسان پرندے کی طرح اتنا عرصہ پنجرے میں بند رہے پھر بھی وہ ہنستا ہے بولتا ہے۔ اس کی سانس سے زندگی خوشبو کشید کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں نے اس باہمت لڑکی کو کھوجا۔ گھر پکوڑوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ گویا وہ معمول کی طرح اپنے کام میں مصروف تھی۔

"ان کے ماموں سے کہا تھا۔ جبران سے بھی کہا تھا' کہنے لگے ہم کیوں دشمنی مول لیں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ ڈر کے بھاگ گئے۔ جانے اس کم بخت نے جبران کو کیا دھمکی دی تھی' چار سال ہو گئے آیا ہی نہیں۔" اذان کے دل کو کسی احساس نے بری طرح کچلا۔

"امی آپ نے ذرا اچھا نہیں کیا۔" حرم شریف میں طواف کرتی ماں سے اس نے بھرپور غائبانہ شکوہ کیا۔ کچھ دیر قبل ماں سے جھوٹ بولنے کا احساس زائل ہو کر اب گہرے پچھتاوے میں بدل گیا۔

"پھر بھی عدن کو اس طرح ڈر کر گھر میں بند نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بے جھجک ہو کر باہر آتی جاتی تو وہ یوں شیر نہ بنتا۔" کافی دیر بعد وہ اپنی آواز اور سانس کی تیزی پہ قابو پا کر کچھ بولنے کے قابل ہوا۔

"آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے۔ میرے لیے ایسا کرنا مشکل ترین تھا۔" عدن نے پکوڑوں سے بھری پلیٹ اور چائے کے تین کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں کہا۔ اذان نے جھٹکے سے سر اٹھا کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اگر وہ مجھے اغوا کر کے ایک گھنٹہ بھی اپنے پاس رکھتا تو باقی تمام زندگی میری لیے صرف موت ہوتی۔ اذان صاحب! عزت کے ساتھ گھر کی قید بھی میرے لیے راحت ہے۔ جنت ہے اور پھر ہمارا تھا ہی کون جو اس سے حساب کتاب لیتا۔" اذان کی نگاہ یکلخت جھکی۔

"بس اللہ ہمارا واحد سہارا ہے جس کی پناہ میں ہم بحفاظت ہیں۔" چائے کا کپ اس نے نرمی سے اذان کے سامنے رکھا اور قدم واپس موڑے۔ وہ اس کے صاف شفاف پاؤں نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔ دل کی بے چینی الگ سوا تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن اس نے آفس کے اردلی بھیج کر اس لڑکے اور اس کے باپ کو اپنے آفس بلایا جو اے سی صاحب کے بلاوے پہ بلا چوں وچراں اس کے سامنے موجود تھے۔ وہ لڑکا اسے اے سی کی کرسی پہ دیکھ کر حیرت زدہ سا دیکھتا ہی رہ گیا۔

"سر آپ کے کتنے بچے ہیں۔" کافی دیر بعد اذان مؤدب انداز میں اس کے باپ سے مخاطب ہوا البتہ اس کی جامد نگاہیں اسی لڑکے پہ ٹکی رہیں۔

"یہی ناخلف میری واحد اولاد ہے۔" باپ نے شرمندگی سے سر جھکا کر جواب دیا۔

"آپ لوگ اس محلے میں کتنے عرصہ سے رہائش پذیر ہیں۔" اگلا سوال آیا۔

"جی بارہ سال ہو گئے ہیں۔" جواب پھر عاجزی سے دیا گیا۔

"ہوں۔" اذان نے ایک گہرا سانس لیا۔

"پھر تو آپ کی حنان صاحب سے دو تین سال تک واقفیت اور بات چیت رہی ہو گی۔"

"جی جی۔" اس آدمی نے فوراً سر ہلایا۔

"آپ یقیناً اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے بھی واقف ہوں گے۔" اذان نے قہر برساتی نظر اس آوارہ پہ ڈالی۔ جو پہلو پہ پہلو بدل رہا تھا۔

"یہ میری بدنصیبی ہے کہ اس نانہجار نے محلے میں مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" باپ کے لہجے میں دکھ کے ساتھ واضح لرزش در آئی۔

"ماں تو ہر گھر میں ہوتی ہے۔ جو عورت کا سب سے مقدس روپ ہے، لیکن اس کے گھر میں دو چار جوان بہنیں ہوتی، تو یہ شخص یوں لوگوں کی بیٹیوں کو اغوا کی دھمکیاں دن دیہاڑے نہ دیتا پھرتا۔" وہ اپنے مزاج کے مطابق تحمل سے بات کر رہا تھا۔ اندر سے وہ جس قدر گزشتہ دن سے کھول رہا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

"خیر۔ رزاق صاحب دو تین دنوں کے اندر آپ کو وہ محلہ چھوڑنا ہوگا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ باپ بیٹے نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ تب ہی دروازہ بجا۔ یس کی آواز پہ ڈیوٹی پہ مامور چپڑاسی نے اندر آکر مؤدب لہجے میں اطلاع دی۔

"سر! ایس۔ ایس۔ پی صاحب آپ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔" اس لڑکے کے چہرے پہ ایک دم تاریکی چھا گئی۔

"انہیں فوراً اندر بھیجیں۔" اس نے مطمئن ہو کر اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بالکل ڈھیلے انداز میں کرسی کو ادھر ادھر گھمایا۔ ایس ایس پی صاحب نے ادھر ادھر نظر ڈالے بنا عین اس کے سامنے نشست سنبھالی۔

"آج اے سی صاحب کو ہماری شکل دیکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔" اس نے اذان سے مصافحہ کرتے ہوئے بشاش لہجے میں کہا۔

"آپ کی شکل دیکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ آپ کو کسی کی شکل دکھانی تھی۔" اذان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"وہ کون سی خوش نصیب شکل ہے۔" اس کا لہجہ بھی شریر ہوا۔

"صاحب اس کو معاف کریں۔ ہم۔ میں وعدہ کرتا ہوں دو دنوں تک وہ محلہ چھوڑ دیں گے۔" اچانک وہ آدمی اٹھا اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ پلیز تشریف رکھیں۔" اذان نے کوفت زدہ ہو کر اسے دیکھا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس کے بیٹے سے مخاطب ہوا۔

"میری بات دھیان سے سنو اور یاد بھی رکھنا، میں حنان صاحب کا سگا بھانجا ہوں اور یہ پولیس آفیسر میرے تایا کا بیٹا ہے۔ اس گھر کو تم نے لاوارث سمجھ رکھا تھا تو یہ تمہاری بھول تھی۔" اس کے کرخت لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

"اگر آئندہ اس لڑکی کو خواب میں بھی دیکھنے کی کوشش کی تو میں تمہاری آنکھیں نکالنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ میری بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔" اس نے ٹیبل پہ زور سے ہاتھ مارا۔

"جی، جی۔" وہ لڑکا ایک دم کانپا۔

"وہ فیملی اب تنہا نہیں۔ پہلے ہمارے کچھ خاندانی مسئلے چل رہے تھے جواب ختم ہو چکے ہیں۔ اب تمام زندگی اس محلے میں تمہاری شکل نظر نہیں آنی چاہیے ورنہ باقی ماندہ عمران صاحب کے جیل میں مہمان بن کر گزارنی پڑے گی۔" اور اسی لمحے اس کے سامنے بیٹھے پولیس آفیسر نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

"بس کرو یار۔ اب گیند تمہارے کورٹ سے نکل چکی ہے۔" پھر وہ اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔

"میں نے تمہاری اغوا کی دھمکیوں کو صرف لڑکی کے نام اور مقام کی وجہ سے فراموش کر دیا ہے ورنہ وہ چھترول لگاتا کہ عشق کا سارا بھوت ہوا ہو جاتا۔" غفران کی بات سے اس کے دل میں کوئی نوکیلا کانچ چبھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عدن کا روشن اور پاکیزہ چہرہ آگیا۔ اتنا گھٹیا اور حقیر شخص عشق جیسے لفظ کا مرتکب وہ بھی اس کے لیے کیسے ہو سکتا ہے۔ چبھن جیسے دل میں گھر کر کے اس کی کیفیت کا لطف لینے لگی۔

"او کے اذان! پھر کل شام میں ملاقات ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ان کے سامان کی شفٹنگ کے وقت اگر میں بھی وہاں موجود ہوں تو زیادہ بہتر رہے گا۔" اس نے بائیں آنکھ میچ کر اسے اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔" اذان نے بھی ذو معنی سا جواب دیا۔ سو وہ ہاتھ ملا کے رخصت ہوا۔

"اب آپ دونوں جاسکتے ہیں۔" اگر اس کے بس میں ہوتا تو ان میں سے ایک کو دنیا سے ہی بھیج دیتا۔ اس نے ان کی طرف دیکھے بنا اپنے سامنے ایک فائل کھسکائی۔ وہ یوں جلدی سے باہر کو لپکے جیسے صدیوں کے بعد رہائی ملی ہو۔

"گھٹیا لوگ۔" اذان نے ان کے جاتے ہی دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جاکر انگلیاں آپس میں مدغم کیں اور خود کو پرسکون کرنے کے لیے جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

"آج زوبیہ کو ہماری یاد کیسے آگئی؟" رخشندہ کو واقعی خوشی ہوئی۔ ایک تو وہ اس کی ہونے والی سمدھن کی قریبی دوست تھی۔ دوسرے بڑے کمال کی چیز تھی' کسی چوکنے اینکر سے کم نہیں تھی۔ جس کا چاہے پانسہ پلٹ سکتی تھی اور کسی کا بھی بیڑا غرق کرنے کا مکمل اختیار رکھتی تھی۔

"آپ سے ملے بھی کافی عرصہ ہوگیا تھا' مگر سچ بتاؤں تو اذان کی خبر گیری کا بھی دھیان تھا۔ آخر کو ماں باپ سے پہلی دفعہ جدا ہوا ہے اتنے عرصے کے لیے پھر آصفہ سے گلہ کرے گا کہ اچھی خالہ ہے تمہاری غیر موجودگی میں میری خبر تک نہیں لی۔" آج وہ خلاف معمول سوچ سمجھ کر بول رہی تھی نظریں بھٹک بھٹک کر دروازے طرف اٹھتیں۔

"اذان ہماری طرف تو نہیں ٹھہرا ہوا۔" رخشندہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"میرے سامنے آصفہ نے اس سے کہا تھا کہ ہمارے بعد تایا کی طرف ٹھہرنا۔"

"پھر یہاں نہیں ہے تو وہ ہے کہاں۔۔۔؟" اس کے اندر خود بڑی شدت سے کھدبد ہوئی۔

اصل میں زوبیہ کو جس کا انتظار تھا' وہ آگیا۔

"السلام علیکم خواتین اینڈ خواتین!" غفران شگفتگی سے مسکرایا اور ماں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"امی۔۔۔ بہت اسٹرونگ سی چائے بنوایئے' بہت تھک گیا ہوں۔"

"ثمو! بھائی کے لیے ذرا الگ سے اسٹرونگ سی چائے بنا لاؤ۔" انہوں نے کچن کی جانب رُخ کر کے ہدایت دی' پھر پوری اس کی طرف گھومیں۔

"غفران! تمہیں کچھ علم ہے اذان کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔" انداز کچھ تشویش زدہ تھا۔

"جی امی۔" وہ اپنے ماموں کے طرف ہے۔" وہ بند آنکھوں کو پوروں سے دباتے ہوئے بولا۔ زوبیہ کو جیسے کسی نے کھولتے ہوئے کنویں میں دھکا دیا۔

"اس کے ماموں کی فیملی کے ہاں تو ایک عرصے سے ان کا آنا جانا تقریباً" ختم ہی ہے۔" رخشندہ نے کچھ محتاط سا ہو کر ترچھی نظروں سے زوبیہ کو دیکھا۔

"مگر ہیں تو ان کے رشتہ دار ہی۔ پھر آنٹی کی رضامندی سے ہی گیا ہوگا۔ میری آج ہی کسی کام کے سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ خوش باش ہے۔ ویسے یاد آیا' آنٹی آپ بھی تو اسی محلے کی پروردہ ہیں۔" غفران ایک دم سیدھا ہوا۔ زوبیہ نے گڑبڑا کے پہلو بدلا۔

"زمانہ ہی ہوگیا اماں ابا کے بعد بھائیوں نے وہ گھر بیچ دیا۔ اب تو بھولے بھٹکے سے بھی کبھی جانا نہیں ہوا۔"

"مگر آپ کے رشتہ دار تو اسی گھر میں رہتے تھے۔" غفران نے جیسے اس کی شہ رگ پہ ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ایکدم بدکی۔

"میرا چچیرا بھائی شاید ابھی تک ادھر ہے کیوں کہ بھائیوں سے وہ گھر اس نے خریدا تھا۔" آواز بمشکل حلق سے نکلی۔

"کل تک وہ ضرور ادھر تھا' مگر آج کہیں اور شفٹ

کر گئے ہیں وہ لوگ۔" غفران کا گھونٹ بھرا ابھی تک اسے اپنے نرخرے پہ محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ تم کیا اس کے ماضی کے دروازے کھول کے بیٹھ گئے ہو۔" رخشندہ ہلکا سا ہنسیں۔

"ارے نہیں امی! اصل میں ان کے کزن کا بیٹا کچھ اچھے قماش کا نہیں تھا۔ دور کی بات تو چھوڑیں' اپنے گلی محلے کی لڑکیوں کو بھی کھلے عام اغوا کی دھمکیاں دیتا پھر رہا تھا۔ وہاں کے باسیوں کی شکایت پر پولیس کو نوٹس لینا پڑا۔ آج شام وہیں گزری تو وہاں آنٹی کے والد کا بھی تذکرہ ہو رہا تھا اور اتفاق دیکھیں گھر آتے ہی ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔"

"بڑی چوکنی ہو گئی ہے ہماری پولیس فوراً" نوٹس لے لیتی ہے۔" ثمرہ نے چائے پکڑاتے ہوئے کھلا طنز کیا۔ رخشندہ کا ذہن کچھ الجھ سا گیا تھا۔

"میں ذرا تھوڑی دیر نیوز کا لطف اٹھالوں۔" وہ ان سے معذرت کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ ملازمہ زوبیہ اور رخشندہ کو چائے پیش کر رہی تھی۔ جب وہ جا چکی تو زوبیہ رخشندہ کی طرف کھسکی پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر رازداری سے بولی۔

"اذان کو کیا سوجھی ماموں کے ہاں ٹھہرنے کی۔ ہم خود بچیوں والے ہیں۔ کہنا تو نہیں چاہیے مگر وہ لڑکیاں اچھے کریکٹر کی نہیں ہیں۔ گلی محلے میں کتنے ہی لڑکوں کو پھانس رکھا ہے اپنا اذان تو پھر سیدھا سادہ بچہ ہے۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا رخشندہ اور میں اب چلتی ہوں۔ سارہ انتظار کرتی ہوگی۔" رخشندہ جیسے زبردستی مسکرائیں اور اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔

اس نے تیلی سلگا کر بھری ماچس میں رکھ دی تھی۔ دھواں بنا یا آگ لگتی کچھ عرصہ تک نتیجے کا انتظار کرنا تھا۔ شیر دل کی باتوں سے اسے شک گزرا تھا کہ وہ اے سی صاحب کہیں اذان ہی تو نہیں جس نے غفران کے ساتھ مل کر انہیں اس محلے سے بے دخل کیا ہے۔ آج اپنے شبے کی تصدیق کی غرض سے ہی وہ یہاں آئی تھی۔

"میں دیکھوں گی مدحت بیگم کہ تمہاری زندگی میں اچھے دن کیسے واپس آسکتے ہیں۔" سوچ کی تلخی کا ذائقہ اس کی زبان تک اتر آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

چھکا چھک' چھکا چھک۔ موٹر پمپ چلتا تو یوں لگتا کہ زمین زلزلے کی زد میں ہے۔ آج وہ مستری سے موٹر پمپ ٹھیک کروا رہا تھا اور جن ٹوٹیوں اور شاورز میں پانی کم آتا تھا ان کی بھی بدلی ہو رہی تھی۔ کام ختم کروا کر ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ عدن کی سنجیدہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"ہم فقیر نہیں اذان صاحب کہ حیلوں بہانوں سے ہماری امداد کی جائے۔ یو پی ایس سے لے کر آج تک کے تمام سامان کی رسیدیں مجھے چاہئیں۔" اذان دیکھ رہا تھا کہ وہ کل کے واقعے کے بعد کچھ اکھڑی' اکھڑی سی تھی۔ گھر خالی کرواتے وقت وہاں پولیس کی کافی بھاری نفری تھی جو کہ باقی گلی محلے والوں کے لیے تنبیہہ تھی کہ اب بند گلی کے سرے پہ موجود گھر کی طرف کوئی میلی یا اجلی آنکھ سے بھی دیکھنے کی جرات ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔

آج صبح سے ہی گھر میں محلے کی خواتین کا آنا جانا لگا رہا سب ایک ہی بات دہراتی رہیں کہ حنان صاحب کا بھانجا بہت بڑا افسر ہے۔ جس نے شیرو جیسے لوفر سے اس محلے کو نجات دلا کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

"کس قدر گھنا ہے یہ بندہ ذرا جو اپنی ملازمت کی بھنک بھی پڑنے دی ہو۔ خالہ کے استفسار پر کیسے معصوم بن کے کہا کہ گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔" آج جب اسے حقیقت کا علم ہوا تو عدن کے تو گویا تلووں پر آ کر بجھی تھی۔ اس کے اس قدر روڈ انداز پہ اذان نے ٹھٹک کر بغور اسے دیکھا۔ پھر سہولت سے بولا۔

"رسیدیں وغیرہ تو میرے پاس ہیں مگر جو بات آپ کو مشتعل کر رہی ہے' سیدھے سبھاؤ سے وہ بتا دیں تو مہربانی ہوگی۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"آپ کسٹم میں ہوں' واپڈا میں کلرک ہوں یا چوکیدار' ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں اور نہ ہی یہ

بات مجھ کو مشتعل کر رہی ہے۔"

"اوہ۔" اذان نے محظوظ سا ہو کر لبوں کو گول کیا۔ اس لمحے اس کی غصیلی آنکھوں میں بھلا وہ جھانکنے کی مجال کیوں کر کر سکتا تھا۔

"عدن یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اشاروں کنایوں میں مدحت اسے ڈپٹ چکی تھیں۔ مگر اب کھل کے بالآخر بولنا ہی پڑا۔

"رہنے دیں آنٹی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے روکا۔ پھر دوبارہ تلملاتی عدن سے مخاطب ہوا۔

"آپ اس تمام واقعے کو صرف اپنی ذات تک محدود مت سمجھیں۔ سمجھیں ہر گھر میں مجبور ماں باپ اپنی بیٹیوں کی طرف سے اسی صورت حال کا شکار تھے۔" اس نے نرم لہجے میں کہہ کر متانت سے اسے دیکھا۔

"آپ کی دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آپ لوگ امداد کے مستحق ہرگز بھی نہیں۔ اب تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں آپ سے پیسے مانگتا اچھا لگوں گا۔" وضاحت دیتی نظریں اسی پہ مرکوز تھیں۔

"جانے سے قبل فرصت میں تسلی سے تمام حساب کر لیں گے۔ جاب کے متعلق اس لیے نہیں بتایا کہ پھر لڑکیاں اس حرکت کو شوبازی سے منسلک کرتی ہیں۔" اس کا چہرہ تک مسکرا اٹھا۔

"کیوں آنٹی سچ کہہ رہا ہوں نا۔" نگاہوں کا ارتکاز ٹوٹا وہ مدحت سے تائید چاہتا' قریب سے گزرتی امن کو پکار بیٹھا۔

"ایک کپ چائے ہو جائے۔" جواباً" اس کے قہقہہ لگانے کو حیرت سے گھورا۔

"سمجھیں آپ نے گرم پانی کی فرمائش کی ہے۔"

وہ جھٹ قہقہے کی وجہ بتاتی کسی کمرے میں گھس گئی۔ عدن اسے گھورنا چھوڑ کر کچن کی طرف مڑی تو اس نے بھی طمانیت بھرا گہرا سانس لیا۔ اسے غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اس کی خودداری اچھی لگی تھی۔

"آپ نے ملازمہ وغیرہ کا جھنجٹ نہیں پالا ہوا۔"

اپنی ماں کو گھر میں ملازمہ سے جھک جھک کرتا دیکھ کر وہ جھنجلاہٹ اور کوفت کا شکار ہوتا تھا۔

"پرانی ملازمہ کی بہو آتی ہے۔ دوسرے تیسرے دن مشین لگا کر کپڑے دھو جاتی ہے۔ ساتھ ہی تفصیلی صفائی وغیرہ بھی کر جاتی ہے۔" آنٹی کی گفتگو میں اس کے سوال کرنے کا تجسس اپنی جگہ برقرار رہا۔

"عدن کو ساتھ ساتھ پڑھائی جاری رکھنی چاہیے۔" وہ دیکھتا تھا کہ وہ کیسے ذرا ذرا سے میسج پڑھانے کے لیے امن کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔

"مطلب ریگولر نا سہی ٹیوشن سینٹر وغیرہ ہی جوائن کر لے۔" وہ بالکل مدہم لہجے میں بات کر رہا تھا کہ مبادا کہیں وہ سن کر پھر کسی کمپلیکس کا شکار نہ ہو جائے۔ ایک تو ویسے ہی بات بات پہ آنکھیں دکھانے لگتی ہے۔

"پہلے تو اس کم بخت لڑکے کا مسئلہ تھا اب میں اس سے بات کروں گی کہ شام میں وقت نکالے۔ ایک تو آج کل یہ لڑکیاں موئے ڈرامے بہت دیکھتی ہیں اور وہ بھی مانو بالکل فارغ ہیں جو ڈراموں پہ ڈرامے بنائے چلے جاتے ہیں۔" ساتھ ہی ترچھی نظر سے چائے لے کر آتی بھانجی کو دیکھا۔

"خالہ کیسی جاہلانہ بات کرتی ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ اعتراض اس پہ تھا کہ سب کے سامنے ہی کرتی ہیں سو کشیدہ نظر مہمان پہ ڈالی۔

"یہ ان کا ذریعہ معاش ہے۔" ٹیبل پہ چائے رکھ کر سیدھی ہوئی تب ہی اس کے سیل پہ مسیج ٹون بجی۔ اب یہ پڑھی لکھی بہن کی طرف دوڑ لگائے گی اور کچھ لمحوں بعد وہ نگاہیں سیل پہ جمائے امن کے نام کی ہانک لگا رہی تھی۔ اذان نے کمروں میں جھانکتی عدن کو محظوظ سا ہو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

زوبیہ نے رزاق کے اٹھتے ہی شیر دل کو آڑے ہاتھوں لیا۔ دل تو کر رہا تھا کہ اس کے لمبے تڑنگے وجود کا حشر قیمے سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

"غفران کے سامنے میرے ابا کا نام لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔" لہجے میں کریلے سے بھی زیادہ کڑواہٹ تھی۔

"کیوں کہ میرے ابا آپ کی سہیلی کے سسرال والوں کو خوب جانتے تھے اور پہچان کر ہی آپ اور ان کے بیچ تعلق کی وضاحت کی تھی۔" شیرو نے زوبیہ کو بڑی میٹھی اور تاڑتی نظروں سے دیکھا۔

"ایسی نظروں سے مجھے نہیں حنان کی بیٹی کو تاڑتے رہتے تو زیادہ بہتر تھا۔" وہ جیسے جھلس کر بولی۔

"اتنے سالوں میں تجھ سے اتنا سا کام نہ ہو سکا۔"

"وہ ذرا سا کام نہیں تھا پھوپھی! دھمکی اپنی جگہ مگر اغوا کرنے کی صورت باقی تمام عمر جیل میں سڑنا پڑتا تو کیا بعد میں تو مجھے نکلواتی جو اپنے باپ کا نام درمیان میں آنے پر مجھے قتل کرنے کے درپے ہے۔" شیرو کو بھی ہری مرچیں داڑھ کے اندر رکھنے کی عادت تھی۔

"ویسے بھی میں تو صرف تیرے کہنے پہ اس لڑکی کے پیچھے لگا رہا ورنہ ایسا کیا تھا اس میں، نہ کوئی اسٹائل نہ فیشن۔" وہ بدمزہ ہو کر بولا۔

"اوپر سے محلے کی لڑکیوں نے جو واقعی دیکھنے کے قابل تھیں، مجھے اس کا عاشق سمجھ کر کبھی لفٹ تک نہ کرائی۔"

"اس کا عاشق رہنے میں تجھے کون سے گھاٹے کا سامنا کرنا پڑا۔" اس نے آم کی قاش اٹھا کر منہ میں رکھی۔ "تیرے باپ کی ابھی تک چونسہ کھانے کی لت نہ گئی۔" آم کا ذائقہ چکھ کر موڈ کچھ خوش گوار ہوا۔

"ایک تو پھوپھی تو ماضی کی کتاب کھول کر ہر وقت رٹے لگاتی رہتی ہے۔" شیرو منہ پھاڑ کے ہنسا۔

"سارے صفحات پھاڑ کے۔ ٹوٹے کر کے پھینک دیے ہیں۔ بس ایک دو سنبھال کے رکھے ہیں۔" آج بھی اس کے تصور میں حنان کا وجود ہلچل مچاتا تھا۔ "خیر اتنا تو ہوا کہ عدن کی پڑھنے پڑھانے کی عمر تیرے خوف سے نکل گئی۔ اوپر سے شکل بھی واجبی سی۔ کہاں اذان... کہاں وہ..." وہ اطمینان و تسلی کے سارے پل باندھ کے بولی۔

"ویسے پھوپھی اچھوتی ہیں بڑی قیامت کی چیز ہے۔" وہ آنکھیں ٹیڑھی کر کے خباثت سے مسکرایا۔

"خبردار۔" اس نے فوراً "شہادت کی انگلی اس پہ تانی۔

"اب نہیں... پہلے کی بات اور تھی۔ اب اذان کا آنا جانا ادھر رہے گا اور جو غفران کے سامنے تیرے باپ نے رشتہ داری کا بک دیا ہے تو جانتا تو ہے کہ میں سارہ کی شادی اذان سے کرنے کی خواہش مند ہوں۔"

"اتنے اونچے خواب نہ دیکھو۔ آسمان سے گرے گی تو ہڈی پسلی کا رونا بھی نہیں رونا پڑے گا پھوپھی۔" سارہ کا پرکشش سراپا نگاہوں میں گھوما تو پھوپھی کی شکل پہ پھٹکار برستی نظر آئی۔

"اتنے سالوں سے آصفہ میری مٹھی میں ہے اور جو گڑ میں رخشندہ کی دیوار کے ساتھ لگا کر آئی ہوں اب دیکھنا کس کا کھیل بنتا ہے اور کس کا بگڑتا ہے۔" دھیان میں رخشندہ کا پھیکا پڑتا چہرہ آیا تو اس کے ہونٹوں پہ ایک شاطر سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"لگتا ہے آج کل شیطان کی اکیڈمی میں پھوپھی کا آنا جانا کچھ زیادہ ہی ہے۔" اس کے بلند و بانگ قہقہے پہ زوبیہ نے چونک کر ناگوار نظروں سے اسے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

ہوا کے چھوتے ہی کھڑکی کا پٹ زور سے بجا۔

"میں ساحرہ ہوں۔ میں محبت کی مانند احساس کو چھو لیتی ہوں۔ جسموں کے اندر سرایت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ آؤ مجھے چھو کے دیکھو اور مجھے چھونے دو۔" اس نے کان میں سرگوشی کر کے ایک کھلی ترغیب دی۔ لمس کا ہلکا سا احساس بخش کر دور ہو گئی۔ اندر حبس بڑھ گیا تھا۔ سب کی نیند ٹوٹنے کے احساس سے آہستگی سے دروازہ وا کرتا وہ باہر آیا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ روزانہ برآمدے میں آنٹی اس کے لیے بستر بچھواتی تھیں۔ وہ باہر سونے کا عادی نہیں تھا۔ آج موسم ٹھنڈا تھا تو وہ کمرے کی گھٹن سے گھبرا کر دبے پاؤں چارپائی تک آیا۔ ہوا بہت خوش گوار تھی جھوم

کے ابا سے لپٹی۔

"عدن۔۔۔ تمہیں اذان بھائی کیسے لگتے ہیں؟" دونوں بہنیں صحن میں چارپائیاں بچھا کر لیٹی ہوئی تھیں۔ امن کے سوال پر وہ سیدھا لیٹا اپنے بارے میں لڑکیوں کی رائے سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اس کی کزنز کی سراہتی نظریں اسے گھیرے میں لیے رہتیں۔ اس کی نظر میں یہ دونوں بہنیں ابھی بچیاں تھیں۔ وہ پرخلوص نگاہوں سے انہیں دیکھتا تھا پھر بہن سے ایسے سوال کی کوئی تک بنتی تھی۔

"کیا مطلب کیسے لگتے ہیں؟" الٹا اس نے سوال داغا۔ تڑتڑاتا ہوا لہجہ چھوٹی بہن کے کان کھینچتا ہوا۔

"اوفوہ!" مطلب دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں۔ امن جھنجلائی۔

"جیسا کہ۔۔۔ جبران تمہیں گنجا نظر آتا ہے۔" جملہ بول کے تھرتھرائی بھی۔

"کیونکہ وہ گنجا ہے اس لیے گنجا نظر آتا ہے۔" وہی سابقہ لہجہ کرختگی سے بھرپور۔

"اچھا چپ تو کرو۔" امن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح سمجھائے۔

"جیسے ہمایوں سعید تمہیں اچھا لگتا ہے۔"

"لاحول ولا قوة۔" اذان نے کروٹ بدلی۔

"بے وقوف ہمایوں کو تو میں نے بے شمار' بے حساب دیکھ رکھا ہے۔" "اس کی تو بات ہی الگ ہے۔" لہجے میں شرینی سی گھلی۔

"میرے حساب سے اذان بھائی کو آئے ہفتہ ڈیڑھ تو ہو ہی گیا ہے گھر آنے کے بعد برآمدے میں ہی بیٹھتا ہے' تو اور کون سا گھونگھٹ نکال کر بیٹھتا ہے۔" امن کا تیز ہوتا لہجہ بے یقینی سے بھرپور تھا اندھیرے میں یقیناً" آنکھیں پھاڑے اسے تک رہی تھی۔

"اچھا ناراض تو مت ہو۔ بتاتی ہوں۔" جیسے بہن پر ترس آیا۔

"سچ بتاؤں۔۔۔ میں نے کبھی اسے دھیان سے دیکھا ہی نہیں۔"

"لیجئے اے سی صاحب' خوش گمانیوں کے جھولے

سے اتر آیئے۔" نرم ہوا نے اس کی آنکھوں پہ دھرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ پورے استحقاق سے دھرا' اس قدر ہوا کا حق جتانا اسے اچھا نہیں لگا تھا شاید کہ جھٹکے سے آنکھوں پر سے کلائی ہٹا کر گھپ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اس بیس سالہ لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی' جس کی دور و نزدیک کی نظر خاصی کمزور ہوگی۔ اس نے یقین کی حد پار کی۔

"اسے دیکھتے ہی مجھے غصہ آجاتا ہے۔" فضا میں گھلی لیموں کی باس نے مہمان کی سانسوں کو کافی کھٹا کیا۔

"ذرا سوچو' ابا کے مرنے کے بعد رشتہ داروں سے محبت ایک دم کہاں سے پھوٹ پڑی ۔۔۔ بلکہ ابا کے ہوتے بھی کون سا پھوپھو آتی تھیں' مگر بہت نرم خو' شفیق سے مسعود پھوپھا کا تصور میرے ذہن میں بہت پختہ ہے' ابا نے جب خالہ سے شادی کی تو اس کے بعد بھی یقیناً" پھوپھو سے چھپ کر ہی آتے ہوں گے۔

"میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتی۔" امن نے اس کی نامکمل بات کا آخری کونا اپنے ہاتھ میں لیا۔

"ہمارے گھر کی دیواروں پہ کون سے ہیرے جواہرات جڑے ہیں جنہیں وہ اتارنے آیا ہے' پھر خالہ مدحت کو اگر اس کے خلوص پر شک ہوتا تو ڈیڑھ دو ماہ کے لیے یوں ایک اجنبی کو گھر میں ٹھہرنے دیتیں۔" امن کو اذان کے بارے میں ہری ہری سوجھ رہی تھی اس لیے اس کا لہجہ بھی سبز پتوں جیسا تھا۔

"خالہ کو جیسے زمانے کی بڑی خبر ہے۔ ان سا سیدھا تو کوئی ہے ہی نہیں بوا رشیدہ بتا رہی تھی کہ اذان صاحب کے چچا تایا اسی شہر میں رہتے ہیں' جبکہ وہ حضرت' خالہ سے کہہ رہے تھے' ماموں کے علاوہ شہر میں کوئی دوسرا رشتے دار نہیں تھا۔ آفس کا مسئلہ تھا۔ اس لیے ادھر آیا ہوں' جبکہ۔۔۔"

"ایک تو یہ تمہارا جبکہ' مجھے زہر لگتا ہے' سونے دو مجھے۔" جب بات اس کی پسند کے خلاف ہوا کرتی تو وہ یوں ہی رستہ بدل لیا کرتی تھی۔

"ناراض مت ہو' صبح دھیان سے دیکھوں گی' پھر

بتاؤں گی کہ کیسا دکھتا ہے ٗلیے بیٹھتا ہے۔"

"تم نے نوٹ کیا ٗہم دونوں سے وہ یوں بات کرتا ہے جیسے ہمارے منہ میں چوسنیاں ہوں۔" رات کے سکوت میں اس کی ہلکی ہنسی کلی کی طرح چٹکی تھی۔

"ہم سے کافی بڑا ہے نا۔۔۔ اس لیے۔" امن کچھ صلح جو ہو کر بولی۔

"وہ ہمیں جاہل اور بے وقوف سمجھتا ہے اس لیے۔" سکوت شب نے مسحور سا ہو کر برآمدے میں چت لیٹے خوبرو مہمان کے ہونٹوں سے چپکی مسکراہٹ کو دل لگا کر دیکھا۔ ہوا پودوں کی خوشبو کو سونگھتے چہار اطراف مٹر گشت کرتے کرتے کچھ تھکنے لگی۔ صحن سے آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ نیند کا اسم محبت کی مانند بے اختیار کر دیتا ہے ٗنیند کی پہلی تھپکی پہ بے اختیاری کے عالم میں اترنے سے قبل وہ کمرے میں چلا آیا۔ صبح اسے برآمدے میں سوتا دیکھ کر وہ انہیں شرمندگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری بات اذان سے نہیں ہوئی۔" نوڈلز کا باؤل تھامے کسی موی میں گم بیٹی کو رخشندہ نے دھیان سے دیکھا۔

"آپ جانتی تو ہیں ٗکس قدر موڈی ہے وہ ٗحال احوال سے آگے بات ہی نہیں کرتا۔ اس کی جاب ایسی ہے کہ وہ واقعی بزی ہوتا ہے۔" ثمرہ نے ایک ہاتھ سے اپنے نرم تراشیدہ بالوں کو ادا سے پیچھے کیا۔

"تمہیں پتا ہے ٗوہ آج کل ناظم آباد میں اپنے ماموں کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔"

"کیا۔" ثمرہ ہلکی آواز میں چیخی۔

"میں بلیو نہیں کر سکتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یقیناً کسی ہوٹل میں ہوگا ٗاسے اپنی پرائیویسی بہت عزیز ہے۔" وہ دوبارہ نوڈلز کی طرف متوجہ ہوئی۔

"خبر پکی ہے کیونکہ غفران نے دی ہے۔" رخشندہ لب کاٹتے ہوئے کسی سوچ کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی۔ اب صحیح معنوں میں ثمرہ کی بھوک اڑی۔

اس نے باؤل قریبی ٹیبل پر رکھا۔

"زوبیہ بتا رہی تھی کہ اس کی ماموں کی لڑکیاں اتنی اچھی شہرت نہیں رکھتیں۔ اس لیے کہہ رہی ہوں اسے اپنے کانٹیکٹ میں رکھو۔"

"مما! وہ لڑکیوں کے معاملے میں نہیں پڑتا۔ خود کو بڑی اونچی چیز سمجھتا ہے ٗبالکل تائی جیسا ہے جو اپنے سامنے کسی کو کچھ گردانتی نہیں اور آپ زوبیہ آنٹی سے اتنا فری مت ہوا کریں۔" ثمرہ کے ذہن میں نیکسٹ عید پہ سارہ کا اذان سے فری ہونا یاد آیا۔۔۔ رخشندہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آئی مین۔۔۔ دونوں ماں بیٹیاں عجیب سی نیچر کی ہیں۔" وہ ماں پہ اور کچھ بھی واضح کر کے اسے مزید الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"ڈونٹ وری مما۔ اذان کی چوائس بہت ہائی فائی ہے۔" سارہ کے معاملے میں اس کی ناگواری ثمرہ نے بھانپ لی تھی۔

"بندہ ذرا الگ مزاج کا ہے۔ اسے تو پانی کا ایک گلاس بھی پورے پروٹوکول اور نفاست کے ساتھ چاہیے۔" بیٹی کے لہجے میں دن دہاڑے جو اذان کے ذکر پہ جگنو چمکتے تھے ٗوہ ماں کی نظریں دیکھ سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

موٹر پمپ کی چھکا چھک سے تو نجات مل گئی تھی ٗواش روم میں رستی ٹونٹیوں کی ٹپ ٹپ بھی بند ہو چکی تھی مگر ایسا کوئی مستری نہیں تھا جو صبح صبح ٗعقبی صحن میں برپا ہونے والی شڑپ شڑپ ٗاور شرڑ شرڑ جیسی سریلی آوازوں سے نجات دہندہ بنتا۔ اس پانیوں پہ چھینٹیں اڑاتی ہوئی لڑکی کی وہ۔۔۔ زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس نے بس پہلی صبح پردہ سرکا کر دیکھنے کی جسارت کی تھی۔ گو کہ منظر دیدہ زیب تھا اور نیند کی طلب پس پشت ڈال کر دیکھا جا سکتا تھا مگر اذان مسعود ایسی غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ شام کو وہ چند فائلز اپنے ساتھ لایا تھا۔ رات خاصی دیر تک وہ کام میں مصروف رہا اب علی الصبح پھر چھپاکے چھٹی۔

"اف! محترمہ عدن صاحبہ مجال ہے جو اپنی ڈیوٹی سے چوک جائے۔" اس نے تکیہ اپنے کانوں پہ رکھا۔

"وہ لکھتے رہے ہیں، تمہیں رونے... خواہشوں کے خط۔" ایک لمبا سُر لگا اس نے دوسرا تکیہ بھی کان پر رکھا۔

"کبھی بھیجے ہی نہیں۔"

"اچھا کرتی ہو بی بی جو نہیں بھیجتی ہو۔" دونوں تکیے اٹھا کر دور پھینکے۔

"پانی میں تر بتر خط کون آنکھوں کا اندھا پڑھ سکتا ہے۔" ایک جھٹکے سے اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تک سک سے تیار تھا۔ اب اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

"پتا نہیں یہ لڑکی صحن سے کن زمانوں کی گرد دھوتی رہتی ہے۔" مدحت بڑبڑائیں "من اگلا صحن صاف کر کے کالج بھی چلی جاتی ہے۔"

آپ کو کیا خبر کہ عقبی صحن میں ہر صبح کون سی شوٹنگ چلتی ہے گویا صحن نہیں سمندر کا کنارا ہوتا ہے۔ وہ برآمدے میں بچھی دوسری چارپائی پہ نیم دراز تھا اس کا موڈ ابھی تک آف تھا۔

"ارے عدن اب آبھی چکو۔" مدحت نے بہ آواز بلند پکارا۔

"رہنے دیں آنٹی! مجھے ناشتے کی کوئی جلدی نہیں۔" پھر چونک کر اپنی دھلی دھلائی گاڑی کو دیکھا یقیناً "یہ امن کی کارستانی تھی۔

"آنٹی، مجھے اچھی طرح یاد ہے ماموں کی بھی گاڑی ہوتی تھی۔"

"ہاں ہوتی تھی۔" انہوں نے اذان کی گاڑی کو حسرت سے دیکھا۔

"پھر اس کا کیا بنا؟" وہ ایک دم سیدھا ہوا۔

"بیچ کر پیسے بینک میں رکھوا دیے کہ کل کو بچیوں کے جہیز کے کام آئیں گے۔" ماضی کی یاد سے بھیگتا، بے آسرا سا لہجہ، نظریں کسی غیر مرئی نکتے پر ٹکیں۔

"وہ گاڑی کس نے خریدی تھی اور وہ رقم کس کے اکاؤنٹ میں شفٹ کی گئی۔" یوں ہی کسی سوچ کے تحت اس نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

"رقم تو میں نے منیر کے اکاؤنٹ میں ہی رکھوائی تھی۔ اور گاڑی کا علم نہیں کس نے خریدی۔" آنٹی کا جواب سن کر، دو روز پہلے کہی گئی عدن کی بات بالکل سچ لگی کہ وہ بہت سادہ لوح عورت ہیں۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رقم کی ادائیگی کتنی ہوئی۔" اور قیمت کا سن کے وہ بھونچکا رہ گیا۔

"نو سال پہلے جب ماموں فوت ہوئے تھے تو میں آیا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے گاڑی بالکل نئی تھی، پھر بھی اونے پونے داموں بیچ دی گئی۔"

"بیٹا! ہمارا پرسان حال کون تھا جس پہ میں بھروسا کرتی۔ آنٹی نے یوں ہی ہوا میں ہاتھ لہرایا برآمدے کی اوپری سیڑھی پہ بیٹھی چڑیا پھر سے اڑی، کھوڑی میں دانے اور آب خورے سے منہ موڑ کر، مدحت کو دکھ محسوس ہوا۔

"جب حسان حیات تھا تو میرے چچا تایا، ماموں وغیرہ جب، جب کراچی آتے یہیں قیام ہوتا، بے سہارا عورتوں کی خبر گیری کون کرتا ہے، منیر کا بھلا ہو، بے آسرا عورتوں کے جھنڈ میں جھانک تو لیتا ہے۔ بھلے سال بھر بعد ہی سہی۔" شکر سے لبریز آواز۔ محسوس کر رہا تھا کہ منیر ان کے لیے ڈوبتوں کو تنکے جیسا سہارا تھا، اس نے دکانیں دیکھی تھیں مین روڈ پہ اچھی لوکیشن پہ تھیں۔ جنہوں نے کرائے پہ لے رکھی تھیں ان سے تفصیلی بات چیت بھی ہوئی تھی۔ منیر صاحب نے ہر جگہ اندھیر مچا رکھا تھا۔ باقی کا کام ان کی آمد کے بعد ہی نبٹایا جا سکتا تھا۔

"بُرے اور کڑے وقت میں اچھے وقتوں کے رشتہ دار اور دوست آنکھیں پھیر کے گزرتے ہیں۔ نہ کبھی ہم نے حساب کتاب مانگا نہ کبھی اس نے دیا۔ کبھی خبر گیری کرنے آجاتا ہے تو گلی محلے میں چلو بھرم ہی رکھ لیتا ہے کہ ان کا بھی کوئی ہے۔" مدحت جیسے خود کلامی کر رہی تھیں۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ نے اذان کے ہونٹوں کو چھوا۔ دو تین دنوں سے اندر چھپائی بات کرنی

مشکل الگ رہی تھی۔ مگر کرنی تو تھی۔ عدن ان کے قریب سے تیزی سے گزر کر اپنے بیڈروم میں گھسی۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اتنی صبح وہ خالہ سے رازونیاز کر رہا ہو گا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ادھر کون سے سیلابی ریلے پہ بند باندھتی رہتی ہو۔ خالہ نے غصے سے بازپرس کی۔

"آنٹی باتیں مزے کی کرتی ہیں۔" بمشکل ہنسی پہ قابو رکھا' کھلا دروازہ پھلانگ کر ہمسائیوں کا بکرا گھر میں گھس آیا تھا۔

"عدن ذرا باہر آنا' ارے اس کو بھگاؤ پودے کھا جائے گا۔ عدن غسل فرما رہی تھی۔ اذان کو ہی اٹھنا پڑا' بکرے کی رسی پکڑی۔

"ابو جی! ذرا دیکھیں تو کیسے' کیسے کام انجام دے رہا ہوں۔" کنڈی لگا کر واپس آیا۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچن کے کونے میں لگے بیسن میں ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوئے۔ میلی موٹی بکرے کے گلے میں پڑی رسی جیسے ہاتھ میں کھب سی گئی تھی۔

انڈا' پراٹھا' دہی' رات کا بچا سالن ٹرے میں ہر چیز نفاست سے موجود تھی۔۔۔ ٹرے رکھتے ہوئے عدن نے تفصیلی جائزہ لیا' اذان نے اسی پل نظریں اٹھائیں۔ وہ نظر' چمکارتی پچکارتی چوری پکڑانے جیسی ہرگز نہیں تھی۔۔۔ بالکل الگ سی تھی کچھ جتاتی' کچھ پوچھتی ہوئی کہ کہو کیسا ہوں؟ اس نے یکلخت گڑبڑا کر نظر جھکائی۔ "دکھنے میں' اٹھنے بیٹھنے میں کیسا لگتا ہوں؟" اس کے گڑبڑانے پر وہ بہت محظوظ ہوا۔

"اسے کیا ہوا ہے۔" کچن میں آکر سوچوں میں غرق ہی چائے بنائی' کچھ منٹوں بعد چائے کا کپ لے تھماتے ہوئے اس نے دوبارہ دیکھنے سے احتراز برتا' مگر کپ تھامنے والے نے اس احتراز کو صاف محسوس کیا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے عدن بی بی کہ میں تمہیں بے وقوف سمجھتا ہوں۔" وہ ایک شریر سے احساس میں گھر کر خوش ذائقہ اور خوش رنگ چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آصفہ سے آج اس کی فون پہ بات ہوئی تھی اور زوبیہ نے انہیں اذان کی بابت بتا دیا تھا۔ کتنی دیر تک دوسری جانب خاموشی چھائی رہی۔

"وہ اپنے باپ کی مرضی سے گیا ہے۔" آصفہ معاملے کی تہہ تک پہنچ کر بولیں۔

"اچھا میں تو سمجھی کوئی اور ہی چکر ہے۔" زوبیہ نے بات کو پھر گھمایا' کیونکہ بھتیجوں کے بارے میں وہ اس کے کان اکثر بھرتی رہتی اور کچھ یوں نقشہ کھینچتی کہ جیسے وہ حنان کا گھر نہیں بہت ہی خراب عورتوں کا ٹھکانہ تھا۔

"تمہیں پتا تو ہے اس کے مزاج کا' وہ ایسے چکروں میں پڑنے والا نہیں' پھر بھی میں اس سے بات کروں گی۔" یہ الگ بات کہ خبر سن کر ان کا خون کھول اٹھا تھا۔ مگر بروقت انہوں نے بات سنبھال لی تھی' وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اذان کے چچا' تایا کی فیملی ان کے بارے میں کچھ ایسا ویسا سوچے' انہوں نے زوبیہ کو خدا حافظ کہا' آصفہ جانتی تھیں کہ زوبیہ کیا سوچ بیٹھی ہے۔ سارہ نے رو دھو کر انٹر پاس کیا تھا جبکہ اذان کو اعلا تعلیم یافتہ "کانفیڈنٹ" مردوں کے شانہ بشانہ چلنے والی لڑکیاں پسند تھیں۔ انہیں بہو کے روپ میں ثمو پسند تھی۔۔۔ اور ان کے بیٹے کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہمیشہ مڈل کلاس ہونے کے احساس کمتری میں مبتلا رہی تھیں۔ اب وہ تصور میں اپنے گھر میں ایک اپر کلاس بہو کو چلتے پھرتے دیکھتی تھیں۔ جو فر فر انگلش بولنا بھی جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"جنہوں نے یہ دکانیں کرائے پہ لی ہوئی ہیں' ایک دو دن پہلے میں ان سے ملا تھا۔" وہ کوشش کر رہا تھا کہ بنا تمہید باندھے مناسب الفاظ میں حقیقت سے پردہ اٹھائے۔ امن خالہ کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ عدن ذرا دور کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"وہ بتا رہے تھے کہ گزشتہ برس منیر صاحب نے فی

دکان یا کیس ہزار کرایہ وصول کیا تھا۔"

مدحت کے سر پہ ساتوں آسمان گرے۔ عدن نے میگزین بند کر کے جھٹکے سے سر اٹھایا۔۔۔ مدحت نے اپنے سفید پڑے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر ازان کے جھکے سر کو تحیر سے دیکھا۔۔۔ وہ جان بوجھ کر ان تینوں کی طرف دیکھنے سے گریز برت رہا تھا' مدحت کا چہرہ کرچیوں میں بٹا' مگر نہیں کرچیاں تو دل میں ہوئی تھیں' اعتبار کے کتنے ہی ٹکڑے ہوئے۔

"یتیم بھانجیوں کا حق غصب کر کے اپنے بال بچوں کے لیے لے جاتا تھا' کبھی یہ نہ سوچا کہ یہ رقم ان کے سال بھر کا گزارہ ہے۔" ان کا لہجہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"آپ کو کرایہ ماہانہ وصول کرنا چاہیے تھا۔" ازان نے سر اٹھا کر انہیں باری باری دیکھا۔

"کون ہر ماہ وصول کرتا' غیر مردوں کے پاس میں اپنی بچیوں کو نہیں بھیج سکتی تھی۔" پھر پتا نہیں انہیں کیا ہوا' وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔" وہ اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھ کر عدن سے پہلے ان کے قریب آیا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ' اتنی بہادر خاتون' اور یہ آنسو۔" وہ بلاوجہ ہی مسکرایا۔

"آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔" وہ اتنی درشتی سے بولی اور اتنے خطرناک تیوروں کے ساتھ کہ اسے لگا کہ وہ ابھی اس کا گریبان پکڑ لے گی۔

"ہم بے خبری میں ہی خوش تھے' آپ ہمارے بھرم کیوں توڑ رہے ہیں۔" اس لمحے ازان نے ان غصیلی آنکھوں میں جھانکنے کی غلطی کی تھی۔ سیدھی سادی گہری سیاہ آنکھوں میں نمی تھی۔ دکھ کے پانیوں میں تیرتی وہ آنکھیں اس کے حیران چہرے پہ گڑی تھیں' کوئی اسیر کرنے والا پل اترا تھا' آنکھ کی تہہ سے لپٹی نمی نے کسی بے رنگ لمحے کو رنگ دیا۔ کہ ازان کا دل اس کے پورے وجود میں دھڑکا اور زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا شور کرتے سنا' وہ اس اجنبی انجان کیفیت سے ایک ساعت میں پورے کا پورا آگاہ ہوا۔۔۔ نظر کا ٹھہرنا وقت نے مقید کر دیا' تو اس سے سوال کرتی آنکھیں ٹھٹکیں' قید سے نکلیں اور پھر جھک گئیں۔ وہ اجنبی لمحوں کے پُرفسوں کھیل سے باہر آیا۔ امن کے آنسو بے آواز بہہ رہے تھے۔

"میرا مقصد آپ سب کو ہرٹ کرنا نہیں تھا' پھر بھی آئی ایم سوری۔" اس نے معذرت خواہانہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"مگر۔۔۔" کچھ لمحوں کا وقفہ دے کر وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"کسی بہت بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹے موٹے دکھ برداشت کرنا ہی بہادری ہے۔" اس کا لہجہ بھاری ہوا۔ "ایک نہ ایک دن تو۔۔۔" "آپ کے نزدیک یہ دکھ کتنا چھوٹا ہے؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"اعتبار' کانچ کا برتن نہیں ہوتا کہ پھر خرید لیا جائے' ایک بچا کھچا رشتہ تھا' آپ کیا چاہتے ہیں کہ چند ہزاروں کی وجہ سے وہ بھی ختم ہو جائے۔ وہ اس کے روبرو غصے سے لال پیلی ہوتی' کہیں کا غبار کہیں نکال رہی تھی۔

"میں ایسا کیوں چاہوں گا۔" وہ نرم آواز میں بولا اور حمایتی نظروں سے امن اور مدحت کو دیکھا' جو اسے مل بھی گئی۔

"ازان نے جو کیا ہماری بہتری کے لیے کیا ہے۔" صباحت کو بھانجی کی بے مروتی سے کی گئی گفتگو ذرا نہیں بھائی تھی۔

"اگر ماموں کی ضرورتوں کے لیے چھتیس ہزار اہم ہیں تو سمجھو ہمارے لیے بھی وہ چند ہزار نہیں۔ رشتوں پہ فوقیت دینے والا ایک روپیہ بھی انمول محبت اور اعتماد کو بے مول کر سکتا ہے۔" امن نے بے دردی سے آنسو پونچھتے ہوئے بہن کو ناپسندیدگی سے دیکھا' جس نے جزبز ہو کر نگاہیں چرائیں۔

"آنٹی اب اجازت چاہتا ہوں' آج رات گھر پر ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔" مسکرانے کی کوشش کرتا وہ ایک دم ہی اپنی نشست سے اٹھا' اس کا دل کچھ بوجھل

سا ہو رہا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ تینوں ایک دوسرے سے غم و غصے کا اظہار کھل کر کر سکتی تھیں۔

"کیوں بیٹا؟" لمحوں میں مدحت کا چہرہ فق ہوا۔

"اس لڑکی کا تو صرف قد بڑھا ہے عقل نام کو نہیں۔" تلخی سے بے عقل بھانجی کو دیکھ کر اس کی طرف سے معافی بھی مانگ لی۔

"کیوں شرمندہ کر رہی ہیں آپ۔" دو قدم آگے کو ہو کر ان کے سامنے ٹکا۔

"مما کا فون آیا تھا کہ برسات کا موسم ہے۔ پتا نہیں مالی نے پیڑ پودوں کو جنگل میں ہی نہ بدل دیا ہو' کل آجاؤں گا اور دوسری بات یہ کہ ان کی باتوں پہ ناراض نہیں ہوں۔" ہنستے ہوئے وہاں سے اٹھا اور وہ جو آگے کی سمت قدم اٹھا چکی تھی اس کے بلاوجہ ہنسنے پہ ٹھٹکی' پھر مڑ کے اسے دیکھا۔ وہ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھا رہا تھا۔ اس کے مڑ کے دیکھنے پہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ ابھی بچی ہے۔ وقت کے ساتھ سمجھ دار ہو جائے گی۔" گہرے لہجے میں شرارت رقصاں تھی۔ سنجیدگی کا سہارا لے کر ان مسکراتی آنکھوں نے جیسے اس کے دکھتے حصے کو زور سے دبایا تھا کہ مقابل کے چہرے پہ مرنے مارنے والی کیفیت اتری۔۔۔ پھر فوراً" نظر کی توپیں بہن کی طرف موڑیں کہ دیکھا میں صحیح کہتی تھی ناں۔ چوٹ تھمانے والے کی طبیعت کا بوجھل پن لمحوں میں رفوچکر ہوا۔ سب پہ الوداعی نظر ڈالتا سرشار قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھا۔

"میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں غلط اور صحیح کا فرق سمجھتی ہوں۔۔۔ بچی نہیں ہوں' بتا دیجیے گا اپنے چہیتے کو۔" وہ دانت کچکچا کر خاصی بلند آواز سے بولی۔ گیٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے اس نے بخوبی سن لیا۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی' امن گیٹ بند کر کے آئی تو وہ خالہ سے دو' دو ہاتھ کر رہی تھی جو بالکل گم صم سی عدن کا چہرہ تکے جا رہی تھیں۔

"کاش رشتوں اور اعتبار کو جوڑنے والی ایلفی ایجاد کر لی جائے۔" کتنی ہی دیر کی خاموشی کے بعد مدحت کے لبوں نے دہائی دی۔ وہ ایک دم چپ ہوئی۔ امن کی ملامتی نظروں سے وہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔ اتنی خاموشی' پرندے چپ' پتے ساکن' در و دیوار اداس' غمگین' حبس بہت بڑھ گیا شاید۔

"بارش ہونے والی ہے۔" خاموشی کی گہری ندی میں امن کی سرسراتی سی آواز نے ہلکا سا کنکر پھینکا۔

"کوئی بھی چیز جب دوبارہ جوڑی جاتی ہے تو اس میں دراڑ واضح ہو جاتی ہے۔ برتن ہوں' رشتے' یا اعتماد' پھر اس نظر آتی دراڑ کو کیسے چھپاتے ہیں۔" اس کی سوالیہ نظریں دونوں کی طرف اٹھیں۔۔۔ ڈری سہمی' مگر چوکنی ہو کر خاصی فربہ چڑیا آبخورے کی طرف بڑھی' خالہ کی بات پہ دونوں نے اپنی سانسوں سے دھواں نکلتا محسوس کیا' اگلے ہی پل وہ ان کے دائیں بائیں بیٹھی زندگی سے بھرپور باتیں کر رہی تھیں۔ وہ انہیں موجودہ کیفیت سے نکالنے میں کامیاب ٹھہریں۔

"عنیزہ سید کا ناول بڑا زبردست ہے شام تک مکمل کر ہی لیں گے۔" عدن نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر میگزین نکالا' پھر ناول کے اختتام تک مدحت کی دلچسپی برقرار رہی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے اسے گہری نیند سے بیدار کیا' اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ کی' چھ بج چکے تھے تو کیا میں تین گھنٹے سوتا رہا ہوں۔۔۔ وہ بعجلت اٹھا' اور دروازہ کھولا۔ سامنے پرانا ملازم غفور کھڑا تھا۔ اذان نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا۔

"وہ صاحب! بیگم صاحبہ کی دوست آئی ہیں' اور آدھے گھنٹے سے مجھے آپ کو جگانے کا کہہ رہی تھیں۔" ملازم نے نظر جھکا کر کہا' اس اطلاع پہ جیسے اس کے سارے وجود میں بل پڑے۔

"میرے گھر آنے کا انہیں کس نے بتایا۔" بولا تو لہجہ بھی سلوٹ زدہ تھا۔

"وہ' جی' کچھ' دن پہلے تشریف لائی تھیں تو مجھے

تاکید کر رہی تھیں کہ..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر صاحب کے غصے کی حدود و قیود سے واقفیت چاہتا تھا' اور وہ اس کے ادھورے جملے سے تمام معاملہ سمجھ گیا۔

"ٹھیک ہے' آپ جائیں۔" وہ گہرا سانس بھر کر بولا۔

"میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔" زوبیہ۔ اس گھر میں خود کو مہمان نہیں سمجھتی تھیں لہٰذا لاؤنج میں ہی براجمان تھیں۔ اذان کو آتا دیکھ کر وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھیں۔

"میں صدقے' قربان' میرے بچے کا کیسا ذرا سا منہ نکل آیا ہے۔" اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہوں نے ہزاروں بلائیں لے ڈالیں۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بڑے اسٹائلش انداز میں صوفے میں دھنسی سارا کو دیکھ کر وہ انتہائی کوفت کا شکار ہوا... کچھ دیر رسمی حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آئیں۔

"میری طرف آ کر رہتے' تمہارا اپنا ہی گھر تھا' اجنبی جگہ اور لوگوں میں رہنا کافی مشکل ہوتا ہے۔" سادہ الفاظ اور سادہ لہجے میں انہوں نے گمبھیر بات کہہ دی۔ جیسے وہ اسے اندر تک پرکھنا چاہتی ہوں۔

"جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" وہ شگفتگی سے مسکرایا' سارہ نے مبہوت سا ہو کر اسے دیکھا' کم بخت مسکراتے ہوئے جوتوں سمیت دل میں گھس جاتا ہے' بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آئے ہائے' ایسی بات ہے تو پھر کون سی مجبوری نے ادھر کا راستہ دکھلا دیا۔"

"یہ ابو کا فیصلہ ہے... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے ہلکے سے کندھے اچکائے... پھر کلائی پہ بندھی انتہائی قیمتی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"میرے بارے میں تو اس نے خوب دل کی بھڑاس نکالی ہوگی۔" زوبیہ نے محتاط سا ہو کر سوال داغا۔

"جی کس نے...؟" معصومیت سے پوچھا گیا۔

"تمہاری ممانی نے اور کس نے؟" وہ کھسیانی سی ہو کر ہنسیں۔

"کیا وہ آپ کو جانتی ہیں۔" بھولپن کی حد کر دی گئی۔ آنکھوں اور لہجے سے اشتیاق ٹپکا۔

"چھوڑیں بھی امی' آپ کس کا ذکر کرنے لگیں۔" سارہ نے بروقت بات سنبھالی۔

"معذرت چاہتا ہوں ابھی مجھے چچا کے گھر جانا ہے تو۔" باوقار لہجہ' بارعب آواز... نیند سے جاگی پر خمار آنکھیں... سارا گنگ سی دیکھتی رہ گئی۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں' یہاں سے اتفاقاً گزر ہوا تو کھلے گیٹ سے تمہاری گاڑی نظر آئی۔ سوچا اپنے بچے کی خیر خیریت دریافت کرلوں۔" ہزاروں سوالوں کو دل میں دباتے ہوئے وہ ہلکی پھلکی سی ہو کر بولیں۔

"ویسے تمہارے ماموں کے گھر میں کتنے افراد ہیں۔" اذان نے آنکھیں پھیلائیں۔

"ممانی سمیت کل تین بنتے ہیں۔" ہونٹوں پہ شہادت کی انگلی موڑ کر کے رکھی اور کچھ ایسی نظر سے ماں کی سہیلی کو دیکھا کہ میں نے تو کب کی پہیلی بوجھ لی تھی۔ انہوں نے اٹھنے میں ہی عافیت جانی' جاتے جاتے بعد اصرار گھر آنے کی پُرزور دعوت دی۔

"اتنے برسوں بعد ماموں کی فیملی کیسے یاد آگئی۔" گھنٹے ڈیڑھ بعد بات گھما پھرا کر ثمر اصل موضوع کی طرف لے آئی۔

"خیر اب ایسی کوئی صدی بھی نہیں گزری۔ چھ' سات سال پیشتر ہم ان کے ہاں آتے جاتے تھے۔" وہ دو سال گول کر کے' لہجے میں در آئی ہلکی سی تلخی کو دبا کر بولا۔

"تاہم وہ ہماری فیملی کا ایک حصہ ہیں۔" اتنا تو وہ جان چکا تھا کہ اس کا وہاں رہنا کسی کے لیے بھی پسندیدہ نہیں۔ اب کے وہ کچھ تحمل سے پرسکون ہو کر بولا۔

"پھر بھی' تمہارے اور ان کے لائف اسٹائل میں

زمین آسمان کا فرق ہو گا ذرا سوچو اس قدر سو کالڈ سے محلے میں تم کیسے آجارہے ہو' اوپر سے وہ تمہاری کزنز بھی کچھ اچھی شہرت کی نہیں۔" اسے لگا' بیش قیمت نفیس کرسٹل کی کیتلی سے گرم چائے ثمو نے اس کے سر پہ انڈیل دی ہے۔ اس نے کپ ٹیبل پر زور سے پٹخا تھا کہ چھلک کر باہر آتی گرم چائے نے اس کی انگلیاں جلادیں۔

"کیا کہا اور یہ بکواس تم سے کس نے کی ہے؟"
اشتعال کی ایک لہر اس کے بوٹوں کی نوکوں تک آئی۔
"بی ہیو یور سیلف اذان" اس میں اتنا مشتعل ہونے والی کون سی بات ہے۔" وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کی جلی ہوئی انگلیاں تھامنے کی کوشش کی' وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔
"پہلے میری بات کا جواب دو۔" وہ ایک' ایک لفظ چبا کر بولا۔ اس کے اس قدر خراب موڈ پہ ثمو نے ششدر ہو کر اسے دیکھا۔ اسے تیزی سے ماحول کی سنگینی کا احساس ہوا کہ اس نے واقعی غلط بات کی ہے۔
"زوبیہ آنٹی مما سے کچھ اس طرح کی بات کر رہی تھیں' تو اذان کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا' اس نے بغور ثمو کا جائزہ لیا' سلیولیس شرٹ میں اس کے گورے بازو دمک رہے تھے۔ اس نے شاٹ شرٹ اور ٹائٹس زیب تن کی ہوئی تھی۔ دوپٹہ کندھے پہ جھول رہا تھا' وہ دونوں غفران کے کمرے میں تنہا بیٹھے تھے جو اچانک وہاں سے اٹھ کر کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ شاید گھر سے ہی چلا گیا تھا' چچی اور چچا کسی ولیمہ کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ وہ اسے دیکھتا جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی جارہی تھی۔
"ان کی شہرت اچھی نہیں ہے کیونکہ ان کا کورنگی میں دس مرلے کا ایک پرانا گھر ہے' سر پہ باپ کا سایہ نہیں' وہ بے یارو مددگار ہیں۔" دھیمی آواز میں کہتے ہوئے وہ رکا' اس نے ثمو کے عریاں کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھا' ثمو کی ریڑھ کی ہڈی میں برف سی جمی۔
"میں گیارہ دن سے وہاں ہوں' اور میری ہمت نہیں پڑی کہ ان کے بیڈ روم کی کھڑکی سے جھانک لوں'

اور تم نے۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔
"یہ دوپٹا جو بطور فیشن اوڑھنے کی کوشش کی ہے' اس نے گردن سے لپٹا دوپٹا نوچ کے دور پھینکا' ثمو پھٹی پھٹی بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"یہ دوپٹا سائبان کی طرح انہیں ڈھانپے رہتا ہے۔ ان پاکیزہ لڑکیوں سے حیا کے معنی و مفہوم سمجھتا ہے یہ۔"
اذان نے اس کا سفید رنگ سیاہ ہوتے دیکھا۔
"لگژری لائف میں یہ سب اچھی شہرت کا حامل ہے' پانچ کنال کی اس کوٹھی کے ویل ڈیکوریٹڈ فرنشڈ بیڈ روم میں' تنہا ہم گھنٹوں بیٹھ سکتے ہیں کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا' دولت عیبوں پہ خوب پردے ڈالتی ہے۔"
اس نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا' ثمو نے اپنا سانس بحال کیا۔
اس کمرے سے باہر آکر بیرونی گیٹ عبور کرنے میں اسے چند منٹ لگے تھے' اس کی گاڑی اب سڑک پہ فراٹے بھر رہی تھی۔ ثمو کی پکار اس کے کانوں میں گونج رہی تھی' ان کے خاندان کے بیچ زہر گھولنے والی زوبیہ تھیں' وہ سوچ رہا تھا کہ بدین جاکر وہاں کا معاملہ حل کرنے کے بعد یہ آخری معرکہ بھی سر کرنا از حد ضروری تھا۔ گھر آنے تک وہ غور و فکر کر چکا تھا کہ کل فجر کے وقت بدین کے لیے روانہ ہو گا۔

☼ ☼ ☼

ستمبر کے وسط میں ہی درودیوار سے اترتے سایوں کو تبدیلی موسم کی نوید' ہوا ہلکی سرگوشیوں میں دے رہی تھی' شاخوں پہ چہکتی چڑیاں۔۔۔ ان سرگوشیوں سے باخبر تنکا' تنکا اکٹھا کر کے نیم کی گھنی شاخوں پہ گھونسلوں کی تعمیر شروع کر چکی تھیں' ہر سال امن کے لیے یہ منظر کشش کا باعث بنتا۔ سہ پہر کے بعد نچلی سیڑھی سے ذرا آگے صحن کی چارپائی' بچھ جاتی' جس کے اطراف پرانی طرز کی آرام دہ کرسیاں عدن اور امن کی نشست ہوتیں' اس وقت بھی عدن اپنے گھٹنوں پر ڈائجسٹ دھرے انہیں ناول پڑھ کر سنا رہی تھی' امن کو ان

دونوں کا یہ مشغلہ بالکل پسند نہیں تھا۔

"ایک تو تیسرے دن واپس آئے ہیں پھر آتے ہی سو گئے۔ وہ بھی سارے گھوڑے گدھے اور ہاتھی بیچ کر' یہ بھی نہیں بتایا کہ۔۔۔"

"امن چپ کرو۔ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔" بہن سے ڈانٹ کھا کر تنکوں کے چھوٹے' چھوٹے ٹکڑے کرتی وہ نچلی سیڑھی پہ بیٹھ گئی۔

"چہار سو چٹکی چاندنی کا فسوں ایسے قصے سنا رہا تھا کہ وہ آئندہ کا سفر تمام کر کے آخری سانس تک وہ چہرہ دیکھنے کی خواہش کرنے لگا۔

جالی دار دروازے سے لگے اذان نے آئندہ کا سفر تمام کر کے کہانیاں سنا تا چہرہ دیکھنے کی خواہش کی اور اتنی آہستگی سے دروازہ کھولا کہ ماحول پہ چھایا چاندی جیسا فسوں ٹوٹنے نہ پائے۔۔۔

وہ راستوں میں رنگ گھولتی ہوا کو پیچھے دھکیلتا جاناں کی طرف بڑھا۔

قصہ گو کا خوب صورت لب و لہجہ اور طرز بیاں سفید دن کو پر فسوں چاندنی میں ڈھال رہا تھا' وہ بھی کچھ کہتی کچھ سنتی سبک ہوا کو اپنے اور اس کے بیچ رکھ کر برآمدے کے تیسرے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ۔وہ خود سے بھی بے خبر ہو کر ناول پڑھ رہی تھی۔

"اردگرد سے بے خبر کبیر نے جاناں کا نرم ہاتھ نرمی سے تھاما۔" اس نے اپنے چہرے پہ کسی کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کیا' تو چہرہ موڑ کے دیکھا۔

"اُف' یہ جانے کب سے کھڑا ہے۔" اس نے خجالت محسوس کی' کیا میں اتنی بے خبری میں پڑھ رہی تھی' خالہ آنکھیں بند کیے نیم دراز تھیں۔

"اب آگے بھی پڑھو۔" بے صبرا پن دکھایا گیا' چور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ لاتعلق سا کھڑا تھا۔ نظریں دوبارہ صفحات پہ مرکوز ہوئیں۔

"سفیدی مائل چہرے پہ شرمگیں سے رنگ اترے' آگے کیسے پڑھ سکتی ہوں۔" اس کے لب کسی احساس سے کانپے۔

"جاناں نے کبیر کے چہرے پہ زوردار تھپڑ لگایا۔"

وہ ستون سے ٹیک لگائے خلا میں گھورتے شخص کے متبسم چہرے کی شرارت سے جیسے زچ ہو کر چڑ کر بولی۔ خالہ نے جھٹ پٹ آنکھیں کھولیں۔

"ہیں' یہ کیا؟ یہ آج کل رائٹرز کو کیا ہو گیا ہے۔" ان کی آواز میں حیرت تھی۔

"پہلے تو ہیرو جب ہیروئن کا ہاتھ پکڑتا تھا تو وہ شرماتی لجاتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اس کے حسن کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملائے' آج کل جوں ہی ہیرو ہاتھ تھامتا ہے یا تو ہیروئن اسے دھکا دے دیتی ہے یا تھپڑ سے نوازتی ہے۔" خالہ کی آواز صدمے سے چور سے بھی آگے تک پہنچی ہوئی تھی۔

ایک دو مرتبہ پہلے بھی وہ اذان کی آمد پر اسی طرح کہانی کا رخ موڑ چکی تھی۔

"اوہو خالہ! آپ جانتی تو ہیں کہ سمیرا حمید اپنے ناولوں میں رومانٹک سین نہیں ڈالتی۔" اس نے جھنجلا کر ذرا سی ترچھی نظر اس پہ ڈالی جو اس کے تنکے توڑنے والے مشغلے کی طرف متوجہ تھا مگر اس کی آنکھیں اور چہرہ ایک محتاط سی ہنسی کی زد میں تھے۔

"آج کل کی ہیروئنیں محب وطن ہیں اس لیے ملکی حالات کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے مار دھاڑ کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔"

امن ہنستے ہوئے دونوں ہاتھ جھاڑ کے اٹھی تو پیچھے کھڑے اذان پہ نظر پڑی۔

"آپ اٹھ گئے۔" وہ جیسے چیخی تھی' مدحت نے دوپٹا ٹھیک طرح سے پھیلایا اور سر ذرا سا اونچا کر کے تکیے سے ٹیک لگائی' وہ اگلی ہی جست میں کرسی گھسیٹ کر چارپائی کے قریب بیٹھ چکا تھا۔

"نیند پوری ہو گئی۔" انہوں نے ناول کے اثر سے باہر آ کر بشاشت سے پوچھا۔

"ہاں بالکل' نیند کا مزہ آ گیا۔" کچھ لہجہ خمار آلود ہوا' کچھ سوئی جاگی آنکھیں میگزین کے صفحات پہ تکی آنکھوں پہ ٹھہریں۔

"اگر ایک کپ چائے مل جائے تو شام کا لطف بھی دوبالا ہو جائے۔" خوشگوار سی ہلکی بھاری ہوتی آواز پہ

پلکیں اٹھا کر بے اختیار ہی دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ نظروں کے بدلے' بدلے زاویے صاف محسوس ہوئے۔

"ان صاحب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔۔۔ کبھی مجھے بچی سمجھتا ہے تو کبھی۔۔۔" ڈائجسٹ بند کر کے وہ جھٹکے سے اٹھی۔ وہ مسکرایا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"آنٹی! آپ خود مطالعہ کیوں نہیں کرتیں؟" نظریں ابھی تک غصے سے پیر پٹختی امن پہ مرکوز تھیں۔

"کیسے پڑھوں؟ قریب کی نظر بہت کمزور ہے۔ منیر سے کہا تھا کہ رکشے میں سفر کرنے سے قاصر ہوں۔ ٹیکسی کروا کر آنکھوں کا معائنہ بھی کروالیں گے ساتھ ہی چشمہ بھی لگ جائے گا' آہ۔" ٹھنڈا گہرا سانس بھر کر بولیں "سنی ان سنی کر گیا۔"

"آپ کل میرے ساتھ چلیے گا۔ بس ایک گھنٹے کا کام ہے' آپ دیکھیے گا۔۔۔ جب آپ خود ناول پڑھیں گی تو ہیروئنیں ملکی حالات بالائے طاق رکھ کر' پھر سے محبت کی باتیں کرنے لگیں گی۔" نچلا لب دبا کر خاصی بلند آواز سے کہا' جو یقیناً" سن لیا گیا تھا' کوئی برتن زور سے پٹخا گیا۔

"لیجیے بھائی! چائے سے پہلے مزیدار شربت انار کا لطف اٹھائیں۔" اس کی بات پہ زوردار قہقہہ لگاتی امن نے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

"واہ بھئی۔۔۔ کیا ذائقہ ہے۔" گھونٹ بھر کر داد دیتی نظروں سے شکریہ ادا کیا۔

"اب بتائیں دو دن کہاں گزارے؟" وہ اس کے سامنے خالہ کی چارپائی پہ ذرا سا ٹکی۔ خالہ نے کندھے پہ ہاتھ مار کے گھوری لگائی کہ تم کون ہوتی ہو حساب کتاب کرنے والی۔

"تم سے پیچھے پڑ جاتی ہو۔" وہ سر کو جھٹکا دے کر دھیرے سے ہنسا۔

"عید کے بعد بتاؤں گا۔" ایک دم سنجیدگی نے اس کا احاطہ کیا۔

"ارے ہاں یاد آیا' پرسوں تو عید ہے۔ ابھی تو بکرے کی خریداری بھی ہونی ہے۔" خالہ نے ماتھے پہ ہاتھ مار کے کہا۔

"اس بار تو ساجدہ نے اپنے بکرے کی خریداری کرلی۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔" لہجے سے فکرمندی عیاں ہوئی۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں بھی ابھی بکرا خریدوں گا۔ پھر یوں کریں گے کہ کل مارننگ ٹائم میں نظر چیک کروالیں گے اور شام کو بکروں کی خریداری ہو جائے گی۔"

"بھائی میں بھی چلوں گی۔" وہ مچلی۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" رحمت نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"اسے مت روکیں۔ امن بی بی ہمارے ہوتے عیش کر سکتی ہیں' مگر پہلے پتا لگا کر آؤ کہ کچن میں چائے کے ساتھ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔" اس کے حسب خواہش کچن میں سن لیا گیا۔

"یہ شخص کس قدر گھنا ہے۔" عدن نے دانت کچکچائے۔ امن کے سیل فون پہ کال آرہی تھی۔ وہ دوسری طرف دوڑی۔ اس نے ذرا سی دیر کو آنکھیں بند کیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واپسی پہ وہ تینوں اداس غمگین ملیں گی' مگر گھر کا ماحول پہلے جیسا ہی تھا۔ بدین سے واپسی پر اس نے گاڑی سروس کے لیے دی تھی اور ایک دوست سے لفٹ لے کر گلی کے موڑ پہ ہی اتر گیا تھا۔ گیٹ کھولنے سے قبل اس کے کانوں میں کچھ خواتین کی آوازیں پڑی تھیں۔

"حسان کا بھانجا تو بہت خوبرو اور سلجھا ہوا ہے' اچھی پوسٹ پہ ہے۔ اسے ہاتھ سے مت جانے دینا۔" تو آنٹی نے کس بے مروتی سے ان کی بات کاٹ کر جواب دیا تھا۔

"ہم خود غرض یا بدنیت نہیں ہیں' ماں باپ کے جانے کے بعد بچہ ڈیڑھ ماہ ماموں کے گھر مہمان بنا ہے۔

آپ سب نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ ہم اتنی گری ہوئی فطرت کے نہیں کہ کسی کو اپنے ہاتھ میں کرنے کی تدبیریں سوچیں۔" وہ میز پہ چائے رکھ کر مڑنے لگی تھی کہ نظر اس کی جلی ہوئی انگلیوں پہ پڑی۔

"یہ کیسے جلیں۔" بے ساختہ ہی پوچھا۔ بوجھل ہوتی پلکوں نے آنکھوں کا در کھولا اور اس سادہ سے چہرے پہ اپنے لیے چھائی پریشانی کو بغور دیکھا۔

"پتا ہی نہیں چلا۔ بس جل گئیں۔" ذومعنی مسکراہٹ شام کی طرح اسے گھیرے ہوئے تھی۔ خود کو سرزنش کی۔ "کیا ضرورت تھی پوچھنے کی۔"

خالہ بھی فوراً" متوجہ ہو گئیں۔ "ارے یہ تو کافی جلی ہوئی ہیں۔ دوا وغیرہ لگائی کہ نہیں۔ ارے امن جا میرے کمرے سے بھاگ کر برنال لے آ۔"

"آپ پریشان مت ہوں۔ سونے سے پہلے لگالوں گا۔" وہ کچھ شرمندہ سا ہوا۔ وہ تو مٹھی سمیٹ کے بیٹھا تھا' بے دھیانی میں ہی کھل گئی اور بے دھیانی میں ہی کسی نے اسے پورے دھیان سے دیکھا تھا۔

پھڑپھڑاتے پروں کے ساتھ کبوتروں نے پرواز ترک کرکے برآمدے کے روشن دانوں کا رخ کیا۔ ان کے سفید پروں سے محبت ہزاروں رنگوں میں کھل کر اس گھر کے آنگن کے کونوں کھدروں تک کو رنگنے لگی تھی۔ یہ نئی کیفیت تھی۔ یہ نیا قصہ تھا۔ نیم کی چوٹی پہ بیٹھی فربہ چڑیا نے وہ قصہ عدن کی آنکھوں میں رقم دیکھا۔

☼ ☼ ☼

آج اس نے مائدہ کے ساتھ (ساجدہ کی بہو) پاپوش مارکیٹ سے کافی خریداری کی تھی۔ وہ گھر آئی تو خالہ آنکھوں کا معائنہ کروانے کے بعد واپس آچکی تھیں۔ ملازمہ مشین لگائے کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ خالہ بہت خوش تھیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے وہ وقفے وقفے سے اذان کو دعائیں دینے لگیں۔

"وہ لوگ چلے گئے بکرے خریدنے۔" اس نے جوتا اتار کے دکھتی انگلیوں کو ہلکے سے دبایا۔

"لگتا ہے موچ ہو گئی ہوں۔"

"کہہ رہے تھے' پہلے شاپنگ کریں گے اس کے بعد بکرا منڈی جائیں گے۔" جواب دینے کے بعد پھر تلاوت کرنے لگیں۔

"مگر امن نے مجھ سے پیسے تو نہیں لیے۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"مجھ سے لے کر گئی ہے۔" خالہ کی بات اتنی اطمینان بخش نہیں تھی۔ وہ بہن کی فضول خرچی سے بخوبی آگاہ تھی۔ "یقیناً" آج اذان صاحب کی جیب ہلکی ہونے والی ہے۔

☼ ☼ ☼

"پوری دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی تم جیسی احمق لڑکی نہیں ملے گی۔ اگر بات منہ سے نکل گئی تھی تو نوبیہ کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔" رخشندہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹی کا کیا حشر کریں۔

"بس کریں مما۔ اگر میں نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔" وہ غصے سے پلٹا کھا کر بولی۔

"میں گیٹ تک اسے پکارتی رہ گئی۔ موصوف نے پلٹ کر بات سننے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔" شمو کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔ رخشندہ کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ ساتھ ہی بیٹی کی حالت پہ ترس آیا۔

"مما آج تک اس نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی۔ وہ میری عادات کو ہمیشہ سراہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے پسندیدگی ہوتی تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ اس کا رویہ میرے ساتھ انسلٹنگ تھا۔" اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ضبط کے باوجود آنسو رخساروں پہ بہنے لگے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج آصفہ سے میری بات ہوئی تھی۔ تم خود کو یوں ہلکان مت کرو۔ مسعود بھائی حنان کے بہترین دوست تھے۔ آصفہ بتا رہی تھی کہ وہ ان ہی کی ایما پہ گیا ہے۔ ان کی پراپرٹی کے کچھ

مسائل ہیں۔ اس کے بعد وہ گھر واپس آجائے گا۔"
انہوں نے بیٹی کا سر اپنے رخسار سے لگالیا۔

"کسی کے بھی کردار پہ یوں بڑھ چڑھ کے نہیں بولتے۔ وہ تو پھر اذان کی کزنز ہیں اور وہ ان کے لیے بہت پوزیسو ہے۔ غفران سے کہہ کر کیسے اس نے نوبیہ کے کسی رشتہ دار کو اس محلے سے ہی چلتا کردیا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے وہ لڑکا ان کی گلی میں بھی یقیناً" آتا جاتا ہوگا۔" ماں کی بات پر ثمو کے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ اس کے کانوں میں اذان کی چنگ آمیز آواز گونجنے لگی جس طرح اس نے اس کا دوپٹا دور پھینکا تھا وہ منظر اسے بھولتا نہیں تھا۔

"یہ نوبیہ آنٹی تو بڑے کام کی چیز ثابت ہو سکتی ہیں۔" اس کے ملال ایک دم دھل سے گئے۔

"میں اتنی آسانی سے تمہیں کسی کا ہونے نہیں دوں گی۔" اس کے چہرے۔ اب کسی نتیجے پہ پہنچنے جیسی کیفیت تھی۔ بیٹی کو پرسکون ہوتا دیکھ کر درخشندہ نے بھی طمانیت محسوس کی۔

✡ ✡ ✡

کل کی بے اختیاری میں کی گئی حرکت کے باعث آج عید کے دن وہ اس سے چھپتی پھر رہی تھی۔ وہ عید کی نماز پڑھنے گیا تو احتیاطاً" برآمدے میں دھری کرسیاں اٹھا کر اس سمت رکھیں کہ ان کی پشت کچن کی جانب تھی۔

"آنٹی زندگی اور صحت سے بھرپور عید مبارک ہو۔" اس کا خوش گوار لہجہ پورے گھر میں گونجا۔ مدحت نے جواباً" اسے ہزاروں دعاؤں سے نوازا۔ اس نے ایک طائرانہ سی نظر برآمدے کی سیٹنگ پہ ڈالی تو ایک گدگداتے سے احساس نے اسے اپنے حصار میں لیا دل نے خواہ مخواہ ہی قہقہہ لگانا چاہا۔

"عدن کہاں رہ گئی ہو۔ ناشتا لے کر آؤ۔ قصاب تو کہیں بارہ بجے کے بعد آئے گا۔ ارے سن رہی ہو۔" انہوں نے پھر کچن کی طرف دیکھ کر ہانک لگائی۔

"سنائی دے گیا ہے خالہ۔ کچن قریب ہی ہے افغانستان میں نہیں ہے۔" اس کی تپی تپی آواز نے بھی ٹھنڈک کا احساس دلایا۔

"اس بار قصاب سب سے پہلے ہمارے گھر آئے گا" آنٹی بے فکر ہوجائیں۔"

"اللہ تمہارا ہمیشہ بھلا کرے۔" انہوں نے فوراً" دعا سے نوازا۔

"اگر سارے بھلے اس کے کھاتے میں آگئے تو باقی دنیا تو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہ جائے گی۔" وہ خاصا جل کر بہ آواز بلند بڑبڑائی۔ کچن واقعی افغانستان میں نہیں تھا۔ اذان کو یقین ہو چلا۔

"ذرا دیکھیں تو آنٹی۔ ان کرسیوں کی کچن والوں سے ضرور لڑائی ہوئی ہے جو بے مروتی سے رخ پھیر کے بیٹھی ہیں، مگر ہماری تو نہیں۔" مسکراہٹ دبا کر فوراً" بدلہ لیا۔

"اللہ یہ بندہ کتنا تیز ہے۔ سب کچھ بھانپ لیتا ہے۔" وہ پوری جان سے تلملائی۔

آج سوٹ کے ہم رنگ نیلا دوپٹا بھی اوڑھ رکھا تھا۔ دونوں کلائیوں میں کوئی چار چھ چوڑیاں بھی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں۔ اتنی سی تیاری اور اس قدر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بھی وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اسے تمام دن وہیں جم کر دیکھنے کو دل نے مکمل آمادگی کا اظہار کیا۔ گویا زندگی کا اگلا سفر تمام کرکے آخری سانس تک یہ چہرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

"دیکھ لیں۔ کچن والوں سے خفا کرسیوں نے صلح جوئی کا جھنڈا لہرا کر اپنا رخ بدل لیا ہے۔" ٹرے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ ذرا سا لرزے۔ اسے مسلسل اپنی جانب دیکھتا پاکر وہ پہلے ہی خاصی بدحواس ہوئی جارہی تھی۔ اس نے غصے سے لب بھینچ کر اسے گھورا، مگر وہ زیر لب مسکراتا ناشتے کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ جہاں خوش رنگ پاستا، فروٹ چاٹ اور سینڈوچز دیکھ کر بھوک کا احساس مچل اٹھا تھا۔

"عدن دیکھو بائدہ نے مجھے کتنی اچھی مہندی لگائی

ہے۔" امن کی آمد نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

"ہاں اچھی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے کی طرف جانے لگی۔

"بھائی آپ بھی دیکھیں۔" وہ اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی تو اس نے خاصی دلچسپی سے اس کے مہندی سے سجے ہاتھوں پہ نظر ڈالی۔

"میرے لیے بھی ایک پلیٹ لے آؤ۔" وہ جو دہلیز پار کرنے لگی تھی اپنا رخ دوبارہ کچن کی طرف کیا۔

"بجائے اس کا ہاتھ بٹانے کے اپنا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اس سے کرواتی ہو۔" مدحت نے غصیلی نگاہ بے فکر سی امن پہ ڈالی۔ ڈانٹ ڈپٹ جس کے سر سے گزر جاتی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔

"مائدہ کہہ رہی تھی ناشتے کے بعد تمہیں بھی لگا جائے گی۔" اس نے پلیٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں۔" سنجیدگی سے ترنت جواب آیا۔

"کہاں بھاگی جا رہی ہو۔ ادھر بیٹھو۔" جاتی ہوئی عدن نے انہیں ٹھٹک کر دیکھا۔ خالہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ بات سنجیدہ ہے چاروناچار اسے بیٹھنا پڑا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے ماموں کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا کل آؤں گا۔ آتے ہوئے یقیناً" کرائے کی وصولی بھی کرے گا۔ تم سب یہاں موجود ہو باہم مشورہ کر لیتے ہیں کہ بات کس طرح کرنی ہے اور۔۔۔" وہ کچھ رکیں۔ کچھ جھجکیں۔

"کہہ رہا تھا کہ شادی کی تاریخ بھی طے کر کے جاؤں گا۔" دھڑ دھڑ دھڑ عدن کا تمام اطمینان و سکون زمین بوس ہوا۔ حواس باختہ سا ہو کر سامنے دیکھا۔ وہ انتہائی اطمینان سے اب ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ مدحت کے چہرے پہ فکرمندی کے آثار نمایاں تھے۔ امن کی بھوک جیسے ایک دم ہی ختم ہوئی۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں بات کروں گا بلکہ کئی باتیں ہوں گی۔" وہ ٹشو سے ہونٹ صاف کرتا عجب سے انداز میں بولا اور سرسری سی نظر عدن پہ ڈالی جس کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

"تمہیں میری یہاں موجودگی کا علم ہے؟" اس کی سوالیہ آواز میں بردباری تھی، ٹھہراؤ تھا۔

"ہاں میں نے کچھ دن پہلے ذکر کیا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ آپ خواتین جانتی ہی نہیں کہ کل کن کن رازوں سے پردہ اٹھنے والا ہے۔" سوچ کی لکیریں اس کی چوڑی پیشانی پہ بھی واضح ہوئیں۔

"اور اگر انہوں نے پوچھا کہ آپ ایک دم ہمارے سربراہ بن کر کہاں سے ٹپک پڑے ہیں تو۔" اپنی سوچوں میں غلطاں اذان نے چونک کر عدن کو دیکھا۔ استہزا اس کے لہجے میں ہی نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھیں بھی واضح تمسخر اڑا رہی تھیں۔

"میں اچانک مشرق سے ٹپکا ہوں یا مغرب سے یہ میں انہیں خود سمجھا لوں گا۔ آپ اپنی انرجی اس معاملے میں ویسٹ مت کریں۔" خلاف معمول جانے کیوں اسے غصہ آگیا۔

"اور امن آپ کے ہاتھ کیوں رک گئے۔ اتنا اچھا ناشتا چھوڑنے پر تمہیں شام تک افسوس رہے گا۔" وہ ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہتا اس کے سر پہ چپت رسید کرتا اپنے سیل فون کی جانب متوجہ ہوا۔ سعودیہ سے کال آ رہی تھی۔ وہ معذرت کرتا گیٹ کی طرف بڑھا۔ مدحت نے بڑی بھانجی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"عجیب بندہ ہے۔" ان کی گھوریوں کا جواب تین حرفوں میں دے کر جان کی امان پاتے ہوئے وہ وہاں سے کھسک لی جبکہ امن اچھا ناشتا ڈونگوں میں نہ چھوڑنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

"یا اللہ ان بچیوں کے معاملے میں میرا دل ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا۔" مدحت نے ——— کر دعا مانگی۔

تب ہی دروازے کی بیل چنگھاڑی۔ "یقیناً قصاب ہو گا۔" وہ چھلانگ لگا کر یہ جا وہ جا۔

"ارے رک تو۔۔۔ اذان دیکھ لے گا۔ تو نے کون سا چھریاں تیز کرنی ہیں۔" خالہ کی اب کون سنتا۔ کچھ دیر بعد بکرا ذبح ہو رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ دھرے

ان کے سر پہ کھڑی تھی۔ اس کے برعکس عدن نے دروازہ اچھی طرح بھیڑ لیا تھا کہ آوازیں اندر نہ آئیں۔

وہ ان سب کے لیے ایک یادگار عید تھی۔ سہ پہر کے وقت امن اور اذان کا باربی کیو شروع ہوا۔ عدن کی بھاگ دوڑ ہوتی رہی برآمدے کے ٹیبل پہ اذان کے سیل پہ مسلسل کالز آرہی تھیں۔ وہ کسی وجہ سے گزری تو اسکرین پہ نظر ڈالی "ثمو کالنگ" ہجے کر کے پڑھ ہی لیا۔ چند ثانیے سوچا پھر سیل لیے اس کے پاس آئی۔

"آپ کی کال آرہی ہیں۔" اس نے پکڑا ضرور، مگر ریسیو نہیں کیا۔

"آپ جب تک بات نہیں کریں گے یہ محترمہ ہمارا سکون غارت کرتی رہیں گی۔" وہ منہ بنا کر خاصی ناگواری سے بولی۔

"اوہ۔ تو محترمہ نام پڑھ چکی ہیں۔ ویسے ذرا وضاحت تو فرمائیں، ان کی کال سے آپ کا سکون کیوں غارت ہو رہا ہے۔" آنکھوں میں شرارت مچلی۔ بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔

"خالہ ابھی سوئی ہیں، مسلسل بجتی ٹون سے اٹھ بھی سکتی تھیں۔" فوراً وضاحت دی۔

"تو یہ کہنا تھا کہ خالہ کی نیند خراب ہو رہی ہے۔" وہ ہنوز سنجیدگی کی آڑ لے کر بولا۔

"درمیان میں اپنے سکون کو مت گھسیٹیں۔" سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا جو اسے گڑبڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ پاؤں پٹختی وہاں سے ہٹی "پتا ہے، بھائی صبح یہ میسج پڑھ رہی تھیں کہ محبت کا بی پی انتہائی لو ہے۔ کسی لمحہ بھی دم توڑا جا سکتا ہے۔" اذان کے فلک شگاف قہقہے نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ دل تو چاہا پلٹ کر امن کی گردن مروڑ دے "اور رات کی سنیں "کیا مہارت سے پڑھا۔ باہر والوں کے لیے خوش خبری کہ آدھی ہری "آدھی کالی لڑکیاں ایجاد کر لی گئی ہیں۔" ان دونوں کے چھت پھاڑتے قہقہوں نے اس کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ دوڑا دی۔ اس آنگن کی پرمسرت گھڑیاں کل سے ناواقف تھیں کہ آج کے بعد یہ سب خواب ہو جائے گا۔ کل کا سورج ان تینوں خالہ بھانجی کے لیے کچھ اچھا ثابت نہیں ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج تو سورج سمجھو اگلے پچھلے تمام حساب چکانے نکلا ہے۔" منیر صاحب کی اس بات پہ اذان بڑے ہی محتاط اور محظوظ انداز میں ہنسا۔

"کبھی نہ کبھی تو حساب چکانے کی باری آ ہی جاتی ہے۔" اور وہ جو پانی کا چوتھا گلاس غٹاغٹ چڑھا رہا تھا۔ ہاتھ ساکت رہ گئے بغور اسے دیکھا۔

حنان کا بھانجا اسے ضرورت سے زیادہ ہی ہوشیار لگا تھا۔ اسے دیکھتے ہی دل کو پتنگے سے لگ گئے تھے۔ اونچا لمبا، خوبرو دیکھنے میں بہت بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس کے اشارے پہ مدحت نے ہی بات شروع کی۔ دونوں لڑکیاں بھی قریب ہی بیٹھی تھیں۔

"میں نے اذان کو آج صبح کرائے کی وصولی کے لیے بھیجا تھا، مگر انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے تک گزشتہ برس کا حساب کلیئر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آج اذان کو بھی ساتھ لے کر جانا۔ اب ہم کرایہ ہر ماہ وصول کیا کریں گے۔" وہ بنا سانس روکے بولتی چلی گئیں۔

منیر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ پھر توقف کے بعد ہونٹوں پہ زبان پھیر کے بولا۔

"ہر ماہ وصولی کرو گی تو بچت کیسے کر پاؤ گی۔" بہن سے نگاہیں چرا کر کان کھجایا۔

"پہلے کون سی بچت ہوتی ہے۔ گھر کا حال دیکھو۔ پرانا کھنڈر ہوتا جا رہا ہے سوچ رہی ہوں، ہر ماہ کچھ مرمت وغیرہ کروا لیا کروں گی۔"

"تو کیا اب گھر میں غیر مردوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔" وہ بہن کی بات کاٹ کر درشتی سے بولا۔

مدحت کو اس کی بات بری طرح چبھی، مگر وہ اصل موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں۔ "زمانے میں ہزاروں اکیلی عورتیں رہ رہی ہیں تو کیا وہ گھریلو کام

کاریگروں سے نہیں کرواتی ہوں گی۔" تحمل سے
جواب دیا۔

"دکاندار کہہ رہے تھے ہم تو چونسٹھ ہزار رینٹ پچھلے دو سالوں سے دے رہے ہیں۔" مدحت نے اسے جلتے توے پہ بٹھا ہی دیا۔ جس نے شعلہ بار نگاہوں سے اذان کو گھورا۔

"تمام رقم تمہارے ہاتھ پہ رکھتا تو تم اور تمہاری بھانجیاں اللوں' تللوں میں اڑا دیتیں۔ اس لیے محفوظ کرتا رہا ہوں۔" وہ انتہائی ڈھیٹ قسم کا بندہ تھا اتنی جلدی چھتری تلے نہیں آنے والا تھا۔

"اور کیا کچھ محفوظ کرتے رہے ہیں آپ۔" اذان نے آخر میدان میں کودنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اس نے بڑی گہری اور ٹھنڈی نظروں سے مسکرا کے اذان کو دیکھا۔

"یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ تم اپنی زبان بند ہی رکھو۔"

"یہ بھی گھر کا ہی بچہ ہے۔" مدحت مضبوطی سے بولیں۔

"اتنے سالوں بعد ہمدردی کا بخار چڑھا کر آگئے ہو میاں! رشتہ داری کا اب علم ہوا ہے' ہنہ۔" وہ سر جھٹک کر ہنسا۔

"مان لیا کہ دیر سے علم ہوا ہے' مگر حساب آپ کے نو سالوں کے برابر کر دیا ہے۔" بے فکرے پن سے ہنس کر معنی خیز جواب دیا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا۔" منیر نے تیکھے ابروؤں سے پوچھا۔

"نو سالوں میں آپ کے نو یا گیارہ چکر لگے ہوں گے۔ اور مجھے اٹھارہ دنوں سے چند گھنٹے زیادہ ہو گئے ہیں تو حساب برابر سے زیادہ ہوا نا۔" ذہین چہرہ۔ فطین آنکھیں۔ پراسرار لہجہ۔ پرتکلف انداز اب جا کر صحیح معنوں میں منیر صاحب کے چھکے' چوکے سب چھوٹتے نظر آئے۔

"بے کار کی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ کام کی بات بھی ہو جائے۔" پٹڑی بدل کے وہ ایک دم جیسے نئے اسٹیشن پر اترا۔

"شادی کی تاریخ کیا فائنل کرنی ہے۔"

"کس کی شادی۔" اذان نے اچنبھے سے پوچھا۔

"جہاں تک میری معلومات ہیں' آپ کا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ تین بچوں کا باپ بھی ہے۔" پورے کا پورا ناظم آباد جڑ سے اکھڑ کے ان تینوں عورتوں کے سر پہ گرا تھا۔ منیر کے لبوں کو چھوتی مسکراہٹ اس پل اڑنچھو ہوئی۔ چہرہ گہرا زرد ہلدی جیسا۔

اگر یہ یہاں تک جانتا ہے تو اور بھی بہت کچھ اس کے علم میں آچکا ہوگا۔ مجھے یوں اپنے حواس نہیں چھوڑنے چاہئیں۔

"اس میں جبران کی رضامندی شامل نہیں تھی بلکہ اس نے مجبوری کے عالم میں اپنی کینسر سے مرتی خالہ کی آخری خواہش پہ سر جھکایا تھا۔" یہ شخص تو میرے قیافوں سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ غصے کی سرخی سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ خبر سننے کے بعد عدن فوراً" وہاں سے اٹھ گئی' مگر امن اور مدحت ابھی تک بے یقینی سے اس کا منہ تک رہی تھیں۔

"بس بہت ہو گیا منیر صاحب۔" وہ ایک دم اکھڑے لہجے میں بولا۔

"آپ ان معصوم بے خبر عورتوں کو اور کتنا دھوکا دیں گے۔" ضبط کے باوجود وہ بھڑک اٹھا۔

"آنٹی! انہوں نے ماموں کی گاڑی بیچی ہی نہیں تھی۔ وہ ابھی تک ان کے استعمال میں ہے۔" مدحت کے گلے میں دکھ سے گرہیں پڑنے لگیں۔ منیر فق چہرے کے ساتھ پوری آنکھیں کھولے ثابت اذان نگلنے کو تیار بیٹھا تھا۔

"ماموں نے آدھا مربع زرعی زمین خرید رکھی تھی۔ یہ شخص ہر سال اس زمین کا ٹھیکہ جو کہ سات سے آٹھ لاکھ تک ہے' ہڑپ کر جاتا ہے۔" حقیقتوں کا گرم تندور بہن اور خالہ کے ساتھ کھڑکی سے لگی عدن کو بھی جھلسا رہا تھا۔ وقت اس قدر سفاکیت دکھلا رہا ہے۔ رشتوں میں صرف میرا میری کا عالم ہے۔ ساکت

وجاہد بیٹھے منیر کے لبوں نے کافی دیر بعد جو کچھ کہا وہ سب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو سوچ رہے تھے کہ وہ کچھ عذر پیش کرے گا' کوئی ٹھوس جواز یا پھر مدلل دلائل سے انہیں قائل کرے گا۔

"تم سب کے بھلے کے لیے ہی ایسا کر تا رہا ہوں۔ مستقبل میں سب عدن کے ہی کام آئے گا۔ اگر سب کچھ تم لوگوں کے حوالے کر دیتا تو لالچی اور مطلب پرست رشتہ داروں کا تانتا بندھا رہتا یہاں۔ پھر تم سب کو کھوٹے کھرے کی پہچان کیونکر ہوتی۔" کوئی قابل ڈاکٹر ابھی ان چاروں سے آکر کہہ دیتا کہ وہ چاروں پاگل ہیں تو وہ بلا چوں و چرا مان لیتے' مگر۔

"سوچ لو مدحت! آج کل لوگ تعلیم یافتہ لڑکیاں پسند کرتے ہیں جب کہ ہماری بھانجی کا شمار ان میں نہیں ہے۔ نہ کوئی ہنر نہ کوئی گن' پھر مان لیا گھر کے لالچ میں کوئی آ بھی گیا تو دوسرے دن تمہیں اور امن کو باہر نکال پھینکے گا۔ شادی کے بعد جبران پندرہ دن یہاں گزارا کرے گا۔ لوگ جہیز میں معذور خالہ کا بوجھ نہیں لے کر جائیں گے۔ گھر کی بات ہے گھر میں نبٹ جائے تو۔"

"بس منیر!" مدحت نے چیخ کر ہاتھ اٹھایا۔

"بھلے عدن گھر میں بیٹھی رہ جائے' مگر اب نہیں۔ مجھے یتیم بچیوں کی ایک ایک پائی واپس چاہیے۔ سیدھے سبھاؤ دے دو ورنہ پھر عدالتوں کے چکر لگاتے پھرنا۔ اور یہ محض دھمکی نہیں۔" مدحت کے چپ ہونے۔ اس نے اذان کو قہر برساتی نظروں سے دیکھ کر یوں جوتا پہنا جیسے اے سی صاحب کو پاؤں میں پہنا ہو۔

"میں دیکھوں گا یہ لڑکا کب تک تمہارا ساتھ دے گا۔ جس کی ماں تم دونوں بہنوں پہ تھوکتی بھی نہیں تھی۔ اس کی اولاد کو اپنا خیر خواہ سمجھ رہی ہو' ہنہ۔" جانے سے قبل اس نے کڑوے اور زہریلے سچ کا پیالہ ان کے منہ سے لگایا تھا کہ وہ تینوں کچھ بولنے کے قابل نہیں رہیں۔

☆ ☆ ☆

بعد میں اس نے تمام تفصیلات ان کے گوش

گزار دیں کہ کیسے وہ اپنے ساتھ پٹواری اور تحصیل دار کو لے کر بدین گیا۔ کمپیوٹر پہ ان کی زمین کے تمام کھاتے کھلوائے۔ اس تمام جھنجٹ سے نبٹنے کے بعد وہ مسعود صاحب کے دوست کے گھر ٹھہرا۔ جس کا گھر اسی محلے میں تھا اور باقی ماندہ معلومات ان صاحب کی امداد کے عوض حاصل ہوئیں۔ ماموں کی گاڑی میں نے خود جبران کو ڈرائیو کرتے دیکھا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ ان تینوں کے لیے دم گھٹنے کا باعث بن رہا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ منیر اس طرح رشتوں کا بھرم چوسنے والی جونک ثابت ہوگا' مجھ سے مانگ کے تو دیکھتا ہم مل بانٹ کے کھالیتے۔" شدید دکھ سے ان کے حلق میں بار بار ایک پھندا سا پڑ رہا تھا۔

"خدا نے تمہیں ہمارے لیے غیبی امداد کے طور بھیجا۔ ورنہ اگر میری بچی کی شادی ہو جاتی تو ہم تو بری طرح پھنس جاتے۔"

"آنٹی یہ سب میں نے اپنے ابو کے کہنے پر کیا ہے۔" آنٹی کا تشکرانہ انداز اسے شرمندہ کر گیا تھا۔

"وہ ایک بار اتفاقاً" بدین گئے تھے اور وہیں اپنے دیرینہ دوست سے انہیں کچھ آدھی ادھوری معلومات ملی تھیں اور پھر حج پہ جانے سے قبل انہوں نے ہی مجھ سے یہ تمام گتھیاں سلجھانے کا وعدہ لیا۔" وہ دونوں اس وقت تنہا تھے' مگر اسے احساس تھا کہ اندر کمرے میں ٹی وی بند ہے۔ ان کی گفتگو عدن بھی سن رہی ہوگی۔

"یقین جانو بیٹا۔ تمہارے ماموں سے شادی ہم دونوں بہنوں نے والدین کی رضامندی سے کی تھی۔ میں تو آپا کی شادی کے بعد ایک دو مرتبہ ہی کراچی آئی تھی۔ مجھے کبھی صباحت آپا نے بھی آصفہ آپا اور حسان کی ناراضی کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ مجھے احساس جرم کچوکے لگاتا ہے کہ میری وجہ سے بچیوں سے ددھیال کا واحد رشتہ چھوٹ گیا۔" انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی۔

"آپ خود کو اس سارے قصے میں ملوث کیوں کرتی ہیں آنٹی ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" انہوں نے اپنے ہاتھ پہ رکھے اذان کے ہاتھ کو نرمی اور شفقت سے تھپکا۔

"عدن کو میری وجہ سے بچپنا چھوڑ کر بڑی عمر کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں، مگر اس بچی نے کبھی اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے میں غفلت یا کوتاہی سے کام نہیں لیا نہ ہی کبھی اس کے مزاج میں، میں نے بے زاری محسوس کی نہ اکتاہٹ پھر بھی میں خود کو اس کے تعلیم حاصل نہ کرنے کا قصوروار سمجھتی ہوں۔"

ان کی دھیمی آواز گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"ایک درخواست ہے بیٹا۔" انہوں نے نم آنکھیں خاموش بیٹھے اذان پہ ٹکائیں۔

"درخواست کیوں آنٹی' آپ حکم کریں۔" اس نے تیزی سے اپنا جھکا سر اٹھا کر کہا۔

"یہ تمہاری اچھی سوچ سلجھے مزاج اور بہترین تربیت کا نتیجہ ہے ورنہ تمہارے بڑے بہن کے سامنے ہم تو تنکے جیسے آسرے ڈھونڈنے والے انسان ہیں، ہماری اندھی بہری زندگی کی آسانیاں تمہاری مرہون منت ہیں۔ بس تھوڑا سا... ساتھ اور دے دینا۔" وہ کچھ جھجک کر ٹھہر کر بولیں۔ وہ جیسے ان کے ہر حکم بجا لانے کا منتظر تھا۔

"اگر تمہاری نظر میں کبھی بھی کوئی اچھی فیملی اور اچھے کردار کا سلجھا ہوا لڑکا آئے تو عدن کو ذہن میں رکھنا۔"

"جی۔" دل پہ کسی نے گرم بلبلاتا پانی انڈیلا۔ اس کے انداز میں اس قدر حیرانی تھی۔ مدحت نے الجھ کر اسے دیکھا۔ جیسے اس نے بڑی اونچی ڈیمانڈ کی ہو۔ اندر بیٹھی عدن کلس کر رہ گئی۔

"چاہے زیادہ پڑھا لکھا نہ ہو، مگر شریف اور اچھے مزاج کا ہو۔ مجھے پتا ہے تمہارا اٹھنا بیٹھنا اپنے ہی جیسے آفیسرز میں ہوتا ہوگا۔ تمہارے لیے ہمارے جوڑ کا آدمی ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔" وہ اس کے چونکنے اور ٹھٹکنے کو اپنے تئیں یہی وجہ سمجھی تھیں۔

"ارے نہیں آنٹی! میرا اٹھنا بیٹھنا ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔"

وہ اپنے حواس کافی حد تک بحال کر چکا تھا اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اندر بیٹھی عدن کا خون کھول کھول کر اب بس سوکھنے کے قریب ہوگا۔

"ابھی اس کی عمر اتنی نہیں ہوئی' اگر پڑھنا چاہے تو اتنا مشکل کام نہیں ہے۔" دل ایک دم ہی اسے چڑانے پہ بضد ہوا۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ آج اس نے ناشتا بھی امن کے ہاتھ بھجوایا تھا۔

"انگلش میں ہی کچھ مہارت حاصل کرلے تو کسی آفیسر کا رشتہ بھی آسکتا ہے۔" انتہائی سنجیدگی کے ساتھ آواز تیز ہی تھی۔

"ہزار دفعہ سمجھا چکی ہوں' مگر اس لڑکی کو ڈراموں سے فرصت تو ملے۔ اب بھی ڈرامہ ہی دیکھ رہی ہوگی۔" وہ فکر مند سی ہو کر بولیں۔ اسی اثنا میں گیٹ پہ دستک ہوئی۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا۔ یقیناً" امن کالج سے آئی تھی۔

✲ ✲ ✲

اگلا ایک ہفتہ بہت مصروفیت میں گزارا۔ ٹھیکیدار کو زمین کے اصل مالک کے کاغذات دکھا کر اس سے قبضہ چھڑوایا گیا۔ اخبار میں زمین کی حق ملکیت کا حنان کے نام اشتہار دیا گیا تاکہ منیر صاحب نئے ٹھیکیداروں کا ناطقہ کہیں بند نہ کردے جلد ہی زمین ٹھیکے پہ دینے کا کام وہ اپنے باپ کے دوست کو سونپ آیا۔ جب کہ منیر گاڑی کسی قیمت پہ دینے کو تیار نہ ہوا۔ آنٹی کے کہنے پہ اس نے مزید اصرار نہیں کیا' مگر اس سے ایک مناسب قیمت وصول کرلی گئی۔ واپس آکر اس نے دونوں بہنوں کے نام سے اکاؤنٹ کھلوایا جس میں موجود رقم سات لاکھ کے قریب تھی۔ آج کل ملکی حالات بھی ایسے تھے کہ کبھی لوڈشیڈنگ پہ دھرنا دیا جارہا ہے تو کبھی گورنمنٹ سروس کے ملازمین تنخواہوں کے نہ ملنے پہ دھرنا مار کے بیٹھ جاتے۔

اس گھر میں گزارا جانے والا اس کا آخری عشرہ تقریباً" باہر ہی گزرا وہ رات خاصی دیر سے ہی گھر آتا۔

اس کی آمد پہ گیٹ بھی امن ہی کھولتی تھی حالانکہ وہ روزانہ اس کا ہی منتظر ہوتا۔ آج کل تو وہ گھر واپسی کے لیے چھوٹی موٹی پیکنگ بھی کرنے لگا تھا۔ اس کی امی کا فون پہ فون آرہا تھا کہ گھر جا کر ملازمین سے ذرا تفصیلی صفائی وغیرہ کرواؤ۔ وہ نوٹ کر رہا تھا کہ عقبی صحن کو سمندر بنانے والا سلسلہ ترک ہو چکا تھا۔ ایک بھید بھری تبدیلی نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

آج کچھ فراغت نصیب ہوئی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا آفس میں ہی کھاتا تھا' مگر آج ایک بجے ہی گھر چلا آیا۔ آتے ہوئے اس نے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے کھانا بھی پیک کروالیا۔ آج چنچل سی ہوا ہر کسی سے بلاوجہ گلے مل رہی تھی۔ ایک ضروری فائل کا تھوڑا سا مطالعہ کرنا تھا۔ آج بھی استقبال امن نے ہی کیا تھا اس نے پیک کیا کھانا اسے پکڑایا۔

"مگر ہم تو کھا چکے ہیں۔" اس گھر میں ظہر سے پہلے کھانا کھالیا جاتا تھا۔

"مگر مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" وہ فوراً "اسی کے اسٹائل میں بولا تو اس کی ہنسی۔ چھوٹ گئی اس کے ہاتھ منہ دھونے تک امن ٹرے سجا کر لے آئی۔

"آپ اتنا کھانا لے آئے ہیں کہ مزید دس آدمی کھا سکتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے ٹک گئی۔

"چلو رات کو سب مل کے کھالیں گے۔ عدن کو بھی کچھ فراغت نصیب ہوگی۔" اس نے منع کرنے کے باوجود رات کا کھانا خاصا اہتمام سے تیار کیا جاتا تھا۔

"آج کل وہ کچھ زیادہ ہی ٹی وی دیکھتی ہے؟" پوچھنے کا انداز سرسری سا تھا۔ پھر بھی دل عجب سی لے پہ دھڑکا۔

"کوئی ٹی وی شی وی نہیں دیکھتی۔ اکثر اسے چپ کے دورے پڑتے ہیں پھر بس کچن اور کمرہ ان دو مقامات کے علاوہ ہر جگہ سے غائب۔۔۔ آج کل تو ناول بھی خالہ خود ہی پڑھتی ہیں۔ آپ نے انہیں چشمہ لگوا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"وہ کیسے؟" محض نگاہوں نے استفسار کیا۔

"خوامخواہ مجھے بھی سننا پڑتا تھا۔" منہ بگاڑ کر کہا گیا۔ اس نے ذرا سا مسکرا کر نگاہ جھکائی۔

ان دونوں کے درمیان صرف خاموشی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ خالہ دوپہر کے کھانے کے بعد سو جاتی تھیں۔ اور وہ کہیں غائب تھی۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے تذبذب کا شکار تھی

"ہاں ضرور۔" وہ مصروف سے انداز میں بولا۔

"کل ساجدہ خالہ نے اشارتاً "اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ دیا ہے۔" لقمہ توڑتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو ساکت ہوئے، "مگر مجھے معلوم ہے عدن انکار کردے گی۔ سانس نے کچھ تازگی محسوس کی۔

"کیوں" وہ ہولے سے مسکرایا۔

کیونکہ اسے گنجے مرد اچھے نہیں لگتے۔ خالہ کے بیٹے کی ناک بھی لمبی ہے۔ جو کہ اسے پسند نہیں۔"

"اوہ!" پانی کا گلاس لبوں سے ہٹا کر امن کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔ اسے اور کیا کیا پسند نہیں' پتا نہیں اسے تنگ کرنا مقصود تھا کہ خود کو خوش کرنا۔

"چھوٹا قد اور جس کی توند نکلی ہوئی ہو وہ بھی نہیں' رنگ بھی کالا نہ ہو۔" اس نے ایک ہی سانس میں اگلا' یعنی کہ بندہ ہیرو ٹائپ ہو' وہ اب پوری دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ تھا۔

"آپ پلیز خالہ سے کہیں' انہیں انکار کردیں اور عدن کا رشتہ وہاں ہونا چاہیے' وہ برسوں سے جسے پسند کرتی ہے۔" اٹھایا تو اس نے کھیرے کا ٹکڑا تھا مگر یوں لگا جیسے ہزار وولٹ کی ننگی تار ہاتھ میں آگئی ہو۔ ایسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی اور میں انوالو ہے' شناسائی کے ریشم سے بندھی ان گھور سیاہ آنکھوں کو اس نے اپنے چہرے پہ جسے بارہا محسوس کیا تھا' وہ اعلا تعلیم یافتہ نہیں تھی وہ مکمل حسن کے معیار پہ بھی پوری نہیں اترتی تھی۔ پھر بھی وہ ایسی تھی جسے پورے فخر و غرور کے ساتھ چاہا جاسکتا تھا۔ وہ پریشانیوں کے سمندر میں بھی خوشیوں کے کنارے ڈھونڈ نکالتی تھی۔ اس نے اپنی خالہ کے سامنے اتنا کچھ ہونے کے باوجود

ماموں کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا تھا بلکہ دل کی بھڑاس نکالتی امن کو بھی ڈپٹ کر خاموش کروا دیا تھا۔ وہ مدحت کو دکھ اور تنہائی کی کیفیت سے چند دنوں میں ہی واپس لے آئی تھی۔ اس نے کھیرا واپس پلیٹ میں رکھا
"تم جانتی ہو وہ کون ہے؟" اپنی ہی آواز کی پستی پہ اسے ہنسی آئی۔
"ایک میں کیا اسے تو پورا پاکستان جانتا ہے" وہ کھلکھلائی "بلکہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔"
"جی نہیں، یہ تینوں نہیں ہمایوں سعید کی بات کر رہی ہوں۔"
"لاحول ولا قوۃ" وہ سر جھٹک کر ایک دم ہی ڈھیلا پڑا۔
"تم لڑکیاں بھی ناں۔" اس نے سامنے براجمان امن کا سر زور سے گھما ڈالا۔ "یہ بندہ شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی اسے اپنے ہینڈ بیگ میں گھسا کر رکھتی ہے۔" پچھلی سیڑھی پہ استادہ عدن ہمن کو قاتلانہ نظروں سے گھورنے لگی۔ امن کے چہرے پہ مایوسی کے رنگ بکھر گئے۔ پھر ایک دم ہی کسی دھیان کے تحت چہکی۔
"تو پھر یوں کریں حمزہ عباسی کا اتا پتا ڈھونڈیں" وہ جو اٹھنے لگا تھا اس نئی افتاد پہ بوکھلا کر پلٹا۔ "وہ عدن کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہے" وہ اس کے جارحانہ تیور دیکھ کر کچھ جھجکی، کچھ ڈری۔
اس نے ہاتھ میں تھمی فائل چارپائی پہ پٹخی، پھر طیش سے اس کا بایاں کان کھینچا "تم یہیں رکو میں ابھی جاوید شیخ کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں" اتنا کہہ کر وہ جز بز ہوتی، دور کھڑی عدن پہ فرصت کی نظر ڈالتا باہر چلا گیا۔ دونوں بہنیں پہلے تو کھسیانی سی ہو کر ہنسیں۔ پھر کھلکھلا کر ہنستی ہی چلی گئیں، ان کی لوٹ پوٹ ہونے والی ہنسی مدحت کی سمجھ سے باہر تھی۔ مگر باہر گیٹ کے پاس کھڑے اپنے سیل پہ کسی کا نمبر ملاتے اذان کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اپنے روبرو بیٹھی ثمو کے منہ سے شیر دل کا ذکر سن کر زوبیہ کا دل غڑھک سے اڑا۔

"آپ مجھے غلط مت سمجھیں، دراصل مجھے اس سے کچھ معلومات چاہئیں" وہ اپنے ذہن میں لفظوں کو ترتیب دے کر بول رہی تھی۔
"میں پوچھ سکتی ہوں کہ کس طرح کی معلومات؟" زوبیہ نے گلا کھنکار کر پوچھا۔ اس کی آنکھیں ثمو کا اسکین کر رہی تھیں۔
"آپ نے کہا تھا کہ اذان کے ماموں کی بیٹیاں کچھ اچھی شہرت نہیں رکھتیں تو مجھے ان ہی کے متعلق پوچھ گچھ کرنی ہے۔"
زوبیہ کے چہرے پہ کئی رنگ آ کے گزر گئے۔ وہ عجب الجھن کا شکار ہوئیں۔
"یعنی مجھے ان کے خلاف کچھ ثبوت چاہئیں" بالآخر اس نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور چند باتیں حذف کر کے باقی اپنی اور اذان کی "تکرار من و عن" اس کے گوش گزار کی۔ یہاں تو کہانی کچھ اور ہی موڑ لے چکی ہے، زوبیہ کا دل خوشی کی ترنگ سے جھوم اٹھا۔
"تمہیں خبر ہے کہ اس سارے قصے میں غفران خود ملوث رہا ہے پھر بھی۔" وہ انتہائی سنجیدگی کا چولا اوڑھ کر بولیں۔
"جو بھی ہے مگر میں اذان کی آنکھوں پہ بندھی پٹی اتارنا چاہتی ہوں، جس نے ان مڈل کلاس کم حیثیت لوگوں کی وجہ سے مجھ پہ انگلی اٹھائی۔ میرے لائف اسٹائل کو تنقید کا نشانہ بنایا۔" وہ انتہائی تنفر کے ساتھ بولی۔
لیجیے، صیاد خود ہی دام میں آ گیا، حنان کی لڑکیوں کو تو واصفہ گھاس تک نہیں ڈالے گی، باقی رہی ثمو تو وہ اپنا پتا خود ہی صاف کرنے پہ تلی ہوئی ہے، اب سارہ کے لیے واصفہ کو راضی کرنا کوئی مشکل نہیں کیونکہ ایک دفعہ اس نے آس دلائی تھی کہ ثمو سے بات نہ طے ہوئی تو پھر میری بہو سارہ کے علاوہ کوئی نہیں ہو گی تاہم وہ کچھ دیر سر جھکا کر بیٹھی رہیں۔ پھر اس سے معذرت کرتی چائے بنانے کے بہانے دوسرے کمرے

میں آئیں۔ انہوں نے ثمو نے بیٹے کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی، پھر بیٹی کو چائے کی تاکید کرتی دوبارہ اندر آئیں۔ کچھ لمحوں بعد ان کا بیٹا بھی اندر آگیا جو صرف گیارہ سال کا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ثمو کے پہلو میں بیٹھی تھیں، وہ لڑکا صوفے کی پشت کی جانب تھا۔

"ابھی میری شیر دل سے بات ہوئی ہے۔ وہ چند ماہ کے لیے پنجاب چلا گیا ہے۔" گھر میں داخل ہوتا شیر دل پھوپھی کے منہ سے اپنا نام سن کر کھڑکی کے پاس رک گیا۔ "میری مانو تو دفع کرو یہ انتقام کا چکر، واصفہ کے آنے پر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔" زوبیہ نے بچی کھچی سہیلی کی طرح اسے سمجھایا۔

"آپ پلیز اسے کہیں ایک دن کے لیے کراچی آجائے، میں اسے منہ مانگی رقم دوں گی۔" وہ اپنی بات پہ ڈٹی ہوئی تھی۔ رقم کے ذکر پہ شیرو کے نہ صرف منہ بلکہ کانوں میں بھی شکر سی گھل گئی۔

"ارے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو اس ناخلف کی باتیں سن کر جو کہ سراسر اس کی من گھڑت ہیں۔ ان بچیوں کے خلاف واصفہ اور رخشندہ کے سامنے منہ سے کچھ پھوٹا۔ وہ تو خود ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔"

"واہ پھوپھی، ان کے پیچھے تو مجھے تم ہی نے لگایا تھا۔"

"ارے بیٹھو چائے تیار ہے۔" اسے اٹھتا دیکھ کر بولی۔

"پھر کبھی سہی۔" وہ لب بھینچ کر سا مسکرائی۔ شیرو جلدی سے باہر نکل گیا، زوبیہ نے اللہ حافظ کہہ کر دروازہ بھیڑ دیا۔

ابھی ثمو نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی کہ ڈرائیونگ ڈور کے شیشے پہ بے صبری سے دستک ہوئی، اس نے کوفت سے سر اٹھا کر دیکھا پھر شیشہ نیچے گرا لیا۔ "میں شیر دل ہوں۔" وہ بے تابی سے بولا، ثمو نے ناسمجھ انداز میں بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "آپ کو جو معلومات چاہئیں میں فراہم کر سکتا ہوں۔" وہ چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہی اس کے وجود سے تناؤ کی کیفیت کم ہونے لگی تو کے اس نے فرنٹ ڈور کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ گلی کا موڑ مڑتی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے شیر دل کو اس کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا، گویا اس منظر کی صورت اس کی آنکھوں میں تیزاب ڈالا گیا تھا۔ اشتعال کی کئی لہروں نے اس کے وجود کو گھیرا تھا، اس نے گاڑی تیزی سے پیچھے کی، اور اندھا دھند بھگا لے گیا۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ ہونے والی دستک اگرچہ مدہم تھی مگر سکوت شب نے کسما کر دستک دینے والی کو حیرانی سے دیکھا۔ وہ اپنی کچھ فائلز بریف کیس میں رکھ رہا تھا، پلٹ کے دیکھا اور ساکت سا رہ گیا۔

"مجھے آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔" وہ ابھی اپنے دیکھنے کو محسوس بھی نہیں کر سکا تھا کہ وہ او جھل ہو گئی، وہ بریف کیس بند کرتا تیزی سے باہر آیا، وہ اس کے کمرے کے سامنے ہی برآمدے کی اوپری سیڑھی پہ بیٹھی تھی۔ وہ ایک مناسب فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"خالہ نے آپ سے میرے رشتے کے متعلق جو بات کی ہے، یوں سمجھیں جیسے آپ نے سنی ہی نہیں۔" وہ بنا تمہید باندھے بولی تو اسے رخ پھیر کے دیکھنا پڑا۔ "مجھے کہیں بھی کسی سے بھی شادی نہیں کرنی، میں امن کو اعلا تعلیم دلواؤں گی وہ ہم دونوں کا سہارا بنے گی۔"

"تو کیا اس کی شادی بھی نہیں کرو گی۔" اسے ایک دم ٹوکنا پڑا، سو سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں، وقت آنے پر شادی ہو جائے گی مگر میں خالہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ پلیز کسی رشتے کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔" وہ ملتجی سی ہو کر بولی۔

"اور جو آپ کی پڑوس سے رشتہ آیا ہے اس کا کیا ہو گا!" حسب اندیشہ اس نے پوچھ ہی لیا۔

"خالہ انہیں خود ہی انکار کر دیں گی۔" وہ انتہائی یقین سے بولی "اب انہیں علم ہے کہ ہم بھی کچھ نہ کچھ

پراپرٹی کی مالک بن چکی ہیں اور دکانوں کا قبضہ اور کرایہ بھی پورا ملتا ہے' اس لیے بیٹے کی منگنی ختم کر کے بھی ادھر رشتہ جوڑنا چاہتی ہیں۔"

"مگر عدن زندگی کی کچھ ترجیحات ہوتی ہیں۔ تم سدا جامن اور نیم کی چھاؤں کو انجوائے نہیں کر سکو گی' اور جب تم پانی پہ چھینٹے اڑانے والی لڑکی نہیں رہو گی تو تمہارا سہارا کون بنے گا۔" اس کے بدن کو جیسے کسی نے جادو کی سوئی چبھو کر سن کر دیا تھا' سب کچھ بے خبری میں ہی ہوا' اس نے نرم آواز میں اور مضبوط لہجے میں آنے والی رتوں کا آئینہ سامنے رکھ دیا تھا۔

"جیسے خدا نے مجھے خالہ کا سہارا بنایا ہے ویسے ہی مجھے بھی خدا سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔" محسوس کی جانے والی خاموشی ان دونوں کے بیچ چپکے سے جم کر بیٹھ گئی۔

"آپ نے جو کچھ بھی ہمارے لیے کیا وہ ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔" دور کسی جگنو پہ نظر ٹکا کر وہ خوابیدہ سی بولی۔

"آج کل کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا' کسی کے پاس فرصت ہی نہیں' اللہ پاک آپ کے ساتھ بھی بہت اچھا کرے گا۔" بے ساختہ چہرہ موڑ کے دیکھا اور پھر اس پر سے نظر نہیں ہٹا سکا' دعا کی خوشبو اور اس پاس بیٹھی لڑکی کی خوشبو' اس کی پلکوں سے لپٹنے لگی' عدن کا بھیگا' نم لہجہ اسے بے قرار سا کر گیا' وہ اسے نظروں کے حصار میں باندھ کے بیٹھا تھا۔ "عدن" کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے۔ "پلیز' کچھ مت کہیے گا۔" اس نے گردن موڑ کے بس آنکھوں سے التجا کی تھی۔

☆ ☆ ☆

حج جیسا مقدس فریضہ ادا کر کے ان دونوں میاں بیوی کو گھر آئے بھی دس دن ہو چکے تھے' تمام دن ملنے ملانے والوں کا تانتا بندھا رہتا' وہ منتظر ہی رہا کہ ماں باز پرس کرے گی یا اس کے خوب لتے لے گی' مگر اس کی جانب سے ہنوز لاپروائی کا عالم تھا جیسے کہ وہ کہیں گیا۔ نہ ماں اس سے دور رہی' مگر اس نے موقع ملتے ہی باپ سے شکوہ کر ڈالا۔

"یار ابو اب اپنے اس چار کنال کے گھر میں میرا دل نہیں لگتا' بس دل کرتا ہے بند گلی کے آخری گھر کا وہ کمرہ کرائے پر لے لوں۔" وہ باپ کے کندھے سے لگ کر آنکھیں موند کے بولا۔ "ہاہاہا" ان کا قہقہہ بڑا جاندار تھا' بھئی ہم تو یہاں سنجیدہ' بردبار سا' اسے سی صاحب چھوڑ کے گئے تھے کیا خبر تھی کہ واپسی میں وہ ایک کالج بوائے کی صورت ملے گا' پوری آنکھیں کھول کے بیٹے کا مسکراتا چہرہ بغور دیکھا' پھر رازداری سے کان میں سرگوشی کی۔

"جس کے لیے وہ کمرا کرائے پہ لینا ہے' اسے ہی اس گھر میں لے آؤ۔" وہ کرنٹ کھا کر ان سے کچھ دور ہوا۔ "آپ کی زوجہ محترمہ ایسا ہونے دیں گی۔" الٹا ان ہی سے سوال کر ڈالا۔ "اب آپ ہی کچھ کریں کیونکہ سارا کیا کرایا آپ کا ہی ہے۔" اس نے باپ کے سر الزام دھرتے ہوئے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"باپ بیٹے میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟" واصفہ نے اندر آتے ہی دونوں کو بغور دیکھا۔

وہ ایک دم بہادر ہوا۔ "آریا یار' کل حنان ماموں کے گھر چکر لگانے کا سوچ رہا تھا تو اگر آپ کو کچھ بھجوانا ہو تو۔" وہ اتنا کہہ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر چپ ہو گیا۔

"میں کیوں بھجواؤں گی' اور اب تمہیں ادھر جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جو ہوا' سو ہوا' سمجھو تم ادھر کبھی رہے ہی نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں درشتی سے بولیں۔ کتنی دیر تک دونوں باپ بیٹے ان سے بیٹھے رہے۔

"کیوں امی' آپ ان کے معاملے میں اتنی کٹھور کیوں ہو جاتی ہیں۔ وہ آپ کی سگی بھتیجیاں ہیں' جنہیں ایک غیر عورت کے لیے آپ نے اپنی زندگی سے نکال پھینکا' آپ خدا کے گھر اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو کر آئی ہیں پھر بھی ان کے خلاف دل کا میل نہیں دھویا' خدا کے گھر پہ تو نگاہ پڑتے ہی انسان نیا جنم لیتا ہے' سبز گنبد کے سامنے ہاتھ اٹھا کر تو بندہ ___ غیروں تک کے لیے دعائیں کرتا ہے اور

آپ اپنی سگی بھتیجوں کے لیے دل سے بغض اور کینہ ختم نہیں کرسکیں ' ہمارے دین میں تو تین دن قطع تعلق کی ممانعت ہے کجا کہ اتنے سال۔" واصفہ پھٹی ' پھٹی آنکھوں سے بیٹے کا چہرہ بے یقینی سے تکنے لگیں ' یہ وہ اذان تو نہیں جو صرف مطلب کی بات کرتا تھا ' بیٹے نے لوہا گرم سمجھا اور مزید ضرب لگائی اور ان کے تمام حالات ماں کے سامنے کھول کر رکھ دیے ' جن کا چہرہ کبھی دھواں تو کبھی شعلہ ہوجاتا "سوچیں آج کے خود غرض دور میں جب سگے ماموں نے یہ کمال دکھائے ہیں تو غیر توان کو بیچ کے کھا جاتے" تازہ تازہ کی گئی عبادت کا اثر تھا کہ دل میں تل برابر گنجائش بنتی محسوس ہوئی۔

"زوسیہ تو مجھے اور ہی کہانیاں سناتی تھی۔"

"سچ پوچھیں تو ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں میں آپ برابر کی شریک ہیں ' آج وہ دل کی بھڑاس خوب نکال رہا تھا۔

"بس کرو اذان۔" آصفہ کا کمزور سا لہجہ ' جگہ ' جگہ سے ٹوٹا۔

"سچ یہی ہے امی ' آپ ان سے رشتے استوار رکھتیں تو انہیں لاوارث سمجھ کر لوگ ان پہ زندگی کو تنگ نہیں کرتے۔" وہ جیسے تھک ہار کے چپ ہوگیا۔

آصفہ نے وزدیدہ نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"ہوگیا نا ' بیٹا میرے سامنے آپ یہی چاہتے تھے۔" شوہر نے بلاوجہ دائیں ' بائیں دیکھا۔

"حنان کی بیوی اچھی عورت نہیں تھی۔ اس نے بھانجیوں کو بھی اپنی راہ چلا لیا۔" وہ بھی بیٹے سے حساب برابر کرنے روبرو آگئیں۔

"اچھی عورتیں کیسی ہوتی ہیں ذرا مجھے تفصیل بتائیں۔" اس کے اندر اشتعال کی لہر اٹھی "جو عورت پچھلے نو سال سے ضرورتاً "بستر سے اٹھتی ہے۔ اسے کونسی بری لت لگی ہوئی ہے" اس کی ماں نے سرعت

سے سر اٹھا کر اسے دیکھا کانوں میں زوسیہ کی آواز ابھری "حادثے کے سال بھر بعد بھلی چنگی ہوگئی تھی۔ سارا دن خود بھی آوارہ گردی کرتی ہے اور لڑکیوں پہ بھی ذرا روک ٹوک نہیں ' اسے مردوں کو پھنسانے کا فن آتا ہے۔" وہ دھیان سے چونکیں "اذان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا" بیٹے پہ بھی پورا یقین تھا۔

"بہت جلد بہت ساری سچائی کھل کر آپ کے سامنے آجائے گی۔" وہ اٹل لہجے میں کہتا وہاں سے اٹھ گیا۔ دونوں میاں بیوی نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا "اگر اتنی اچھی ہوتی تو حنان کی بچیوں سے صرف خدمتیں نہیں کرواتی انہیں صرف پلو سے باندھ کے رکھا ' کسی اسکول کا منہ تک نہیں دیکھا۔" اس نے لاؤنج کا دروازہ عبور کرتے ہوئے یہ آخری بات سنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اذان بھائی نے تو بے وفائی کی حد کردی ' کہتے تھے جلد آیا کروں گا مگر دو ہفتے سے اوپر ہوگئے جو ایک چکر بھی لگایا ہو۔" امن واقعی اداس تھی۔

"ماشاء اللہ اس کے ماں باپ حج کرکے آئے ہیں۔ ابھی تو ملنے ملانے والوں سے ہی فراغت نہیں ہوگی۔" ____ امن کے شکووں پہ مدحت اسے تسلیاں دیتیں۔

"دو ہفتے ' دو ماہ پھر دو سال انتظار کرتی رہنا۔" عدن کا اتنا کہنا اسے آگ بگولا کردیتا ' عدن کے چہرے پہ صدیوں اور زمانوں کا حساب کتاب پڑھ کر اندیشوں میں گھری محبت بند گلی کے آخری گھر کا کواڑ کھول کے راستہ دیکھتی۔

مجمع لگا تھا ' چھٹ بھی گیا تھا ' عدالت لگائی گئی گواہ ' وکیل ' جج ' سب ہی نے اپنی ' اپنی بولیاں بولیں ' مجرموں کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ الزام سنایا گیا ' کوئی اپنی صفائی میں بولا تو کسی نے ہار مان کے جرم تسلیم کرکے گردن جھکا لی ' اذان کو زوسیہ اور منیر میں کچھ فرق محسوس نہیں ہوا تھا ' دونوں ہی موقع پرست ڈھیٹ اور بے شرم ثابت ہوئے۔

سب سے زیادہ ظلم تو آصفہ نے اپنے وجود پہ ہوتا محسوس کیا ' وہ دکھ سے ابھی تک نڈھال تھیں انہوں

نے ایک غلط لڑکی سے دوستی نبھائی' اور اس لڑکی نے دوستی کی آڑ میں خوب دشمنی نبھائی۔

ایک تروتازہ سی صبح کو رشتے کروانے والی ماسی اماں کو کچھ لڑکیوں کی تصویریں دکھانے لائی حنان بھی قریب بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا' اماں کو جو لڑکی پسند آئی' بیٹے کو بھی چپکے سے تصویر تھمادی' نرم و نازک سی مسکراتی آنکھوں والی صباحت پہلی ہی نظر میں اس کے دل کو بھاگئی' سو ان کی طرف سے لڑکی والوں کو رضامندی کا عندیہ بھیج دیا گیا' اماں نے آصفہ کو بھی بلاوا بھیج دیا' جس کے ساتھ سات سال کا اذان بھی تھا۔

بھائی کی شادی کی تاریخ رکھنے کی خبر سن کے بہن نے لڑائی کی کہ وہ تو اپنی سہیلی زوبیہ کو بھابی بنانا چاہتی ہے' اماں بھی سامنے سے ڈٹ گئیں کہ زبان دے دی ہے' انکار نہیں ہو سکتا' کچھ عزیز از جان شوہر نے بھی سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا بجھے دل کے ساتھ ہی سہی مگر بارات کے ساتھ چار گھنٹے کا سفر کر کے وہ بدین سے بھائی کی من پسند بیوی بیاہ لائی' واپسی پہ شوہر کے ساتھ اپنے سسرال چلی گئیں' بھائی کو اس بات کا ہمیشہ قلق رہا کہ اکلوتی بہن نے شادی کی پہلی پہلی رسموں میں شرکت کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

ان کی ہنستی بستی زندگی کو پتا نہیں کس کی بددعا لگی کہ ایک رات بیٹھے بیٹھے عارضے میں مبتلا ہو کر صباحت چل بسی' اماں اور حنان کی اس آنا" فانا" صدمے سے جیسی کمر ٹوٹ گئی' دکھ کے اس کڑے اور بھاری وقت میں بھی آصفہ نے کم ہی میکے کا رخ کیا' ان ہی دنوں زوبیہ نے دوبارہ اپنی خواہش سہیلی کے سامنے رکھی' تو وہ دوڑی دوڑی ماں اور بھائی سے بات کرنے پہنچیں۔ مگر اس بار بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ حنان مدحت سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا' بہن کے سامنے اس نے زوبیہ کی منگنیاں ٹوٹنے کا بھی پول کھولا' مگر اس نے کسی بات پہ اعتبار نہیں کیا۔

"آپا! جوان بہن کی اچانک موت پہ مدحت نیم پاگل ہو چکی ہے۔ بھانجیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹے گی تو ان میں ــــ بہن کی خوشبو پاکر سنبھل جائے گی۔"

اس شام دونوں کی تلخ کلامی گلی کے موڑ تک سنی جاسکتی تھی۔

"زوبیہ ایک فلرٹ اور حاسد لڑکی ہے' کبھی اس سے پوچھنا کہ وہ کن کی گاڑیوں میں گھومتی پھرتی ہے۔" وہ لبوں پہ ہاتھ دھرے ششدر سی دیکھ رہی تھی' بھائی کو نہیں بلکہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی زوبیہ کو' اس کے استعجابیہ انداز پر حنان نے پیچھے مڑ کے دیکھا' وہ جاچکی تھی۔

"اگر تم نے میری دوست کے بجائے اپنی سالی سے بیاہ رچایا تو مجھ سے اپنا رشتہ ختم سمجھو۔" وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی حتمی لہجے میں پھنکاری۔

"اس سے تو میں مر کے بھی شادی نہیں کروں گا۔ تمہیں جو کرنا ہے کرلو۔" ماں نے دہل کر دونوں ضدی بچوں کو دیکھا' انہوں نے سینے میں اٹھتے درد کو ہاتھ سے دبایا' جانتی تھیں کہ بیٹی نے جو کہہ دیا وہ کر دکھائے گی' جب تک ماں زندہ رہی حنان کی غیر موجودگی میں آصفہ دو گھڑی میکے کا چکر لگا جاتی تھی بعد میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس گھر میں مدحت کی موجودگی اسے شدید ترین شکست کا احساس دلاتی۔

آخری بار وہ ناظم آباد اپنے مرے ہوئے بھائی کا آخری دیدار کرنے گئی تھیں۔ سب ہی اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ اسے رونا نہیں آرہا تھا' حالانکہ رونے کا مقام تھا' ان کے اعتبار کی دھجیاں اڑی تھیں کیسے زوبیہ نے ان کا تمسخر اڑاتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔

"اس نے مجھے آوارہ اور بدچلن کہا تھا پھر میں کیسے ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی کہ حنان کی بیٹیاں تو زم زم سے دھلی ہیں۔" ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بھائی کے گھر سے فاصلوں کی خلیج تو کبھی اس کی دوست نے پاٹنے ہی نہیں دی تھی' وہ ان کی سگی بھتیجیاں تھیں جنہیں برباد کرنے میں زوبیہ ہر حد سے گزر گئی تھی' پتا نہیں کہاں کہاں اس نے حنان کی بیٹیوں کو

رسوا نہیں کیا ہوگا۔" ان کا سینہ جلنے لگا۔ اس کے اردگرد مختلف آوازیں ناچنے لگیں۔

"میں تو صرف شیردل سے کچھ معلومات چاہتی تھی، وہ بھی اذان سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے، بلیومی، اس سے زیادہ میرے ارادوں میں کچھ شامل نہیں تھا۔" یہ ثمو کی آواز تھی، روتی بلکتی گڑگڑاتی ہوئی۔ "بھائی پلیز، مما، پاپا کو کچھ مت بتایئے گا۔"

"وہ تو شکر کرو کہ اذان نے مجھے فون پہ بروقت اطلاع دی کہ اس نے شیرو کو ثمو کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا ہے، پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شیرو جیسا شخص، ثمو سے کہاں ٹکرا گیا۔ پھر مجھے اذان نے بتایا کہ وہ زوبیہ سے ان افواہوں کی بازپرس کرنے گیا تھا جو سراسر غلط تھیں۔ وہاں جو منظر اس نے دیکھا، وہ ناقابل برداشت تھا، پھر تھانے میں ہلکی سی مالش ہونے کے بعد ہی شیرو نے اپنی زبان کھول دی۔ اس سارے قصے کو بخوبی انجام تک پہنچانے والی زوبیہ ہی ہے۔"

وائے قسمت دوسری شام زوبیہ نے اذان سے فون پر کہا کہ وہ اسے کچھ دکھانا چاہتی ہیں، ان کے آنے سے قبل ہی اذان نے غفران اور ثمو کو بھی بلا لیا۔ اس تمام معاملے سے بڑوں کو دور رکھا گیا سوائے آصفہ بیگم کے کیونکہ زوبیہ کی اصلیت ان پہ واضح کرنی ناگزیر تھی، انہوں نے ثمو کے لیے گڑھا کھودا تھا، جس میں وہ خود اوندھے منہ گریں، تمام حقیقت کھلنے کے باوجود بھی انہیں پشیمانی نہیں تھی، مگر وہ وہاں زیادہ دیر رکی بھی نہیں تھیں۔

"یہ ہمیشہ ہم سے کہتی رہی ہے کہ آصفہ نے حنان اور میرے معاملے کو یوں ہی منہ دے رکھا تھا، اصل میں تو اپر کلاس میں بیاہ کر وہ اپنے مڈل کلاس میکے والوں سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی تاکہ اس کے حلقہ احباب والے یہ نہ جان سکیں کہ اس کی بیک کیا ہے۔" غصے میں آکر ثمو نے کیسے کیسے راز اگلے تھے۔

"جب سعود نے ہمیں دیکھا تھا تو ہم دونوں ساتھ تھیں۔ اور موسم خراب ہونے کی وجہ سے میں نے ہی اس سے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تھا، پتا نہیں راستے میں آصفہ نے کیسا جادو چلایا کہ مہینہ بھر بعد ہی اپنے اماں، ابا کے ساتھ پرپوزل لے کر پہنچ گیا۔ اف اس قدر جان لیوا انکشافات" اس نے اپنے کانوں پہ ہاتھ دبا کے رکھے، "بعد میں سعود اسے چھیڑتے تھے کہ تمہاری سہیلی نے راستہ بھر مجھ سے اشاروں میں باتیں کیں، وہ خفا ہو جاتیں کہ زوبیہ ایسی نہیں تو کیا وہ سب سچ تھا۔"

"ہوا یہ لکھا کسی کو نظر نہیں آتا، کسی کی تعریف لکھ دو، یا کسی کے عیب "تم میری دوست تھیں" لو میں نے لکھ دیا "اب تم میری دشمن بھی نہیں ہو۔ جینے پہ بھی لکھ لیا۔" اندر آتے اذان نے ماں کی اس حرکت کو تعجب سے دیکھا، پھر کچھ بھی بولے بنا ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"آپ کو دکھ پہنچا ہوگا امی، مجھے معاف کردیں۔" اس نے نرمی سے ماں کا ہاتھ چوما، وہ گردن موڑ کے کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

"تم بھی ثمو کو معاف کردو، یہ اس کی پہلی غلطی تھی۔" وہ بہت آہستہ سے بولیں۔

"میں سمجھتا تھا تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے کہ وہ صحیح اور غلط کی تمیز کرتا ہے، علم اس کی سوچ کے نئے در وا کرتا ہے، ذہن کو وسیع اور دل میں گنجائش کا باعث بنتا ہے۔ مگر مجھے ثمو کے اس عمل سے اتنا تو پتا چل گیا علم محض ڈگری دیتا ہے اور صرف اپنی ذات کے لیے کمائی کا ایک ذریعہ ہے خود بھی کھاؤ پیو اور بال بچوں کو بھی پالو۔" وہ ہنسا۔ "وہ علم فطرت نہیں بدل سکتا، سب سے اعلا چیز انسانیت سے محبت ہے، اپنے معیار کو برقرار رکھنا ہے۔ رشتوں کا احترام اور انہیں آپس میں برتنے کا طریقہ علم نہیں سکھاتا۔ علم سے پیسہ آجاتا ہے، خوشی نہیں وہ کچھ پل کو خاموش ہوا۔" وہ خوش رہنے اور خوش رکھنے کا ہنر جانتی ہے وہ کسی سے انتقام کی خاطر اپنے معیار سے بھی نہیں گر سکتی۔ "اس نے جتنی نرمی سے ماں کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس سے زیادہ

ملائمت سے چوم کر چھوڑ دیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

✡ ✡ ✡

وہ ایک مسئلے سے نمٹ پاتا تو دوسرا کھڑا ہو جاتا' آج کل آفس میں کام کی نوعیت کچھ ایسی ہی تھی۔ ہڑتالز وغیرہ میں کچھ کمی آئی تھی جس کے باعث فیلڈ کا کام ذرا کم ہو گیا تھا اب T.M.A کی حدود کے اندر سڑکوں کی ڈیولپمنٹ کے لیے ٹھیکیداروں کا تانتا بندھا رہتا تو کبھی تحصیلدار لوگوں کی زمینوں کے ریکارڈ اٹھا کر ان کے رقبے مخصوص کرانے کی غرض سے روزانہ چکر لگاتے رہتے' اس وجہ سے چاہنے کے باوجود وہ ناظم آباد نہیں جا پا رہا تھا۔ ابھی لنچ کے لیے وہ اٹھا ہی تھا کہ سیل پہ میسج ٹون ہوئی' وہ میٹنگ میں مصروف تھا تو موبائل سائلنٹ کر دیا تھا۔

"بھائی! آپ کال ریسو کیوں نہیں کر رہے۔" امن کا میسج تھا۔

"او خدا!" لاتعداد کالز تھیں۔ اس نے سائلنٹ پہ سے ہٹایا ہی تھا کہ کال دوبارہ آ گئی۔

"ماموں لوگ آئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں عدن اور جبران کا نکاح ابھی ہو گا۔ آپ پلیز ابھی آ جائیں۔" اتنا کہہ کر حواس باختہ سی امن نے کال ڈراپ کر دی' یہ سن کر اس کے قدموں تلے سے زمین ساری تہوں تک کھسکی تھی۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو اس نے پینتیس منٹ میں کی' وہ گاڑی اڑا کر لایا تھا' صحن میں دس افراد پہ مشتمل مختصر سی بارات پہ وہ اچنتی سی نظر ڈالتا سیدھا مدحت کے پاس آیا۔ منیر صاحب کی اس طرف پشت تھی۔

"یہ سب کیا ہے آنٹی؟" اس کا سنجیدہ لہجہ برف میں لپٹا ہوا تھا۔۔۔ منیر جیسے اچھل کر کھڑا ہوا۔

"اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں برخوردار۔" وہ اونچی آواز میں غرایا۔

"آواز نیچی رکھیں منیر صاحب۔۔۔ یہ گھر ہے آپ مجمعے میں نہیں کھڑے۔" مضبوط لہجے میں کہہ کر اس نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کی طرف شہادت کی انگلی اٹھائی۔

"وہ میرے بیٹے کی منگیتر ہے' ایسے کیسے ہم رشتہ ختم کر دیں۔" "پھر مرد چار شادیاں بھی کر سکتا ہے۔" وہ یقیناً" منیر کی بیوی تھی جو کمر کس کے میدان میں اتری۔ "اور تم ہوتے کون ہو میرے شوہر سے اس طرح جرح کرنے والے' خاندان ہمارا' لڑکی ہماری۔" اس عورت کی آنکھیں مقابل کو بھسم کرنے والے شعلے اگل رہی تھیں۔

"نسیمہ' ختم کرو یہ ڈراما۔" مدحت پہلی بار غصے بھری آواز میں چلائیں۔ "اور اپنی یہ نام نہاد بارات واپس لے جاؤ۔۔۔ جہاں تک اذان کی بات ہے یہ غیر نہیں ان بچیوں کا پھوپھی زاد ہے۔" مدحت کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹتا جا رہا تھا۔

"ارے منیر۔۔۔ تم فون کر کے قاضی کو بلاؤ۔۔۔ میں دیکھوں گی کون روکتا ہے۔" وہ پہلے سے زیادہ کرخت آواز میں بولی۔

"آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی' میں روکوں گا۔" اس کے مضبوط اٹل لہجے پہ ایک لمحے کو جیسے وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا۔

باوقار' بردبار' سچا' حکم صادر کرنے والا' اپنے زور بازو پہ فیصلے بدلوانے والا اس کی پسند ایسی ہی تھی' دروازے سے جڑی عدن آنکھوں سے بہتا نمکین پانی ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے لگی۔

"ہماری بات کو سمجھو بیٹا' ان بچیوں کے اپنے ہم دونوں گھرانے ہی ہیں' کسی بھی تیسرے گھر والے لالچی ہو سکتے ہیں' مخلص نہیں۔ کل کو لڑکیوں سے سب کچھ ہتھیا کر' انہیں خالی ہاتھ اور بے سہارا چھوڑنے والوں کی کمی نہیں' کئی اپنے بن کر ان کی زندگیوں میں آئیں گے' مگر حقیقت یہی ہے کہ دولت کے لیے آنے والوں کو لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی۔" منیر کی بیوی نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا "جبران شادی شدہ ضرور ہے مگر مال ہتھیا کر لڑکی کو بے سہارا نہیں کرے گا کھائے گا۔ بھی تو مل بانٹ کے' باقی رہ گئے تم' تو سیدھی بات بھی ہے

تم ایک اعلا خاندان کے چشم و چراغ ہو۔۔۔ چار دن ہمدردی دکھا کر اپنی راہ ہو لو گے پھر۔" وہ مسکرا کر سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتی اسے عجب سی آزمائش میں ڈال گئیں۔

"میں اگر اعلا خاندان کا ہوں تو عدن بھی گری پڑی نہیں۔۔۔ اور میں ہمدردی جتا کر اپنی راہ پہ واپس نہیں جاؤں گا' آپ کو اعتبار نہیں تو ابھی قاضی کو بلائیں۔ میں ابھی اسی وقت عدن سے نکاح کے لیے تیار ہوں۔" وہ بہت پرسکون ہو کر بار عب انداز میں اپنا فیصلہ سنا گیا۔۔۔ وہاں اتنی خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔

"مگر مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔" اس خاموشی کو عدن کی فیصلہ کن سرد آواز نے توڑا۔ "دونوں باراتیں واپس جاسکتی ہیں۔" وہ سب کو حیرت کے بوجھ تلے دباتی اس مہمان پہ ایک شکوہ کناں نظر ڈالتی واپس مڑ گئی۔۔۔ جس کا خوب صورت چہرہ ایک پل کو متغیر ہوا تھا۔

"اور ہاں ایک بات اور۔" اس نے دوسرے پل اپنا رخ روشن دکھایا۔ "میں اپنے باپ کے گھر رہ رہی ہوں' سڑک پہ نہیں کہ کوئی بھی میرا ہاتھ تھام سکتا ہے۔" اس بار اس نے اندر جا کر دروازہ کھٹاک سے بند کیا تھا۔

"لو جی' آپ تو کہتے تھے لڑکی کے منہ میں زبان ہی نہیں۔ بے زبان گائے جیسی ہے۔۔۔ دیکھ لیا کیسے اس بے زبان گائے نے کسی کے آگے سوکھی گھاس بھی نہیں ڈالی' توبہ' توبہ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ارے مدحت' تف ہے تمہاری تربیت پہ۔" وہ ہاتھ نچاتی۔۔۔ لہراتی سب کو اٹھنے کا اشارہ کرتی بہ آواز بلند بھرے کر رہی تھی۔

"واہ منیر صاحب! یہاں لا کر آپ نے ہمیں یہ کمال دکھانے تھے' ابھی تو چلیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" منیر نے فاتحہ پڑھتی نظروں سے بہن کو دیکھا۔ جو پتھر کا بت بنی بیٹھی تھیں۔ اگلے دو منٹ میں گھر خالی ہو گیا۔ اذان کا دل ابھی تک بے یقینی کی منزلوں پہ کھڑا تھا۔

"آنٹی مجھے بھی اجازت دیجیے۔" وہ پھیکا سا مسکرایا' مگر مدحت مسکرا بھی نہ سکیں' بس نگاہیں اٹھا کر اس کے چہرے پہ بے یقینی کے اترے سایوں کو خالی' خالی آنکھوں سے تکا۔

"بھائی پھر آئیں گے ناں؟" امن کسی کمرے سے نکل کر تیزی سے اس کے سامنے آئی' اور امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں گڑیا' کیونکہ میں نے ابھی رشتے ختم نہیں کیے۔" وہ اس کا رخسار تھپتھپا کر نرمی سے گویا ہوا۔۔۔ مگر قدم اٹھانے سے پہلے اس نے اس دشمن جاں کے کمرے کے بند دروازے کو ایک عزم سے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

بیٹے کی زبانی تمام ماجرا سننے کے بعد آصفہ بڑی خوب صورتی سے مسکرائیں۔

"اس وقت اسے ایسا ہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔"

"لیجیے بھرے مجمع میں آپ کے خوبرو کماؤ بیٹے کو آپ کی بھتیجی نے بے دردی سے ٹھکرا دیا' اور آپ ہنس رہی ہیں۔" وہ مصنوعی خفگی سے منہ پھلا کر بولا۔

"کیوں کہ اچھی لڑکیاں بنا لڑکے کے گھر والوں کے شادیاں نہیں کرتیں۔" آج مسکراہٹ آصفہ کے ہونٹوں سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

"چلیں آپ نے مان لیا وہ اچھی لڑکی ہے۔" کسی خوش کن احساس کے تحت اس کا لہجہ گداز سا ہوا۔

"مان تو لیا ہے مگر' باقی آدھا فیصلہ اسے دیکھ کر کروں گی۔" نقلی سنجیدگی طاری کر کے بیٹے کو ڈرانا چاہا۔

"چلیے بیگم صاحبہ گاڑی میں مٹھائی اور پھل وغیرہ رکھوا دیے ہیں۔" مسعود صاحب کی خوشی بھی دیدنی تھی۔

"امی! آدھا فیصلہ اب ابو کو کرنے دیجیے گا۔" مسعود صاحب کو شرارتی نظروں سے دیکھا' جنہوں نے نا سمجھی سے ماں بیٹے کے ہنستے چہروں کو دیکھا' "میں نے آنٹی اور امن سے فون پہ بات کر لی ہے' مگر یہ نہیں بتایا

کہ آپ آج ہی آرہے ہیں۔"

"تو پھر بات کیا کی ہے۔" آصفہ نے رک کر اس کے جھکتے چہرے پہ نظر ٹکائی۔

"تمام معاملہ رازداری میں رکھنا ہے۔ میں بھی اس سے تھوڑا سا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے سے جگنو اڑنے لگے۔ "باقی کا معاملہ میں سنبھال لوں گا" منگنی کی تاریخ لے کر اور شادی کی تاریخ دے کر آئیے گا۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے ہی قہقہے کو انجوائے کیا تو وہ دونوں بھی سر جھٹک کر ہنس دیے۔

☼ ☼ ☼

اتنے برسوں کے بعد ان راستوں پہ سفر کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ گھر سے کچھ فاصلے پہ اترے۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ نومبر کی نرم ہلکی دھوپ نے بھیگی آنکھوں والی عورت کو حیرت سے دیکھا۔

"یہی تو وقت تھا پھوپھی کو نیچا دکھانے کا۔ عدن نے بہت غلط کیا۔" کسی عورت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گئیں۔

"تمہارا ان سے کوئی مقابلہ نہیں، اس گھر کے دروازے ہمیشہ ان کے لیے کھلے ہیں۔ اگر میرے ماں باپ نہیں تو میں کسی اور سے اس کے ماں باپ کیوں چھینوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ پھوپھو کے دل میں ہمارے لیے اور نفرت بڑھتی۔" اس سے زیادہ وہ سن نہیں سکتی تھیں۔ سو کھلا دروازہ دھکیلتی اندر چلی آئیں۔ ان سب نے انہیں آنکھیں مل کے دیکھا، مگر وہ مجسم حقیقت تھیں۔ انہوں نے باہیں وا کیں تو دونوں بہنوں نے بھی گلے لگنے میں ذرا تاخیر نہیں کی تھی۔ مدحت سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی اس نے۔ نند کے جڑے ہاتھوں کو دھیرے سے چوم لیا۔ نہ انہوں نے کچھ شکوہ کیا نہ آصفہ کو صفائی دینے کی ضرورت پیش آئی۔

بہت شفیق اور مہربان سے مسعود صاحب میں اذان کی جھلک واضح تھی۔ عدن چائے بنانے کے لیے گئی تو انہوں نے اپنا دامن مدحت کے سامنے پھیلایا۔

مسکراتی آنکھوں سمیت سرو قد نازک سی عدن اپنی ماں کی کاپی تھی۔

"آپا! شرمندہ مت کریں" آپ کی اپنی بچی ہے۔" تشکر سے ان کی آواز تک بھیگ گئی کبھی کبھی خوشی سے بھی حلق میں پھندے پڑ جاتے ہیں۔

"اذان جیسا بیٹا خدا سب کا نصیب کرے۔" "نہیں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"ارے! ابھی تک روشن دانوں میں کبوتروں کا بسیرا ہے۔" حیرت سے دیکھا انہیں اماں کی صلواتیں یاد آئیں جو وہ ان کبوتروں کو سناتی تھی۔ ایک پل یادوں کے آنسو چھلکے تو دوسرے پل ہنس دیں۔ روئی کے گالوں جیسی سفید نرم دھوپ میں مزیدار چائے کا لطف اٹھایا گیا۔ چپکے سے منگنی کا دن بھی مقرر کر لیا۔

"بندہ ذرا سی ہمت دکھائے تو ٹوٹے رشتے پھر سے استوار ہو جاتے ہیں۔" مسعود صاحب نے بیوی کی طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پچھتاوے ان کے حصے میں آئے تھے، مگر شوہر کی کاوش اور نیک نیتی پہ توصیفی نگاہ ان پہ ڈالی۔

"تمہاری کوشش اپنی جگہ مسعود، مگر میں نے خدا کے گھر میں ہاتھ اٹھا کر اپنے لیے رب سے ہدایت مانگی تھی۔ دل سے میل دھل جانے کی دعا کی تھی۔ یہ ایسی دعا ہے جب کوئی اپنے لیے رب کریم سے مانگتا ہے تو قبولیت کی گھڑی آنے میں دیر نہیں لگتی بشرطیکہ کوئی مانگے تو نا۔"

☼ ☼ ☼

محبت ہے، بہت سرکش بلا کا حافظہ اس کا
جسے ہم بھول جاتے ہیں یہ اس کو یاد رکھتی ہے

آج کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ امن اور خالہ کی تیاریاں عروج پر تھیں جن کے بیچ اسے بھی گھسیٹ لیا جاتا۔

"اف اس قدر بے رنگ، پھیکا سا چہرہ۔ وہ کیا سمجھے گا کہ تم اسے ٹھکرا کے پچھتا رہی ہو۔" رات کو جب وہ فیشل کے لیے گئی تو اسے بھی زبردستی ساتھ لے لیا۔

ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ امنہ آگئی۔

"پہلے عدن کو مہندی لگاؤ۔"

"ارے۔ نن۔ نہیں میں کیوں۔" ہاتھ پیچھے کرلیے۔

"اتنی سج دھج سے تیار ہو کر جاؤ کہ صاف ظاہر ہو کہ اسے ریجیکٹ کرنے میں دل کا فیصلہ بھی شامل تھا۔"

وہ ذرا رعب سے بولی۔ یہ فیصلہ دل کا تو ہر گز نہیں تھا مگر خودداری اور اپنی ذات کو معتبر رکھنا دل سے زیادہ ضروری تھا۔ آنکھوں میں اتری نمی کو جھپک جھپک کے پیچھے دھکیلا۔

"اس قدر اسٹائلش پنک سوٹ۔ ارے یہ کب خریدا۔"

"بس خرید لیا۔" وہ منہ پھیر کے مسکرائیں "ایک تم ہی بے خبر رہتا۔ ڈرائیور کہاں رہ گیا ہم تو تیار بیٹھے ہیں۔" مدحت کے چہرے پہ سکون و اطمینان جھلک رہا تھا مگر وہ بھانجی کے چہرے کو بھی دھیان سے دیکھ لیتیں۔

"امن اسے بتایا تھا ناکہ اس کی دو ٹائیاں اور کچھ موزے ادھر رہ گئے ہیں۔" بلاوجہ ہی ہاتھوں میں اترے رنگوں کو دیکھا۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ نہیں آیا تھا حالانکہ اس نے بہن سے بارہا میسج بھجوائے تھے۔

"ہاں بھئی۔ آج کل مہنگائی کے دور میں دونوں چیزیں خریدنا کافی مشکل ہے۔" خالہ کی آنکھیں تک مسکرانے لگیں تب ہی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ امن خالہ کو سہارا دے کر سیڑھیاں اتروانے لگی تو وہ بھی تیزی سے ان کے دوسری جانب آگئی۔ امن نے گیٹ سے باہر جھانکا۔

"گاڑی میں تو مٹھائی کی ٹوکریاں پڑی ہیں۔ تین افراد کے لیے جگہ نہیں۔" مڑ کے بہن کو جواب دیا۔

"ڈرائیور تمہیں دوبارہ لینے آجائے گا۔" مسکراہٹ دبا کر کہا۔ "پھوپھو کی ہدایت تھی کہ ڈرامے میں جھول نہ رہے' دونوں ہماری طرف آجانا پھر اکٹھے اسے سرپرائز دیں گے۔ گاڑی چلی گئی تو وہ دروازہ بند کر کے سست قدموں سے واپس مڑی۔ چڑیا خوشی سے چوں' چوں کرتی پھدک کے دوسری شاخ پہ بیٹھی۔

"اتنی خوش کیوں ہو۔" خفگی سے اسے ڈپٹا۔ دوبارہ دستک ہوئی۔

"مجھے تو پہلی محبت کے بچھڑ جانے کا غم بھی نہیں منانے دیا جارہا۔"

"آپ یہاں۔" حیرانی سے دیکھا۔

"جی میں۔" اپنی ادھر رہ جانے والی چیزیں لینے آیا ہوں۔" اسے ایک طرف ہٹاتا اندر چلا آیا۔ "گھر میں مل نہیں رہیں۔ بازاروں میں آج کل شارٹ ہیں۔" انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"ایسا کیونکر ہو سکتا ہے' اتنی کامن چیزیں اور شارٹ ہوں" الجھ کر اسے دیکھا۔

"اس قدر تو اترے میسجز آرہے تھے لگ رہا تھا عالمی مارکیٹ سے بھی یہ چیزیں شارٹ ہو چکی ہیں۔ اب صرف اس گھر میں مل سکتی ہیں۔" دونوں آگے پیچھے ہی برآمدے میں آئے۔ خاصا محظوظ سا ہو کر بڑے دھیان سے اسے دیکھا۔

"آپ یہیں ٹھہریں۔" اس کے زیر استعمال کمرے میں گئی۔ جالی کا دروازہ کھول کر وہ بھی اندر آگیا۔ عقبی صحن میں کھلنے والی دیوار گیر کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ وہ گرل کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ لیں۔" نظر اٹھائے بنا' ہاتھ میں پکڑی ٹائیاں دکھائیں' مگر سامنے کھڑے شخص نے ان کے بجائے ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے سٹپٹا کے تحیر سے اسے دیکھا۔ آنکھوں کی سطح ہلکی گیلی تھی۔ وہی اسیر کر دینے والا پل

"یہ سمیرا احمید کا ناول نہیں۔ اس لیے رومانٹک سچویشن کری ایٹ کی جاسکتی ہے۔" شوخ ہوتی گہری نگاہیں اسی پہ مرکوز تھیں۔ مہندی کی خوشبو لبوں تک لے جانے کے سوچ تھی۔ ہاتھ چھڑانے کے لیے کافی زور لگایا پھر ناقابل فہم انداز میں اسے دیکھا۔

"غور سے دیکھو کیا میں گنجا ہوں۔ ٹھگنا بھی نہیں۔

نہ ناک لمبی ہے نہ توند نکلی ہوئی۔ رنگ بھی بہت صاف ہے۔ پوچھ سکتا ہوں پھر مجھے کس وجہ سے بے دردی سے ٹھکرا دیا۔" دھیما لہجہ بھاری پن لیے تھا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کچلنے لگی۔

"یہاں سے واپس گیا' ہر طرف صحرا ہی نظر آئے۔ سمندر تو یہیں رہ گیا تھا۔ آتی ہوئی لہروں پہ جاتی ہوئی لڑکی بھی پورے کراچی میں کہیں نظر نہیں آئی تو واپس یہیں آنا پڑا۔" وہ خجل سی ہو کر اس کے بوٹوں کی تکنے لگی۔ آج اس نے ڈارک براؤن شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور اس کا چہرا الگ ہی کہانیاں سنا رہا تھا۔

"اب آپ پلیز جائیں۔" آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔

"پہلے مجھے ٹھکرانے کی وجہ بتاؤ۔" ذرا سختی سے اس کی نم پڑتی ہتھیلی کو بھینچا۔

"میں آپ کے والدین کی مرضی کے بغیر نامعتبر ہو کر آپ کی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی تھی کہ شرمندگی سے میری نگاہیں تاعمر جھکی رہتیں۔ میں سر اٹھا کر جینے کی قائل ہوں۔ ایک وجہ اور بھی ہے۔" وہ کچھ دیر خاموش ہوئی۔ "میں خود کو تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار نہیں کرتی۔ بس میرا آپ کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔" وہ ایک دم جھنجلا کر بولی۔ تو وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"تم ہاں تو کرو۔ میں اپنے والدین کی رضامندی سے تمہیں اپنا سکتا ہوں۔" اس کی آنچ دیتی خواہش پہ عدن کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں۔

"آج آپ کی منگنی ہے جس سے ہونی ہے اسی سے کریں۔ میں اپنی وجہ سے کسی لڑکی کو دکھ نہیں دے سکتی۔" وہ رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"سب کا خیال ہے۔ بس میرا اور اپنا نہیں۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

"جو ہمیں تکلیف ہو رہی ہے' اس کا مداوا کیسے ہو گا؟" وہ اس کی طرف جھک کر نرمی سے بولا۔

"مجھے کچھ نہیں ہو رہا۔" وہ وہاں سے کھسک کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"عدن! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" وہ انتہائی وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ باہر جانے والے دروازے میں جم کر کھڑا تھا۔ اسے ہمایوں سعید یاد آیا۔ جب اس کی منگنی کسی سے طے ہے تو اقرار کرنے کا فائدہ۔ مہوش حیات بننے میں کیا حرج ہے۔ دل کے اندر گانٹھیں سی پڑیں۔

"مگر میں تم سے محبت نہیں کرتی۔" ارے یہ کیا۔ دل کو قرار سا آگیا۔ اس نے لپک کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں کسی کہانی کا ہیرو نہیں کہ تم مجھے تھپڑ لگاؤ گی یا پھر دھکا دو گی۔" معنی خیزی سے کہتا وہ کچھ قریب ہوا۔

"کیونکہ حقیقی زندگی میں ہیروئنیں اتنی بدلحاظ نہیں ہوتیں۔" خوشی سے لہجہ بوجھل سا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر تھا۔

"اصل میں ہیروئنیں اتنی ہی کٹھور ہوتی ہیں۔" عدن نے باہر ہونے والا شور اور آوازیں محسوس کرلی تھیں جب کہ وہ کمرے سے باہر حق دق کھڑا تھا۔

"بس بہت ڈراما ہو گیا۔ اب دلہن کو لے آئیں۔" یہ آواز تو پھوپھو کی ہے ان تمام لوگوں کے بجائے اگر اس وقت دو بکرے کہیں سے آجاتے میری تو قسمت جاگ جاتی۔" اس کی آنکھیں ہی نہیں آواز بھی لو دینے لگی۔ وہ ایک دم گلابی سی ہو کر آگے بڑھی اور دو دھموکے اس کے کندھوں پر جڑے سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔

"ارے... ارے... یہ کیا۔ دیکھا امن میں کہتی تھی نا کہ آج کل لڑکیاں محبت کی باتیں چھوڑ کر دہشت گردی پہ اتر آتی ہیں۔" مدحت نے کھلکھلا کر سب کو تائیدی نظروں سے دیکھا۔ اس گھر کی بوسیدہ دیواروں کو محبت نے رنگ دیا تھا۔ غرغوں 'سفید اور سرمئی کبوتروں نے سرشار سا ہو کر پرواز کی۔

"پتا نہیں یہ جوگی ہیں فقیر کے اللہ والے 'نہ خود اونگھتے ہیں نہ چین سے آرام کرنے دیتے ہیں۔" آمنہ کو گھر کے ہر کونے سے ماں کی آواز سنائی دی۔

"میں ان پرندوں کی بیٹ صاف کر کر کے ہلکان ہوتی ہوں اور یہ مہارانی اڑتے پرندوں کو دانے ڈال ڈال کر عادی کر دیتی ہیں۔" حنان کا قہقہہ گماں کی بڑبڑاہٹیں' ساس کی دہائیوں پہ کیسے مسعود نے سرگوشی کی تھی۔

"ہمیں بھی ایسے ہی دانہ ڈال کر پھانس لیا۔"

"اف! کہیں اماں نے سن تو نہیں لیا۔" ویسے ہی گھبرا کے سامنے دیکھا۔ شوہر کی مسکراتی نظروں سے ٹکراؤ ہوا۔ یادیں زمانے گزر جانے کے بعد بھی کونوں کھدروں سے نکل کر اسے چھونے لگیں۔

"آپا! اگر کوئی بات ہے تو میں کہتا ہوں اپنی سہیلی کو آنکھیں کھول کر دیکھا کرو۔ کیا خبر سچائی نظر آجائے۔" حنان دھیرے سے اس کے پاس سے اٹھا۔ اس نے بے دھیانی میں اپنا پہلو ٹٹولا جو بالکل خالی تھا۔ کاش وہ اس کی باتوں کا اعتبار کر لیتی۔ ذرا جو پرکھتی توسچ سامنے آجاتا۔ تو کیا زوبیہ حنان کی فیملی سے بدلہ لینے کے لیے اتنے سال کسی آسیب کی طرح اس کی ذات سے چمٹی رہی۔

"امی سوچ لیجیے۔" اذان کی آواز سے اک سحر سا ٹوٹا۔ یادوں نے یکلخت چہرہ چھپایا۔ "صرف بہو نہیں پورا سمندر ساتھ جائے گا۔" اس نے بائیں طرف سے گردن کو ہلکے سے مسلا اور روشن دانتوں سے نظریں ہٹا کر سوالیہ انداز سے بیٹے کو دیکھا۔ جواب امن کی طرف سے خاصا تفصیل سے دیا گیا۔ عدن نے شرمندہ ہو کر پہلو پہ بدلا۔

"مجھے منظور ہے۔" آصفہ کی آواز سب کے قہقہوں میں دب گئی۔ اس نے ڈھیروں دعاؤں سے نواز کر اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔ اذان کی جگر جگر کرتی آنکھیں اسی پہ مرکوز تھیں۔ جب بیٹے کو مسعود نے انگوٹھی پہنائی تو اسے حنان کی جگہ پا کر سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اچھے وقتوں کو بلاوجہ کی انا میں باندھ کر رکھ دیں اور پھر بھول جائیں تو اچھی یادیں بھی پچھتاوؤں کے ناگ بن کر ڈستی ہیں۔ میں اپنے ساتھ صرف ایک عمر لے کر جاؤں گی جس میں صرف ہم جئیں گے۔ اس نے اپنے پہلو میں بیٹھے اذان کو ذرا سا دیکھا۔

"میں نے دنیا کو اور کتابوں کو بالکل بھی نہیں پڑھا بس دنیا کو بے رحم اور خود غرضی کی حالت میں دیکھا اور برتا ہے' مگر ان ڈائجسٹوں میں زندگی کو برتتی' قریب سے دیکھتی' پڑھی لکھی رائٹرز کو بہت گہرائی تک جا کر پڑھا ہے کہ خوشی فراہم کرنا اور خوش رہنا ہی اصل زندگی ہے۔ بیچ میں جو سب بھی ہوتا ہے وہ دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔ نیت کی سچائی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔" اس نے خالہ کے تکیے کے ساتھ پڑے ڈائجسٹ کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ تب ہی ایک ہنس مکھ فاختہ اوپری سیڑھی پہ آبیٹھی۔ اس نے آبخوروں میں پانی بھرنے والی گھونسلوں سے گرے تنکوں کو سمیٹ کے رکھنے والی' ہر موسم میں شاخوں کو ہرا بھرا دیکھنے کی دعا کرنے والی لڑکی کو اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کے ہمراہ ہمیشہ سر سبز رہنے کی دعا کی تھی۔

فائزہ رابعہ

روزانہ کی طرح جوں ہی کلاک نے ایک بجایا، گاڑی کا ہارن بجا، گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور عبدالحفیظ صاحب اندر داخل ہوئے۔

"بابا آگئے.... بابا آگئے۔" مغیث، منیب سب کام چھوڑ کر ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں گھس گئے۔ شادی کی رات دو گھنٹے تیرہ منٹ اور سات سیکنڈ عبدالحفیظ صاحب نے بیوی کو اپنی منظم زندگی کی خصوصیات گنوائی تھیں اور اس منظم زندگی کا دارومدار (ان کے بقول) صرف اور صرف وقت کی پابندی میں تھا۔ سو وہ دن اور آج کا دن نصرت ماسی گھڑی کی سوئیوں کی طرح گھومتی تھیں۔

ٹھیک ایک بجے عبدالحفیظ صاحب اسپتال سے آتے، کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگ چکا ہوتا تھا۔ صرف پھلکے بنانے کا کام باقی ہوتا۔ جو سربراہ کے آتے ہی توے سے اترنا شروع ہو جاتے۔ ایک بج کر دس منٹ پر کھانا لگ چکا ہوتا اور گھر کے سب افراد جمع ہوتے۔ بھوک لگی ہو یا نہ لگی ہو گھر کے سب افراد کو کھانے کی میز پر موجود ہونا چاہیے۔ سو سب ہی حاضر ہوتے، کھانا خاموشی سے کھایا جاتا بعد میں سویٹ ڈش کے طور پر کوئی نہ کوئی پھل پیش کیا جاتا، جسے کھانے کے دوران گپ شپ ہوتی۔ مسئلے مسائل پیش کیے جاتے اور حل ڈھونڈا جاتا جو بالعموم بیس سے بائیس منٹ کے دورانیے میں حل ہو جاتا۔

مغیث، منیب نے عبدالحفیظ صاحب کو آتے دیکھا تو فوراً" ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر پہنچے۔ عبدالحفیظ صاحب جونہی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سوں سوں کرکے ناک سکیڑتے ہوئے کچھ سونگھا اور بولے۔

"لگتا ہے حافظ آباد سے آئے ہیں۔"

کمرے میں موجود افراد کھلکھلا کر ہنسے۔

"واہ بابا جان، کیا کہنے آپ کی اس حس شناخت کے" آپ کو کیسے پتا چلا؟" ان کی اکلوتی بیٹی ثوبیہ بولی۔

"وہ ایسے کہ تیا آئی ہوں یا نفرو، مجھے ان کے کپڑوں سے ہی حافظ آباد کے چاولوں کی خوشبو آجاتی ہے۔" عبدالحفیظ صاحب معصومیت سے بولے۔

دروازہ کھلا اور نفرو اندر داخل ہوئی۔ "ماموں میاں! السلام علیکم!"

ماموں میاں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، منہ سے وعلیکم السلام کہا اور بولے۔ "کب اور کس کے ساتھ آئی ہو۔" ان کے چہرے پر بڑی دل نواز مسکراہٹ تھی جیسے کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات کے وقت....

"ابھی بیس پچیس منٹ پہلے رضی بھائی کے ساتھ.... ان کی ہاؤس جاب کل سے شروع ہے نا۔" ماموں میاں کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے نفرو نے جواب دیا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ اب آئی ہو تو چار چھ دن رہ کے ہی جانا۔" انہوں نے لقمہ توڑنے سے پہلے کہا۔

"نہیں، ماموں میاں، مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔" نفرو نے وضاحت کی۔ ماموں میاں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ جونہی کھانا ختم ہوا، ہاتھ نیپکن سے صاف کیے، انگوروں کا گچھا سامنے رکھتے ہوئے ماموں میاں نے نفرو کو مخاطب کیا۔

"آج ہی کیوں، کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟"

"پڑوس والے ذوالفقار صاحب کی نواسی کی شادی ہے۔" نفرو نے فوری واپسی کی وجہ بتائی۔

"چھوڑو بھئی.... کیا رکھا ہے شادیوں میں شرکت

ے ہاں ہمارا پرسوں پہاڑی علاقوں کا پروگرام ہے کاغان، ناران، مالم جبہ کا۔۔۔ ساتھ چلو، عیش کرو گی۔" اب کے ممانی نصرت نے بھی لب کشائی کی۔ نفو اگر ان کے میاں کی چہیتی تھی تو وہ بھی برابر کی دعوے دار تھیں۔

"ممانی جان! وہاں تو گرم کپڑوں، بند جوتوں، جاگرز وغیرہ کی ضرورت ہو گی، میں تو صرف یہ سوٹ لائی ہوں جو پہن رکھا ہے۔" نفو نے نہ جانے کی اپنی تئیں معقول وجہ پیش کی۔

"یہ تو محض بہانہ ہے، میرا تمہارا ایک ہی سائز ہے، جوتوں کا بھی اور کپڑوں کا بھی۔۔۔ ہاں نہ جانا چاہو تو الگ بات ہے۔" ماموں میاں کی اکلوتی بیٹی ثوبیہ نے ناک

چڑھاتے ہوئے کہا۔ ثوبیہ عمر میں تو نفرو سے دو سال تین مہینے بڑی تھی، مگر نصرت مامی کی طرح اس کا قد بھی نسبتاً کم تھا۔ نفرو کے برابر۔۔۔ برابر۔۔۔

"نہیں ثوبیہ باجی! بہانہ نہیں اصل میں۔۔۔"

کھی کھی کھی۔۔۔ قل قل قل کر کے چاروں طرف سے قہقہے ابل پڑے۔ نفرو حیرانی سے آنکھیں پھاڑے سب کو دیکھ رہی تھی۔

"بری بات، میری نجورانی کو کوئی نہ تنگ کرے۔" ماموں میاں نے سب کو سرزنش کی۔

"بھئی نفرو! بات یہ ہے کہ آج صبح ناشتا کے بعد ہم سب اپنی بحث اور ڈسکشن کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ جب کوئی شخص اپنی گفتگو میں۔۔۔ اگر، مگر، چونکہ، چنانچہ یا "در اصل" میں کا لفظ شروع ہی میں استعمال کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص کہیں نہ کہیں بات چھپا رہا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا!" نفرو کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی، پھر بولی۔ "لیکن میری بات سو فیصد درست ہے، پھر بھی۔۔۔ اصل میں سے ہی شروع ہو گی کہ پچھلی دفعہ میں دو دن کے لیے لاہور آئی اور بارہ دن کے بعد حافظ آباد پہنچی تو گھر والوں نے مجھے دیکھتے ہی پتا ہے کیا کہا۔"

اللہ جانے کہاں سے ساون بھادوں کی بارش اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے برسنے لگی۔ ٹپ ٹپ ٹپ آنسو اس کے رخساروں پر گرے۔ اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔ "ممانی جان! آپا اور رضی بھائی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "اے لڑکی! کیوں گھسی جارہی ہو ہمارے گھر میں۔۔۔ کون ہو تم؟" ابا کہنے لگے۔ "دیکھی دیکھی سی شکل ہے، شاید لاہور میں کہیں دیکھا ہو۔"

سارے پھر ۔۔۔ کورس کی شکل میں ہنسے۔

بات نفرو کی سو فیصد درست تھی۔ وہ جب بھی لاہور آئی، بے چاری بری طرح سے ہی پھنسی۔۔۔ کبھی ممانی جان کا اچانک پتے کا آپریشن ہوا، عالیہ کے ایف ایس سی کے پیپرز کے بعد انٹری ٹیسٹ چل رہے تھے تو تیمار داری کے لیے اسے رکنا پڑا۔ کبھی مغیث، منیب کے سالانہ امتحانات ہیں، ممانی جان کی سگی خالہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اب ان دونوں کو کون قابو کر کے بٹھائے اور امتحانات کی تیاری کروائے۔ ممانی جان تو تین چار دن کے لیے رحیم یار خان روانہ ہو گئیں اور اتفاقاً" وہاں پر موجود نفرو کو ہی رکنا پڑا۔

پچھلا داغ دار ریکارڈ اس کے سامنے تھا۔ بھلا وہ کیسے مان جاتی لاہور میں قیام بڑھانے پر۔۔۔ رضی بھائی اور ابا نے کلاس لے کر اس کے ہی کان کھینچنا تھے۔ اسے کشمکش میں دیکھ کر نصرت ممانی نے کہا۔

"تم ٹینشن نہ لو، آپا سے اور نجیب سے میں خود ہی بات کر لوں گی۔ کچھ نہیں کہیں گی وہ، تمہیں تو ویسے ہی پہاڑی علاقوں سے عشق ہے، اچھی بات ہے، چھٹیاں بھی ہیں، ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

نفرو خاموش رہی اور "خاموشی نیم رضا" کے مقولے کو سامنے رکھ کر سب نے خوشی سے نعرہ لگایا اور اسے مبارک باد دی۔

ماموں میاں ہوں یا نفرو بھانجی، دونوں کی عادات و اطوار ایک جیسے تھے۔ دونوں کی ایک دوسرے میں جان تھی۔ ماموں نے بھی بھانجی پر محبتوں کے خزانے نچھاور کیے اور اتنے کیے کہ مغیث، منیب یہ کہتے پائے جاتے کہ "ابا جان ہم سے زیادہ ثوبیہ آپی اور نفرو آپی سے پیار کرتے ہیں۔" نفرو کی محبتوں کا تو انداز ہی جدا تھا۔ اس لیے گھر میں تھوڑا سا اضافی کام ہوتا، لاہور سے حافظ آباد ایک فون کال پر نفرو دوڑی چلی آتی۔ اب تو خیر سے یہ بھی مشہور ہو چکا تھا کہ ماموں میاں کے گھر میں کسی کو چھینک بھی آجائے نفرو دوڑی چلی جاتی ہے۔

ماموں، بھانجی میں یہ محبت شروع سے ہی تھی۔ دونوں کا ذوق ایک جیسا تھا۔ دونوں کی پسند ناپسند ایک جیسی تھی۔ صورت سے بھی ثوبیہ سے زیادہ نفرو ان کی بیٹی لگتی۔ دونوں ادب کے رسیا تھے۔ ماموں ملازمت اور ڈاکٹری مصروفیات کی وجہ سے ادب اور ادبی شوق کو وقت نہ دے پاتے۔ ان کی ادبی مصروفیات محض اچھی ادبی کتب، ادبی جرائد و رسائل کے مطالعہ، ادیبوں کے بارے میں معلومات تک ہی محدود تھیں۔ یہ معلومات

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اتنی اپ ٹو ڈیٹ رہتیں کہ نفرو انہیں ادیبوں کی ڈکشنری کہتی۔ ہاں کبھی کبھار ڈائری کے صفحات پر اپنے دل کی باتیں ضرور رقم کیا کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں اسکول اور میڈیکل کالج کے وہ مجلے جن میں ان کی تحریریں شائع ہوئی تھیں' ابھی تک ان کی تعلیمی اسناد کے ساتھ محفوظ تھے۔

البتہ نفرو کا ادبی شوق مطالعے سے اوپر تھا۔ اس کی چھوٹی موٹی تحریریں' خط' تبصرے تو ہفتہ وار میگزین میں تواتر سے شائع ہوتے ہی تھے۔ انعامی مقابلہ جات میں بھی اس کی تحریروں کو اول' دوم' سوم انعام مل ہی جاتا تھا۔ نفرو ماموں میاں کی تہ دل سے ممنون تھی۔ یہ سب ان کی توجہ اور حوصلہ افزائی کی بنا پر ہی ممکن ہوا تھا۔ مارکیٹ میں کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی یا کہیں اشتہار پڑھتے تو کتاب چوبیس گھنٹے کے اندر ماموں میاں کے ہاتھوں میں ہوتی۔ بس۔ پھر وہ کتاب ہوتی اور ماموں بھانجی کی ڈسکشن' لمبی گفتگو۔ فقرے خط کشید کیے جاتے' ان کے نئے نئے معنی ڈھونڈے جاتے۔ یہ ان دونوں کے ادبی ذوق اور روحانی تسکین کے لیے بہت عمدہ ٹانک ہوتا۔ چار دن ماموں میاں کے ہاں رہ کر واپس حافظ آباد پہنچنے والی نفرو' ہفتوں اس ملاقات اور گفتگو کے حصار میں رہتی۔

شروع شروع میں ان دونوں کی گفتگو ممانی کے کچھ پلے نہ پڑتی۔ پھر وہ اس کی عادی ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ بھی آیا وہ نہ صرف ان کی لمبی لمبی ادبی گفتگو میں حصہ لیتی تھیں' بلکہ موسموں کی مناسبت سے ڈرائی فروٹ' چائے کافی' کیوبز کی شکل میں کاٹے ہوئے ٹھنڈے یخ خربوزے کے علاوہ اسی قسم کے لوازمات پیش کرتیں۔

نفرو کی معصومیت اور سادہ حسن نے بہت جلد ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اب ثوبیہ کی طرح وہ اس پر بھی پورا دھیان دیتیں۔ کبھی کبابوں کا مسالا بنوا رہی ہیں' کبھی قیمے کی ترپائی سکھا رہی ہیں۔ نفرو نے فرنچ فرائز اور فرنچ ٹوسٹ پہلی مرتبہ کھائے بھی ماموں کے گھر میں تھے اور بنائے بھی ان ہی کے گھر میں تھے۔

اب ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ نفرو ماموں میاں کے ہاں آئے اور ماموں میاں اسے لیے بغیر پہاڑی علاقوں پر چلے جائیں۔ جب ماموں نے ساتھ چلنے پر بے حد اصرار کیا تو نفرو نے ان سے سوال کیا۔

"ماموں میاں اگر میں اتفاق سے لاہور نہ آتی تو آپ کو میرے بغیر ہی جانا تھا نا؟"

ماموں میاں نے اسے دیکھا اور جواب دیا۔ "پگلی! ہم تمہیں حافظ آباد سے لے لیتے۔"

اب پگلی کے ہونٹوں پر بارہ من وزنی قفل لگ گیا' آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ ماموں میاں کی سات بھانجیاں (تین بہنوں سے) اور بھی تھیں' اب یہ نفرو کی خوش نصیبی نہیں تو کیا تھی کہ ماموں کی شفقت اور محبت کی بلا شرکت غیرے وہ حق دار تھی۔

پہاڑی علاقوں میں گزرے سات دن اس کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ جس پہاڑ کو دیکھا جس پتھریا چٹان پر قدم رکھا' اس کی داستان بنا ڈالی۔ "دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔" پر تو دونوں ماموں' بھانجی نے پورا دن لگایا۔ پہاڑی علاقوں پر ہی کیا موقوف' چھانگا مانگا کے جنگلات ہوں یا میانوالی کے بنجر پہاڑ' جنوبی پنجاب کے میدان یا کراچی کا ساحل سمندر۔۔۔ قدرت کا ایک ایک معجزہ جہاں اسے قدرت سے قریب کرتا' وہیں ماموں میاں کی محبت کا سمندر دل میں ٹھاٹیں مارنے لگتا۔

آٹھویں دن جب وہ لاہور کی طرف روانہ ہوئے تو سارا راستہ اس نے ماموں میاں کو منانے کی کوشش کی کہ مجھے حافظ آباد ڈراپ کرتے جائیں۔ اپیا ناراض ہوں گی۔ ابا ڈانٹیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ماموں نے اسے حافظ آباد سے بائی پاس لاہور لے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسی پر کاربند رہے اور وہ منہ بسورتی واپس لاہور پہنچ گئی۔ لاہور میں خوب آرام کر کے' اپنی منوں ٹنوں وزنی تھکن اتار کے وہ حافظ آباد پہنچی تو گھر سے نکلے پورے چودہ دن ہو چکے تھے۔

گھر میں پہنچ کر وہی چال بے ڈھنگی' جو پہلے تھی' چلنا

تھی۔ صبح سویرے اٹھنا‘ آٹا گوندھنا‘ ناشتے کے برتن دھونا‘ ان کے قصبہ میں گرلز کالج نہیں تھا۔ لہٰذا پرائیویٹ بی اے کے پیپرز کی تیاری۔ اخبار کا ابا کو شوق نہ تھا۔ ٹی وی پر اماں نے صرف خبروں والے چینل کی اجازت دی تھی۔ کام تو سارے دل جمعی سے ہی کرتی مگر بولائی بولائی پھرتی۔ کانوں میں ماموں ممانی کے فقروں کی ٹیپ ہی چلتی رہتی۔ بس ان ہی چکروں اور دنیاداری کے گورکھ دھندوں میں اپیا کی اور پھر ثوبیہ کی شادی بھی ہوگئی۔ اپیا حاصل پور والوں کو پیاری ہوگئیں اور ثوبیہ آپی اپنے ماموں زاد بھائی بلال کی دلہن بن کر کینیڈا شفٹ ہوگئیں۔ اپنے والدین کے پاس تو وہ موجود تھی‘ اسے ماموں ممانی کی تنہائی کا دکھ کھائے جاتا۔ مغیث اور منیب بھی باپ کی طرح ایف ایس سی پری میڈیکل کے طالب علم تھے اور سننے میں یہی آیا کہ سرتوڑ کوشش کررہے ہیں میرٹ پر آنے کے لیے۔

اس کی زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ وہ گزشتہ سات آٹھ ماہ سے ماموں میاں سے ملنے نہ جاسکی تھی۔ بالعموم ماموں میاں ہی اسے ہفتہ دس دن کے بعد فون کرتے تو اس کا چھوٹے بچوں کی طرح جی مچلتا کہ کاش فون کے ریسیور سے نکل کے ماموں کے پاس پہنچ جاؤں۔ مگر ایسا ہونا کہاں ممکن تھا۔

ممکن تو بہت سی باتیں نہیں تھیں۔ جیسے ماموں میاں کی دبی دبی خواہش تھی کہ نفرو کی شادی کے لیے وہ خود اچھا سا لڑکا ڈھونڈیں سبزی‘ پھل اور کپڑا بیچنے والوں میں واحد ادبی ذوق رکھنے والی حساس نرم و نازک سی نفرو تنہا نہ رہ جائے۔ ماموں میاں نے کوشش بھی کی لیکن وہی ہوا جس کا خوف نفرو کے سینے میں پنجے گاڑے ہوئے تھا۔ نفرو کے پڑوس میں شادی تھی۔ اپیا اور ثوبی آپی کی شادی کے بعد تنہا رہنے کی اتنی عادی ہوچکی تھی کہ ماں کے کہنے کے باوجود نہ مانی۔ ابا اور بھائی نے اسے شادی میں شرکت پر آمادہ کیا۔ بے دلی سے عام سا جوڑا پہن کر بغیر ہار سنگھار کیے وہ چلی گئی۔ دلہن کی رخصتی سے پہلے ہی وہ گھر بھی واپس آگئی۔ اسی آدھ گھنٹے کی شرکت نے اس کے مقدر کا سنجوگ حیدر آباد سے جوڑ دیا۔ باراتیوں سے ابا کے خوش گوار تعلقات پیدا ہوئے۔ ان کی خواتین کو نفرو پسند بھی آگئی۔ اس کے چہرے پر تیزی طراری کی بجائے سادگی اور بھولپن تھا۔ انہیں ایسی ہی لڑکی درکار تھی۔

اس سے پوچھا گیا۔ رشتہ کے حق میں ہزار دلائل دیے گئے۔ لیکن دلائل نفرو کے پاس بھی تھے۔ نہ ماننے کے ایک ہزار ایک دلائل۔ دبے دبے لفظوں میں اس نے ماں سے کہا کہ ”پوچھ تو لیں جس سے میرا عمر بھر کا ناتا جوڑ رہی ہیں وہ کیا کرتا ہے۔ کیا مشاغل ہیں۔ کیا ذوق ہے؟“ رضی بھائی ٹھٹھا مار کر ہنسے۔

”ابا نے سب معلومات لی ہیں۔ ماں باپ کبھی کسی کا برا نہیں سوچتے‘ رہی بات کچھ کرنے کی‘ اس کی حیدر آباد لطیف آباد میں سب سے مشہور جیولری شاپ ہے۔ زرگر۔ سونا بنانے اور بیچنے والے۔ ارے سونے میں تولی جاؤ گی۔“

”بھائی! ماموں سے تو مشورہ کرلیں۔“

وہ ایک لمحہ کے لیے چپ ہوئے‘ پھر اچھل کر بولے۔ ”ان کی ثوبیہ بھی تو کاروباری لوگوں میں گئی ہے۔“

”لیکن بھائی میرا اور ثوبی کا مزاج بہت مختلف ہے۔“

”چھوڑو پرے ہو۔ عورتوں کے اپنے اپنے گھروں میں جاکر ایک جیسے مزاج ہوجاتے ہیں۔“ اماں خدا جانے کب سے دروازے کی اوٹ سے ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔ جھٹ سے بولیں۔

”خود ہی بتاؤ‘ کیا تمہارے ماموں کا ممانی سے مزاج ملتا تھا۔ ادب کی الف‘ ب سے واقف نہیں تھی لیکن آج اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب اور زبان پر ادیبوں‘ شاعروں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اچھی بیویاں اپنے شوہروں کی پسند میں لاشعوری طور پر غیر محسوس طریقے سے ڈھل جاتی ہیں۔

بیٹا! بہت سلجھے‘ کھاتے پیتے‘ گھرانے کے لوگ ہیں۔ فیملی بھی بہت بڑی نہیں۔ باقی خوشیاں ہم مزاج لوگوں کا ہی مقدر ہوتیں‘ تو دنیا کے سارے بے ادب

دکھی اور ادیب خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے۔"

نفرو ویسے ہی کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ اب مزید کیا کہتی؟ کیا اپیا سے ان کے رشتہ کے بارے میں رائے لی گئی تھی؟ قطعی نہیں' اس لیے اس نے بھی چپ کا تالا منہ پر لگالیا۔ اک چپ سو سکھ۔

چار چھ مہینوں بعد شادی بھی ہو گئی۔ شادی میں ماموں میاں آئے۔ نقد رقم' تحائف اور اس کی پسند کی کتابوں سے لدے پھندے۔۔۔ ممانی بھی آئیں' مگر ثوبیہ ملک سے باہر اور مغیث' منیب کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ وہ نہ آسکے۔

ماموں میاں کی گود میں سر رکھ کے وہ بہت روئی' مچلی' چہکی۔

"ماموں میاں ادیب کے لفظوں کی قسمت تو دنیا والے سونے کے ترازو میں تول سکتے ہیں۔ ہیرے جواہرات سے زیادہ قیمتی قرار دے سکتے ہیں' لیکن کیا ایک سنار بھی ان لفظوں کی قیمت لگا سکتا ہے۔ اس کے لیے تو گاہک کا ہر لفظ سونے چاندی سے زیادہ قیمتی ہوتا ہوگا۔"

"جھلی۔۔۔" ماموں میاں نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے سر پر چپت لگائی۔

"خواہ مخواہ کی اوٹ پٹانگ باتیں مت سوچو۔ فضول خیالات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ خود سوچو اگر میری شادی کے وقت تمہاری ممانی یہ ارشاد فرماتیں کہ لڑکے کے منہ سے تو پایوڈین اور ادویات کی بدبو آتی ہے۔ پھر۔ اچھی اچھی باتیں سوچو' اللہ سے دعا مانگو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو گا۔"

بات نفرو کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ماموں' ممانی نے بیسیوں طرح کے ٹوٹکے بتائے سسرال میں رہنے کے۔ جن میں سے کچھ اس کی سمجھ میں آئے اور کچھ اس کے سر سے گزر گئے۔ حق مہر کے آٹھ تولہ زیور اور باراتیوں کے والہانہ استقبال کے ساتھ حافظ آباد سے حیدر آباد روانہ ہو گئی۔ چلتے چلتے ماموں میاں اپنا منہ اس کے کان کے پاس کرکے بولے۔

"اور بھی سب کچھ اسی طرح اچھا اچھا ہو گا' جیسے حیدر آباد اور حافظ آباد کا آخری لفظ ایک ہی ہے۔ تسلی رکھو' تمہارا دولہا مجھے سلیم النفس انسان لگا ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

سو خدشات اور ہزاروں امید بھری آرزوؤں کے ساتھ وہ سسرال پہنچ گئی۔ کھلا گھر' سندھی لب و لہجے میں بات کرنے والے لوگ۔۔۔ خوب آؤ بھگت سے اس کا استقبال ہوا۔ ولیمہ پورے ہفتے بعد تھا' تاکہ نفرو کے میکے والے اپنا کام اور پھیلاوا سمیٹ کے تھکن اتار کے بچی کی خوشی میں شامل ہو سکیں۔

نفرو کے دل کو یہ بات اچھی بھی لگی اور بری بھی۔ اچھی اس لیے کہ اس کے میکے والوں کا بہرحال یہ احترام کا ایک انداز تھا۔ بری اس لیے کہ اجنبی لوگوں میں ایک ہفتہ گزارنا۔ اس ہفتے میں ماموں میاں اور ممانی کے بھی دو فون آئے۔ ادھر ادھر کی خوب باتیں کیں۔ ولیمہ پر آنے کی خوش خبری سنائی۔ لیکن چاہنے کے باوجود وہ ولیمہ پر نہ پہنچ سکے۔

اسٹیج پر دلہن بن کر بھی ہال میں نظر دوڑائی کہ شاید ماموں میاں نظر آجائیں۔ امی نے ان کی طبیعت کی خرابی کا بتایا۔ وہ چپ ہو گئی۔ دن گزرتے گئے۔ شروع کے ایک' ڈیڑھ سال میں تو اس کے آنے بہانے سے میکے کے چکر لگتے ہی رہے۔ کبھی جہاز پر اکیلے سوار ہو جاتی اور کبھی میاں کے ساتھ مسافرت اختیار کرتی۔

ہر بندہ بشر کی طرح اس کا میاں بھی خوبیوں' خامیوں کا مجموعہ تھا۔ خوبیوں پر نظر رکھنے والا' مقولہ ماموں نے اتنا ازبر کروادیا تھا کہ خامیوں پر بس وہ خاموش ہو جاتی۔ ناگواری کی لہر بھی ماتھے پر نمودار ہوتی' مگر ردعمل سے دور ہی رہتی۔ جب اس کی گود میں زوبیہ آئی تو آخری دفعہ میکے میں جی بھر کے پورے دو ماہ رہ کر آئی۔ ان دو مہینوں میں ہر چیز بدل گئی۔ رضی بھائی انگلینڈ چلے گئے۔ اپیا تینوں بچوں میں مگن۔۔۔ ماموں میاں آئے۔ تحائف سے لدے پھندے۔۔۔ سوٹ' جیولری' کیک' پھل' کتاب بھی تھی جیسے آتے ہوئے خریدی گئی ہو۔ نئی نکور۔۔۔ ماموں میاں اسے تھکے

تھکے سے لگے۔ نفرو کے دل کو کچھ ہوا۔

"ماموں میاں آپ کو کیا ہوا ہے۔"

"کچھ نہیں ' ٹھیک ہوں۔" وہ مختصراً" بولے ' حالانکہ نفرو کے لیے ان کا تکیہ کلام ہی "ٹنگی" تھا۔

"ماموں میاں آپ بیمار تو نہیں؟" نفرو کو وہ بہت اداس اور تنہا دکھائی دے رہے تھے۔ گو کہ اداس اور تنہائی کی کوئی معقول وجہ تو نہیں تھی۔ تو بیہ اپنے گھر اور بچوں میں مگن ' خوش باش۔ مغیث اور منیب ڈاکٹر بن چکے تھے۔ بلکہ اسے پتا چلا تھا کہ ممانی نے ان کے لیے دو سگی بہنوں کا رشتہ بھی پسند کرلیا ہے۔ پچھلے ماہ ماموں ' ممانی حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے تھے۔ بظاہر اتنی اداسی یا کم گوئی کی وجہ تو نہیں تھی ' پھر بھی اس کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ ہوئی۔

"ماموں آپ سچ سچ بتائیں ' آپ کو کوئی ٹینشن تو نہیں۔"

"ہے نا جھلی۔ ٹینشن کا ہے کی۔ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ سرمایہ بہت کم اور سفر بہت کٹھن۔۔۔" ماموں میاں کی آواز بوجھل ہو گئی۔ "ایک ہی دفعہ اللہ زندگی عطا کرتا ہے ' پتا نہیں میں نے اسے نعمت سمجھ کر استعمال کیا یا بے کار سمجھ کر ضائع کر دیا۔ اللہ ہی جانے "کل کلاں میرے ساتھ کیا معاملہ ہو۔"

"ماموں۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ ہونق بن کر پوچھنے لگی۔

"ہاں تو دنیا کون سا دل لگانے کی جگہ ہے۔ بہت دن رہ لیے ' بہت عیش کر لیے ' اب اللہ آگے بھی ایسا ہی معاملہ کر دے تو اس کی رحمت ہے۔ خیر تم سناؤ بچی کا نام کس نے رکھا؟" انہوں نے جھرجھری لے کر موضوع تبدیل کیا۔

"زوبیہ۔ اس کے بابا نے رکھا ہے۔" وہ جوش سے بتانے لگی۔

ماموں مسکرائے۔۔۔ "دیکھا! تم کتنی خوشی سے بتا رہی ہو ' حالانکہ یہ نام تم نے نہیں رکھا۔ اچھا بتاؤ خوش تو ہونا؟" انہوں نے سوال کیا۔

"خوش۔۔۔ اگر خوشی بغیر مانگے خوراک ' لباس اور آسائشیں ملنے کا نام ہے تو میں بہت خوش ' بلکہ خوش حال ہوں۔" نفرو نے جواب دیا۔

ماموں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"جھلیے۔۔۔ اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟ تم ان عورتوں سے پوچھو جن کو اپنی عزت نفس کا سودا کر کے مانگنے پر بھی یہ آسائشیں نہیں ملتیں۔ تم اتنی ناشکری تو نہیں تھیں؟" پریشانی سے انہوں نے کہا۔

"ماموں میں ناشکری نہیں کر رہی ' ہمارے شوق اور مشاغل مختلف ہیں ان کو صرف اسپورٹس چینل پسند ہیں ' ادبی کتب کیا ' انہوں نے تو کبھی اخبار بھی نہیں پڑھا۔" دکھ سے نفرو نے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" ماموں نے فوراً" پلٹ کے کہا۔

"اگر سب میاں بیوی کے شوق ایک جیسے ہو جائیں۔ پسند ناپسند ایک جیسی ہو جائے تو دنیا جمود اور یکسانیت کا شکار ہو جائے۔ عادات میں فرق ہوتا تو ہے بس انہیں سمجھنے کے لیے کچھ وقت چاہیے ہوتا ہے ' سمجھیں۔۔۔" ماموں میاں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" نفرو نے آہستہ سے کہا اور ادھر ادھر کے موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔

اس کی زندگی کے یہ بہترین دن رات تھے۔ اس کے ماں ' باپ کی وہ محبت جو دل کے کونوں کھدروں میں چھپی ہوئی تھی نواسی کی پیدائش کے بعد ایک دم سے جاگ اٹھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ رزق کی طرح محبتیں بھی اللہ نے مقدر میں لکھی ہوئی ہیں۔ بڑی بھاگوان تھی جس کی آمد پر اسے ہر طرف سے محبتیں مل رہی تھیں۔ حاصل پور سے آپی آئیں ' رضی بھائی روزانہ اسکائپ پر موجود ہوتے۔

دو ماہ کے قیام کے بعد جب وہ حیدر آباد روانہ ہوئی تو اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی رخصتی آج ہوئی ہے۔ سارا محلہ اسے الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔ ابا بار بار آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ امی بڑے حوصلے سے تھیں ' لیکن بچی کو گود میں لے کر ان کی آنکھوں کا پانی جذبات لٹاتا زوبیہ کے چہرے پر گرنے لگا۔ گھر سے نکلتے

نکلتے اس نے ماموں میاں کو فون کیا۔

"نہیں بھئی لاہور ایئرپورٹ سے روانگی ہے، گھر راستہ میں ہے اور تم ایسے ہی گزر جاؤ گی؟"

"ماموں میاں فلائٹ میں بہت تھوڑا وقت ہے۔" وہ بولی۔

"کوئی ایسی فکر کی بات نہیں... تم بس شکل دکھا دو۔ بلکہ نعیم سے میری بات کرواؤ۔" نفو نے موبائل میاں کو پکڑا دیا۔

لاہور ایئرپورٹ سے پہلے صرف پانچ منٹ کے لیے وہ لوگ ماموں میاں کی طرف گئے۔ نفو کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ ماموں ان دس بارہ دنوں میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔

"ماموں آپ نے اپنا چیک اپ کروایا ہے؟" وہ تشویش سے بولی۔

"کوئی بات نہیں، چھوٹی موٹی بیماریاں تو چلتی رہتی ہیں۔ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا جو ملنے آ گئے۔" ممانی جی بہت ضعیف سی لگیں۔ مغیث، منیب بھی موجود تھے۔ بس لمحوں کی ملاقات تھی، لیکن ایک گھنٹے پانچ منٹ کے سفر میں وہ اپنے میاں کے کانوں میں اپنے اور ماموں کے مثالی تعلقات کا تذکرہ کرتی رہی۔

"تم اچھی ہو نا کوئی پہیلی نہ کزن، ماموں کو دوست بنا لیا۔" میاں نے اس طویل تذکرے پر تبصرہ کیا۔

"ماموں نامہ..." ختم ہوا تو سفر بھی اختتام کے قریب تھا۔

ماموں کی یادیں جھلمل جھلمل کرتے عکس کی طرح اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں جم چکی تھیں۔ ہاں ماموں کا اداس چہرہ اسے پریشان کرتا تو وہ کاموں میں مگن ہو جاتی۔

☆ ☆ ☆
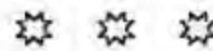
چند ماہ کے بعد مغیث اور منیب کی شادی کا کارڈ بھی اسے مل گیا۔ دل تو چاہتا تھا پر لگا کے اڑ کے چلی جائے، مگر اس کے گھریلو حالات کی بنا پر یہ ممکن نہ تھا۔ نفو نے دل پسند تحائف خریدے، حیدر آبادی چوڑیوں کے سیٹ لیے اور مغیث، منیب کی سلامی کے ساتھ بجھوا دیے۔ شادی کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ویڈیو کال کے ذریعہ EMO پر ثوبیہ نے دکھا دیا۔ شادی کے فنکشن کی تصاویر اپیا نے واٹس ایپ کے ذریعہ بھیج دیں۔ مبارک باد کے کئی فون اس نے کیے، کبھی بارات کی روانگی کے وقت مغیث، منیب سے بات ہو رہی ہے تو کبھی نکاح کے فارم پہ سائن کرتی دلہنوں کو دیکھ کر ان کی اماں کو مبارک باد دی جا رہی ہے۔ ولیمہ کے لیے ہال میں قدم ماموں نے بعد میں رکھا پہلے اس نے مبارک باد کی کال کی۔ شریک نہ ہو سکنے کے احساس کو کم کرنے کے لیے نفو نے کیا کیا نہ جتن کیے... پھر بھی ٹھنڈی آہیں ہی اس کے ہونٹوں پر جم کے بیٹھی رہیں۔ اس کا میاں۔ نہ چاہتے ہوئے کھانے پر ہوٹل میں لے گیا۔ واپسی پر آئس کریم پارلر سے آئس کریم کھلائی۔ اس کی پسند کی شاپنگ کروائی۔ مگر اس کا احساس محرومی بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو لاکھ سمجھانا چاہا، مگر سمجھ نہ سکی کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر چچا خالد کے بیٹے کی شادی، خالہ نزہت کی دو بیٹیوں کی شادی بھی تو پچھلے مہینے ہی ہوئی ہے، وہ کون سا ان میں شریک ہو سکی تھی۔ شاید ان سے اس کا تعلق اس نوعیت کا نہیں تھا، جیسے ماموں میاں اور ان کی اولاد سے تھا...

اس سوچ نے چند سیکنڈ کے لیے ہی اسے مطمئن کیا، پھر پہلے سے بھی بدتر صورت حال... میں بھی چلی جاتی تو کتنا اچھا تھا... نے اسے رلا ہی دیا۔ اسے روتا دیکھ کر نعیم کو بہت تپ چڑھی۔

"اتنا کچھ تو کیا ہے، پھر بھی تم وہی ہو کے بھر رہی ہو۔ نسیم آپا بھی تو میری شادی پر کینیڈا سے نہیں پہنچ سکی تھیں۔ اپنے سسر کے انتقال پر وہ تیسرے دن پہنچ سکی تھیں۔ انہوں نے تو ایسے ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ جیسے تم کر رہی ہو؟"

میاں کی بات سن کر نفو چپ ہو گئی۔ کیا کیا حیلے بہانے نہ کیے، مگر دل تھا کہ دھڑ دھڑ کرتا پسلیوں سے نکلا جا رہا تھا۔

"اللہ خیر کرے۔" وہ متوحش ہو کر بولی۔ وہ تین دن اسی حالت میں گزرے۔۔۔۔ نعیم نے ہی بالآخر اس کے سامنے تجویز رکھی "کیوں نہ ہم تمہارے ماموں کی فیملی کی دعوت کریں۔ یہاں سے کراچی لے چلیں گے۔ سمندر کا نظارہ بھی ہو گا۔ وہیں "دو دریا" پر کھانے کی دعوت بھی ہو جائے گی۔"

"ارے واہ!" نفرو خوش ہو گئی۔ "میں صبح ہی ماموں میاں کو فون کر کے دعوت دیتی ہوں اس وقت تو وہ سو چکے ہوں گے۔" اس نے کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

دونوں مطمئن ہو گئے۔ لیکن اگلی صبح بڑی ہولناک تھی۔ نفرو کی ساس کا پاؤں واش روم سے باہر آتے ہوئے پھسل گیا تھا۔ ٹانگ دو جگہ سے فریکچر ہو چکی تھی۔ شوگر اور بلڈ پریشر دونوں اوپر سے اوپر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بڑی خوف ناک صبح تھی۔ کھایا نہ پیا۔ ساس کی چیخنے چلانے کی آواز نے مانو ٹانگوں سے ہی جان نکال دی۔ اگلے چار پانچ دن بڑی خواری اور مشقت میں گزرے۔ ایک ٹیسٹ دوسرا ٹیسٹ رہی سہی کسر ڈاکٹروں کی ہڑتال نے پوری کر دی۔ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال کا سفر جتنا تکلیف دہ تھا' اس سے کہیں زیادہ گھر کے حالات تھے۔ جٹھانی کا بچہ ان ہی حالات میں پیدا ہوا۔ ان کے دو بچے 'نفرو کی بیٹی' کام والی ماسی کا بغیر بتائے کام چھوڑ جانا۔

ایسے میں جب سب حوصلہ چھوڑ بیٹھے تھے' ماموں میاں کا ماضی میں دیا لیکچر یاد آ گیا' جس کا لب لباب یہ تھا کہ اللہ نے ہر غم اور پریشانی کے بعد نہیں' ساتھ آسانی رکھی ہوئی ہے اور اللہ نے ایک عسر کے ساتھ دو یسر رکھے ہوئے ہیں۔ غم اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر انسان غم کو یاد رکھتا ہے' خوشی کا وقت بھلا دیتا ہے۔ غم آزمائش ہوتی ہے یا سزا۔۔۔ آزمائش ہے تو خیریت کے ساتھ نکلنے کی اور سزا ہے تو رب رحیم سے معافی مانگو۔

نفرو کی پلکوں سے آنسو تارے موتی بن کر ٹوٹ پڑے۔

"ماموں میاں آپ کتنے اچھے ہیں۔" اس نے دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے اندر نئی توانائی محسوس کی۔

جتنے دن نفرو کی ساس اسپتال میں رہیں' وہ دل و جان سے ان کی خدمت میں مصروف رہی۔ میکہ سے کئی لوگوں کا خبر گیری کے لیے فون آیا' مگر اس کے پاس تفصیل سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اسپتال سے ساس کو چھٹی ملی۔ بخیر و عافیت پلاسٹر والی ٹانگ کے ساتھ گھر پہنچیں تو نفرو حواسوں میں آئی۔ کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے اس نے ایسے ہی سوچا۔ بھلا کس کس کا فون آیا تھا ساس کا حال پوچھنے کے لیے۔ امی' ابا' آپا' بہنوئی' رضی بھائی' خالہ۔۔۔ چچا۔۔۔ ماموں کا فون آیا تھا یا نہیں۔۔۔ کچھ یاد نہیں آیا۔۔۔ اس نے تین چار دن سے تکیے کے نیچے پڑے موبائل پر یوں ہی نظر ڈالی۔

"چالیس میسج۔۔۔۔" اس نے واٹس ایپ کھول کر نظر ڈالی۔۔۔ ایک ہی خبر۔۔۔ ایک ہی اطلاع۔۔۔ خبر تھی یا بجلی جو اس کے وجود کو راکھ کر گئی۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔۔" وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔ ماموں میاں اور ممانی جان ٹریفک کے حادثے میں اس مکروہ دنیا سے پردہ کر چکے تھے۔ اس نے دوبارہ اپنے پیاروں کے میسج پر نظر ڈالی۔ ماموں میاں اور ممانی کو تو قبر میں گئے بھی چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو چکا تھا۔

"ماموں۔۔۔ میرے پیارے ماموں۔۔۔ اللہ آپ سے راضی ہو۔" آنسو تمام حد بندیاں توڑ کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

اسے کسی نے خبر نہ دی کہ شامل تو ہو نہیں سکتی۔ رات گئے تک رو' رو کر اس کا سر بوجھل اور دماغ سن ہو چکا تھا۔ گھر کے سب افراد کو ماموں اور ممانی کی رحلت کا علم تھا' مگر اسے لاعلم رکھا تھا۔ جب علم ہو گیا تو اس کی حالت سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

رات بستر پر لیٹ کر آنکھ لگی ہی تھی کہ جھٹکے سے پھر کھل گئی۔ وہ ساری رات خواب میں ماموں کی انگلی

تھا۔ گلیوں بازاروں میں پھرتی رہی۔ کبھی کسی ادبی جریدے کے مضامین پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ کبھی کسی ادیب کو موضوع گفتگو بنایا ہوا ہے۔ اگلے کئی دن اسی عالم میں گزرے۔

کیا زندگی اسی کو کہتے ہیں؟ اس کی سسکی نکل جاتی۔ کام کرتے کرتے، نماز کے دوران، دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ تصور میں ماموں میاں کو سامنے بٹھا کر خوب شکوہ کرتی۔

"ماموں میاں! ابھی تو میں آپ کو دعوت پر بلانے کا پروگرام بنا رہی تھی، آپ نے اور ہی پروگرام بنا لیا۔"

"ماموں میاں! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ابھی تو مغیث، نیب کی دلہنوں کے ہاتھ کی مہندی کا رنگ بھی نہیں چھوٹا تھا۔"

"ماموں میاں آپ نے اچھا نہیں کیا بغیر ملاقات کے چلے گئے۔"

امی، ثوبیہ، مغیث، نیب سب سے اس نے گھنٹوں بات کی۔ ماموں کی یادوں کو تازہ کیا۔ پھر وہی ہوا زخموں پر کھرنڈ آگیا۔ جیسے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین کی کہ ہر مصیبت اور دکھ پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھو۔ پورے قرآن میں رحمت، ہدایت اور سکینت کو اللہ نے اتنی سی بات سے مشروط کر دیا ہے۔ وہ بھی یاد آنے پر انا للہ ہی پڑھ لیتی۔ جانے والے واپس تو نہیں آسکتے، لیکن ان کے لیے مغفرت کی دعا تو کی جاسکتی ہے۔ بس یہی وہ ہتھیار اس کے پاس تھے جو وہ صدمہ کی کٹھن وادی سے گزر گئی اور اب اس دکھ کے سامنے اسے ساس کی ٹانگ کا فریکچر، کام والی ماسی کا بندوبست نہ ہونا، پہلو ٹھی کی چھوٹی بچی کا ساتھ۔ جٹھانی کے ہاں بچی کی ولادت جیسے کاموں کے پہاڑ ہلکے لگتے۔

ماموں میاں کے جانے کے بعد اس نے ایک کام باقاعدگی سے شروع کر دیا جو پہلے وقفے سے ہوتا تھا اور وہ یہ کہ رات سونے سے پہلے روزانہ ماں کو فون کرتی اور ادھر ادھر کی باتوں میں ماں کا دل لگاتی۔ جانے والوں کی خوبیاں بیان کرتی۔ اس کے دماغ سے یہی بات چپک کے رہ گئی تھی کہ کہیں اللہ نہ کرے ماموں ممانی کی طرح امی بھی اچانک نہ رخصت ہو جائیں۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ جاتی۔ کل تک جو کام ازحد ضروری لگتے تھے سب غیر ضروری لگنے لگے۔ ضروری کام تو بس یہی تھا، ماں کو روزانہ فون کرنا۔ اپنی موجودگی کا احساس دلانا۔ جب دو ماہ کے بعد ساس کی ٹانگ کا پلاستر اترا تو ٹانگ میں کچھ نقص باقی تھا۔ اس کی نند نسیم باجی بھی کینیڈا سے بچوں کے ہمراہ آرہی تھیں۔ وہ حافظ آباد گئی ضرور، مگر ہوا کے جھونکے کی طرح، بس دو چار دن کے لیے۔ تیسرے چوتھے دن اس کی واپسی بھی ہو گئی۔ مغیث، نیب بیویوں کے ہمراہ عمرے پر گئے ہوئے تھے۔ ثوبیہ آپی واپس کینیڈا جا چکی تھیں۔ ماموں میاں کے ہاں کس کے پاس جاتی۔ بس حسرت لے کر واپس آگئی۔

تھی اک شخص کے تصور سے
مگر اب وہ رعنائی خیال کہاں

یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ ماموں کی ساری یادیں ہی زندگی سے بھرپور اور خوش گوار تھیں۔ جب بھی ان کو تصورات کی دنیا میں یاد کرتی مسکراہٹ ہی اس کے چہرہ پر چپکی رہتی۔ کبھی کبھار ساس سے یا نعیم سے ان کی یادوں کو شیئر کرتی تو وجود ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ ساس تو اکثر یہی کہتیں۔

"کس قدر خوش نصیب انسان ہے جو مرنے کے بعد اچھائی کے طور پر یاد رہے۔ اس کی کوئی بات یا کوئی عمل تکلیف دینے کی وجہ سے یاد نہ ہو۔"

واقعی ماموں فرشتہ تو نہیں، فرشتہ صفت تھے۔" وہ فقرہ دہرائی۔ سسرال میں نسیم باجی کے آنے سے بہت رونق ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ پاکستان میں طے کرنا چاہتی تھیں۔ مصروفیات کا یہ سلسلہ اگلے چار چھ ماہ جاری رہا۔ لڑکا دیکھنے جا رہے ہیں یا لڑکے والے آرہے ہیں۔ بارے خدا خدا کر کے بہاول پور میں رشتہ طے ہوا۔ سب سے زیادہ خوشی نفرو کو تھی۔ میکے جانے کے لیے آسرا ہو گیا۔ ولیمہ کی تقریب کے بعد سب لوگ واپس حیدر آباد روانہ ہوئے اور وہ حافظ

آیا۔۔۔ اس وقت اس نے سفر سے پہلے صدقہ دیا۔ دعا کی سفر اچھا گزرے' قیام برکتوں والا رہے۔ اللہ نے صدقہ قبول کیا اور وہ سات آٹھ گھنٹوں کے سفر کے بعد ماں کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ مدتوں سے جو سناٹا اس کے اندر تھا' اب سکون میں بدل چکا تھا۔ امی اور وہ دونوں خاموش تھیں' لیکن ان کی خاموشی بھی گفتگو تھی۔

"ہفتہ دو ہفتہ جی بھر کے رو لینا۔ یہاں کی ٹینشن نہ لینا۔ نسیم آپی اور بھابھی ہیں نا۔" نعیم نے اسے فون پر تسلی دی تھی۔ یہ دو ہفتے بہت اچھی طرح گزرے۔ جی بھر کے اس نے ماں کی خدمت کی' ان کے چھوٹے چھوٹے کام کیے۔ رضی بھائی کے لیے لڑکی تلاش کی۔ ابا سے ڈھیروں ڈھیر باتیں کیں۔ محلے میں ہر گھر میں گئی۔ جو دو ایک سہیلیاں تھیں۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس مرتبہ کے قیام کے ہر لمحہ کو اپنی یادوں میں سرمائے کے طور پر محفوظ رکھنا چاہتی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہی۔

واپسی سے دو چار دن پہلے بیٹھے بٹھائے اس نے ماموں میاں کے ہاں جانے کا پروگرام بنالیا۔ خیالات ہی میں اس نے پروگرام کو عملی جامہ بھی پہنالیا۔ مغیث کو اپنی آمد کی اطلاع دے کر اس نے رخت سفر باندھا۔ رضی بھائی پاکستان آئے ہوئے تھے۔ انہیں لاہور میں دو ایک دن ضروری کاموں کے لیے رکنا تھا۔ وہ بھی مغیث کو روانگی کا میسج ٹیکسٹ کرکے لاہور روانہ ہو گئی۔ ان شاء اللہ تین بجے آپ کے گیٹ پر موجود ہوں گی۔ مغیث کے پروگرام پوچھنے پر اس نے جواب بھیجا۔

سارا راستہ دونوں' بہن بھائی ماضی کی شرارتوں اور یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد کر کرکے ہنستے رہے۔

لاہور آگیا' پتا بھی نہ چلا۔ رضی بھائی کو سوا تین بجے کسی سے ملنا تھا' کل واپسی میں لے لوں گا۔۔۔ کہہ کر وہ اسے گیٹ پر ہی اتار گئے۔ نفو نے سوچا وہ تین بجے گیٹ پر پہنچے گی تو گیٹ کھلا ملے گا۔ مگر ایسے نہ ہوا۔

اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ دوسری مرتبہ' تیسری مرتبہ۔۔۔ پھر میسج کیا' مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ ماموں اور بچے ہمیشہ اس کے منتظر ہوتے۔ گیٹ پر ہی ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

اس نے قدرے بے زاری سے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ مغیب نہ مغیث نہ ان کی بیویاں' دروازہ کھولنے والی ان کی ملازمہ تھی۔

دوسرا جھٹکا۔۔۔ مرے مرے قدموں سے وہ اندر آئی اور ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ "اوہ۔۔۔ بی بی جی۔۔۔ ادھر ڈرائنگ روم میں آئیں' یہ تو مغیث صاحب کا بیڈ روم ہے۔" ماسی نے اس کے بڑھتے قدموں کو روکا۔

نفو بے طرح شرمندہ ہوئی۔ اس کے زمانے میں تو یہ ڈرائنگ روم ہی تھا' اسے کیا خبر اب یہ بیڈ روم بن چکا ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اسے پانچ چھ منٹ گزر گئے۔ بندہ نہ بندے کی ذات۔ وہ بے زار ہوئی۔ تیسرا صدمہ۔۔۔ کیا ماموں میاں ہوتے تو اس کو مہمانوں کی طرح ڈرائنگ روم میں بٹھاتے اور بٹھانے کے بعد ملنے بھی نہ آتے۔ کافی دیر کے بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ ماسی اور مغیث کی دلہن اکٹھی داخل ہوئیں۔ اسے مغیث کی دلہن کا ناک نقشہ واٹس ایپ پر تصویریں دیکھ دیکھ کر حفظ ہو چکا تھا۔ بائیں آنکھ کے نیچے بڑا سارا سیاہ تل یاد رکھنے کے لیے کافی تھا۔

"آپ دانیہ بھابھی ہیں نا۔" اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی۔۔۔ آپ نفو آپی ہیں۔ مغیث آپ کا ذکر کر رہے تھے۔" جواباً" اس نے بھی بتا دیا۔ دو ایک سفر کے اور دو ایک نوسیہ کے متعلق سوالات کیے۔ پھر اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"معاف کیجیے' میری بھانجی کی ویڈیو کال آنے والی ہے' ضروری کام تھا مجھے اس سے۔" نفو تھک چکی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ کہیں آرام سے لیٹ جائے۔ اچانک ہی ڈھیر ساری تھکن اس کی آنکھوں

میں جمع ہو گئی۔ گھر کے ہر کونے سے اسے ماموں ممانی کی آوازیں سنائی دینے لگیں' ان کے ساتھ گزارے گئے خوش گوار لحات ایک فلم کی طرح اس کے ذہن کی پردہ اسکرین پر نمودار ہونے لگے۔ ایک کے بعد دوسری' پھر تیسری۔۔۔ کئی یادیں اس کے اردگرد جمع تھیں۔۔۔ دروازے سے ٹرالی گھسیٹنے کی آواز آئی۔۔۔ ماسی چائے کے ساتھ لوازمات لیے اندر داخل ہوئی۔

کباب' دہی بڑے' بسکٹ' چائے' ماسی نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے کیا۔ دل میں اک لہر سی اٹھی' کیا میں یہ چیزیں کھانے کے لیے آئی ہوں؟ میں جس چیز کے لیے آئی ہوں وہ کہاں سے ملے گی۔ پلیٹ میں کباب رکھ تو لیا' منہ میں بھی ڈالا' مگر حلق میں پھنس کر رہ گیا۔

"ماموں میاں۔۔۔ وہ پھپھک پھپھک کر رو پڑی۔

ماسی واپس جا چکی تھی۔ اس نے کلاک پر نظر ڈالی۔ مغیث کی بیوی کو بھانجی سے بات کرنے کے لیے کمرے سے باہر گئے' پورے پچیس منٹ گزر چکے تھے۔ وہ بور ہو کر اٹھی۔ سوچا ہمت کر کے خود ہی باہر چلی جائے۔ یہ تو تہذیب کے خلاف' مگر یہاں بیٹھ کر وہ کیا کرے؟" ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھایا ہی تھا کہ اس کی سماعت پر بم گرا۔ کلسٹر بم سے بھی زیادہ خطرناک اور وزنی بم۔۔۔ اس کے وجود کے پرخچے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ پورے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ بڑی مشکل سے اس نے صوفے پر سے نوسیہ کو اٹھایا۔ ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

"یہ کیا ہوا؟" اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

اسے کیا خبر تھی کہ تقدیر اس سے کیا مذاق کرنے والی ہے۔ اس نے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ وانیہ کی آواز سنائی دی۔ خدا جانے وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی یا اس کے سامنے کوئی موجود تھا۔ نفرو کو صحیح طرح سے اندازہ نہ ہو سکا' اس لیے کہ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اپنی طرف سے اس نے یہ فقرہ سرگوشی کے سے انداز ہی میں کہا تھا۔ لیکن اسے فقرہ کہتے ہیں تو دنیا میں سب سے سنگین یہی فقرہ ہو سکتا تھا۔ نفرو کے کانوں میں اس کی آواز آئی۔

"اللہ جانے مغیث کی یہ کزن فائننشلی کیسی ہیں؟ کہیں ڈیزرونگ تو نہیں۔۔۔ اسی لیے بیٹھی ہوں۔"

اڑ ڑ۔۔۔ ا۔۔۔ دھم۔۔۔ ساتوں آسمان نفرو کے سر پر آن گرے۔ گیراج تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا۔ اپنے اوپر بلکہ اپنی اس نام نہاد حساسیت پہ اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی۔ ماموں ممانی کے افسوس کے لیے آنے کی؟ جو مر گئے۔ اپنی اپنی قبروں میں دفن ہو گئے۔ کیا انہوں نے تعزیت کے کلمات سننے کے لیے زندہ ہو جانا تھا۔ تواتر سے اشک بہہ رہے تھے۔ جوں ہی وہ گیٹ تک پہنچی گیٹ کا آٹومیٹک لاک کھلا۔

گہرے رنگ کی کرولا اندر داخل ہوئی۔ آنسوؤں کی چادر نے شیشے کے پار دیکھنے سے محروم ہی رکھا۔ وہ نظر بچا کر نکل جانا چاہتی تھی' مگر کار کا دروازہ کھلا۔ مغیث' نیب چمکتے اور چھلکتے گاڑی سے باہر آئے۔ دونوں کے ہاتھ میں مشہور فوڈ چین کے شاپر تھے۔

"السلام علیکم نفرو آپی۔" دونوں نے کورس کے انداز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" کے الفاظ نفرو کے حلق میں ہی پھنس گئے۔

مغیث نے چونک کر دیکھا۔ اس کی سوچی آنکھوں پر نظر پڑی۔

"اوہ۔" ایک دم اسے یاد آیا۔ بابا اور اماں کے انتقال کے بعد نفرو آپی پہلی دفعہ آئی ہیں 'یقیناً" بابا کو یاد کرکے روتی رہی ہوں گی۔

"آپی! آپ کہاں جارہی ہیں؟" منیب نے پوچھا۔

"وہ کہیں نہیں۔" نفرو کے چلتے قدم تھم گئے۔ کیا بہانہ پیش کرے۔

"آپی اندر چلیں اور یہ گڑیا سو رہی ہے۔" اس نے آگے بڑھ کے زوبیہ کو پکڑا۔ جبراً "پاؤں گھسیٹتے ہوئے بددلی کے ساتھ نفرو بھی ان کے ہمراہ چل پڑی۔

"آپی ادھر آئیں۔ ہمارے کمرے میں۔" مغیث بولا۔ "دیکھیے سارے گھر میں کتنی تبدیلی آگئی ہے۔"

کچن کے ساتھ چھوٹا سا کمرہ جو پہلے نہیں تھا۔ کراکری کے ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور ذرا سی گردن گھمانے پر پورا منظر نظر آرہا تھا۔ کتنی یادیں وابستہ تھیں کھانے کے کمرے سے 'پرانی والی میز اسی کمرے میں پڑی تھی اور ساری میز مختلف طرح کی ہینڈ ہینڈنگز سے اٹی پڑی تھی۔ وہ پیارے چہرے ان کی آوازیں 'پھر قوت سماعت میں اضافہ کرنے لگیں۔

"چادر اتاریے اور آرام سے ٹانگیں پسار کے لیٹ جائیے۔" منیب نے کہا۔ دونوں کے پرجوش چہروں پر وہی خلوص اور دائمی مسکراہٹ تھی جو ماموں میاں کے ہونٹوں سے چپکی رہتی تھی۔ مغیث بولا۔

"جب آپ کا میسج آیا میں میٹنگ میں تھا۔ اسے چھوڑ کر راستے سے منیب کو لیا۔ آپ کی پسند کے وہی بڑے اور چپلی کباب پیک کروائے۔ اس لیے دیر ہوگئی۔ ایمان سے آپی! آپ کے آنے کا سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتا۔"

دونوں اپنی اپنی یادوں کی پٹاری کھولے بیٹھے تھے۔ وہی چودہ پندرہ سال پہلے والے معصوم بچے۔ نفرو کو ایسے محسوس ہو رہا تھا' ماموں میاں زندہ ہو کر نئے وجود میں سامنے بیٹھے ہیں اور اس کے سر پر چپت لگا کے کہہ رہے ہیں۔

"او پگلی۔ رشتے بھی کبھی مرتے ہیں؟ رشتے تو صدا زندہ رہتے ہیں' لیکن ان کی زندگی کا دارومدار ایک ہی چیز پر ہوتا ہے اور وہ ہے تعلق۔ جتنا تعلق ہوگا' اتنی ہی محبت بڑھے گی۔

اب تم خود بتاؤ مغیث' منیب کی بیویوں سے تمہارا تعلق کتنا رہا؟" چند لمحے قبل کا غصہ۔ شرمندگی اور ندامت میں بدل گیا۔ وہ اٹھی اور مغیث کی بیوی کو ڈھونڈا جو کچن میں بہت اہتمام سے کریلے گوشت بنا رہی تھی۔ پلاؤ دم پر تھا' جس کی خوشبو چاروں سمت پھیلی ہوئی تھی۔ کباب توے پر رکھے تھے۔ سلاد کھانے کی میز پر رکھا ہوا تھا۔

سارا منظر مکمل تھا۔ آج سے دس بارہ سال قبل یہ ہی مناظر تھے۔ جو اس کی یادوں کو تازہ رکھتے تھے۔

"بھابھی" آپ مجھے بتائیں' میں آپ کی کیا مدد کرا سکتی ہوں؟" اس نے لہجہ میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ آئیں' یہی ہمارے لیے بہت بڑی بات ہے۔" سادہ 'ریا سے پاک لہجے میں مغیث کی بیوی نے جواب دیا۔ اندر کمرے میں مغیث' منیب کے چہکنے اور زوبیہ کی قلقاریوں کی آواز آرہی تھی۔

اس کے منہ سے بے ساختہ الحمدللہ کے الفاظ نکلے۔ جیسے نفرو چھوٹی ہو کر زوبی کے روپ میں اور ماموں میاں' مغیث' منیب کے روپ میں ہوں۔ اسے بہت اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا۔ جیسے انسان کے لیے آکسیجن اور زندگی کے لیے پانی ضروری ہے' اس طرح محبتوں کی آبیاری کے لیے تعلق رکھنا ضروری ہے۔

☆

بچپن سے ہی ثمن کا دل اپنے گھر سے زیادہ تایا جی کے گھر میں لگتا تھا۔ دونوں گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ثمن چار بہن بھائی تھے تو تایا جی کے بچوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی، پھر جانے کیوں تایا جی کے گھر میں اتنا امن، سکون اور خاموشی ہوتی تھی جبکہ ثمن کے اپنے گھر میں تو ہر وقت شور و غل برپا رہتا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی ریں ریں، چیخ و پکار، امی کی بلند آواز میں ڈانٹ پھٹکار اور ابا کے گھر آنے کے بعد امی، ابا کی لڑائی، جبکہ تایا جی کے گھر میں ایسا کوئی تماشا نہیں تھا۔

دھیمے لہجے میں بات کرنے والی شفیق سی تائی جان، بچوں پر جان چھڑکنے والے تایا جی، جو اپنے بچوں کے علاوہ بھتیجا، بھتیجیوں پر بھی خوب ہی شفقت لٹاتے، شہزادیوں جیسی حسین آمنہ آپی، ان سے چھوٹے بلا کے ہنسوڑ خضر بھائی، ذہین، فطین رانیہ آپی اور سب

راشدہ رفعت

سے چھوٹی اریبہ۔ تو خیر ثمن کی پکی سہیلی تھی ہی۔ وہ اریبہ کے ساتھ کھیلنے کا کہہ کر گھر سے نکلتی تو کئی کئی گھنٹے تائی جان کے ہاں گزار دیتی۔ یا تو امی اس کے کسی چھوٹے بہن بھائی کو بھیج کر اسے بلواتیں یا پھر خود ہی بکتی، جھکتی اسے لینے آتیں۔ ماں کے تیور دیکھ کر وہ تائی کی آغوش میں پناہ لیتی۔ تائی جان ہی امی کو رسان سے سمجھاتیں۔

"ابھی بچی ہے۔ اتنی سختی مت کیا کرو نجمہ! پیار سے سمجھاؤ گی تو مان جائے گی۔"

"اب اتنی بھی بچی نہیں ہے بھابھی! ماں کا ذرا احساس نہیں کرتی، اگر تھوڑی دیر کو چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھال لے تو میں اتنے گھر کے بکھیڑے سمیٹ لوں، مگر یہ گھر میں ٹکے تو بات ہے۔ میں اکیلی جان کیا کچھ دیکھوں۔ اگر آپ کے دیور جی کے آنے سے پہلے کھانا تیار نہ ہو تو وہ الگ غل مچاتے ہیں۔" نجمہ بھیجانی سے دکھڑا روتیں۔

"تم فکر نہ کرو، میں بچیوں کو بھیجتی ہوں، وہ تمہارا ہاتھ بٹا دیں گی۔" تائی جان، آمنہ آپی اور رانیہ آپی کو ان کے ہاں بھیج دیتیں اور واقعی پھیلا ہوا کام منٹوں میں سمٹ جاتا۔

ثمن کا بچپن رخصت ہوا اور اس نے لڑکپن کی دہلیز پر قدم رکھا، مگر تایا کی فیملی سے اس کے لگاؤ میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ سب لوگ اسے اپنے آس پاس بسنے والے دوسرے لوگوں سے بہت منفرد اور ممتاز لگتے تھے۔

اس نے کبھی تائی جان کے منہ سے کسی کی غیبت یا

برائی انہیں سنی نہ ہی کبھی تایا جی کو کسی سے لڑتے جھگڑتے یا الجھتے دیکھا۔ تایا جی پیشے کے اعتبار سے استاد تھے اور انہوں نے ہمیشہ اس پیشے کا وقار ملحوظ رکھا۔ وہ ہر کسی کو نیکی کا درس دینے والے عالم باعمل تھے۔ دونوں میاں' بیوی نے اولاد کی بھی بے مثال تربیت کی تھی۔

ثمن کو اپنے تایا جی کا گھرانہ ہر لحاظ سے آئیڈیل لگا کرتا تھا۔ آئمہ آپی تایا جی کی سب سے بڑی بیٹی تھیں اور ثمن تو گویا ان کی عاشق تھی۔ بے پناہ حسن اور تمکنت رکھنے والی آئمہ آپی کی نسبت ٹھہرائی گئی تو رانیہ اور اریبہ کے ساتھ مل کر ثمن نے بھی خوب ہی آنسو بہائے۔ وہ اب بہت جلد پرائی ہونے والی تھیں' یہ سوچ سوچ کر ثمن کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ آئمہ آپی نے ہمیشہ بڑی بہنوں کی طرح ہی اس کے لاڈ اٹھائے تھے' اب بھی انہوں نے اس کے آنسو پونچھ کر ڈھیروں تسلیاں دیں۔

"میں کوئی دوسرے شہر رخصت ہو کر تھوڑی جا رہی ہوں ثمن گڑیا! جلدی' جلدی گھر کے چکر لگایا کروں گی۔" انہوں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

ثمن سمجھ بھی گئی اور بہل بھی گئی' واقعی آئمہ آپی کا سسرال یہیں اسی شہر میں ہی تو تھا۔ وہ لوگ دور پرے کے رشتہ دار بھی تھے۔ اویس بھائی بھی بہت خوب صورت تھے۔ ان کا آئمہ آپی سے صحیح جوڑ بنتا تھا۔

ثمن نے اپنی اداسی پس پشت ڈال کر آئمہ آپی کی شادی میں خوب رونق لگائی۔ آئمہ آپی پیا دیس سدھار گئیں۔ تایا جی کے گھر میں اداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔

آئمہ آپی اپنے وعدوں کے برعکس بہت دنوں بعد میکے کا چکر لگاتی تھیں اور ان کے آنے کے بعد تایا جی کے گھر کی اداسیاں کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی تھیں' ایسا کیوں ہوتا تھا ثمن وجہ جاننے سے قاصر تھی۔ پھر اسے اریبہ کی زبانی پتا چلا کہ وہ جس کو اداسی سمجھ رہی ہے' وہ حقیقت میں تایا جی کے گھرانے کی پریشانی ہے۔

آئمہ آپی کے سسرال والے بظاہر پڑھے لکھے' مگر بے حد تنگ ذہنیت کے لوگ تھے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانا شروع کر دیے تھے۔ آئمہ آپی کی ذات ہر وقت کڑی تنقید کی زد میں رہتی۔ ان کے کیے گئے ہر کام میں مین میخ نکالی جاتی۔ ان کے خلاف اویس کے کان بھرے جاتے۔ ان کے سونے' جاگنے' اٹھنے' بیٹھنے' کھانے پینے غرض ہر بات پر اعتراض کیا جاتا۔

آئمہ آپی کا حسن کملا کر رہ گیا تھا۔ ان کے لب مسکرانا بھول گئے' جبکہ آنکھوں میں عجیب سے ہراس نے ڈیرے ڈال لیے۔ ان کی حالت دیکھ کر ثمن کا جی بہت دکھتا' مگر وہ دعا کے سوا کچھ کرنے پر قادر نہ تھی' پھر ایک حیران کن بات ہوئی۔ تائی جان نے خضر بھائی کے لیے آئمہ آپی کی نند کا رشتہ مانگ لیا۔

"بہت اچھا فیصلہ کیا بھابھی! ان لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے یہ ہی ایک طریقہ تھا۔" امی نے تائی جان کے اس فیصلے پر ان کی پیٹھ ٹھونکی تھی۔

ثمن کو لگا ابھی تائی جان امی کی بات کی تردید کر دیں گی' لیکن تائی جان صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ ثمن خود آئمہ آپی کے سسرال والوں کو غائبانہ کوسنوں سے نوازتی تھی' لیکن جانے کیوں تائی جان کا یہ فیصلہ اس کے من کو نہ بھایا۔ یہ فیملی ہمیشہ سے ہی اس کی آئیڈیل فیملی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے سطحی سوچ رکھنے والے انسانوں کی طرح کوئی ہتھکنڈا اپنائیں گے۔

ثمن کو اس طرز عمل سے دکھ پہنچا تھا۔ زندگی میں ایک مشکل موڑ آنے پر اس خاندان کی مثالیت پسندی کتنی آسانی سے عملیت پسندی میں بدل گئی۔ تائی جان اور تایا جی نے زندگی بھر جن باتوں کا درس دیا تھا اب وہ اس کے بالکل الٹ کرنے جا رہے تھے۔

"خضر بھائی اس شادی پر راضی ہو گئے؟" اس نے چپکے سے اریبہ سے پوچھا۔

مجبوری ہے۔" ثمن نے... "آپی کو ان کے سسرال والوں نے جتنا تنگ کیا، اب انہیں سبق سکھانا ضروری ہو گیا ہے۔" اریبہ دھیرے سے بولی تھی۔

ثمن کا جی مزید مکدر ہو گیا اور پھر کچھ عرصے بعد ہی خضر بھائی آئمہ آپی کی نند کو بیاہ لائے تھے۔ ثمن اس بار شادی میں اس جوش و خروش سے شرکت نہ کر پائی، ویسے بھی فائنل امتحانات سر پر تھے۔ پڑھائی سر کھجانے کی فرصت نہ دیتی تھی، شادی کے ہنگاموں میں شمولیت کی مہلت کیونکر دیتی۔ امتحانات ختم ہوئے تو ثمن نے حسب سابق فرصت کے لمحات تایا جی کے گھر گزارنے شروع کر دیے۔

اس بار گھر کے معمولات دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ تایا جی کے گھر میں ابھی تک نئی دلہن کے چاؤ، چونچلے اٹھائے جا رہے تھے۔ تائی جان بہو پر واری صدقے جاتیں تو بہنوں کا بھابھی 'بھابھی' کہہ کر منہ نہ سوکھتا۔ تایا جی جب بھی گھر لوٹتے تو بہو کے لیے گرم گرم سموسے یا خستہ کچوریاں لے کر آتے۔

خضر بھائی بھی اکثر شام کو بیوی کو لے کر آؤٹنگ پر نکل جاتے۔ نئی نویلی دلہن کی جانب سے بھی سسرال والوں کے لیے خوب ہی اپنائیت کا مظاہرہ ہوتا۔ نیلما بھابھی کبھی تائی جان کے سر میں تیل لگا کر ان کی چوٹی گوندھ رہی ہوتیں تو کبھی رانیہ، اریبہ کے ساتھ کچن میں کوئی نئی ڈش بنا رہی ہوتیں۔ اس سب کو دیکھ کر ثمن کا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔

اب آئمہ آپی کے بھی میکے کے چکر جلد لگنے لگے تھے۔ ثمن نے دیکھا کہ اب آئمہ آپی کی آنکھوں کا ہراس ختم ہو گیا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر پھر سے مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ آخر ایک دن موقع پا کر ثمن نے آئمہ آپی کو جا ہی لیا۔

"ہم سب تو یہ سمجھ رہے تھے آپی! کہ تائی جان نے آپ کے سسرال والوں کو سبق سکھانے کے لیے آپ کی نند کا رشتہ مانگا ہے، لیکن یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔" آئمہ آپی سوال سن کر ہولے سے ہنس پڑی

"امی کا مقصد میرے سسرال والوں کو سبق سکھانا ہی تھا ثمن گڑیا! اور اللہ کا شکر ہے امی اس مقصد میں کامیاب رہیں۔"

"ہائیں وہ کیسے۔" ثمن کو واقعی آئمہ آپی کی بات کا مطلب سمجھ میں نہ آیا تھا۔

"وہ ایسے چندا کہ میرے سسرال والوں کو پتا ہی نہ تھا کہ جب ایک لڑکی ماں باپ کا گھر چھوڑ کر سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس لڑکی کو اپنائیت کا احساس دلانا اور اس کے جذبات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک بہو سسرال کی زمین پر سرزمین پر صرف اس وقت مضبوطی سے قدم جما سکتی ہے جب اس کے سسرالی رشتہ داروں نے اسے خوش آمدید کہا ہو۔ میرے گھر والوں نے نیلما کو جو محبت اور اپنائیت دی تو یہ بالواسطہ میرے سسرال والوں کو دیا جانے والا سبق ہی تھا اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ طریقہ کارگر ٹھہرا، اسے میری خوش قسمتی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے جو سوچا وہ پا لیا۔ میرے سسرال والوں کو یہ سبق سکھانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔" آئمہ آپی نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔

ثمن حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہی۔ کتنے دنوں تک وہ تایا جی کے گھرانے کے متعلق غلط گمان میں مبتلا رہی، جبکہ اب وہ یقین سے دعوا کر سکتی تھی کہ ان لوگوں جیسا منفرد گھرانہ دور و نزدیک میں کوئی نہیں۔ ثمن کے چہرے پر سے حیرت بھرے تاثرات رخصت ہوئے۔ اب وہ ان انوکھے لوگوں کی انوکھی فلاسفی پر مسکرا رہی تھی۔ جینے کا یہ انداز اس کے من کو بہت بھایا تھا۔

تجھے اکیلے پڑھوں کوئی ہم سبق نہ رہے
میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر کسی کا حق نہ رہے

مجھے جدائی کے موسم پہ اعتراض نہیں
مری دعا ہے کہ اس کو بھی کچھ قلق نہ رہے

وہ مجھ کو چھوڑ نہ دیتا تو اور کیا کرتا
میں وہ کتاب ہوں جس کے کئی ورق نہ رہے

جو تیرا نام کسی اجنبی کے لب چُومے
میری جبیں پہ یہ ممکن نہیں عرق نہ رہے

اسے بھی ہو گئی مدت کتابِ دل کھولے
مجھے بھی یاد پرانے کئی سبق نہ رہے

وہ ہم سے چھین کے ماضی بھی لے گیا رانا
ہم اس کو یاد بھی کرنے کے مستحق نہ رہے

مسعود رانا

کھرے سودے کا قائل ہوں سو بہتر بیچ دیتا ہوں
میں دریا پاس رکھتا ہوں سمندر بیچ دیتا ہوں

سہانے خواب تو کانٹوں کے بستر پر بھی ممکن ہیں
میسر ہو اگر پھولوں کا بستر بیچ دیتا ہوں

نہیں معلوم مستقبل میں میرے فن پہ کیا گزرے
اسی باعث میں اس کو اُدھا کر بیچ دیتا ہوں

چلو یونہی انا گر آپ کی تسکین پاتی ہے
تو میں حق گوئی کا انمول گوہر بیچ دیتا ہوں

حیاتِ چند روزہ کے سکونِ خام کی خاطر
میں اپنی دائمی قدروں کا پیکر بیچ دیتا ہوں

کیا تھا مصحفی نے بھی یہ کارِ آشیاں بندی
کلامِ تازہ میں بھی اس روش پر بیچ دیتا ہوں

کسی کا جون اچھا کٹ سکے گا اس طرح ناصر
بہت پہلے سے میں اپنا دسمبر بیچ دیتا ہوں

ناصر زیدی

مشتاق بدستور زمانہ ہے تمہارا
آنے سے بڑا کھیل نہ آنا ہے تمہارا

لیلیٰ کی حکایت بھی حکایت ہے تمہاری
شیریں کا فسانہ بھی فسانہ ہے تمہارا

دل میں کوئی آجائے تو واپس نہیں جاتا
دشوار یہاں سے کہیں جانا ہے تمہارا

کیوں روشنی و رنگ سے معمور نہ ہو دل
سنسان سہی، آئینہ خانہ ہے تمہارا

سمجھایا بجھایا نہ کرو دل کو شعور اب
کم بخت نے کہنا کبھی مانا ہے تمہارا

انور شعور

اک نظم تجھے بھی بھیجوں گا
یہ سوچ کے ہی
تنہائی کے نیچے کاربن پیپر رکھ کے میں
اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتا ہوں
الفاظ اتر آتے ہیں کاغذ پہ
آواز کی شکل نہیں ابھرتی
راتوں کو سیاہی دکھتی ہے

گلزار

اے ماہ کی دستک اِن سے

مجبوری

فلم کی ریلیز سے پہلے ہی اس کی اتنی شہرت ہو چکی تھی کہ مہینوں پہلے کی ایڈوانس بکنگ چل رہی تھی۔ فلم لگی تو پہلے شو میں۔۔۔ پچھلی قطار میں دو خواتین بیٹھی تھیں ہمراں کے درمیان سیٹ خالی تھی۔ انٹرویل میں ایک خاتون نے بات چیت شروع کرتے ہوئے دوسری خاتون سے کہا۔

"میں نے یہ فلم دیکھنے کے لیے آٹھ مہینے پہلے بکنگ کرائی تھی۔"

دوسری خاتون بولیں۔ "عجیب اتفاق ہے۔۔۔ میں نے بھی آٹھ مہینے پہلے بکنگ کرائی تھی۔"

پہلی خاتون بیچ کی خالی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"لیکن نہ جانے یہ کون بد نصیب تھا جو بکنگ کرانے کے باوجود فلم دیکھنے نہیں آسکا؟"

"یہ سیٹ بھی میری ہے۔" دوسری خاتون نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "دوسرا ٹکٹ میں نے اپنے شوہر کے لیے لیا تھا' لیکن اس دوران ان کا انتقال ہو گیا۔"

"اوہ۔۔۔ بڑا افسوس ہوا سن کر۔۔۔" پہلی خاتون نے ہمدردی سے کہا۔

"لیکن آپ اپنی کسی دوست یا رشتے دار کو ساتھ لاسکتی تھیں۔"

"خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔" دوسری خاتون نے تاسف سے کہا۔ "لیکن کسی کو بھی ساتھ لانا مشکل تھا۔ وہ سب تو میرے شوہر کے جنازے میں شرکت کرنے گئے ہیں۔"

حنا تسلیم اعوان۔۔۔ گاؤں آخون ہانڈی ہری پور

شریک حیات

شوہر بے حد بیمار تھا جسے ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا اس کی بیوی بہت پریشان اور فکر مند رہتی تھی۔ وہ خدا سے دعا کرتی تھی کہ اے اللہ! میری جان لے لے اور میرے شوہر کی جان کو بخش دے۔ ابھی عورت یہ دعا مانگ ہی رہی تھی کہ کچن میں بلی نے دودھ میں منہ ڈالا جس سے برتن گر پڑا۔

عورت گھبرا گئی اور سمجھی کہ ملک الموت آگئے ہیں۔ یہ خیال آیا کہ شاید میری دعا قبول ہو گئی ہو۔ بہت ڈری اور کہنے لگی کہ "حضرت ادھر خیال نہ کریں۔ جس کے لیے آپ آئے ہیں اسے ہی لے کر جائیں۔ وہ اندر پڑا ہے۔"

پروین افضل شاہین۔۔۔ بہاول نگر

ستم ظریفی

بلبل نے جب جگنو کو اپنے پاس سے خاموشی سے گزرتے ہوئے دیکھا تو وہ بڑا حیران ہوا' کیونکہ پہلے کی طرح اس نے اسے نہیں کہا تھا کہ آؤ بھائی میں آپ کو آپ کو گھونسلے تک چھوڑ آؤں۔ آخر بلبل خود ہی جگنو سے بولا۔

"بھائی جگنو! اندھیرا بہت ہے' مجھے میرے گھر تک چھوڑ آو۔"

یہ سن کر جگنو بولا۔ "بھائی بلبل! پہلے تو میرا روشنی پر کوئی خرچ نہیں آتا تھا' مگر جب سے واپڈا والوں نے مجھے روشن دیکھا ہے' انہوں نے مجھے بھی بل بھیجنا شروع کر دیا ہے۔"

صبا طارق۔۔۔ گوجرانوالہ

محبت

ہوسٹل میں رہنے والے بیٹے نے باپ کو خط میں لکھا۔

"تین مہینے سے آپ نے مجھے پیسے نہیں بھیجے۔ میں آپ کو کئی خط لکھ چکا ہوں۔ آپ تو کہتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے بڑی محبت ہے۔ تین مہینے سے آپ نے مجھے خرچے کے لیے پیسے ہی نہیں بھیجے۔ یہ کس قسم کی محبت ہے؟"

باپ نے جوابی خط میں لکھا۔

"بیٹا! یہ وہ محبت ہے۔ جو اپنے اظہار کے لیے پیسوں کی محتاج نہیں ہے۔"

خوش قسمت

چرچ میں ایک پادری صاحب یہ بتا رہے تھے کہ۔

"انسان کا صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ آدمی زندگی میں جو کچھ بھی پاتا ہے وہ اپنی محنت و مشقت کے بل بوتے پر حاصل کرتا ہے۔"

مثال دیتے ہوئے پادری نے کہا۔ "جارج ذہین تو ہے لیکن محنت سے جی چراتا ہے' اس لیے زندگی میں زیادہ ترقی نہ کر سکا' اس کے برخلاف جان نے محنتی ہونے کی وجہ سے زندگی میں اپنے لیے ایک اعلا مقام پیدا کیا اور جب مرا تو اپنی جوان بیوہ کے لیے لاکھوں کی جائیداد چھوڑ گیا۔"

یہ سن کر پیچھے سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔

"شاید آپ کو تازہ ترین اطلاع نہیں ملی ہے' جارج اب جان کی بیوہ سے شادی کر رہا ہے۔"

یسریٰ قریشی۔ لاہور

ہوا کا رخ

ایک لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھوم رہی تھی کہ اچانک اس کا شوہر آگیا اور بوائے فرینڈ کو مارنے لگا۔ لڑکی نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"مار کمینے کو' دوسروں کی بیوی کو گھمانے لے آتا ہے۔"

اتنے میں بوائے فرینڈ کو جوش آیا اور وہ شوہر کو مارنے لگا۔

لڑکی پھر بولی "مار کمبخت کو' نہ خود گھمانے لے جاتا ہے اور نہ کسی کو گھمانے دیتا ہے۔"

(سائرہ علی۔ چکوال)

بد قسمتی

وہ کافی دیر سے بار میں بیٹھا گلاس کو گھورے جا رہا تھا۔ قریب بیٹھا ایک قوی الجثہ ڈرائیور بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ اٹھا اور اس کے سامنے پڑا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

نوجوان اچانک بلک بلک کر رونے لگا۔ ڈرائیور سے دیکھا نہ گیا اور بولا۔

"کچھ تو بتاؤ کیوں رو رہے ہو؟ میں نیا پیگ منگوا دیتا ہوں۔"

نوجوان بولا۔ "نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ میرے لیے آج کا دن بڑا منحوس ہے۔ صبح دیر سے اٹھا تو دفتر میں باس برس پڑا اور مجھے نوکری سے نکال دیا۔ باہر نکلا تو گاڑی غائب تھی' پولیس والے بھی فوری ایکشن نہ لے سکے۔ ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔ اندر داخل ہوا تو اچانک معلوم ہوا کریڈٹ کارڈ سمیت اپنا پرس ٹیکسی میں بھول آیا ہوں۔ بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہاں میری بیوی مالی کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ یہ سب میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں ایسا نوجوان تھا جس کی بیوی بھی بے وفا نکلی۔ میں اپنی زندگی کو ختم کرنے کے لیے یہاں آگیا۔ میری بد قسمتی تمہاری صورت میں نازل ہو گئی۔ میں نے اپنے پیگ میں زہر ڈال دیا تھا۔ مگر مجھ سے پہلے تم جلدی میں اسے پی گئے۔"

مسرت الطاف۔ کراچی

شگفتہ جاہ

محبت سے حج خوشبو پاؤں چھوٹا کے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

مسلم کی روایت میں ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم میں سے کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے اور نہ اس کے آنے سے پہلے اس کی دعا کرے۔ اس لیے کہ جب یہ مر جائے گا تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور مومن کے لیے اس کی عمر میں اضافہ اس کے لیے بھلائی ہی میں اضافے کا باعث ہے۔"
(صحیح بخاری)

فائدہ:۔
اس میں موت کی آرزو کرنے سے روکا گیا ہے، اس لیے کہ ایک مومن کے لیے عمر میں زیادتی ہر صورت میں مفید ہے۔ جتنی زیادہ عمر اسے ملے گی وہ نیکیوں میں اتنی ہی ترقی کرے گا، یا کسی گناہ میں مبتلا ہوگا تو شاید اس سے تائب ہونے کا اسے موقع مل جائے۔ پس مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنا دامن زیادہ سے زیادہ نیکیوں سے بھر لے۔

خیال میرا خوشبو سا،

- وہ لوگ کبھی تنہا نہیں ہوتے جن کے ساتھ خوبصورت خیالات ہوتے ہیں۔
- افواج کے حملے کو روکا جا سکتا ہے لیکن خیالات کے حملے کو روکنا بہت مشکل ہے۔
- عظیم خیالات جب عمل کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو عظیم تخلیقات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔
- جب انسان کچھ پا لیتا ہے تو کچھ کھو بھی دیتا ہے، پا لینے کی سرشاری وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو جاتی ہے اور کھو دینے کا ملال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔
- آسودگی، سکون، محبت آپ کو طشتری میں سجا کر قدرت کبھی پیش نہیں کرتی۔ اس کے حصول کے لیے آپ کا حرکت میں آنا ضروری ہے۔
- اسے المیہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ آج کا انسان کچھ بھی کھوئے بغیر بہت کچھ پانا چاہتا ہے۔
- جہاں محبت ہلکی ہو، عیب بھاری نظر آتے ہیں
- محبت دکھ نہیں دیتی، یہ دکھ ہم خود مستعار لیتے ہیں۔ اپنے غلط فیصلوں اور غلط نقطہ نظر سے۔

حورین ترنب، ثریا شاہ۔ کہروڑ پکا

خوشی اور قوم،

- لذتیں وقتی اور ہنگامی ہوتی ہیں۔ مسرتیں، شادمانیاں مستقل ہوتی ہیں۔ لذتوں کا جسم سے تعلق ہوتا ہے اور خوشیوں کا روح سے۔

(اشفاق احمد)

ثمینہ اکرم۔ کراچی

دنیا سے نصیحت

حضرت حاتم سے پوچھا گیا کہ "دنیا میں نصیحت یافتہ کب ہو سکتے ہیں؟"
فرمایا "جب یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جائے کہ دنیا کی ہر چیز کا انجام بربادی ہے اور دنیادار کو انجام کار مٹی میں جانا ہے لہٰذا تعجب ہے اس شخص پر جس کے سامنے جنازہ گزرے اور وہ اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔

عاصمہ ندیم۔ کراچی

مشکل ترین کام،

حضرت امام شافعی علیہ الرحمتہ کا فرمان ہے کہ تین کام سب سے مشکل ہیں۔ تنگ دستی کے باوجود سخاوت کرنا۔ تنہائی اور خلوت میں بھی تقویٰ اختیار کرکے گناہ سے بچنا۔ اور ایسے شخص کے سامنے حق بات کہنا جس سے امیدیں بھی وابستہ ہوں اور اس سے خوف بھی لاحق ہو۔

واصف خیال،

٭ گمانوں کی تاریک راتوں میں یقین کے چراغ جلتے ہی رہتے ہیں۔
٭ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں بھولنے کی صفت دی ہے۔ ورنہ ایک غم ہمیشہ کے لیے غم بن جاتا۔
٭ خوف بدعملی کی سزا ہوتا ہے۔
٭ خواہشات کا ادھم مچا ہوا ہے۔ نصیحت کی آواز کیسے سنائی دے۔
٭ گناہ کا احساس پیدا ہو جائے تو گناہ سے نفرت ضرور پیدا ہو گی۔
٭ چھوٹے معاشرے میں عزت کے کام سے مشہور ہونے والا آدمی در اصل ذلت میں ہے۔
٭ بڑی سے بڑی اور آسان فقیری یہی ہے کہ ہمیں اللہ کا ہر فیصلہ منظور رہے۔
٭ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں، محبت کو نہیں۔
٭ نیت کا گناہ نیت کی توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ عمل کا گناہ عمل کی توبہ سے دور ہوتا ہے۔ تحریر کا گناہ تحریر کی توبہ سے ختم ہو جاتا ہے۔

نوال افضل کھمن۔ کراچی

اخلاص،

منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد سے لوگوں نے کہا کہ فلاں جگہ ایک درخت ہے۔ لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کو خدا سمجھتے ہیں۔ یہ سن کر عابد کو غصہ آیا اور ایک کلہاڑا کندھے پر رکھ کر اس درخت کو کاٹنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسے ایک بوڑھے شخص کی صورت میں ابلیس ملا اور پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "فلاں درخت کاٹنے کے لیے جا رہا ہوں۔"

ابلیس نے کہا۔ "جاؤ اللہ کی عبادت کرو۔ عبادت میں مشغول رہنا تمہارے اس کام سے بہتر ہے۔"

عابد نے کہا۔ "میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گا کہ اب میری عبادت یہی ہے۔"

ابلیس نے کہا۔ "میں تم کو نہیں جانے دوں گا۔" اور وہ عابد سے لڑنے لگا۔ عابد نے ابلیس کو زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ تب ابلیس نے کہا۔

"اگر اس درخت کا کاٹنا اللہ کو منظور ہوتا تو اپنے کسی پیغمبر کو حکم فرماتا اور اس نے حکم تو تم کو بھی نہیں دیا ہے۔ پس یہ کام کیوں کرتے ہو؟"

عابد نے کہا۔ "میں ضرور یہ کام کروں گا۔"

دونوں پھر لڑنے لگے۔

عابد نے ابلیس کو پٹخ دیا۔

ابلیس نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔ اے عابد جو کچھ لوگ تم کو دے دیتے ہیں اس پر تمہاری گزر ہے۔ اگر تمہارے پاس کافی مال ہو تو خود اپنے کام میں بھی لاؤ اور دوسرے درویشوں پر بھی خرچ کرو، تم جھاڑ کو مت کاٹو۔ اگر تم نے درخت کاٹ بھی دیا تو بت پرست دوسرا درخت لگا دیں گے ان کا کچھ نقصان نہ ہو گا۔ اگر تم نے درخت نہیں کاٹا اور تم اس خیال سے باز رہے تو میں ہر صبح تمہارے بستر کے نیچے دو دینار رکھ دیا کروں گا۔"

عابد نے سوچا کہ نہ تو مجھے درخت اکھاڑنے کا حکم ملا ہے اور نہ میں پیغمبر ہوں کہ یہ کام مجھ پر واجب ہو۔

غرض اسی خیال میں محو وہ اپنے گھر واپس آ گیا۔

اس کو تین دن تک دو دینار ملتے رہے۔ عابد نے کہا۔

"اچھا ہوا جو میں نے درخت کو نہیں کاٹا۔"

چوتھے دن عابد کو یہ دینار نہیں ملے۔ اسے سخت غصہ آیا اور کلہاڑا اٹھا کر درخت کاٹنے روانہ ہو گیا۔

ابلیس نے پھر راستے میں آ لیا اور پوچھا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

عابد نے کہا "فلاں درخت کاٹنے جارہا ہوں۔"

ابلیس نے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ خدا کی قسم اب تم درخت نہ کاٹ سکو گے۔"

یہ سنتے ہی عابد ابلیس سے لڑنے لگا اور دو تین جھٹکوں ہی میں ابلیس نے عابد کو پٹخ دیا اور یہ اس کے ہاتھ میں بالکل چڑیا کی طرح حقیر و بے بس ہو رہا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ ابھی واپس چلے جاؤ ورنہ تمہارا سر کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

عابد نے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا۔

"میں واپس چلا جاؤں گا لیکن مجھے اتنا بتا دے کہ پہلے دو مرتبہ میں تجھ پر غالب آیا اور اب تو مجھ پر غالب آگیا اس کا سبب کیا ہے؟"

ابلیس نے جواب دیا۔ "اول تو خدا کے واسطے غصے میں آیا تھا۔ تب خدا نے مجھ کو مغلوب کر دیا تھا اور جو کوئی کچھ کام خدا کے واسطے اخلاص سے کرتا ہے اس پر میرا زور نہیں چلتا اور اس بار تیرا غصہ محض دیناروں کے سبب سے تھا، اس لیے میں غالب آگیا۔

ارم، نادیہ، تجمہ۔ کراچی

مہکتے پھول

- ہمیشہ اپنی نشست و برخاست ان لوگوں میں رکھو جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔
- انسان کو خیالات کا بلند ہونا چاہیے باتوں کا نہیں کیونکہ ایک چھوٹا پرندہ اونچی عمارت پر بیٹھ کر عقاب نہیں بن جاتا۔
- اگر شخصیت میں پختگی ہو تو عادت میں سادگی خود بخود آجاتی ہے۔
- آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔
- اگر تم والدین کی باتوں پر توجہ دو تو لوہے کی، پتھر کی سلیں بھی تمہارے ہاتھوں موم بن جائیں گی۔
- کبھی بھی کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے آنسو تمہارے لیے سزا بن جائیں۔
- خوشبو اور مسکراہٹ دو اہم خزانے ہیں۔ خوشبو کو اپنے جسم اور مسکراہٹ کو دوسروں پر نچھاور کرو۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

تکبر

ایک روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بڑا عابد و زاہد تھا اور ایک فاسق و بدکار۔ وہ عابد بیٹھا ہوا تھا اور ایک ٹکڑا ابر کا اس پر سایہ فگن تھا۔ اس فاسق کو خیال آیا کہ جاؤں اور جا کر اس عابد کے پاس جا بیٹھوں۔ شاید حق تعالیٰ اس کی برکت سے مجھ پر رحم فرمائے۔

جب یہ فاسق اس عابد کے پاس جا کر بیٹھا تو عابد نے اپنے دل میں خیال کیا کہ یہ نالائق میرے پاس آکر کیوں بیٹھتا ہے۔ اس جیسا نکما بھی کوئی اور ہوگا۔" یہ خیال کر کے اس نے فاسق سے کہا۔

"اٹھو اور یہاں سے جاؤ، تمہارا میرے پاس کیا کام؟"

وہ بے چارا اٹھ کر چلا گیا۔ اور ابر کا وہ ٹکڑا بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ تب اس عہد کے رسول پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہہ دو کہ اب دونوں از سر نو عمل کریں کہ جو گناہ فاسق نے کیے تھے وہ میں نے اس کے ایمان نیک کے باعث بخش دیے اور عابد نے جو عبادت کی تھی اس کے تکبر کے سبب سے برباد کر دی گئی۔

(کیمیائے سعادت۔ امام غزالی)

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

میں پھول چنتا ہوں

- عیش پسندی سے بچو، اللہ کے بندے عیش پسند نہیں ہوتے۔
- دنیا قدیم ہے لیکن اس کا نیا پن کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انیقہ انا۔ چکوال

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

سیدہ لوبا سجاد ـــــــ کہروڑ پکا

دل اُن سے کھل کے جو کہہ دے تو کوئی بات بنے
وگرنہ صبر سے سہہ لے تو کوئی بات بنے
مجھے وہ مل ہی کبھی جائے گا کہیں نہ کہیں
میں خود کو ڈھونڈ لوں پہلے تو کوئی بات بنے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

یہ توجہ کا تقاضا بھی غلط ہے ان سے
دل کی قیمت تو فقط ایک نظر ہوتی ہے

طیبہ سعدیہ عطاریہ ـــــــ کھڈیالہ

وہ مجھ کو چھوڑ کے خوش ہے تو شکایت کیسی
اب میں اس کو خوش بھی نہ دیکھوں تو محبت کیسی

اُم موسیٰ احسان ـــــــ عبدالحکیم

انا کی قید سے نکلے مقابلہ تو کرے
وہ میرا ساتھ نبھانے کا حوصلہ تو کرے

مدیحہ نورین مہک ـــــــ برنالی

اس بار میری جنگ ہے خود اپنی ذات سے
اس بار ہار جانے کا امکان بہت ہے

ارم ذوالفقار، نادیہ، نجمہ ـــــــ گلستان جوہر

بڑھتی ہیں دل کی الجھنیں راحت کے ساتھ ساتھ
تنہائیاں بھی ملتی ہیں شہرت کے ساتھ ساتھ
سمجھو نہ کارِ عشق کو جز وقتی مشغلہ
ممکن نہیں کچھ اور محبت کے ساتھ ساتھ

شائستہ اکبر ـــــــ گڈو کالونی

اب وہ منظر نہ وہ چہرے نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں

اقصیٰ ناصر ـــــــ کراچی

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اُس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

اقرا صادق ـــــــ بہاول پور

میں لوگوں سے ملاقات کے لمحے یاد رکھتی ہوں
میں باتیں بھول جاتی ہوں لہجے یاد رکھتی ہوں

ثمرہ ہاشمی ـــــــ کندیاں

بہت پہلے سے ان کے قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فہمیدہ گل ـــــــ لاڑکانہ

کاش آ جائے وہ، مجھے جاں سے گزرتے دیکھے
اس کی خواہش تھی کبھی مجھ کو بکھرتے دیکھے
وہ سلیقے سے ہوئے ہم سے گریزاں ورنہ
لوگ تو صاف محبت میں مکرتے دیکھے

نوال افضل گھمن ـــــــ کراچی

جس شام بدلتے ہیں تیرے ہجر کے بادل
اس صبح کوئی ہجر کا مارا نہیں ہوتا
یونہی میرے پہلو میں چلا آتا ہے اکثر
وہ درد جسے کبھی میں نے پکارا نہیں ہوتا

شگفتہ ناز ـــــــ میاں چنوں

فضا میں رنگ نہ ہوں آنکھ میں نمی بھی نہ ہو
وہ حرف کیا کہ رقم ہو تو روشنی بھی نہ ہو
ملے تو مل لیے بچھڑے تو یاد بھی نہ رہے
تعلقات میں ایسی رواروی بھی نہ ہو

کائنات اصغر۔ لونزدار ـــــــ ڈہرکی

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
میرے قاتل حسابِ خوں بہا، ایسا نہیں ہوتا
ہر اک صبح ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسا نہیں ہوتا

سیدہ لوبا سجاد ــــــــ کھروڑ پکا

میں سب میں ایک سا تقسیم تھا مگر پھر بھی
کسی بہانے خفا ہو گیا کوئی نہ کوئی
میں کس سے پوچھنے نکلوں، کسے تلاش کروں
قدم قدم پہ جدا ہو گیا کوئی نہ کوئی

رابعہ اقبال ــــــــ حاجی واہ

آئے کوئی آ کر یہ تیرے درد سنبھالے
ہم سے تو یہ جاگیر سنبھالی نہیں جاتی
ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

صدف عمران ــــــــ کے ڈی اے کراچی

برسوں کے انتظار کا انجام لکھ دیا
کاغذ پہ شام کاٹ کر پھر شام لکھ دیا
بکھری پڑی تھیں ٹوٹ کر کلیاں زمین پر
ترتیب دے کے میں نے تیرا نام لکھ دیا

نخبہ اکرم ــــــــ گاؤں گوئیکی

بھنور کی گود میں جیسے کنارہ ساتھ رہتا ہے
کچھ ایسے ہی ہمارا اور تمہارا ساتھ رہتا ہے
سفر میں عین ممکن ہے کہ خود کو چھوڑ دوں لیکن
دعائیں کرنے والوں کا سہارا ساتھ رہتا ہے

نودین مسکان پیرود ــــــــ ڈسکہ

لوگ پتھر مارنے آئے تو وہ بھی ساتھ تھے
ہم خطائیں جن کی اپنے نام لکھواتے رہے

جے، آئی، اے ــــــــ ڈیرہ غازی خان

عجب ہے دستور قضا کا آئین عشق میں
کہ دیتے ہیں قاتل کو بھی دعا آئین عشق میں

فریحہ شبیر ــــــــ شاہ نکڈر

جانے کتنے ہی سوالات ادھورے تھے!!
وقتِ رخصت اس نے میری آنکھوں میں تو دیکھا ہوتا

بینا ــــــــ کراچی

مسلسل عذاب رہی ہے محبت آپ کی
دھوکا سراب رہی ہے محبت آپ کی
آرزو رہی آپ کے لب و رخسار کی
ادھورا خواب رہی ہے محبت آپ کی

عذرا ناصر ــــــــ کراچی

نہ پوچھ عہدِ الفت کی، بس اک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پہ لائے، نہ دل کا مدعا سمجھے

اقصیٰ ناصر ــــــــ کراچی

بس اک تیرے بچھڑنے کی دیر تھی
سمٹ کر آ گیا لمحوں میں کرب صدیوں کا

کرن اکبر ــــــــ کراچی

کلی پہ قطرۂ شبنم کا دکھ عیاں نہ ہوا
امیدوار تھے ہم بھی اسے گماں نہ ہوا
تمام شہر میں اس کے کرم کے چرچے تھے
یہ اور بات کہ ہم پر وہ مہرباں نہ ہوا

کائنات اصغر بوزدار ــــــــ ڈہرکی

خاموش ہو، دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے
دہشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و ماہ و انجام کو بجھا کیوں نہیں دیتے

حرا شاہ ــــــــ شجاع آباد

اگر ہم سے محبت تھی، ہمارا مان تو رکھتے
تم اپنے لوٹ آنے کا کوئی امکان تو رکھتے

آمنہ اجالا ــــــــ ڈہرکی

یہ ضروری تو نہیں ہے کہ سدا رہیں مراسم
یہ سفر کی دوستی ہے اسے روگ مت بناؤ

شازیہ رانا ــــــــ پاک پتن شریف

جو ہر قدم پہ نبھانے کی کھا رہا تھا قسم
وہ دو قدم پہ ہی اپنا بیان بدلنے لگا

رافیہ بلوچ ــــــــ کھوکھی

جھوٹی ہیں ساری وحشتیں، شوق کی ساری شدتیں
اس کی طلب کے نام پر، کرتے ہو خود سے پیار تم

ایمن فاطمہ ــــــــ پسرور

ورق ورق شکستہ پتوں کی داستان ہے
خزاں میں اپنی چاہتوں کا باب کیا لکھے کوئی

امتہ الصبور

حضرت عیسیٰ کے حواری کی غدار بیوی

حضرت عیسیٰ کے عہد نبوت میں "شمشون اسرائیل" نامی ایک شخص تھے' جو روم کے کسی شہر کے تھے اور بوجہ رشد و ہدایت کے جو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا ہوئی' وہ حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں میں سے ہو گئے تھے۔ شمشون کے خاندان کے لوگ بُت پرست تھے اور شہر میں رہتے تھے۔ انہوں نے بستی سے دور ایک مکان میں سکونت اختیار کرلی اور موقع بہ موقع آپ شہر والوں سے جہاد کرکے ان کو قید کرلیتے اور مال غنیمت حاصل کرتے۔ بعض اوقات آپ بغیر کچھ کھائے پیئے کئی کئی دن قتال کرتے اور جب کبھی آپ کو پیاس لگتی تو آپ کے لیے پتھروں سے پانی نکلنے لگتا اور آپ خوب سیر ہو کر پی لیتے۔ رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کو قوت بطشی (گرفت) اعلا پیمانے پر عطا ہوئی تھی۔ اس لیے اہل شہر ان سے پریشان تھے اور ان کا کچھ نہ کرسکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن آپس میں مشورہ کیا کہ ان سے کس طرح نپٹا جائے۔ اہل مشورہ میں سے کسی نے کہا۔

"کہ جب تک ان کی اہلیہ سے ساز باز نہیں کریں گے تب تک ان پر قابو پانا مشکل ہے۔"

چنانچہ ان لوگوں میں سے کچھ حضرت شمشون کی بیوی کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ "اگر تم اپنے شوہر کے خلاف ہمارا ساتھ دو گی تو ہم تم کو اتنا مال انعام میں دیں گے۔"

چنانچہ یہ عورت مال کی طمع میں اپنے شوہر سے غداری کرنے پر رضامند ہو گئی اور ان سے وعدہ کرلیا کہ میں ضرور تمہاری مدد کروں گی۔ ان لوگوں نے عورت کو خوب مضبوط رسیاں دے دیں اور کہا کہ جب شمشون سو جائیں تو یہ رسیاں آپ کے پاؤں میں ڈال کر گردن سے جکڑ دینا۔ اس طرح وہ عورت کو خوب سمجھا کر واپس چلے گئے۔

"رات کو جب حضرت شمشون گھر تشریف لائے' سونے کے لیے لیٹ گئے اور خوب غافل ہو گئے تو عورت نے آپ کے شانوں میں رسیاں ڈال کر آپ کے ہاتھ گردن سے جکڑ کر خوب مضبوط باندھ دیے اور صبح کے انتظار میں لیٹ گئی۔ لیکن جب آپ نیند سے بیدار ہوئے اور آپ نے ہاتھ پھیلائے تو رسیاں ٹوٹ گئیں' آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بیوی سے پوچھا۔

"کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟"

مکار بیوی نے جواب دیا "یہ میں نے آپ کی قوت آزمانے کے لیے کیا تھا کہ دیکھوں آپ کتنے طاقت ور ہیں۔"

اس کے بعد اس عورت نے خفیہ طور سے شہر والوں کو کہلا بھیجا "میں نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا تھا' مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیونکہ وہ بھی ان کی طاقت کے سامنے موم بن گئیں۔"

یہ سن کر شہر والوں نے اس کے پاس لوہے کا طوق اور زنجیر بھجوادی اور کہا "کہ جب وہ سو جائیں تو یہ ان کی گردن میں ڈال دینا۔

چنانچہ رات کو عورت نے ایسا ہی کیا' مگر جب حضرت شمشون بیدار ہوئے تو یہ طوق اور زنجیر بھی آپ کے گلے سے ٹوٹ کر نکل گئی۔

آپ نے عورت سے پھر وہی سوال کیا تو اس نے پھر وہی جواب دیا اور کہنے لگی

"کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس سے تم مغلوب ہو جاؤ۔"

آپ نے فرمایا "کہ صرف خدا تعالیٰ مجھ کو مغلوب کر سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو ایک اور چیز بھی مجھے مغلوب کر سکتی ہے۔"

عورت نے پوچھا کہ "وہ کیا چیز ہے؟"

آپ نے فرمایا "وہ چیز میں تجھ کو نہیں بتلا سکتا۔" لیکن یہ مکار اور غدار عورت ان کو بہکاتی اور پھسلاتی رہی اور وہ ترکیب معلوم کرتی رہی، اصرار کرتی رہی۔

حضرت شمشون کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔

آپ نے فرمایا کہ

"میری والدہ میرے لیے ایک بہت ڈر کی چیز چھوڑ گئی ہیں اور وہ میرے یہ سر کے بال ہیں، اگر کوئی مجھے ان سے باندھ دے گا تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ کیونکہ ان پر میرا بس نہیں چلتا۔"

عورت یہ معلوم کر کے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی اور جب رات کو آپ سو گئے تو اس نے چپکے سے اٹھ کر آپ کے بالوں سے آپ کو باندھ دیا اور شہر والوں کو اطلاع دے دی۔ چنانچہ شہر والے آئے اور حضرت شمشون کو پکڑ کر لے گئے اور آپ کے کان و ناک کاٹ دیے، آنکھیں نکال کر شہر کے وسط میں لوگوں کے تماشا کے لیے کھڑا کر دیا۔ اس شہر میں جگہ جگہ ستون کھڑے تھے جن پر بیٹھ کر لوگ ان کا تماشا بنا رہے تھے۔ بادشاہ بھی تماشا دیکھنے کے لیے محل سے نکلا اور ایک مینارہ پر شہر کے دیگر عمائدین شہر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چنانچہ جب آپ کا مثلہ کیا جانے لگا تو آپ نے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی کہ

"الٰہی! تو مجھ کو ان پر مسلط فرما دے۔"

رب تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پھر صحیح و سالم فرما کر حکم دیا کہ شہر کا وہ مینارہ جس پر بادشاہ دیگر لوگ بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں، اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، جس سے وہ سب لوگ ہلاک ہو گئے اور آپ کی غدار بیوی پر خدا تعالیٰ نے بجلی گرا دی، جس سے وہ بدبخت جل کر خاکستر ہو گئی۔

پہاڑ ہل گیا

جعفر صادق محمد الباقر سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک دین دار شخص تھا جس کا معاملہ اللہ کے ساتھ اچھا تھا اور اس کی ایک عورت تھی جو نہایت خوب صورت تھی، وہ دین دار شخص باہر جاتا تو گھر کا دروزاہ باہر سے مقفل کر کے جاتا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کسی جوان مرد سے اس کی بیوی کی آنکھ لڑ گئی، وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے مگر باہمی معاملات کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی، عورت نے کسی ذریعے سے باہر کے تالے کی ایک کنجی بنوائی اور اس نوجوان کو بھجوا دی۔

اس نوجوان کا اس عورت کے پاس اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ رات اور دن میں جب کبھی اس کو موقع ملتا وہ دروازے کا تالا کھول کر اس کے پاس آ جاتا۔ عورت کے شوہر کو اس آمد و رفت کی عرصہ دراز تک خبر نہ ہوئی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کا شوہر چونکہ ایک عابد و زاہد شخص تھا تو اس کو خود بخود یہ احساس ہوا کہ اس کی عورت اس سے کچھ کنارہ کشی اختیار کرنے لگی ہے، چنانچہ اس نے اس خدشہ سے عورت کو مطلع کر دیا اور کہا۔

"مجھے اسی وقت اطمینان ہو سکتا ہے جبکہ تو اپنی عفت و عصمت پر حلف اٹھا لے گی۔ عورت اس پر راضی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"جب آپ کا جی چاہے مجھ سے حلف لے لیجیے۔"

جس شہر کا یہ واقعہ ہے وہاں ایک پہاڑ تھا اور اس کے قریب ایک نہر بہتی تھی، وہاں جا کر بنی اسرائیل قسم اور حلف اٹھایا کرتے تھے اور جو شخص وہاں پر جھوٹی قسم یا حلف اٹھاتا فوراً ہلاک ہو جاتا۔

میاں بیوی کے درمیان حلف کی بات چیت کے بعد اس کا آشنا اس کے پاس آیا تو اس نے اس سے اپنے شوہر کی بدگمانی اور پہاڑ پر چل کر قسم کھانے کا قصہ سنایا۔ یہ سن کر وہ نوجوان پریشان ہو گیا کہ اب کیا کیا جائے۔

عورت نے اس کو تسلی دی اور کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایسی ترکیب کروں گی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ فلاں دن فلاں وقت میں اپنے شوہر کے ساتھ قسم کھانے کے لیے اس پہاڑ پر جاؤں گی۔ لہٰذا تم بھیس بدل کر اور سواری کا ایک گدھا لے کر شہر کے باہر پھاٹک پر کھڑے ہوجانا اور جب تم ہم دونوں میاں بیوی کو آتا دیکھو تو گدھے کو لے کر ہمارے قریب آجانا۔ میں تمہارے گدھے پر پہاڑ تک جانے کے لیے سوار ہوں گی تو جلدی سے مجھے اٹھا کر گدھے پر سوار کرا دینا۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے؟

چنانچہ جب حلف اٹھانے کا دن آیا تو اس دین دار شوہر نے اپنی بیوی سے کہا۔

"چلو اس پہاڑ پر چلیں، تاکہ تم وعدے کے مطابق حلف اٹھا کر مجھے مطمئن کرسکو۔"

یہ سن کر وہ جلدی سے کپڑے بدلے بغیر چلنے کے لیے تیار ہوگئی اور کہنے لگی۔ میں پیدل پہاڑ پر نہیں جاسکتی۔

شوہر نے کہا "چلو شہر کے پھاٹک پر کوئی گدھے والا کھڑا ہوگا۔ اس کا گدھا کرایہ پر لے لیں گے۔"

چنانچہ دونوں گھر سے پیدل چل دیے۔ جب شہر کے دروازے پر پہنچے تو عورت کا آشنا گدھا لیے ہوئے وہاں موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی عورت نے آواز دی "او گدھے والے ہم تجھ کو نصف درہم دیں گے کیا تو ہمیں اس پہاڑ تک پہنچا دے گا۔" وہ بولا "جی ہاں پہنچا دوں گا" اور جلدی سے گدھا لے کر آیا اور عورت کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر گدھے پر بٹھا دیا اور روانہ ہوگئے۔

آگے آگے گدھا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے عورت کا شوہر اور وہ بہروپی گدھے والا چل رہا تھا۔ جب پہاڑ آگیا اور گدھے سے اترنے کا وقت آیا تو عورت نے اس بہروپیے کو آواز دی کہ گدھا پکڑ اور مجھ کو اتار دے۔" وہ آنے بھی نہ پایا تھا کہ عورت خود بخود گدھے سے گر

بڑی اور اس طرح گری کہ اس کا ستر بہروپیے کے سامنے کھل گیا۔

عورت اس کو بناوٹی گالیاں دینے لگی تو یہ بہروپیا بولا کہ بیگم صاحبہ میرا اس میں قصور نہیں ہے" اور اس کو پکڑ کر زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

اس کے بعد وہ پہاڑ پر چڑھے اور جب اس جگہ پر پہنچے جہاں قسم کھائی جاتی تھی تو عورت نے اپنے ہاتھ سے پہاڑ کو پکڑ لیا اور شوہر کی طرف مخاطب ہو کر قسم کھا کر کہنے لگی۔

جب سے تمہارا اور میرا ساتھ ہوا ہے، تب سے آج تک مجھے سوائے آپ کے اور اس گدھے والے کے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ دیکھا ہے۔" چونکہ یہ قسم ظاہر میں سچی تھی کہ سوائے اس کے شوہر اور اس بہروپیے کے کسی تیسرے شخص نے نہ اس کو چھوا

تھا، اس لیے وہ پہاڑ زور، زور سے ہلنے لگا اور زمین میں دھنس گیا اور بنی اسرائیل اس کو بھول گئے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے، ترجمہ "اگرچہ ان کفار و مشرکین کی سازشیں ایسی تھیں جن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے۔" (حوالہ بالا)

راجہ داہر کی ماں کا مکر و فریب

سندھ کی بدھ مت تاریخ پڑھیں تو آخری بادشاہ کی رانی کا نام سوہاندی ملے گا جو حسن و جمال میں یکتا تھی اور عقل و دانش میں بھی یگانہ..... مگر اول تا آخر صرف اپنی خواہشوں کی اسیر۔

اس کی دانش کے بطن سے جو منصوبے بھی جنم لیتے، وہ کچھ حاصل کرنے کی سازشوں پر مبنی ہوتے تھے۔ سوہاندی وہ خاتون تھی جسے عوام نے محبتوں کا تاج پہنا کر ملکہ کے عہدے پر فائز کیا۔ وہ لیڈر تھی، مگر اس نے مذہب، ملت اور ملک کو صرف اپنی خواہش اور محبت پر قربان کر دیا۔

سندھ کی تاریخ اس دور میں تاریکی میں بدلنا شروع ہوئی اور مذہب بھی یہیں سے تبدیل ہوا۔ اسی دور میں بدھا کا سندھ ہندو برہمنوں کی گود میں پکے ہوئے اس پھل کی طرح جا گرا جس پر محنت کوئی اور کرتا ہے، مگر وہ حاصل کسی اور کو ہو جاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کا ابتدائی دور، سندھ میں راں رائے سہاسی کی مضبوط حکومت سندھ کے علاوہ پنجاب اور بلوچستان کے کئی علاقوں پر مشتمل تھی۔ دارالحکومت آج کے روہڑی کے قریب رور نامی شہر تھا۔ اس وقت بھی یہ اتنا ترقی یافتہ تھا کہ شہر میں پختہ سڑکیں تھیں، سرسبز باغات اور مکانات رعایا کی خوش حالی کی گواہی دیتے تھے۔ پوری مملکت میں بدھ مت کے ماننے والے رہتے تھے اور خود بادشاہ بھی پشتوں سے بدھا کا ماننے والا تھا۔ رائے خاندان کے بدھا راجا کئی پشتوں سے اس علاقے پر حکمران تھے مگر اب ان کی بادشاہت کو سوہاندی کی شکل میں دیمک لگ چکی تھی۔

ایک روز راجا اپنا دربار سجائے ہوئے بیٹھا تھا کہ دربانوں نے چچ کی حاضری کی اطلاع دی۔ راجا نے سوہاندی کی طرف دیکھا جو اس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، مگر اس نے دربار میں موجود رہنا پسند کیا اور راجا نے وزیر چچ کو اندر طلب کر لیا۔

"چچ ذات کا ہندو برہمن تھا اور سندھ میں کہیں اور سے آیا تھا، دربار میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا وزارت کے عہدے تک پہنچا اور مقرب خاص بن گیا۔

رانی سوہاندی نے جب اسے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، کیونکہ چچ ایک وجیہہ آدمی تھا۔ اگلے دن ہی رانی کے خاص کارندے چچ کے پاس پہنچ گئے اور اسے رانی کا پیغام پہنچایا، مگر چچ نے انکار کر دیا، اس کا کہنا تھا.....

"تین چیزوں پر کبھی بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے، ایک آگ، دوسرا پانی اور تیسرا راجا۔ میں راجا کا ملازم ہوں اور اپنے انجام سے ڈرتا ہوں، مجھے اپنی امیدوں کو عبرت ناک انجام سے بچانا چاہیے۔"

رانی کا اقرار اور چچ کا انکار محض ابتدا تھی، مگر جب ایک بار رابطے شروع ہو جائیں تو پھر بات آگے بڑھتی

رہتی ہے۔ سن گن رکھنے والوں نے راجا رائے کے کانوں تک بات پہنچائی' مگر اس نے یقین کرنے سے انکار کردیا۔

دربار میں موجود ایسے لوگ جنھوں نے راجا تک یہ باتیں پہنچائی تھیں' رانی نے انھیں کوڑے لگواکر دربار سے باہر پھنکوا دیا۔ سوہاندی بندہ مار قسم کی عورت تھی' نہ جانے اس نے رائے سہاسی پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ اس کی ہر بات مانتا چلا جاتا۔ یہی جادو اب اس نے چچ پر بھی کردیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو راجا دیکھنے کے سپنے سجالیے۔

پھر اچانک راجا سہاسی بیمار پڑ گیا۔ حکیموں' طبیبوں نے اس کے بہتیرے معالجے کیے' مگر رانی نے کسی کی ایک نہ چلنے دی' تاریخ کی بعض کتابوں میں ملتا ہے کہ رانی اپنے شوہر سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے آہستہ آہستہ زہر دے رہی تھی اور اسی وجہ سے دوائیں اثر نہیں کرتی تھیں۔

آخر کار ایک روز راجا آنجہانی ہوگیا' مگر سوہاندی نے کسی کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ اس نے پچاس ایسے افراد کی فہرست بنا رکھی تھی جو مملکت کے اہم عہدوں پر فائز اور رانی کے مخالف تھے۔ سوہاندی نے سب کو ایک ایک کرکے اپنے محل میں طلب کیا اور ان کی توقعات کے عین خلاف انھیں زنجیروں میں جکڑ دیا' اس کے بعد راجا کے ان غریب اور ناراض رشتہ داروں کو بلوایا جو نظر انداز کیے جانے پر دل برداشتہ تھے۔ رانی ان میں سے چند کو کسی ایک پابہ زنجیر قیدی کے پاس لے جاتی اور بتاتی۔

راجا سے تمہاری دوری اور غربت کی وجہ یہ شخص تھا' اسی لیے راجا نے اب اسے قید کرلیا ہے اور تمھیں حکم دیا ہے کہ اپنا بدلہ لے لو۔''

اپنی زندگی بھر کی ذلتوں کا ذمے دار سامنے دیکھ کر غریب آدمی فوراً'' آپے سے باہر ہوجاتا اور قیدی کو مار ڈالتا' اسی طرح پچاس کے پچاس مخالفین خاموشی سے موت کے گھاٹ اتر گئے اور کوئی بڑا مخالف سامنے نہیں رہا۔

اس کے ساتھ ہی رانی کے حمایتیوں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہوگیا' کیونکہ اس نے جن لوگوں سے قتل کرائے تھے انھیں بھاری انعام بھی دیا تھا۔

راتوں رات امیر بن جانے والے رانی کے حمایتی تھے' ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اس نے ایک روز دربار منعقد کیا اور درباریوں کو بتایا کہ راجا رائے اتنا بیمار ہے کہ دربار میں نہیں آسکتا' مگر اس نے چچ کو اپنا جانشین مقرر کردیا ہے اور اب وہی حکومت کے معاملات دیکھے گا' اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو بتائے؟

اعتراض کرنے والوں کا حشر سب کے سامنے تھا' اب مزید کس کا دم تھا۔ یوں ایک ہندو' برہمن' جو پجاری اور ویدوں کا عالم تھا اور سندھ سے اس کا تعلق بھی نہیں تھا' وہ رائے خاندان کی بدھ سلطنت کا بادشاہ بن گیا اور اس کے بھانجے' بھتیجے جو مندروں اور کھنڈروں میں ایک وقت کے کھانے کی تگ و دو میں جی رہے تھے شہزادے کہلانے لگے۔

چچ کی حکومت تیس سال قائم رہی' اس عرصے میں ہندو برہمن نے سارے بدھوں کو بھی ہندو بنا دیا اور سندھ ہندو مملکت کے طور پر مانا جانے لگا۔

چچ اور رانی سوہاندی کے دو بیٹے ہوئے جن میں سے ایک راجا داہر کے طور پر تاریخ میں محفوظ ہے۔ یہ وہی ڈاکو حکمران ہے جو مسلمان تاجروں کو لوٹا کرتا تھا' اسی سے اپنی عزت بچانے کے لیے کسی مسلمان عرب عورت نے سندھ کے ساحل پر حجاج کو پکارا تھا اور اس کے جواب میں محمد بن قاسم سندھ میں آئے اور راجہ داہر مارا گیا' راجا داہر اسی دھوکے باز رانی سوہاندی کا ڈاکو بیٹا تھا۔

(بہ شکریہ جسارت)

✡

واصفہ سہیل

آس پاس کی سنیں

کام کرنے کے بعد (نام کمانے کے بعد) جب فلموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی تو میں نے قبول کرلی۔ (اتنا انتظار کرنے کے بعد جو آفر ہوئی تھی) انہوں نے مزید کہا کہ پاکستانی فلموں کا معیار اور ہمارے فنکاروں کا انداز بہت الگ ہے اور ان کی شب و روز محنت کو دیکھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت جلد پاکستان کی فلمی صنعت دنیا میں اپنا بڑا نام بنالے گی (عروہ، بولی وڈ یا ترا تنا کام ہو گئی ہے کیا؟ آپ کی باتوں سے تو یہی لگ رہا ہے کہ۔۔۔؟)

قدم

بولی وڈ میں کام کرنے والے پاکستانی فنکار۔ اپنے رشتے داروں کو بھی بولی وڈ میں کھڑا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ جاوید شیخ نے اپنی بیٹی مومل شیخ کو متعارف کروایا تو ماورا نے عروہ کو متعارف کرانے کی کوشش کی۔ اب علی ظفر کیوں پیچھے رہتے انہوں نے بھی اپنے بھائی کو ان کرایا "دانیال ظفر بولی وڈ

خواہش

خواتین ڈائجسٹ کی مصنفہ فرحت اشتیاق ان دنوں "پرواز جنون" کے نام سے فلم لکھ رہی ہیں۔ پاک فضائیہ کے اشتراک سے بننے والی فلم کے مرکزی کرداروں میں حمزہ علی عباسی اور خالد عثمان بٹ شامل ہیں۔ ہیروئن کا نام ابھی صیغہ راز میں رکھا جارہا ہے۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ اس فلم کی ہیروئن ماہرہ خان ہی ہوں گی۔ (ویسے مایا علی بھی اس کی ہیروئن ہو سکتی ہیں) خالد عثمان کا کہنا ہے کہ انہیں بچپن سے ہی پائلٹ بننے کا شوق تھا لیکن بن نہ سکے (کیوں؟) اب ان کی یہ خواہش حقیقت میں نہ سہی فلم میں ضرور پوری ہونے جارہی ہے۔

ناکام

اداکارہ عروہ حسین کا کہنا ہے کہ ماڈلنگ اور ٹی وی پر

کے سب سے بڑے فلمی بینر اسٹار راج کے تحت بننے والی فلم کے ذریعے انڈسٹری میں قدم رکھیں گے۔ دانیال ظفر جو ہیں تو گلوکار لیکن فلم میں اداکاری کے جوہر دکھائیں گے۔ کیونکہ فلم کی کہانی بھی ایک میوزک بینڈ کے متعلق ہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علی ظفر کی طرح دانیال ظفر بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہیں یا۔۔۔ (بھئی لوٹ کے بدھو۔۔۔ آئے) ویسے تو اس فلم کے ڈائریکٹر فیصل حبیب ہیں (جو کہ گمنام ہیں) اور فلم میں مزید پانچ نئے چہرے بھی سامنے لائے جارہے ہیں (لو جی پھر تو بالکل ہی ڈوب گئی۔ بھئی نیا اور کیا۔۔۔؟)

مشورہ

ریڈیو پاکستان لاہور کو اپنا گھر کہنے والے راشد محمود کہتے ہیں آج میں جو کچھ ہوں ریڈیو پاکستان لاہور کی وجہ سے ہی ہوں (راشد محمود کو اس سال پرائڈ آف پرفارمنس کے لیے نامزد کیا گیا ہے) اور یہ اعزاز بھی مجھے اسی وجہ سے ملا ہے۔ میں اپنے کام سے گھبراتا بالکل نہیں ہوں، منافق بالکل نہیں ہوں دل میں جو کچھ ہو وہ بیان کر دیتا ہوں۔

راشد محمود نے کہا کہ اگر ماضی پر نظر ڈالی جائے تو پاکستانی فلمیں بھی لاجواب ہیں لیکن جب "گھس پیٹیوں" نے فلمی صنعت میں قدم رکھا تو وہ تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ انہوں نے مزید کہا کہ قوم کی بیٹی شرمین عبید چنائے نے دو آسکر ایوارڈ مسلسل حاصل کیے۔ جو دنیا کے فنکاروں کا خواب ہوتا ہے۔ لیکن میں اپنی بیٹی سے سوال کرتا ہوں کہ کیا انہیں پاکستان میں صرف تیزاب پھینکنے اور غیرت کے نام پر قتل کے جرائم ہی نظر آتے ہیں ہمارے دین۔ نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ دنیا کے کسی مذہب نے نہیں ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ کوئی ایسی دستاویزی فلم بنائیں جس میں ہمارے مذہب اور ملک کا روشن پہلو نمایاں ہو۔ (مشورہ تو اچھا ہے مگر۔ ایوارڈ۔۔۔؟)

ادھر ادھر سے

★ میر قاسم کا شمار جماعت اسلامی کے اہم ترین رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ بنگلہ دیش کے معروف کاروباری شخصیت تھے۔ انہوں نے جماعت اسلامی کو از سر نو تشکیل دے کر مالی طور پر مستحکم کیا۔ وہ شپنگ بینکنگ اور رئیل اسٹیٹ کے شعبے سے وابستہ تھے اور ان کا شمار بنگلہ دیش کے بزنس ٹائیکون میں کیا جاتا تھا۔ 2012ء میں جب انہیں گرفتار کیا گیا تو وہ ایک پرائیویٹ میڈیا گروپ کے سربراہ تھے۔ جو جماعت اسلامی کا اخبار اور پرائیویٹ ٹی وی چینل چلاتا تھا لیکن بعد ازاں اخبار اور ٹی وی چینل بند کر دیا گیا۔ میر قاسم نے اپنی سزا کے خلاف بنگلہ دیش کے صدر سے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اپیل کی صورت میں انہیں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو قبول کرنا ہوتا جو انہوں نے گوارا نہ کیا۔ میر قاسم کے بیٹے میر احمد قاسم جو خود ایک وکیل ہیں اپنے والد کا قانونی دفاع کر رہے تھے۔ انہیں گزشتہ ماہ سیکیورٹی فورسز نے مبینہ طور پر اغوا کر لیا تھا۔

(آج کی دنیا۔ اشتیاق بیگ)

دستک دستک دستک

شاہین رشید

انعم قاضی، آر جے ایف ایم 101

"کیسی ہو...؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ریڈیو کیسا چل رہا ہے۔ مطلب تمہاری جاب؟"

"بہت اچھا... میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ مائیک ایک بے جان چیز ہے تو بے جان چیز کے آگے بولنا کیسا لگتا ہے؟"

"میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ جب ہماری ٹریننگ ہو رہی تھی تو ہمیں ایک بات بتائی گئی تھی کہ آپ کے سامعین تک ہر وہ بات پہنچے گی جو آپ کہیں گی... یہ مائیک لاکھوں، کروڑوں کانوں تک آپ کی بات پہنچاتا ہے... اور... یہ کہ اس مائیک کے لیے یہ مت سوچیے گا کہ آپ جو کہہ دیں گی بھول جائے گا... ایسا نہیں ہے۔ لاکھوں لوگ اس کے ذریعے آپ کی باتوں کو سنتے ہیں۔ آپ کو فالو کرتے ہیں۔ کوئی ہمیں ہماری موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ کوئی ہمیں خاموشی کے ساتھ سنتا ہے۔ کوئی بس میں، کوئی ڈھابے میں تو کوئی کچن میں..."

"ریڈیو کی مقبولیت کا اندازہ آپ کو کس طرح ہوتا ہے؟"

"لوگوں کی لائیو کالز سے اور اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگائیں کہ اب ہر سیل فون پہ ایف ایم ریڈیو کا آپشن ہوتا ہے۔ ہینڈ فری ہوتا ہے جسے لگا کر آپ آرام سے ہجوم میں بیٹھ کر اپنے من پسند آر جے کو سن سکتے ہیں۔ گانے سن سکتے ہیں، ان کی باتیں سن سکتے ہیں... ٹی وی کے تو آگے بیٹھنا پڑتا ہے۔ پروگرام کا انتظار کرنا پڑتا ہے، مگر ریڈیو کے لیے وقت کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔"

"آر جے بننے سے پہلے جب آپ ریڈیو سنتی تھیں تو کیسا لگتا تھا؟"

"میں جب سنتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میرے لیے کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ ساری باتیں میرے دل کو لگتی تھیں۔ اگر پریشان ہوں تب بھی اور اگر خوش ہوں تب اور میں نے دیکھا کہ اکثر خواتین خود بخود مسکرا دیتی ہیں، جیسے مخاطب ان سے ہی باتیں کر رہا ہے۔ وہی آر جے کامیاب ہے جو آپ کے دلوں پہ راج کرے۔ جس کی بات آپ کے دل پر اثر کرے۔"

"دنیا ٹی وی کی طرف جا رہی ہے اور آپ؟ اور وائس اوور کیوں نہیں کرتیں؟"

"بہت سے لوگوں نے کہا کہ معاوضہ بھی اچھا ملتا ہے اور آواز کی کوالٹی بھی باہر آتی ہے، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے صرف ریڈیو کا ہی جنون ہے اور اس پہ ہی اپنی سب صلاحیتیں دکھاتی ہوں۔"

"آر جے ہر فیلڈ میں اپنے آپ کو آزماتے ہیں۔ کمرشل ڈبنگ، وائس اوور وغیرہ وغیرہ؟"

"جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب آپ کی باتوں پر غور کروں گی۔ حالانکہ مجھے مواقع بھی ملے مگر سب ضائع کر دیے۔ بس مجھے جھجک ہے کیمرے کے آگے جانے کی، اس لیے ٹی وی کی طرف نہیں آئی۔ ان شاء اللہ کبھی تو جھجک ختم ہو گی۔"

"آج کل آپ کے پروگراموں کا شیڈول کیا ہے؟"

"جی پیر گیارہ بجے سے ایک بجے تک... "سویٹ

بے نیاز یہ نوجوان اپنی دھن میں مگن کچھ نہ کچھ کرنے کا عزم لیے ایسے کارنامے انجام دے جاتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

اسامہ اعجاز آئی ٹی ریسرچ اسسٹنٹ اور ڈی ایچ اے سفہ یونی کے طالب علم ہیں۔ کمپیوٹر پروگرامنگ کے سلسلے میں ہونے والے مقابلے جو کہ حیدر آباد' کراچی اور اسلام آباد میں منعقد ہوئے ہیں میں حصہ لے چکے ہیں اور اب تک جو کام مکمل کر چکے ہیں ان میں اردو وائیڈ کی بورڈ' سندھی وائیڈ کی بورڈ اور پنجابی وائیڈ کی بورڈ شامل ہیں اور "پشتو کی بورڈ" اور "سرائیکی کی بورڈ" میں کام کر رہے ہیں اور سیکیور ایس ایم ایس پہ بھی کام جاری ہے۔ اسامہ بہت ہونہار طالب علم ہیں۔ ان سے ہم نے پوچھا۔

"اردو' پنجابی' سندھی اور اب پشتو اور سرائیکی کی بورڈ بنانے کا خیال کیسے آیا؟"

"حال ہی میں گوگل نے انڈیا کے لیے کی بورڈ لانچ کیا ہے۔ جس میں انڈیا کی زبانیں تامل' ہندی' گجراتی وغیرہ لکھی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ فرنچ' اسپینش' عربک اور تقریباً" ہر زبان کے باقاعدہ کی بورڈز' موبائل فونز پہ دستیاب ہیں'

ہوم شو" کے نام سے ہوتا ہے اور اس میں سیگمنٹ ہے۔ "ہم' آپ اور آپ کا انتخاب" اور اس میں ہر ٹاپک پہ ہم تفصیل سے بات کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں۔ مگر کچھ کہہ نہیں پاتے بدھ کے دن ایف ایم 101 میل باکس ہوتا ہے اور جمعہ کو گیارہ سے ایک بجے ہوم سویٹ ہوم میں سیگمنٹ ہے۔ "آؤ مل کر بنائیں پیارا گھر" اور اس میں ہم گھر کے حوالے سے مختلف موضوعات پر بات کرتے ہیں۔"

"زندگی اور وقت کیسا گزر رہا ہے؟"

"زندگی اچھی ہو تو وقت خود بخود اچھا ہو جاتا ہے تو الحمدللہ زندگی بھی اچھی گزر رہی ہے اور وقت بھی۔۔۔ "ماشاء اللہ۔۔۔"

اسامہ اعجاز طالب علم (آئی ٹی)

"ہمارے ملک میں ہنر مند نوجوانوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ حکومتی سطح پر اور نہ ہی میڈیا کی سطح پہ۔۔۔ آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے اور ہمارے نوجوان اس میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ شہرت کی خواہش سے

لیکن پاکستانی زبانوں کے باقاعدہ کی بورڈز مارکیٹ میں نہیں ہیں۔ اردو کا کی بورڈ گوگل نے بنایا ہے۔ لیکن آپ نے بہت کم لوگوں کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ کیونکہ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ لیکن ہمارے کی بورڈ میں آپ کو سارے الفابیٹ ایک ہی پیج پر لکھے ہوئے ملیں گے۔ یعنی کہ عام کی بورڈز کی طرح آپ کو "ح" لکھنے کے لیے ایچ شفٹ نہیں دبانا پڑے گا۔

اور کسی حرف کو ڈھونڈنے کے لیے دوسرے پیج پر نہیں جانا پڑے گا۔ اس سے ٹائپنگ اسپیڈ پہ فرق آجاتا ہے اور موبائل فون صارف ٹائپنگ اسپیڈ کی وجہ سے کتنے باخبر ہیں یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا۔

دوسری چیز یہ کہ اس میں انگریزی اور دوسرے کی بورڈز کی طرح ورڈ کمپلیکشن موجود ہیں۔ آپ احمد کا الف اور ح ٹائپ کریں۔ وہ مکمل ورڈ خود ہی متعین کرے گا۔ اس کی امپلی مینٹ کرنے کے لیے ہمیں سب سے زیادہ وقت لگا۔ اور تیسری بات یہ کہ جب آپ ایک حرف لکھ دیں گے تو دوسرا حرف وہ خود ہی ایڈجسٹ کرے گا۔ ہمیں یہ کی بورڈز بنانے کے لیے بہت ریسرچ کرنا پڑی۔ اور یہ سارا ٹیم ورک ہوتا ہے۔ لیکن یہ کی بورڈز بنانے کا آئیڈیا میرا اپنا تھا۔ جس پر کام بھی میں نے کیا اور میری مدد میرے جینئر تفسیر احمد اور میرے سی او ریسرچ مینشن داسوانی نے کی۔"

"کیا اس کے لیے زبان پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے؟"

"کی بورڈ بنانے کے لیے زبان پر عبور ہونا یا سمجھنا اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بس تھوڑی بنیادی معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ حروف کو سیٹ کرتے وقت کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ لیکن جب ٹیسٹنگ کا وقت آتا ہے، تب اس پر عبور ہونا ضروری ہے اور ٹیسٹنگ میں خود نہیں کرتا، بلکہ ریسرچر کی مدد لے لیتا ہوں، جو کہ لیب میں موجود ہوتے ہیں۔ آپ کو بتاؤں کہ اس میں سب سے زیادہ اہم کام "مواد" جمع کرنا ہوتا ہے، جو اردو اور سندھی زبان کے لیے تو آسان ہے، لیکن پنجابی پشتو اور سرائیکی کے لیے مشکل ہے۔ ہم نے اردو کے لیے 185000 حروف استعمال کیے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور سندھی کے لیے 135000 سے زیادہ حروف استعمال کیے اور پنجابی میں 86000 سے زیادہ حروف کا استعمال کیا اور ہمارا یہ سارا کام تقریباً 10 ماہ میں مکمل ہوا۔"

"اس کے لیے اخراجات کون دیتا ہے؟"

"ہماری حکومت تو نہیں دیتی پیسے۔ ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں انہیں خیال آجائے۔ فی الحال تو ہمیں ہماری یونی ورسٹی ہی بہت سپورٹ کرتی ہے اور جرمنی سے بھی ہمیں فنڈنگ آتی ہے۔ سالانہ کی بنیاد پر۔"

"اسامہ آپ سیکیور ایس ایم ایس کے لیے بھی کام کر رہے ہیں؟ یہ کیا ہے؟"

"سیکیور ایس ایم ایس ایک ایسی ایپلی کیشن ہے جس کے ذریعے کیے جانے والے ایس ایم ایس سینڈر اور ریسیور کے درمیان ہی رہیں گے۔ اگر کوئی وائرس یا نیٹ ورک پرووائڈر بھی آپ کے ایس ایم ایس پڑھنا چاہے گا تو نہیں پڑھ سکے گا۔ کیونکہ یہ ایس ایم ایس ان کرپٹڈ ہوں گے۔ میری ایپلی کیشن ایس ایم ایس کو سینڈ کرتے وقت اسے ایک عجیب سے کوڈ میں بدل دے گی اور جب کوئی مسیج ریسیو ہو گا تو وہ پہلے چیک کرے گی کہ یہ ایس ایم ایس اس یوزر کے لیے ہے جس کا یہ موبائل ہے یا نہیں، اگر مسیج اسی یوزر کے لیے ہو گا تو ایس ایم ایس کلیئر ہو جائے گا۔ ورنہ نہیں۔ ان کرپٹ ڈی کرپٹ کرنے کے لیے ایلگورتھم میں نے بنایا ہے۔"

"فیوچر میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ حکومت سے کوئی رابطہ ہوا آپ کا؟"

"پاکستان کے حوالے سے فیوچر کے لیے بہت سے آئیڈیاز ہیں میرے پاس، لیکن جب تک امپلی منٹ نہیں ہوتے، انہیں ڈسکس یا ڈس کلوز نہیں کرنا چاہتا

اکتوبر 2016ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- ''آب حیات'' عمیرہ احمد کا ناول تکمیل کے مراحل میں،
- ''تمل'' نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- ''تو حرف بیاں'' سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- ''کسی راہ کی چاہ میں'' نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- ''عمر ماروی'' کنیز نبوی کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ''وحشت جنوں'' آمنہ ریاض کا ناول،
- مصباح علی اور سمیرا عثمان گل کے ناولٹ،
- راشدہ رفعت، نادیہ جہانگیر، عطیہ خالد اور قانتہ رابعہ کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ اور معروف کرکٹر تسنیم عارف کی بیگم ''روبینہ عارف'' سے ملاقات،
- میری بیٹی، میری بھابھی کے صارم ''علی حسن'' سے باتیں،
- ''حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ'' مصنفین سے سروے،
- ''کرن کرن روشنی'' احادیث کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

اور حکومت کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ویسے میرا اپنا شوق ہے ہالی ووڈ میں بہ حیثیت گرافک ایڈیٹر کے کام کرنے کا۔"

"کمپیوٹر سائنس میں تعلیم حاصل کرنے کا خیال کیسے آیا؟ جبکہ والدین کی خواہش تو ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا ڈاکٹر یا انجینئر بنے؟"

"بچپن سے ہی کمپیوٹر دیکھتا اور استعمال کرتا چلا آرہا ہوں اور جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اسے جاننے کا شوق بڑھتا گیا۔ تو اس لیے اس طرف آگیا اور چونکہ والدین کی طرف سے بھی اجازت تھی کہ جو بننا چاہتے ہو بنو تو اور بھی آسانی ہو گئی۔"

"اپنی پڑھائی اور اپنی کاوش کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہو گے؟"

"جی۔ میں اپنے عوام سے کہنا چاہوں گا کہ یہ کی بورڈز اور سیکیور ایس ایم ایس میں نے آپ کے لیے بنائے ہیں' اس لیے آپ زیادہ سے زیادہ اس کا استعمال کریں۔ یہ آپ کی اپنی زبانیں ہیں اور ہمیں اپنی زبان کو فروغ دینا چاہیے اور میں والدین سے بھی گزارش کروں گا کہ اپنے بچوں کو اس فیلڈ میں جانے دیں جن میں ان کی دلچسپی ہے۔ ان پر زبردستی نہ کریں کہ یہ پڑھو' یہ نہ پڑھو' یہ بنو۔ وہ بنو وغیرہ وغیرہ۔ آپ انہیں فری ہینڈ دیں' پھر دیکھیں وہ کس طرح آگے بڑھتے ہیں۔"

"اسامہ آپ کے خیالات جان کر اور آپ کی قابلیت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پڑھائی کے علاوہ کیا مشاغل ہیں آپ کے؟"

"پڑھائی کے علاوہ کمپیوٹر گیمز کا بہت کریز ہے۔ کھیلوں میں باسکٹ بال پسند ہے۔ سوئمنگ بھی پسند ہے۔ اور موویز دیکھنے کا نہ صرف شوق ہے کہ موویز بنانے کا بھی بہت شوق ہے اور اپنا یہ شوق چھوٹی چھوٹی موویز بنا کر پورا کرتا رہتا ہوں۔ ان شاء اللہ اسے بڑے پیمانے پر بھی بناؤں گا۔"

"کب' کہاں پیدا ہوئے اور کتنے بہن بھائی ہیں؟"

"جی میں 4 مئی 1996ء میں کراچی میں پیدا ہوا اور ہم تین بہن بھائی ہیں۔ بڑا میں ہوں۔ پھر بہن ہے جو "اقراء یونی ورسٹی" میں "بی بی اے" کی طالبہ ہے اور پھر چھوٹا بھائی ہے' جس نے حال ہی میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے۔"

"بہت شکریہ اسامہ۔ بہت ترقی کرو۔"

☆

توے کے پکوان

خالدہ جیلانی

بھنا کڑاہی قیمہ

ضروری اشیاء :

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
پسا ہوا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
کچا پپیتا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا پاؤ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا پسا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پانی	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت
پسا گرم مسالا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب :

قیمہ دھو کر چھلنی میں ڈال کر پانی خشک کر لیں۔ پیالے میں قیمہ اور پسا ہوا کچا پپیتا ڈال کر ملا لیں اور میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کر کے پیاز گلابی ہونے تک تلیں پھر اس میں دہی، نمک، گرم مسالا، لال مرچ، زیرہ اور پسا ہوا دھنیا ڈال کر بھونیں اور ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔

جب قیمہ گل جائے تو اچھی طرح بھون کر سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

توا کلیجی

ضروری اشیاء :

کلیجی	آدھا کلو
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
لال کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر پسے ہوئے	تین کھانے کے چمچے
تیل	تین کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

توے پر تیل گرم کر کے لہسن کو کوٹ کر ہلکا سا تل لیں اور کلیجی ڈال کر رنگ تبدیل ہونے تک بھونیں۔ اس کے بعد اس میں نمک، کٹی لال مرچ اور ٹماٹر پسے ہوئے ڈال کر ڈھک کر دس سے بارہ منٹ ہلکی آنچ پر گلنے تک پکائیں۔

جب گل جائے تو لیموں کا رس شامل کر کے چولہا بند کر دیں۔ سرونگ ڈش نکال کر پیش کریں۔

شاہی چانپ قورمہ

ضروری اشیاء :

چانپیں	آٹھ سے دس عدد
پیاز	تین عدد
دہی	ایک کپ
بڑی الائچی	ایک عدد
چھوٹی الائچی	دو سے تین عدد
لونگ	چار سے پانچ عدد
کالی مرچ	چھ سے سات عدد
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دیگی لال مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسا ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
پسے بادام	آدھا چائے کا چمچہ

زعفران ایسنس	چند قطرے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دیگچی میں تیل گرم کرکے پیاز کو سنہرا کرکے نکال لیں۔ بلینڈر میں دہی اور پیاز ڈال کر پیس لیں۔ اس کے بعد دیگچی میں تیل گرم کرکے چانپیں ڈال کر فرائی کرلیں اور نمک 'لال مرچ' کالی مرچ' ہلدی 'پسا دھنیا' پسا لہسن 'ادرک' لونگ چھوٹی الائچی اور بڑی الائچی

ڈال کر چانپیں گلنے تک ــــ ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔

جب چانپیں گل جائیں تو بھونتے وقت پیاز اور دہی کا آمیزہ اور پسی لال مرچ ڈال کر اچھی طرح بھون لیں' تھوڑا سا پانی ڈال کر حسب پسند گریوی بنالیں' جوش آنے پر پسے بادام اور زعفران ایسنس ڈال کر چولہا بند کردیں اور دو منٹ تک دم پر رکھ کر سرونگ ڈش میں نکال کر سلاد اور نان کے ساتھ تناول فرمایے مزے دار شاہی چانپ قورمہ تیار ہے۔

گولا کباب ہانڈی

ضروری اشیاء :

گولا کباب کے لیے

قیمہ	آدھا کلو
تلی ہوئی پیاز	آدھا کپ
پسے ہوئے چنے	دو کھانے کا چمچہ
خشخاش	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ہری مرچیں	دو سے تین
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
پسی جائفل جاوتری	ایک چوتھائی چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو چائے کے چمچے

ہانڈی کے لیے :

پیاز	دو عدد
پسی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چوپر میں قیمہ' تلی ہوئی پیاز' پسے ہوئے چنے' خشخاش' ہرا دھنیا' ہری مرچیں' گرم مسالا' لال مرچ' جائفل' جاوتری' نمک اور تیل ڈال کر قیمے کو اچھی طرح باریک پیس لیں اور اس کے لمبوترے کباب بنا کر فریج میں ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

اس کے بعد پین میں تیل گرم کرکے پسی ہوئی پیاز ڈال کر ہلکا سا تل لیں۔ لال مرچ' دھنیا' ہلدی' زیرہ ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اور دہی شامل کرکے دھیمی آنچ پر بھونیں اور چمچہ بھی چلاتی رہیں' ضرورت محسوس ہو تو پانی کا چھینٹا دیں۔ جب مسالا اچھی طرح بھن جائے اور خوشبو آنے لگے۔ اس میں تیار کیے ہوئے کباب شامل کرکے ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں' چمچہ نہیں چلانا' دیگچی کو کپڑے سے پکڑ کر ہلائیں جب پانی خشک ہوجائے تیل اوپر آجائے تو بھون کر حسب پسند شوربا بنالیں اور ہری مرچیں شامل کرکے کچھ دیر کے لیے ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر نان کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

سندھی بریانی

ضروری اشیاء :

گوشت	تین پاؤ

باسمتی چاول	تین پاؤ
ہری مرچیں	آٹھ عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ٹماٹر	چار عدد
دہی	ایک کپ
پیاز	دو عدد
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
جائفل جاوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچیں	دس عدد
لونگ	چھ عدد
دار چینی	ایک انچ کا ٹکڑا
سبز الائچی	آٹھ عدد
بڑی الائچی	دو سے تین عدد
پسا لہسن اور ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
آلو	آدھا کلو
کیوڑہ	ایک کھانے کا چمچہ
زرد رنگ	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر تل لیں، سنہری ہوجائے تو نکال کر ______ پیس لیں۔ اسی تیل میں گوشت، ادرک، لہسن، ہری مرچ اور پسا ہرا دھنیا ڈال کر تھوڑا سا تل لیں۔ لال مرچ، پسی جائفل جاوتری، کالا زیرہ، لونگ، سیاہ مرچیں، دار چینی، سبز الائچی، بڑی الائچی، دہی، ٹماٹر اور نمک ڈال کر بھون لیں۔

دیگچی میں چاول اور حسب ذائقہ نمک ڈال کر ابال لیں۔ ایک کنی باقی ہو تو چھان لیں۔ بڑی دیگچی میں ہلکا سا تیل لگا کر پھیلا دیں، پھر ایک تہ گوشت کی لگائیں۔ ابلے ہوئے آلو ڈال کر ایک تہ چاول کی لگائیں۔ زرد رنگ اور کیوڑہ ڈال کر بیس سے پچیس منٹ ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔

چاول کی ڈش میں نکال کر سنہری پیاز سے سجا کر پیش کریں۔

سادہ کیک

اجزا :

انڈے	تین عدد
میدہ	ایک کپ
چینی	دو سے تین کپ
مکھن	آدھا پاؤ
بیکنگ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
فوڈ کلر	تین قطرے

ترکیب :

مکھن میں چینی اور ونیلا ایسنس ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔ حتی کہ چینی اور مکھن یکجان ہوجائیں۔ پھر انڈے پھینٹ کر ڈال دیں۔ میدہ اور بیکنگ پاؤڈر چھان کر ڈالیں اور ساتھ ہی فوڈ کلر بھی ڈال دیں اور اچھی طرح ملالیں۔ اور کیک کے سانچے میں ڈال کر اوون میں بیک کریں۔ اگر آپ کے پاس اوون نہیں ہے تو ایک بڑے پتیلے میں اسٹینڈ یا اسٹیل کی پلیٹ رکھ کر اس پر کیک کا سانچہ رکھ دیں اور پتیلے کو اچھی طرح ڈھک دیں۔ تاکہ اس کی بھاپ باہر نہ جائے۔ پھر دس منٹ بعد اسے چھری سے چیک کریں۔ کیک بیک ہوجائے تو نکال کر چائے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ادارہ

خوب صورت سلسلے

دن بھر ترو تازہ رہیں

لندن میں ماہرین نے چھ ایسے نسخے پیش کیے ہیں جو پورے دن آپ کو ترو تازہ اور چوکنا رکھتے ہیں تاکہ آپ غنودگی سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے کام بہ آسانی انجام دے سکیں۔

کمرے میں اندھیرا نہ ہو

خواب گاہ یا کمرے میں ایسا انتظام رکھیں کہ صبح ہوتے ہی روشنی آپ تک پہنچے۔ اگر ممکن ہو تو کمرے کی کھڑکیاں کھول کر سوئیں تاکہ ہوا اندر آتی رہے، جو صحت کے لیے فرحت بخش ہوتی ہے۔ صبح بے دار ہونے کے لیے روشنی خصوصی اہمیت رکھتی ہے اور یہی روشنی نیند کو باقاعدہ بھگاتی ہے۔ اندھیرا نیند لاتا ہے تو روشنی بے دار کرنے میں مدد دیتی ہے۔

ٹھنڈے پانی سے غسل

ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ پانی دماغ کے بعض حصوں کو جگا کر بے داری کو ممکن بناتا ہے اور یوں تھکاوٹ اور غنودگی کم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے جسم کا میٹابولزم کا نظام بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈا پانی بدن کے اعصابی نظام کو متحرک کرتا ہے جس کا اثر پورے دن رہتا ہے۔ لیکن یہ عمل سردیوں میں ہرگز نہ کریں، کیونکہ اس سے آپ کی صحت پر منفی اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔

پانی کا زیادہ استعمال

صبح برش کرنے کے بعد ایک سے دو گلاس پانی پی لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیند کے آٹھ گھنٹے تک آپ پانی نہیں پیتے اور پسینے وغیرہ سے بدن میں پانی کی قلت ہو جاتی ہے۔ پانی کی کمی دماغ کو شدید متاثر کرتی ہے، جبکہ مناسب مقدار میں پانی نہ پینے سے دماغی ارتکاز اور جسمانی پھرتی کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے پانی کا بھرپور استعمال کریں۔

صحت سے بھرپور ناشتا

ناشتا دن کا سب سے اہم کھانا ہے، جس کی اہمیت ہر روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ میٹھی اشیا کم کھائیں، اس کے بجائے ریشے (فائبر) اور کاربوہائیڈریٹ والی خوراک کا استعمال کریں۔ کیونکہ انہیں کھانے سے بدن چست اور توانا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دلیہ، سیریلز اور ایسی ہی دیگر اشیا کا ناشتا بہت موثر رہتا ہے، جو بھوک دیر سے لگاتا ہے اور آپ کو توانا اور چاق و چوبند رکھتا ہے۔

آپ کو میٹھی اشیا مثلاً "ڈونٹس وغیرہ نہ کھانے کا مشورہ اس لیے دیا جا رہا ہے کہ مٹھاس کی توانائی جلدی ختم ہو جاتی ہے اور بھوک جاگ جاتی ہے، جس کا نتیجہ جسمانی سستی کی صورت میں نکلتا ہے۔

کینو کا رس

اگر صبح ایک گلاس کینو کا جوس پی لیا جائے تو یہ صحت کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھٹے رسیلے پھلوں میں فلیو نوئڈز پائے جاتے ہیں، جو نہ صرف دماغ کو حاضر رکھتے ہیں، بلکہ یادداشت بہتر بنانے سمیت جسمانی رد عمل کو بھی موثر بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھول اور نسیان کے امراض کو بھی کم کرتے ہیں۔

کینو کا جوس نہ ہو تو کوئی بھی موسمی پھل کھایا جا سکتا ہے۔

ورزش

صبح کی تیز واک کا کوئی متبادل نہیں۔ صبح کی ورزش پورے دن مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لیے صبح تیز قدموں سے کم از کم تیس سے چالیس منٹ تک واک کریں، کیونکہ اس سے دماغ کا ایک حصہ ـــــ بہت سرگرم ہوتا ہے اور یہ گوشہ یادداشت اور سیکھنے کے عمل میں اپنا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(بہ شکریہ فرائی ڈے اسپیشل)

✡